سیرت محمد علیؒ

مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

بسم اللہ

سیرت محمد علیؒ

مرتبہ

رئیس احمد جعفری۔ ندوی
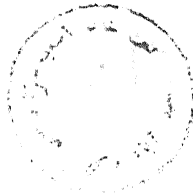
شائع کردہ

مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

قیمت ۱ر — ۳۲ء

مطبوعہ جامعہ برقی پریس، دہلی

پہلے شیخ الجامعہ، جامعہ ملیہ، علی گڑھ
(سنہ ۱۹۲۲ء)

فہرست

حصّہ اوّل

حصّہ دوم

عرض ناشر

شہید ملت مولانا محمد علی مرحوم کے سوانح حیات کا ایک مختصر خاکہ ناظرین کی خدمت میں پیش ہے۔ انسان کی زندگی کائنات کا سب سے پوشیدہ راز ہے۔ اور انسانی شخصیت کو سمجھنا اور سمجھ کر دوسروں کو سمجھانا اسی نسبت سے دشوار۔ پھر جب یہ شخصیت محمد علی جیسی جامع حیثیات ہو تو اس دشواری کا کیا ٹھکانا ہے!

محمد علی کی زندگی کا بیان دراصل ایک قوم اور ایک ملت کے حال و استقبال کی تفسیر کرنا ہے کہ محمد علی اسلامی ملت اور ہندی قوم کا قائد تھا اور نمائندہ بھی۔ ایک بیدار ہونے والے ملک، ایک خواب گراں سے جاگنے والی ملت کی ساری بیتابی، سارا وفور شوق، ساری سرگرمی، ساری خود فراموشی اس ایک پیکر خاکی میں جلوہ گر تھی۔ یہی نہیں، اس کی ذات آغاز کار کی تمام تکلیفوں اور پریشانیوں، بے ترتیبیوں اور ہنگاموں کا مظہر بھی تھی نامساعد حالات سے جنگ پیہم، بے سروسامانی، بے یاری و بے مددگاری، ہمرہوں کی خفتہ پائی، ہم نواؤں کی کج فہمی، غرض کونسی چوٹ تھی جس نے اُس کی روح کے گوشہ گوشہ کو گھائل نہ کر دیا ہو، وہ ہماری قومی اور ملی زندگی کی اجمالی تصویر تھا۔ ان صفحات میں اس تصویر کا ایک عکس ضرور ہے، مگر بس ایک خاکہ، دھندلا سا اور نامکمل۔ اس کی تکمیل کا پورا حق بیسویں صدی میں اسلام اور ہندوستان کی سرگذشت لکھنے والا مورخ ادا کر سکے تو کر سکے۔

مگر اس نمائندہ اور قائد کے سینہ میں ایک آگ تھی، جس کی چنگاری سے خفتہ ملتیں بیدار اور مردہ قومیں زندہ ہو جاتی ہیں۔ وہ آگ جو کبھی باطل دوستوں کے لیے بہت ناگوار شعلہ نوائی کی شکل میں ظاہر ہوتی، کبھی آنسو بن کر اس کی سرشار محبت آنکھوں سے ڈھلتی تھی اپنے سینہ کے اس دفینۂ آتشیں سے

وہ اپنی قوم کے نوجوانوں کے سینوں میں کچھ چنگاریاں منتقل کر گیا ہے۔ جو اس کے ان خوابوں کی تعبیر کی ضمانت ہیں جنھیں نادان سمجھتے ہیں کہ اس کے ساتھ ختم ہو گئے۔ اس سیرت کے مرتب مولوی رئیس احمد صاحب جعفری انھیں نوجوانوں میں ہیں۔ انھیں اپنے موضوع سے محبت ہے، عشق ہے، اور اس لیے کیا عجب کہ یہ اس کیمیا اثر چنگاری کو دوسرے سینوں تک منتقل کرنے میں کامیاب ہوں۔ اگر یہ ہو تو ہم اپنی سعی کو مشکور سمجھیں گے۔

ناشر
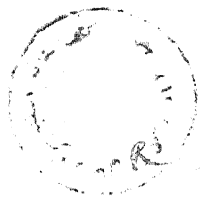
دیباچہ

از مولانا عبد الماجد صاحب بی، اے، مدیر "سچ"

ماضی قریب میں اسلامی ہند کی سرزمین نے جو چوٹی کے اکابر و مشاہیر پیدا کیے، اگر یہ سوال ہو کہ بہ لحاظ جامعیت ان میں سرِ فہرست کس کو بنایا جائے، اور کون ایک ایسا شخص انتخاب کیا جائے جس کی سوانح حیات کے اندر اجمالاً پوری عصر حاضرہ کی تاریخ آجائے تو جواب میں صرف ایک ہی نام لیا جا سکتا ہے، اور وہ نام امت کے محبوب ترین ناموں "محمد" اور "علی" کا مجموعہ ہوگا!

اس دور نے یقیناً بعض بڑے اور جلیل القدر علماء دین پیدا کیے، لیکن ان کی ناموری صرف دینداروں کے طبقہ تک محدود رہی، بعض نامی و گرامی مشائخ طریقت پیدا کیے لیکن ان کا نام بس مریدوں اور معتقدوں ہی کی زبان تک رہا، بعض مشہور رفارمر پیدا کیے لیکن ان کی اور ان کے "رفارم" دونوں کی شہرت، انگریزی تعلیم یافتہ گروہ کے حدود سے آگے نہ بڑھی، بعض زبردست خطیب اور لیڈر پیدا کیے، لیکن انھیں کانفرنسوں کے پلیٹ فارم اور کانگرسوں کے ڈائس کے باہر کسی نے نہ جانا، یہ چیدہ مشاہیر اور اکابر کا حال ہوا، دوسروں کی آوازیں اور بھی پست تر نکلیں اور ان سے بھی تنگ تر دائروں میں گونج کر رہیں، ملک کے طول و عرض میں بس ایک ہی ہستی ایسی تھی جس کی آواز مشرق نے بھی سنی اور مغرب نے بھی، شمال نے بھی اور جنوب نے بھی، ہمالیہ کی بلندیوں نے بھی اور گنگا کی لہروں نے بھی، پڑھے لکھوں نے بھی اور ان پڑھوں نے بھی، عالموں نے بھی اور جاہلوں نے بھی، بڑوں نے بھی چھوٹوں نے بھی، سرداروں نے بھی اور خاکساروں نے بھی، شہر کے مہذبوں نے بھی اور دیہات کے گنواروں نے بھی۔ وائسرائگل لاج کی چمکتی اور جگمگاتی ہوئی

برجیوں نے بھی، اور جیل خانہ کی تنگ و تاریک کال کوٹھریوں نے بھی، راجوں مہاراجوں کے قصر و ایوان نے بھی اور فاقہ کشوں کے ٹوٹے پھوٹے جھونپڑوں نے بھی!

اس کا کلام حسن سنکر ڈرائنگ روم کے کوچ اور صوفے کھلکھلا کھلکھلا کر ہنسے، اس کا پیام حسن سنکر مسجد کے محراب و منبر بلبلا بلبلا کر روئے، خانقاہیں اور مدرسے، پارک اور نشاط خانے، کھنڈر اور ویرانے، قوم پروروں کی کانگرس اور فرقہ پروروں کی کانفرنس، پریس اور پلیٹ فارم، دیوبند اور ندوہ، فرنگی محل اور علی گڑھ، جمعیۃ العلماء اور مسلم لیگ سب کے سب اس سے مانوس اور مالوف، سب کے چپہ چپہ پر اس کے نقش قدم کے نشان، سب کا ذرہ ذرہ اس کے خیر مقدم سے لطف اندوز!

معاصر اور حریف بہت سے تھے پر قبول خداداد اور محبوبیت تام کی دولت سے وہی ایک ممتاز، یہ سعادت "زور بازو" کا نتیجہ نہیں، ذٰلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔

کہتے ہیں جو حق تعالیٰ کا ہو جاتا ہے، حق تعالیٰ اُس کا ہو جاتا ہے، بزرگوں کا قول ہے یقیناً صحیح ہوگا، لیکن آنکھوں کا مشاہدہ تو یہ ہے کہ جو اللہ کے بندوں کا ہو گیا تھا اللہ کے بندے اُسکے ہو گئے تھے، محمد علی نے اپنے کو اللہ کی خاطر، اللہ کے دین کی خاطر، خدمت خلق کے لیے وقف کر دیا تھا، خلق نے بھی اپنے تئیں محمد علی کے لیے وقف کر دیا، وعدۂ ربانی کہ

ان الذین اٰمنوا وعملوا الصّٰلحٰت سیجعل لھم الرحمٰن ودًّا (مریم ع ۶)	یقیناً جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال کرتے رہے ہیں خدائے رحمٰن ان کے لیے (خلق کے دلوں میں) محبت پیدا کر دیگا !

کی تفسیریں لفظ و عبارت میں بہت دیکھی تھیں، گوشت و پوست میں مجسم تفسیر محمد علی کی زندگی میں نظر آئی!

اس دل و دماغ کا، ایسا جامع الصفات سردار کسی قوم کو خوش نصیبی ہی سے کہیں مدتوں میں ہاتھ آتا ہے، جنھیں یہ نعمت ملی انھوں نے قدر نہ کی ——— وقت پر نعمت کی قدر دنیا نے کب کی ہے؟ ——— دولت کیا ٹھہرنے والی اور نعمت کیا رکنے والی تھی! ایک آنی دولت اور فانی نعمت تھی، آئی اور گئی

تو نظیری ز فلک آمدہ بودی چو مسیح　　باز پس رفتی و کس قدر تو نشناخت دریغ

اور پھر مسلمان! انھوں نے اپنی تیرہ سو سال کی تاریخ میں قدر کس کی پہچانی ہی؟ شیرِ خدا علیؓ مرتضیٰؓ کی؟ خلیفۂ رسول عثمانؓ غنی کی؟ جوانانِ جنت کے سردار حسینؑ کی؟ جب اپنی شور بختیوں سے ایسے ایسے سرداروں کی قدر نہ پہچانی تو اسے کیا غم و ماتم کہ ان کے غلاموں کے غلام، محمد علی کی ناقدری رہی؟ اور اسے خواہ مخواہ شور بختی ہی کیوں قرار دیجیے؟ صنّاع کامل کی مصلحتوں کی تھاہ، اور حکیم علی الاطلاق کی حکمتوں کے بھید کون پا سکا ہے؟
کم تھے جنھوں نے محمد علی کو پہچاننے کی کوشش کی، کمتر تھے جو اس کوشش میں کامیاب ہی،

ادب و سیاست، خطابت و صحافت، قیادت اور انشا پردازی، طرح طرح کے گہرے گہرے نقاب کچھ اس طرح تہ بتہ پڑے ہوئے تھے کہ چہرے کے اصلی خط و خال اور بشرہ کے حقیقی حسن و جمال کا مشاہدہ دشوار ہو گیا تھا، مبارک تھے وہ جنھوں نے قریب آکر دیکھ لیا، مبارک تر تھے وہ جنھوں نے دور ہی سے فراستِ ایمانی کی روشنی میں بھانپ لیا، اور جیتے جی نہ سہی، مرنے کے بعد یوں فاش و برملا کہدیا[1]،

بدینِ مصطفیٰ دیوانہ بودی	فدائے ملتِ جانانہ بودی
بہ بزمِ ما رئیسِ عشق بازاں	بہ رزمِ دشمناں فرزانہ بودی
بدل بودی فقیرِ بے نوائی	بہ قالبِ پیکرِ شاہانہ بودی
سیاست را نقابِ چہرہ کردی	وگرنہ عاشقِ مستانہ بودی
سیاست تہمتی بر حُسنِ پاکت	ز آئینِ خرد بیگانہ بودی
چہ دانستی کجا سوزم، نہ سوزم	تو شمعِ دین را پروانہ بودی
بایمانہا ز تو زورے و شورے	کجاہا ہمتِ مردانہ بودی
رمیدی از رہِ اغیار نایار	عجب مستے عجب دیوانہ بودی

محمد علی کی بہت سی تصویریں کھینچی گئیں، لیکن صحیح ترین مرقع یہی ہی، محمد علی پہلے جو کچھ بھی رہے ہوں علیگڑھ کے ایک مشہور "کھلنڈرے" آکسفرڈ کے ایک بہترین طالب علم، انگریزی کے ایک اعلیٰ انشا پرداز، ایک بہترین ایڈیٹر، شیکسپیر کے ایک ماہر نقاد، اتھیلو، میکبتھ وغیرہ کے ایک اعلیٰ مبصر، ایک سحر بیان مقرر، ایک بلند پایہ

[1] اشارہ ہی مولنا مناظر احسن صاحب (عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد) کی طرف یہ اشعار صاحب موصوف نے مولنا محمد علی کے انتقال پر کہے تھے۔ مؤلف

شاعر، ملک کے ایک نامور رہنما، ایک ممتاز ترین سیاسی سردار، لیکن آخر میں؟ آخر میں یہ ساری حیثیات سمٹ سمٹا کر صرف ایک ہی حیثیت میں جمع ہوگئی تھیں، اور جو کبھی اپنی عقل و فرزانگی کے لیے مشہور تھا، وہ اپنے خبط و دیوانگی کے لیے بدنام ہو کر رہ گیا"! مرنے پر کانوں میں آوازیں آئیں کہ ملک و ملت کا سیاسی رہنما چل بسا لیکن دل سے صدا اُٹھی تو بس یہی۔ کہ آج "محمد" کا دیوانہ دنیا سے رخصت ہوگیا!

ہاں، وہ محمد کا شیدائی، دین مصطفےٰ کا دیوانہ، اور اُمت محمدی کا بن داموں کا غلام تھا۔ ہندوستان ہی میں نہیں عالم اسلام میں کہیں کسی کلمہ گو کے پھانس چبھتی، اور اُس کی چبھن محمد علی کے ہونے لگتی، مصیبت کسی مسلمان پر بھی آئے اور درد سے بیتاب محمد علی، اسلام پر، قانون اسلام پر، شعائر اسلام پر، کہیں کوئی حملہ ہوا اور تڑپ محمد علی کے دل و جگر میں پیدا! مقابلہ انگریزوں سے آپڑے، ہندوؤں سے پڑ جائے، حکومت سے ہو، خود اپنے مسلمانوں سے ہو، محمد علی کا سینہ ہر وار کے لیے سپر بنا ہوا! ۱۹۲۶ء میں حج اور شرکت مؤتمر اسلامیہ کے لیے جب جانے لگے، اور سلطان ابن مسعود کی حکومت ابھی نئی نئی ہوئی تھی، تو ہمدرد میں اپنے قلم سے خود لکھا

"اب نہ بنی امیہ کا دور ہو سکتا ہے، نہ بنو عباس کا، نہ خاندان عثمان کا، اب حکومت اسلام ابن اسلام کی ہوگی"

دن رات اُٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، یہی دُھن تھی اور اسی کا کلمہ آخری سفر پر جب بمبئی سے روانہ ہونے لگے جو سفر آخرت کا پیش خیمہ تھا، تو اُس وقت بھی اسلام کے تحفظ ناموس پر کچھ ایسے ہی الفاظ زبان سے کہے۔ حق تھا کہ ایسے شخص کی جب موت آئے تو سارا عالم اسلام شرق سے غرب تک اُس کی عزاداری میں سیہ پوش ہو جائے اور شمال سے جنوب تک ایک ماتم سرا بن جائے، اور یہی ہو، پھر غریب الوطنی کی موت کے بعد جگہ بھی ملی تو کہاں؟ وہاں جہاں کے لیے آرزو اور تمنا بڑے بڑے صدیقوں اور شہیدوں نے کی ہے، خود بعض انبیاء کرام تک نے کی ہے! سلیمانؑ و داؤدؑ کا قبلہ، موسیٰؑ و عیسیٰؑ کا قبلہ، خود نبی القبلتین کا پہلا قبلہ! داقبال

خاک قدس اور ابہ آغوش تمنا در گرفت سوے گردوں رفتن آں راہے کہ پیغمبر گزشت

"جسم" کو جو عروج نصیب ہوا سب نے دیکھا، "روح" کو جو مقام حاصل ہوا ہوگا اُس کا اندازہ کون کرے؟ جیسے آدمی کاندھوں پر اُٹھا کر لائے اُسے سب نے دیکھا، جسے نور کے فرشتے ہاتھوں ہاتھ لے گئے اُس کے درجہ و مرتبہ کو کون

ایک ایسا شخص جو ایک طرف وزیر ہند (مسٹر مانٹیگو) اور وزیر اعظم برطانیہ (مسٹر لائڈ جارج) کے سامنے لندن میں گھنٹوں مسئلہ خلافت پر آزادانہ تقریر کر سکتا ہو، جو عین ہیجان مخالفت کے وقت لندن اور پیرس کی بڑی بڑی مجلسوں میں ترکوں کی حمایت میں مدلل و مفصل، شستہ و برجستہ اظہار خیال کر سکتا ہو، جو وایسرائے اور گورنروں کے سامنے، سارڈا ایکٹ اور دوسرے قوانین کے سلسلہ میں مخالفانہ تقریر کر کرکے انھیں قائل و معقول کر سکتا ہو، کامریڈ میں سیاست حاضرہ اور مذہب پر دس دس بیس بیس کالم کے مضامین بہترین ادب و انشا کے ساتھ سپرد قلم کر سکتا ہو، انگریزوں کی کلب لائف میں شریک ہو تو ایسا گھل مل جائے کہ انھیں میں سے ایک معلوم ہونے لگے، دوسری طرف مسجد کے منبر پر وعظ کہنے کھڑا ہو تو روتے روتے اپنی داڑھی بھگو لے، اور سننے والوں کی تو ہچکیاں بندھ بندھ جائیں، محفل سماع میں بیٹھے تو اس کا وجد وحال دیکھ کر دوسروں کو وجد آجائے، مسئلہ قتل مرتد پر حسب استشہاد و استنباط شروع کرے تو اچھے اچھے فقہا اس کا لوہا مان جائیں، آزاد خیال اتنا کہ ہر کلمہ گو کو اپنا حقیقی بھائی سمجھ لے، متقشف ایسا کہ مصطفےٰ کمال امان اللہ خاں، اور سلطان ابن سعود کو آخر تک معاف نہ کرے، نماز کا پابند اتنا کہ ایوان پارلیمنٹ کے برامدہ میں بھی جانماز بچھا کر کھڑا ہو جائے اور اس عمارت میں شاید بالکل ہی پہلی بار رکوع و سجود کی ایک نظیر قائم کر جائے، دلیر اتنا کہ دشمنوں کے بڑے سے بڑے مجمع میں گھس جائے، سلطان ابن سعود کے منہ پر بھرے مجمع میں سب کچھ کہہ سنکر رکھدے، ادیبوں کی محفل میں ادیب، شاعروں کی مجلس میں غزل گو، اہل سیاست کی صف میں ممتاز، عوام وخواص دونوں کے اعتماد و عقیدت سے سرفراز، ایسی ہمہ گیر، ایسی عامۃ الورود ہستی کی سوانح حیات مرتب کرنا کوئی آسان بات ہے؟

مذہب، سیاست، علم، ادب، تعلیم، صحافت، کانفرنسیں اور جلسے، اس پچیس تیس سال کے اندر، اسلامی ہند بلکہ ایک حد تک مملکت ہند، اور عالم اسلامی میں، جو بھی تحریک کسی بھی ادارے میں ہوئی محمد علی کی شخصیت اس کے اندر کارفرما، اور محمد علی کا اثر براہ راست نہ سہی بالواسطہ سہی اس میں موجود، ایسے شخص کی سیرۃ نگاری، ایک شخص کی سیرۃ لکھنا نہیں، وقت کی پوری تاریخ مرتب کر ڈالنا ہے، کس پہلو کو لیا جائے، کس کو چھوڑا جائے کون کون سے رُخ نمایاں کیے جائیں اور کون سے مدھم ہی رہنے دیے جائیں، کیا کیا پھیلایا جائے، اور

کیا کیا سمیٹ لیا جائے، ہر ہر موضوع ایک مفصل اور مبسوط گفتگو کا طالب، ہر ہر عنوان ایک ضخیم دفتر کا متقاضی۔

ضرورت تھی کہ اچھے جید اہل قلم اور پختہ کار مصنفین کی ایک پوری جماعت "ترتیب سوانح" کا کام ہاتھ میں لیتی، اور وہ بھی فی الفور نہیں ایک عرصہ تک تلاش و تفحص جاری رکھنے کے بعد اپنی فکر و کاوش کے نتائج ایک نہیں کئی ضخیم مجلدات میں مرتب کرکے شائع کرتی، لیکن حالات مساعد نہ ہونے تھے نہ ہوئے، تفصیلات کو چھوڑیئے ان اسباب کی شرح اگر کیجائے تو خود ایک مستقل رسالہ "شرح اسباب" تیار ہو جائے، جمود اور افسردگی کے اس منظر کو دیکھکر، جامعہ ملیہ کا ایک نوعمر و نوخیز ہونہار اہل قلم آگے بڑھا، اور اپنی عمر و تجربہ کی کمی کو ہمت کی فراوانی سے پورا کرکے بلا تکلف اور بے دھڑک اس بار عظیم کے لیے اپنے سر و شانہ کو پیش کر دیا جس کے سنبھالنے کے لیے کئی کئی قوی الجثہ اور تنومند پہلوان، کشتیاں نکالے ہوئے اور اکھاڑے جیتے ہوئے درکار تھے، آفرین در حمت اسکی ہمت پر، آفرین و رحمت جامعہ کی مستعدی و کارگذاری پر! جامعہ ہاں وہی محمد علی کی یادگار جامعہ ملیہ ——— وہ پودا جسے محمد علی نے اپنے ہاتھ سے زمین میں لگایا، بڑھایا، سینچا، پالا

منازل سفر کی دوریوں، اور راہ کی دشواریوں، زاد سفر کی بے سر و سامانیوں اور یاران طریق کی کج ادائیوں کی حکایت کیا، اور کس سے کیجیے؟ اور کیجیے بھی تو سننے والوں سے امید کیا رکھیے، خود جوہر ہی کے الفاظ میں،

خضر کیا جانے بھلا راہ نمائی کے مزے!

ہر کیف بہرحال چند ماہ کی مختصر مدت میں، شوق و عقیدت کے جذبات اپنے نقوش جو کچھ کاغذ کے دامن پر پھیلا سکتے تھے، وہ حاضر خدمت ہیں، یہ لخت دل "ہیں" اپنے "مال تجارت" کا دھوکا نہ ہو۔

آگے بڑھنے سے قبل معروضات ذیل کو ذہن نشین فرما لیا جائے۔

صاحب سیرۃ کی زندگی، سپاہی کی زندگی تھی، ساری عمر دشمنوں سے اور کبھی کبھی دوستوں سے بھی لڑتے اور مقابلہ کرتے ہی گزری، ممکن نہیں کہ محمد علی کی سیرۃ دیانت کے ساتھ لکھی جائے، اور محض بزم آرائیوں کی داستان پر ختم ہو جائے۔ "خالد جانباز" کے وقائع اور کارنامے کوئی "حافظ شیراز" کی زبان میں آخر کیونکر بیان

کرے؛ بعض نازک دلوں کے جذبات کو جابجا صدمہ یقیناً پہونچیگا اس کے لیے شروع ہی سے تیار رہنا چاہئے مؤلف نے سنبھل سنبھل کر اور بہتوں کے جذبات کی رعایت کر کر کے قلم اٹھایا ہی، پھر بھی واقعات میں تحریف کے مجرم تو نہیں ہو سکتے تھے، علی مرتضیٰ کے سیرۃ نگار کے لیے، جنگ صفین، اور حسین بن علی کے سوانح نویس کے لیے میدان کربلا کا ذکر زبان قلم پر نہ لانا کیونکر ممکن ہی؟

(۲) بعض بعض مقامات پر کم فرصتی کے باعث واقعات کی پوری تحقیق نہ ہو سکی، یا انداز بیان، اور واقعات میں کچھ خلط ملط سا ہو گیا ہی مثلاً صفحہ ۳۸۹ پر ایک جلسۂ لکھنؤ کا جو ذکر ہی وہ بعض جزئیات کے لحاظ سے محتاج تصحیح ہی، علیٰ ہذا صفحہ ۳۹۴ کے بعض جزئیات، صفحہ ۲۰۸ پر علی گڑھ کی کورٹ کی ممبری کا ذکر ہی، حالانکہ اس وقت تک علی گڑھ محض کالج تھا، اور کورٹ کی اصطلاح اس وقت تک وجود میں نہیں آئی تھی، کالج کے اہل حل وعقد "ٹرسٹی" کہلاتے تھے۔ صفحہ ۲۱۳ پر لکھنؤ کی میٹنگ کے سلسلہ میں ڈاکٹر انصاری کا نام آیا ہی، حالانکہ ڈاکٹر صاحب اسوقت ہندوستان میں موجود نہ تھے، اور نہ اسوقت تک ان تحریکات میں ان کی کوئی نمایاں حیثیت تھی، ان کی یہ حیثیت تین سال بعد ۱۹۱۵ء میں قائم ہوئی، صفحہ ۲۱۸ پر مولانا ابن شرل کو ماہر سیاست و فلسفہ لکھا ہی، بجائے فلسفہ کے صحافت صحیح تھا، صفحہ ۲۷۵ پر ایک غیر مستند بیان پر اعتماد کر کے یہ عبارت درج کر دی ہی کہ مالوی جی نے علی برادران کو کانگریس کا ڈیلیگیٹ بنایا، اسکے کوئی معنی ہی نہیں، صفحہ ۳۴۷ پر تقریر کے جو الفاظ محمد علی کی جانب منسوب کیے گئے ہیں، یہ الفاظ اصلاً مولانا شوکت علی کے تھے محمد علی نے انھیں صرف دہرا دیا تھا۔

بس یہ اور اسی قبیل کی چند جزئی فروگزاشتوں کو چھوڑ کر کتاب بحیثیت مجموعی قابل داد ہی اور ہونہار مصنف کی سعی و کاوش مستحق ستائش۔ بلکہ جب یہ یاد ہوتا ہی کہ انکی یہ بالکل پہلی تصنیفی کوشش ہی تو حیرت کے ساتھ انپر رشک کرنے کو جی چاہنے لگتا ہی، متعدد عبارتیں ایسی ادیبانہ ہیں کہ اچھے اچھے کہنہ مشق اور پختہ کار ادیبوں کے لئے باعث فخر ہو سکتی ہیں۔

یہ نقش اوّل ہی، آئندہ ایڈیشن نقش ثانی ہوگا، جو اہم واقعات اس میں درج ہونے سے رہ گئے ہیں یا محض سرسری اور ناتمام درج ہوے ہیں خدا کرے اسوقت پوری طرح مفصل و مشرح درج ہوں، اور اللہ وہ وقت جلد لائے

بسم اللہ

اشارات!

محمد علی جیسے زعیم ملت کی سوانح عمری کسی بڑے آدمی ہی کو لکھنی چاہیئے تھی، نہ کہ اس کے لیئے انتخاب ہوا ایک گمنام، کم علم، ہیچ میرز شخص کا: میرانیس کی زبان میں' مورضعیف و مدح سلیمانِ ذی حشم! بہرحال جیسا کچھ بن آیا حاضر ہی! مفصل اور مطول ایڈیشن تو بعد کو نکلیگا،

چند باتیں بغیر کسی تمہید کے ضروری طور سے قابل گزارش ہیں۔

(۱) کوشش اس کی کی گئی ہی کہ عبارت آرائی کو ذرا بھی دخل نہ دیا جاے، جہاں تک ہو سکے واقعات اور مواد پیش کیا جائے، کہ سوانح نگاری کا اصل اُصول یہی ہی!

(۲) کسی عبارت یا جملہ پر اگر زور دینا مقصود ہوا تو اُس پر خطوط کھینچ دیئے گئے ہیں،

کتاب کے دو حصے کر دیے گئے ہیں، پہلے حصہ میں صاحب سیرت کے اخلاق و عادات، اور عام حالات زندگی سے بحث کی گئی ہی، اور دوسرے حصے میں ان کے کارنامہ ہاے حیات پر گفتگو ہی، اور اس کا لحاظ رکھا گیا ہی کہ کارنامے ترتیب وار تاریخ سے بیان ہوں۔

اس سلسلہ میں ایک بات قابل لحاظ یہ ہی کہ عنوان کا آغاز ترتیب تاریخی کے ماتحت کیا گیا ہی، اور پھر اس عنوان کے جتنے ادوار قائم ہو سکتے تھے وہ اسی عنوان کے ماتحت ذکر کر دیے گئے ہیں، تاکہ واقعات کا تسلسل قائم رہے۔

مثلاً ۔ ہمدرد پر جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ شروع تو اُس وقت سے کیا گیا ہے جب وہ دہلی سے پہلی بار شائع ہوا، پھر اس سلسلہ میں ہمدرد کے تمام ادوارِ حیات پر (مضمون کا تسلسل قائم رکھنے کی غرض سے) بحث کی گئی ہے۔ مثلاً، اشاعت، خصوصیات، وغیرہ

شاید ایک عنوان ایسا بھی ملیگا جس میں تاریخی ترتیب میں ذرا فصل ہو گیا ہے، وہ بھی تسلسل ہی قائم رکھنے کی وجہ سے ہوا۔

کسی کسی عنوان میں شاید یہ خیال ہو کہ بعض باتیں غیر ضروری یا غیر متعلق ہیں، لیکن آگے چل کر معلوم ہو گا کہ ایسا کرنا ناگزیر تھا۔ اس کا خاص طور سے خیال رکھا گیا ہے کہ محمد علی کے کارنامہ ہائے حیات کے ساتھ ہی ساتھ اگر ممکن ہو سکے تو ان کی خصوصیت ممیزہ قیادت کو اجاگر کرنے کے لیئے اس فضا اور ماحول کا تذکرہ بھی کر دیا جائے، جسمیں محمد علی نے اپنی جدوجہد کا آغاز کیا، تاکہ ان کے کارناموں کی صحیح قدر و قیمت ذہن نشین ہو سکے۔

نزاعی مسائل کی ناگزیری

محمد علی کا زندگی کا اکثر حصہ جنگ و جدل میں صرف ہوا، اپنے خیال میں انھوں نے جسے برسرِ غلط سمجھا اس کے مقابلہ میں انھوں نے اپنی پوری طاقت صرف کر دی، ایسے مسائل پر نہایت تکلیف کے ساتھ قلم اٹھایا گیا ہے، اور انسے جلد از جلد گذرنے کی کوشش کی گئی ہے، صرف نفسِ واقعہ کو ملائم سے ملائم الفاظ میں بیان کیا ہے۔

ان مختلف فیہ مسائل سے اعراض کیا جا سکتا تھا، یا ایسا اندازِ بیان اختیار کیا جاتا کہ محمد علی کے متعلق سب کچھ ہوتا، مگر ان مسائل پر کچھ نہ ہوتا، لیکن شاید سوانح نگاری کا یہ کوئی عمدہ اصول نہ ہوتا کہ بعض باتوں کو جو محمد علی کی زندگی میں خاص اہمیت رکھتی ہیں بالکل نظر انداز کر دیا جاتا،

اسی لیئے، بادلِ ناخواستہ ایسے عنوانات پر نہایت حزم و احتیاط، اور ایہام و ابہام کے ساتھ عرضِ مطلب کی کوشش کی ہے۔

اس کتاب کی ترتیب و تالیف کے وقت وہ تمام مواد پیش نظر رہا ہے، جو محمد علی پر مطبوعہ صورت میں موجود ہے، پھر مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کی عنایت سے بعض اخبارات کے محمد علی نمبر اور

خاص خاص تراشے بھی حاصل ہو گئے جنسے بہت قیمتی مدد ملی، اور جو خاص مواقع پر کام آئے۔

اس کتاب کی اشاعت کا ایک اہم مقصد یہ سمجھنا چاہیئے کہ محمد علی کے عقیدتمند، بد دل نہ ہو جائیں یعنی یہ نہ سمجھ لیں کہ کام نہیں ہو رہا ہے۔

ان اوراق سے یہ تو بہر حال ثابت ہو گیا کہ کام ہو رہا ہے، لیکن نوعیت کار کو بہتر سے بہتر اسوقت بنایا جا سکتا ہے جب محمد علی کے احباب و اعزہ اپنے معلومات سے ہمیں مستفید فرمائیں، مولانا شوکت علی سلسلہ شروع فرما چکے ہیں، اور مولانا عبد الماجد صاحب مد ظلہ عنقریب سلسلہ مضامین شروع فرمانے والے ہیں، آئندہ اڈیشن میں ان چیزوں سے بھی بہت کافی مواد حاصل ہو سکیگا۔

اسکے علاوہ اگر محمد علی کے خلوت اور جلوت کے رفیق، بے تکلف دوست، عزیز اور شناسا اپنے اپنے معلومات شائع فرما دیں تو بہت کچھ فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے،

ہمارے مخاطب بالخصوص، جناب ڈاکٹر انصاری صاحب، جناب شعیب قریشی، جناب مولوی ذوالفقار علی خاں صاحب (برادر اکبر مولانائے مرحوم)، جناب معظم علی صاحب چیف جج رامپور سٹیٹ (برادر نسبتی حضرت مرحوم)، جناب احسان الحق صاحب سشن جج (پنجاب)، جناب ظفر عمر صاحب، جناب اصغر یار جنگ صاحب، جج ہائیکورٹ حیدرآباد، میاں سر فضل حسین صاحب، مولانا محمد عرفان صاحب، جناب ڈاکٹر سید محمود صاحب، سر وزیر حسن چیف جسٹس لکھنؤ چیف کورٹ، عبد المجید خواجہ صاحب بیرسٹر الہ آباد، مسٹر تصدق احمد خاں شروانی، مولانا سید سلیمان صاحب ندوی، چودھری خلیق الزماں صاحب، جناب حسن محمد حیات صاحب سکرٹری لیجسلیٹو کونسل بھوپال، مسٹر سعید محمد خاں کسٹم افیسر بھوپال، جناب شاہ عزت حسن صاحب اڈوکیٹ (بنارس)، سر جوزف بھور، جناب قاضی عبد الغفار صاحب، اور دوسرے احباب علی گڑھ اور سیاسی رفقاء کار ہیں، اگر یہ حضرات ذرا بھی توجہ فرماویں تو سیرۃ کا آئندہ اڈیشن نہایت کامیاب ہو سکتا ہے۔

اردو کے مشہور ادیب میر محفوظ علی صاحب اور سید سجاد حیدر صاحب یلدرم کا شکریہ واجب ہے کہ ان بزرگوں کے مقالات سے سیرۃ کے اس نسخہ کی ترتیب و تالیف میں کافی مدد ملی۔

خوش قسمتی سے ہمیں، محمد علی کی ڈائریاں، اور شوکت صاحب کی ڈائریاں (ہتیول جیل) اور انکے پرائیوٹ کاغذات وخطوط، اور ہمدرد کے مقالات ومضامین بھی مل گئے۔ ان کے مطالعہ سے ہم نے کافی فائدہ اُٹھایا اور ایسی چیزیں پیش کر سکے، جو اب تک منظرعام پر نہیں آسکی تھیں۔

لیکن اس سلسلہ کو ابھی ختم نہ سمجھ لینا چاہیئے، ابھی اور بہت کافی مواد حاصل ہو سکتا ہے، اگر بڑودہ کوئی شخص جائے اور دو چار مہینے وہاں قیام کرے تو بہت معلومات حاصل ہو سکتے ہیں۔ اس لئے کہ وہاں سات سال تک محمد علی نے نہایت نیک نامی کے ساتھ اپنی زندگی بسر کی، ایک ثقہ اور معتبر دوست کا بیان ہے کہ بڑودہ میں ابھی ایسے متعدد اشخاص ہیں جو محمد علی کے کارناموں سے واقف ہیں اور انھیں مزے لے لیکر بیان کرتے ہیں، اس لیے اگر وہاں تک کوئی پہنچ سکے تو نادر معلومات کا نہایت گراں بہا ذخیرہ حاصل ہو سکتا ہے۔

اسی طرح اگر گاندھی جی، ڈاکٹر انصاری، بیگم صاحبہ محمد علی وغیرہ کے پیچھے کوئی لگ جائے تو ان بزرگوں سے بھی نہایت گراں قدر امداد مل سکتی ہے کثرت مشاغل کے باعث ان بزرگوں سے اس کی توقع عبث ہے کہ اپنے معلومات وتاثرات یہ خود قلمبند بھی فرما سکیں گے، یہی غنیمت ہے کہ ان سے کسی واقعہ کی روایت سن لیجائے، اور پھر خود ہی اُسے لکھ لیا جائے۔

مولانا شوکت علی کے پاس بمبئی میں بہت سے کاغذات وخطوط ہیں، جن کے لیے مولانا یہ شرط پیش فرماتے ہیں کہ کوئی بمبئی آئے، اور وہاں کچھ روز رہے، پھر ان میں سے ضروری کاغذات چھانٹ لے اور ان سے فائدہ اُٹھائے۔

ظاہر ہے یہ صورت بھی بہت فائدہ مند ہے، اگر اس پر عمل ہو سکے، تو پھر بہت نادر اور نایاب مسالہ فراہم ہو سکتا ہے۔

اس متوقع مواد کے علاوہ ہمدرد کی پوری جلدوں کی ورق گردانی، ہزاروں خطوط وکاغذات کی ایک ایک سطر پڑھنے، اور مطبوعہ مواد سامنے رکھنے کے بعد جو کچھ ہو سکا، وہ پیش خدمت عالی ہے خامیوں اور غلطیوں سے نہ انکار ہے نہ انکار پر اصرار۔ اگر ان خامیوں سے مطلع کر دیا گیا، تو آئندہ ایڈیشن میں

ان کی تصحیح کا لحاظ رکھا جائے گا۔

اُمید ہے کہ یہ چند اشارات اصل کتاب کے مطالبہ میں ممد و معاون ثابت ہونگے۔

نیز جن بزرگوں کے اسماء گرامی لکھکر اُمید ظاہر کی گئی ہے کہ وہ توجہ فرمائیں گے یقین ہے کہ یہ آواز صدا بہ صحرا انہیں ثابت ہوگی۔ مولانا عبد الماجد صاحب مد ظلہٗ (مدیر سچ) کا شکریہ واجب ہے کہ موصوف نے اپنا بہت سا قیمتی وقت مسودہ کی نظر ثانی پر صرف فرمایا، اور مسودہ کی ایک ایک سطر کو ملاحظہ فرمایا، بعض غیر ضروری چیزوں کو حذف فرمایا اور بعض ضروری چیزوں کو جو رہ گئی تھیں درج کرنے کی ہدایت فرمائی، لب و لہجہ میں اگر کسی جگہ سختی آگئی تھی وہ بھی مولٰنا کے نشان زدہ اور عطا کردہ ہدایات اور یادداشت کی بنا پر قلمزد کر دی گئی۔ ! ڈاکٹر ذاکر حسین خانصاحب شیخ الجامعہ نے بھی مسودہ کو شروع سے آخر تک ملاحظہ فرمایا۔

رئیس احمد جعفری

محمد علی میوزیم

جامعہ ملیہ اسلامیہ

دھلی

۲۶۔ اکتوبر ۱۹۳۲ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حصہ اوّل

تمہید

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ انسان از آدم تا ایندم، حریص حکومت ہے، اپنی خداوندی چاہتا ہے اور اگر موقعہ مل جائے تو اپنی خدائی کا اعلان کرنے سے بھی باک نہیں کرتا، وہ "زبونِ شہریاری" ہے، اسلئے وہ یکسر خواہش اقتدار ہے اور بس! پھر اپنا اقتدار، اپنی حکومت، اپنی شہریاری وہ چاہتا کس پر ہے؟ اپنی ہی جنس پر، اپنے ہی جیسے لوگوں پر، اسی لئے اقبال کو

تعجب ہے کہ انسان نوع انسان کا شکاری ہے!

حیات انسانی کی تاریخ کا مطالعہ کرو، جو ورق الٹو گے وہ اسی "داستان قیصریت" سے رنگین ہوگا تخت حکومت ملا اور انسان نے خداوندی سے خدائی کے خواب دیکھنے شروع کئے! یہی جذبۂ فاسد کبھی فرعون کی صورت میں رونما ہوا، کبھی شداد کی، کبھی نیرو کے روپ میں جلوہ گر ہوا کبھی نمرود کے، کبھی زار کے دہشت انگیز نام سے دنیا میں آیا، کبھی قیصر جرمنی کے، کبھی سکندر کی ہیئت میں اس نے جنم لیا، کبھی جولیس سیزر کی، کبھی سیل تا تارین کر امڈا کبھی نادر شاہ کا لشکر بن کر، کبھی ہلاکو خاں کے زلزلہ فگن نام سے متعارف ہوا، کبھی

حجاج بن یوسف کے۔

لیکن اس سیلاب اقتدار کا مقابلہ کس نے کیا؟ ہندی تلواریں کند ہوگئیں، یونانیوں کے دل بیٹھ گئے، روما کا پتہ پانی ہوگیا، ایران کے سورماؤں نے فرار پر قرار کیا، قوم مطیع و منقاد ہو گئی، ملک میں غلامی کی فضا قائم ہو گئی۔

اس اقتدار کے بت نے ان جواں ہمت، قوی بازو، شیر دل انسانوں کو آستانہ خواجگی پر جبیں سائی کے لئے مجبور کیا، جنھیں صرف اپنے خالق کی بارگاہ بے نیاز میں نیاز و عقیدت کی گردن جھکانی تھی۔

بت خانہ شہریاری کی اس تزئین و آرائش کے باوجود ہمیشہ ایسے مردان حق آگاہ و حق شناس پیدا ہوتے رہے جنھوں نے ظلم و عدوان، طغیان و تمرد اور نفس خود پرست کے قصر فلک بوس کو ہمیشہ ڈھایا، کبھی جمال الدین نے، کبھی مصطفےٰ کامل نے، کبھی عبدالکریم مجاہد ریف نے، کبھی سعد پاشا زاغلول نے اور کبھی محمود الحسن نے، کبھی محمد علی نے، رضی اللہ عنہم۔

ان مجاہدین استقلال و حریت کے پاس نہ اژدر دم توپیں تھیں، نہ عقاب پرواز "ایروپلین"، نہ مور و ملخ سا لشکر، نہ اعوان و انصار کی فوج، یہ داعیان حق و صداقت جب میدان عمل میں گام فرسا ہوئے، تو یمین و یسار تبعین و مریدین کی کوئی جماعت بھی نہیں تھی لیکن جب ان کا نعرہ حق، شیر کی گرج بن کر فضائے عدوان و تمرد میں زلزلہ انداز ہوا تو لوگوں نے دیکھا کہ قصر ملوکیت کی دیواریں لرزنے لگیں، بتخانہ شہریاری کے بت سرنگوں ہو گئے۔ "بکنگھم پیلس" میں زلزلہ آگیا۔

ابھی تم نے انھیں بے یار و مددگار دیکھا تھا، اب نظر اٹھاؤ تو جاں نثاروں اور فداکاروں

کی فوج نظر آئے گی، تم نے انھیں تہیدست و بے نوا پایا تھا لیکن غور کرو تو معلوم ہوگا کہ سیم و زر کے انبار ان کے قدم چوم رہے ہیں، عرصۂ حریت میں تمھیں یہ تن تنہا نظر آئے تھے لیکن دیکھا! ان کے گرد تو ٹھٹھ کا ٹھٹھ لگا ہوا ہے! جس کے سینے نوکِ سنگین کھانے کے لئے کھلے ہوئے ہیں، جس کے دلوں میں تمنائے شہادت ہے اور جس کے سروں میں سودائے جہاد!

ان غازیانِ راہ آزادی کے تیور دیکھو! لوگ سجن و زندان کے نام سے لرزتے ہیں لیکن یہ ہیں کہ پروانہ وار اپنے تئیں قید و بند کے مصائب کے لئے پیش کر رہے ہیں، "دار و رسن کا افسانہ کہن" لوگوں کے حافظے سے محو ہو چکا ہے، لیکن ان شہیدانِ حق و صداقت کے چمکتے ہوئے، مسکراتے ہوئے، منور چہروں کو دیکھ لو، کس خوشی سے تختۂ دار پر جلوہ فرما ہیں؟ "لال پگڑی" بڑے بڑے امیروں اور رئیسوں کے لئے کتنی لرزہ انداز ہوتی ہے لیکن ذرا ان قیدیوں کے بے خوف چہروں کو دیکھو، جن کے ہاتھوں میں ہتکڑی ہے پاؤں میں بیڑی ہے، عدالت کے کٹہرہ میں فوج اور پولیس کے جلو میں کھڑے ہیں، کس بے خوفی سے "صاحب" سے ہم کلام ہیں، کس بے باکی سے ان کا نعرۂ صداقت عدالت کے کمرہ میں گونج رہا ہے، اور کس بے پروائی سے اپنا حکمِ سزا سن رہے ہیں۔

دیکھتے دیکھتے یہ انقلاب کیسے پیدا ہو گیا؟ جو بزدل تھے وہ شیر دل کیسے بن گئے؟ جن کو پر تکلف مسہریوں پر اور "بالشِ کمخواب" پر گرانی سر کی شکایت ہوتی تھی وہ آج جیل کی تنگ و تاریک کوٹھریوں میں میلے کچیلے کپڑوں میں، تانبے کے بدقلعی برتنوں میں، سڑے گلے کھانے میں کتنے مگن ہیں؟ کتنے خوش ہیں؟

حق و صداقت کی چوٹ دیکھی؟ نعرۂ حریت کا اثر دیکھا؟ جب کبھی بھی کسی "یاجوج" وقت نے اپنی خواجگی اور قیصریت کا پٹہ دوسروں کے گلوں میں ڈالنا چاہا تو ایک جماعت پیدا

ہوئی جس نے اس بڑھتے ہوئے سیلاب اقتدار کا مقابلہ کیا اور اپنی بے مائگی اور تہی دامنی کے باوجود بالآخر کامیابی و کامرانی سے ہمکنار ہوئی!

اسی قسم کے داعیان استقلال و آزادی کے ایک بہت بڑے بطل حریت محمد علی کا تذکرہ ان صفحات کا موضوع ہے۔

غدر کے بعد عام حالت

۱۸۵۷ء کے عالم آشوب غدر کے بعد ہندوستان کی حالت حد درجہ سقیم ہوگئی تھی، غدر کے شریک کار ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں قوموں کے افراد تھے، اور ہر شریک غدر نے بقدر استعداد و ظرف اس "کار ثواب" میں اہم ترین حصہ لیا تھا، اس لئے کہ سور کی چربی میں ہاتھ لگانا مسلمانوں کے لئے ناممکن تھا، اور گائے کی چربی میں ہندو ہاتھ نہیں لگا سکتے تھے، لیکن غدر کے فرو ہونے کے بعد ہندوستان کی حالت بلکہ ذہنیت میں عظیم الشان تغیر ہوگیا، برادران وطن نے تلافی مافات کے طور پر گورنمنٹ سے پورے طور سے تعاون کیا، انگریزی تعلیم انھوں نے حاصل کی، سرکاری اسامیوں پر انھوں نے قبضہ کیا، گورنمنٹ کے ظل عاطفت کو انھوں نے سایۂ ہما سمجھا، لیکن چونکہ مسلمانوں کے ہاتھ سے حکومت ہی نکل گئی تھی دگو وہ لاکھ کم مایہ سہی لیکن نام تو تھا کہ "خسرو ہندوستان" یہی قوم ہے) اس لئے قدرۃً ان کے دل انگریزوں کی طرف سے صاف نہیں تھے، پھر اس وقت کے علما کی ایک بہت بڑی جماعت انگریزوں کی تعلیم و تربیت، تہذیب و تمدن معاشرت و خیالات، غرض ہر چیز کو پورے طور سے "نجس العین" سمجھتی تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان انگریزوں کی ہر چیز سے بھڑکنے لگے۔

سرسید

ان حالات میں سید احمد خاں علم اصلاح و تغیر لے کے اٹھے، انھوں نے بتلایا کہ حکومت تو بہرحال تمھارے ہاتھ سے جاچکی، تمھیں اپنی زندگی اب اس

حکومت کے سایہ میں بسر کرنی ہے، ہندو تم سے بازی لیجا چکے تعلیم انھوں نے تم سے زیادہ حاصل کرلی، انگریزوں کی نظر میں اپنی "بے قصوری" انھوں نے ثابت کردی، سرکاری اسامیوں پر ان کا قبضہ ہوگیا، اس کے برعکس گورنمنٹ کی نظروں میں "بغاوت" کے مجرم صرف تم ثابت ہوئے تعلیم انگریزی تم نے نہیں حاصل کی، انگریزوں کی نوکری تم نے حرام سمجھی، تو اب اگر حقیقتہً زندہ رہنا چاہتے ہو، تو کمرہمت چست کرو، اور بسم اللہ کرکے اٹھ کھڑے ہو، جو نقصان ہونا تھا وہ ہوچکا، جو تلافی کرسکتے ہو کرو، اگر باعزت زندگی بسر کرنا چاہتے ہو، تو انگریزی تعلیم حاصل کرو، گورنمنٹ کو اپنا ہمدرد اور مربی سمجھو اور پورے امن وسکون کے ساتھ اپنی زندگی بسر کرو۔

سرسید کی پالیسی

لیکن اس نسخہ کے ساتھ ہی اس حکیم وقت نے ایک سخت ترین "پرہیز" بھی بتایا، اور وہ تھا، سیاسیات سے الگ رہنا، اس کی شرط یہ تھی کہ جب تک تم اپنی تعلیمی خامیاں نہ پوری کرلو، اس وقت تک سیاسیات کو شجر ممنوعہ سمجھتے رہو، اگرچہ مسلمانوں میں ان کی عام مخالفت ہوئی، تکفیر کے فتوے شائع ہوئے، ہر ہر طرح سے ان کے راستہ میں رکاوٹیں پیدا کی گئیں لیکن اس مرد حق آگاہ نے ان تمام موانع کا نہایت خندہ پیشانی سے مقابلہ کیا اور بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں نے اپنی عام مخالفت کے باوجود اس کی رہنمائی قبول کی اور اس کے بتائے ہوئے اصول پر عمل کیا۔

سرسید کے بعد

سرسید کے انتقال کے بعد ان کے جانشین نواب محسن الملک مرحوم نے بھی سرسید کے نقش قدم پر قوم کو چلایا لیکن اب رفتہ رفتہ حالات بدلنے لگے، ادھر مسلمانوں میں تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد بھی خاصی ہوگئی ادھر گورنمنٹ کے طرز عمل میں فرق آنے لگا،

گورنمنٹ کی پالیسی

اب گورنمنٹ کی پالیسی علی الاعلان "لڑاؤ اور حکومت کرو" کے اصول پر جاری تھی۔ پہلے اردو ہندی کا قضیہ

پیدا کیا گیا، اور اس طرح سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں اختلافات کی خلیج پیدا کرنے کی کوشش کی گئی، پھر شملہ میں ایک وفد طلب کیا گیا جس میں از راہ "مراحم خسروانہ" اس انعام سرمدی کا اعلان ہوا کہ جداگانہ انتخاب جب تک تم چاہو گے برقرار رکھا جائے گا، پھر انہیں نامحمود حرکتوں پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ عالم اسلامی پر بھی برطانیہ کے دندان حرص و آز تیز ہونے لگے بہیم وعدہ خلافیاں کی گئیں اور مسلسل دروغ بیانیوں سے مسلمانوں میں ایک ہیجان عظیم پیدا ہو گیا، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ملکہ وکٹوریہ کے اس تاریخی اعلان کو ٹھکرا یا گیا جس میں مسلمانوں کی مذہبی معاملات میں "مکمل آزادی" تسلیم کی گئی تھی، کانپور کی مسجد کا سانحۂ خوں چکاں ایسا نہیں ہے جو کبھی فراموش ہو سکے، ادھر خلافت عظمیٰ عثمانیہ پر طرح طرح کی ریشہ دوانیاں کی گئیں، ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں

مسلمانوں میں حرکت

کے جذبات میں ہیجان و تموج پیدا ہوا، اور وہ اپنے گوشۂ عافیت سے باہر نکلے، اس عزم صمیم کے ساتھ کہ یا تو وہ ان دراز دستیوں کا استیصال کریں گے یا خود فنا ہو جائیں گے، لیکن اس وقت زیادہ ضرورت ایک ایسے راہ نما کی

ایک لیڈر کی ضرورت

تھی، جو دل فرنگ کی ہوس استعمار سے واقف ہو جو ان کے عادات واطوار، طینت و ذہنیت کا رمز شناس ہو، اور جو ان کی سیاسی فریب کاریوں کا ماہر خصوصی ہو اور ساتھ ہی ساتھ جس کا دل مضبوط ہو، جس کا دماغ اپنا ہو، اور جس میں ہوس قیادت نہ ہو بلکہ جذبۂ خدمت ہو۔

محمد علی کا ظہور

یہ ہمیشہ سے سنت اللہ چلی آتی ہے کہ ایسے نازک مواقع پر کوئی نہ کوئی مرد مجاہد پیدا ہو جاتا ہے جو باطل کے تمام عزائم مشئومہ اور تدابیر سیئہ کا قلع قمع کر کے رکھ دیتا ہے، چنانچہ اس وقت بھی جو ملت اسلامیہ کے لئے حد درجہ نازک بلکہ ہلاکت آفریں عہد تھا، ایک مرد مجاہد، اپنی تمام گہرائیوں اور خصوصیتوں، اپنی قابل رشک،

قابلیتوں اور اپنی لائق فخر صلاحیتوں کے ساتھ نمودار ہوا، جسے دنیا نے محمد علی کے نام سے یاد کیا!

محمد علی میدان عمل میں

میدان عمل میں اس نے قدم رکھتے ہی یہ ثابت کر دیا کہ وہ ایک بے نظیر مقرر ایک بہترین مدبر، اور ایک سحر نگار انشا پرداز ہی نہیں ہے بلکہ خدمت اسلام کا ایسا بے پناہ جذبہ اس کے سینہ میں کار فرما ہے جو مسلمانوں میں ایک نئی زندگی پیدا کر سکتا ہے، اور باطل کو خائب و خاسر کر سکتا ہے۔

پھر دنیا نے چند ہی دنوں میں دیکھ لیا کہ جو امیدیں اس سے قائم کی گئی تھیں وہ غلط نہیں ثابت ہوئیں، اس نے امت اسلامیہ میں ایک حیات تازہ پیدا کر دی، اس نے خدمت گزاران قوم کی ایک جماعت کو میدان عمل میں لا کھڑا کیا، اور اس نے ملت اسلامیہ، بلکہ زیادہ واضح الفاظ میں عالم اسلام کے ایسے گرانبہا خدمات انجام دیے، جو رہتی دنیا تک اس کا نام باقی رکھیں گے، لوگ اعزام و احترام سے اس کے کارنامے سنیں گے، اور اس کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرینگے، جن لوگوں نے اس مبارک ہستی کو نہیں دیکھا ہے وہ حسرت کریں گے کہ کاش ان کی آنکھوں نے محمد علی کی نہیں، مجاہد اعظم کی زیارت کی ہوتی، جو آنکھیں شرف زیارت سے ممتاز ہو چکی ہیں ان کی آرزو ہوگی کہ کاش انھیں فخر تکلم حاصل ہوتا، اور جو خوبی بخت سے اس سے بھی مستفیض ہو چکے ہیں، ان کو تمنا ہوگی کہ کاش یہ نعمت عظمیٰ ہم سے ابھی اور نہ چھینی جاتی لیکن مشیت ایزدی پوری ہو کر رہی، وہ گراں مایہ ہستی ہم سے جدا ہو کر رہی، اب اس کے روشن اور زریں کارنامے ہیں، جو ہماری تسکین و رہنمائی کے لئے کافی ہیں۔

باب اوّل

ابتدائی حالات

سلام!

گل حدیقۂ بوبکر و شمع بزم علی — چراغ انجمن مصطفےٰ سلام علیک
امام خلق، سعید ازل، عزیز وطن — قتیل عشق شہید وفا سلام علیک
امیر حلقۂ خدام کعبۂ یزداں — رئیس عسکر دین خدا سلام علیک
دیار ہند ز تو یافت عظمت ابدی — زعیم مملکت ایشیا سلام علیک
بہ اوج عشق تو روح بلال می نازد — جیب قلب رسول خدا سلام علیک

خاندان کا مختصر تذکرہ محمد علی کا خاندان ہمیشہ سے اپنے اقران و اماثل میں ممتاز چلا آرہا ہے محمد علی کے دادا علی بخش صاحب نے ہنگامۂ غدر میں غیر معمولی شرافت و شجاعت سے کام لے کر متعدد انگریزوں کی جان بچائی اور بالآخر اس صلہ میں مراد آباد کے علاقہ میں ایک ممتاز جاگیر بطور بخشش ملی، محمد علی کے والد عبد العلی خاں صاحب کو نواب یوسف علی خاں ناظم فرماں روائے رامپور نے باصرار رامپور بلا کر اپنے مقربین و معتمدین کے زمرہ میں شامل کیا۔ موصوف اپنی زندگی بھر نواب صاحب کے منظور نظر رہے، اور ہر اعتبار سے اپنے ہمعصروں میں ممتاز۔

مرز بوم محمد علی کا اصلی وطن کیا ہے؟ اس میں محمد علی کے واقف کاروں اور شناساؤں

کا خفیف سا اختلاف ہے، ایک جماعت کا خیال ہے کہ ان کا اصلی وطن مراد آباد ہے، دوسرا گروہ کہتا ہے کہ وہ بجنور کی طرف کے تھے لیکن ترجیح آخری قول کو ہے، خود مرحوم نے اپنے ایک مضمون میں ضمناً اپنے وطن کا تذکرہ کیا ہے اور اسے تسلیم کیا ہے کہ وہ نجیب آباد (بجنور) سے وطنی خصوصیت رکھتے ہیں۔

پیدائش اور بھائی بہنوں کی تفصیل

پیدائش ۱۸۷۸ء کے اواخر کی ہے، اپنے بھائیوں میں سب سے چھوٹے محمد علی تھے، بڑے بھائی شوکت علی تھے، ان سے بڑے ذوالفقار علی خاں صاحب گوہر۔

یتیمی

کچھ عجیب اتفاق ہے کہ جتنے اعاظم رجال گزرے ہیں ان میں اکثر اپنے ایام طفولیت ہی میں کم از کم سایۂ پدری سے محروم ہو گئے ہیں، محمد علی بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں تھے انھوں نے ابھی اپنے بچپن کی دو بہاریں دیکھی تھیں کہ داغ یتیمی برداشت کرنا پڑا۔

تعلیم

لیکن خوبی قسمت سے آغوش مادر سے جدا نہیں ہوئے تھے "بی اماں" مرحومہ نے جس بے نظیر استقلال و ایثار سے کام لے کر اپنے صاحبزادوں کو انگریزی تعلیم دلائی وہ یقیناً تاریخ نسائیات کا ایک اہم باب ہے، پہلے معمولی اردو فارسی کی تعلیم تو مکان ہی پر ہوئی

بریلی

پھر بریلی کے ہائی اسکول میں داخل کر دئے گئے، اور وہیں بورڈنگ ہاؤس میں قیام کا انتظام ہوا، اس وقت بریلی کے ہائی اسکول کی اونچی جماعتوں میں شوکت علی میر محفوظ علی وغیرہ تعلیم حاصل کر رہے تھے، ان بڑوں میں ایک موٹا تازہ چست چالاک، بھولا بھالا، لڑکا محمد علی بھی تھا، وہ اس وقت چھوٹا تھا، لیکن بعد کو سب سے بڑھ گیا!

ذہین لیکن کم محنت

میر محفوظ علی صاحب جو اس زمانہ میں خود بھی بریلی ہائی اسکول میں زیر تعلیم تھے فرماتے ہیں:-

"(محمد علی) بریلی میں بلا کے ذہین مگر کم محنت تھے، استاد سب خوش رہتے تھے

مزاج میں تیزی اور حاضر جوابی بہت تھی"۔

میر صاحب موصوف کا بیان ہے کہ

بھائی کا احترام

"شوکت خوش گپ اور یار باش ہونیکے ساتھ کاہل اور خوگر حکمرانی ہو چلے تھے۔ طالبعلموں کے مجمع میں بیٹھے، محمد علی، پانی پلاؤ، پان لاؤ، کتاب اٹھاؤ، اچکن رکھ آؤ، کہا کرتے تھے ایک دن خطیب جی نے (مولوی سخاوت حسین مرحوم اسسٹنٹ انسپکٹر مدارس) محمد علی کو سگ باش برادر خورد مباش کے معنی سمجھائے میں نے کہا ایک دوسرا جملہ بھی ہے، خر باش برادر بزرگ مباش خطیب جی نے اس کے معنی بھی سمجھا کر کہا تو محمد علی تم سگ ہوئے اور شوکت خر' محمد علی نے فوراً جواب دیا، جناب! میں خود تو سگ بنا پسند کروں گا، مگر شوکت بھائی کا خر بنا پسند نہ کروں گا، خطیب جی نے کہا شاباش"

لیڈری

قیادت کا جوہر بچپن ہی سے فطرت میں پوشیدہ تھا، بریلی میں ان کی بساط ہی کیا تھی، ایک بچہ ابتدائی جماعت کا طالب علم لیکن یہاں بھی انھوں نے بچوں ہی کی ٹولی میں اپنے سردار ہونے کا لوہا منوالیا اور اپنی چھوٹی موٹی جماعت کے وہ "لیڈر" تسلیم کر لئے گئے۔

باب ۲

علی گڑھ

علی گڑھ کی عام فضا

سرسید کے "مدرستہ العلوم" کا اس زمانے میں گھر گھر نیا نیا شہرہ تھا، چند ہی دنوں میں اس "مدرستہ العلوم" نے مسلمانوں میں اپنی دھاک بٹھا لی تھی، عام مخالفت کے باوجود ہر شخص اس کے خصوصیات کا معترف تھا، حقیقت بھی یہ ہے کہ اس زمانہ میں علی گڑھ کی دنیا ایک دوسری دنیا تھی، بورڈنگ کا طرز معاشرت، طلبہ کا شوق تعلیم، کھیلوں اور ورزشوں میں طلبہ کا امتیاز، تحریر و تقریر میں ان کا کمال، گھریلو زندگی میں ان کی دلچسپیاں، یہ وہ چیزیں تھیں جو علی گڑھ کے احاطے سے نکل کر دور دور پہنچ چکی تھیں، اب علی گڑھ کی طرف میلان عام ہو رہا تھا، جسے "صاحب" بننے کی ہوس تھی وہیں جانا چاہتا تھا، اور وہیں کے خصوصیات کا اپنے تئیں حامل بنانا ہر شخص کا منتہائے نظر تھا۔

اس زمانہ میں عجیب سحر آفریں فضا علیگڑھ نے قائم کر دی تھی، سیکڑوں "مرزا پھویا" علیگڑھ میں داخل ہوئے لیکن جب وہاں سے نکلے تو تیز و طرار بن کر بات بات میں شوخی، چال ڈھال میں رنگینی، کسی سادہ لوح کو دیکھا ایک فقرہ چست کر دیا، ریل میں سوار ہوئے تو آفت مچا دی، ڈپٹی کلکٹری اور اسی قسم کے سرکاری عہدے تو اس زمانہ میں گویا ایک "علیگ" کیلئے نہایت سہل الحصول ملازمت تھی، جب چاہتا تھا وہ ان پر قبضہ کر سکتا تھا۔

محمد علی کا داخلہ

یہ فضا تھی جس میں محمد علی علیگڑھ میں اپنے برادر بزرگ مولانا شوکت علی کی

نگرانی میں داخل ہوئے اور تھوڑے ہی دنوں میں یہ معلوم ہوگیا کہ علیگڑھ کے خصوصیات کو چار چاند لگانے میں علیگڑھ کی دلچسپیوں میں اضافہ کرنے میں محمد علی کا غیر معمولی حصہ ہے۔

کم مختنی

علیگڑھ میں آنیکے بعد بھی محمد علی کے اوضاع واطوار میں فرق نہیں آیا، جس طرح بریلی میں وہ سب سے زیادہ ذہین اور سب سے کم پڑھنے والے تھے، یہاں بھی ان کی یہ خصوصیت قایم رہی۔

سر یعقوب کا بیان

سر محمد یعقوب سابق پریسیڈنٹ لیجسلیٹو اسمبلی جو محمد علی کے رفیق درس رہ چکے ہیں، فرماتے ہیں:-

"سال کا بہت بڑا حصہ تفریحات اور کھیل کود میں گزرتا تھا، کورس کی تمام کتابیں کبھی مشکل سے محمد علی کے پاس جمع ہوتی ہوں گی، مگر مبداء فیاض نے ان کو غضب کا حافظہ اور ذہن عطا کیا تھا، امتحان سے دو مہینے بیشتر کتابیں ادھر ادھر سے جمع کر کے وہ پڑھائی پر پل جاتے تھے اور چند روز کی محنت سے وہ ہمیشہ اچھی طرح پاس ہوتے تھے۔"

میر محفوظ علی کا بیان

میر محفوظ علی صاحب ان کی کم مختنی کا یہاں بھی اعتراف فرماتے ہیں، لیکن یہ بھی ارشاد فرماتے ہیں کہ:

"محمد علی قابل رشک اہلیت کے ساتھ کلاس میں لیکچر سنتے، فیلڈ میں کرکٹ کھیلتے اور یونین میں تقریریں کرتے تھے۔"

سجاد حیدر کا بیان

سید سجاد حیدر صاحب یلدرم، سابق رجسٹرار مسلم یونیورسٹی علیگڑھ، جو محمد علی کے کلاس فیلو اور نہایت عزیز دوست ہیں، ان کے بیان کا ایک اہم اقتباس درج ذیل کیا جاتا ہے۔ اس میں سید صاحب نے اپنے قلم اعجاز رقم سے علیگڑھ کی زندگی اور محمد علی

کی حالت کا پورا دلفریب نقشہ کھینچ کر رکھ دیا ہے۔

"خواجہ غلام الثقلین، ظفر علی خاں، چودھری خوشی محمد ناظر، حمید الدین (فراہی) کالج کی کلاسوں میں پڑھ رہے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی علمی زندگی سے طلبہ اور اساتذہ کے محبوب بنے ہوئے ہیں، شوکت علی خاں کرکٹ کے کپتان ہیں اور کرکٹ کا کپتان اس وقت کے علیگڑھ میں اپنی قلمرو (بورڈنگ) کا سولینی ہے، طلبہ اس کے تابع فرمان، پروفیسر اس کے اقتدار کو ماننے والے اور بڑھانے والے، کپتانی اوروں نے بھی کی اور کر رہے ہیں، لیکن شوکت علی کی کپتانی یادگار زمانہ ہے، اسی نے کپتان کے کمرہ کو ایک دربار کی حیثیت دیدی تھی وہ کمرہ ایک ہی وقت میں دربار شاہانہ اور بزم احباب بنا رہتا تھا، جونیر طلبہ کے استغاثے وہاں سنے جاتے تھے، اور فیصل ہوتے تھے، ان استغاثوں کی سماعت کے وقت کمرہ میں، اور شام کو کمرہ کے باہر صحن میں احباب کا جمگھٹا رہتا تھا جو کبھی کبھی اس لئے کہ سولینی ہر وقت ان سے یہ کام نہیں لیتا تھا جیوری کے فرائض بھی ادا کرتے تھے، جب میں علیگڑھ کالج کے اسکول کی

محمد علی سے تعارف

نویں جماعت میں داخل ہوا تو شوکت علی کے ساتھ اس کا چھوٹا بھائی محمد علی بھی رہتا تھا یہ لڑکا کلاس میں ذہین، کلاس سے باہر لڑاکا اور ہر فن مولا تھا، محمد علی اپنی بہت ہی مختصر دنیا اپنے ہم عمر لڑکوں کی سرداری

سرداری

کرتا تھا، مگر نہ اس طنطنے کے ساتھ جو اس کے بڑے بھائی شوکت علی کو نصیب تھی اور پھر غضب یہ کہ اس چھوٹے سے سردار کی بڑا بھائی سب کے سامنے ایسی ذلت کر دیتا تھا کہ سردار کی محدود سرداری دھری رہجاتی تھی۔

بارہا ہم نے دیکھا کہ بڑے بھائی نے محمد علی کو ڈانٹ کر اپنے حضور میں بلایا اور اس بزم احباب و دربار عام میں جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے دو ایک سوال و جواب کے بعد رخساروں پر تھپڑ مار کر سزا دی گئی۔"

انگریزی قابلیت

سجاد رحیدر صاحب ہی کا بیان یہ بھی ہے کہ "اپنی انگریزی قابلیت کے لئے وہ اب بھی ممتاز تھے کہ ہم دونوں انٹرنس کا امتحان پاس کر کے کالج کی کلاسوں میں آئے یہاں پہنچ کر ان کے کردار کی وہ خصوصیت نمایاں ہوئی جس نے دنیا میں محمد علی کو اپنے اقران و معصروں میں سب سے علیحدہ کر دیا یعنی محمد علی کی آزادی رائے و آزادی عمل، وہ اکثر اپنے پروفیسروں سے اختلاف کرتے تھے

یونین کی تقریریں اور پروفیسروں سے اختلاف

یونین میں ایسے مباحث پر تقریر کرتے تھے جس جانب تقریر کرنا اکثر پروفیسروں کی چیں جبیں کا باعث ہوتا تھا، تقریریں ان کی زوردار، زبان شستہ اور اپنے سن و سال کے لحاظ سے نہایت موثر ہوتی تھیں۔"

ذہانت

محمد علی کی ذہانت علیگڑھ میں بھی ممتاز رہی اگرچہ انکی کم محنتی کی ہر شخص شکایت کرتا ہے لیکن ان کی غیر معمولی ذہانت اور قوت حافظہ کا بھی ہر شخص معترف ہے۔

مولانا شبلی کا امتحان لینا

اتفاقاً ہمیں اس باب میں ایک پرلطف واقعہ مولانا شبلی کے امتحان لینے کا مل گیا، اور خوش قسمتی سے وہ واقعہ خود صاحب واقعہ بیان کر رہا ہے مولانا مرحوم اپنے ایک مکتوب گرامی میں مولانا عبدالماجد صاحب مدظلہ (مدیر سچ) کے ایک استفسار کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"گیارہ برس کی عمر میں میں علیگڑھ گیا، ایک بڑے بھائی نے میری مئودن گوئی

کا ذکر مولنا شبلی[1] مرحوم سے کیا، دوسرے نے میرے حافظہ کی تعریف کی کہ حسین کے قتل پر جو مرثیہ ہے اس کا ریں نے، ایک عربی کا شعر پڑھا تو محمد علی، نے مجھے ترجمہ سنا دیا، حالانکہ عربی سے بالکل ناواقف ہے، مولنا کو یقین نہ آیا، اور امتحان کی غرض سے ہم بلائے گئے، پہلے مامون کی اولاد کی فہرست مانگی پھر اس کا شجرہ پوچھا، جب اس میں پاس ہو گئے تو ایک مصرع طرح اسی وقت دیا اور کہا کہ شعر لکھو، چیزے از قسم لچر پوچ اسی وقت تیار ہو گئی میرا خیال ہے کہ مولنا مرحوم پر جو سکہ بیٹھ گیا تھا وہ اسی لچر پوچ کا تھا۔"

شاعری

بچپن ہی سے محمد علی کو شعر و شاعری سے دلچسپی تھی اور جب انھیں موقعہ ملتا تھا تو انکے افکار موزوں دل کی خلوت سے نکل کر احباب کی جلوت میں آجاتے تھے۔ اپنی شاعری کے متعلق انھوں نے مولنا عبد الماجد صاحب دریابادی کے نام ایک خط میں مبسوط تذکرہ کیا ہے جس کا ایک حصہ ہم یہاں درج کرتے ہیں اور اہم ترین حصہ اس سلسلہ میں درج کرینگے جب محمد علی پر ایک شعر گو کی حیثیت سے گفتگو کی جائیگی، بہرحال اس مکتوب میں اپنی کالج کی شاعری کے متعلق انھوں نے جو کچھ فرمایا ہے وہ یہ ہے:-

"کالج میں آخری سال سجاد حیدر کی صحبت میں شعر و سخن کا چرچا رہا، پہلے بھی جب ہم لوگ انٹرنس میں تھے تو ایک نظم تین شعرا نے حاجی اسمٰعیل خاں صاحب کے شکریہ میں تیار کی تھی، ان میں سے ایک یہ خاکسار تھا، ایک سجاد حیدر اور ایک سید وزیر حسن صاحب "آزیبل" و "آزمودہ کار" سکرٹری مسلم لیگ

---

[1] مولنا شبلی مرحوم اس زمانہ میں علیگڑھ میں عربی کے پروفیسر تھے۔ (مؤلف)

کے برادر اصغر[۱]"——— وہ مشاعرہ جب بعد کو حسرت نے رونق بخشی ہم ہی لوگوں کا ایجاد کردہ تھا، چودھویں کو ہوا کرتا تھا، اور ایک شمع پیش کی جاتی تھی، کرکٹ کا لان جائے مشاعرہ تھا، ایک بار چودھویں کو بارش ہوگئی تو تین چار دن مطلع صاف ہونیکی راہ دیکھ کر مشاعرہ ڈائننگ ہال میں کیا گیا، اس وقت میں نے اپنی ایک غیر طرح غزل میں اس شعر کا بھی اضافہ کردیا ؎

فرش زمردیں نہیں وہ چاندنی نہیں — لطف مشاعرہ تو گیا چودھویں کے ساتھ"

بی، اے کا امتحان

۱۸۹۶ء میں علیگڑھ سے بی، اے کا امتحان دیا، صوبہ متحدہ کے کامیاب طلبہ میں محمد علی کا نمبر اول تھا، لوگوں نے اسے حیرت کے ساتھ سنا کہ علیگڑھ کا یہ کھلنڈرا، یونیورسٹی میں سب سے اول کس طرح آگیا لیکن جو لوگ اس کی غیر معمولی فہم و ذکاوت سے واقف تھے ان کے نزدیک یہ کوئی تعجب خیز واقعہ نہ تھا۔

میر محفوظ علی کا بیان

میر محفوظ علی صاحب اپنے مخصوص انداز میں محمد علی کا واقعہ کامیابی محمد علی ہی کی زبان سے بیان فرماتے ہیں کہ

"مسٹر گوکھلے کی وفات پر دہلی کے ٹاؤن ہال کے میدان میں جلسہ ہوا تو پنڈت مدن موہن مالوی یا سر سیندر ناتھ بنرجی نے بیان کیا کہ گوکھلے نے اکیس سال کی عمر میں بی اے کیا اور یونیورسٹی میں امتیازی جگہ حاصل کی، محمد علی نے اپنی تقریر میں کہا کہ گوکھلے علم و قابلیت کا مجسمہ تھے، انکے لئے یہ امور باعث فخر نہیں، آپ کا یہ نیاز مند جو گوکھلے سے کوئی نسبت نہیں رکھتا بیس سال کی عمر میں یونیورسٹی میں اول آچکا ہے، یہ سن کر حاضرین منہ تکنے لگے"

---

[۱] سید اصغر حسین صاحب بی اے، ال ال بی (علیگ) اسسٹنٹ جج۔ (مؤلف)

باب ۳

آکسفورڈ

علیگڑھ میں محمد علی اپنی لائق رشک زندگی ختم کر کے عازم انگلستان ہوئے، علیگڑھ سے کس طرح رخصت ہوئے، ولایت جانے کا انتظام کیونکر ہوا؟ احباب پر کیا تاثرات قائم ہوئے اور اساتذہ نے کیا کیا؟ اس کے متعلق بہترین بیان محمد علی کے کلاس فیلو سید سجاد حیدر صاحب ہی دے سکتے ہیں، چنانچہ وہ فرماتے ہیں:۔

سجاد حیدر کا بیان "علی گڑھ کی طالب علمی اس چمک دمک کے ساتھ ختم کرنے کے بعد محمد علی علیگڑھ سے رخصت ہوئے، مگر کس طرح؟ پرنسپل خوش تھے کہ ایک جھگڑالو طالبعلم جا رہا ہے، عام طلبہ کو رنج تھا کہ ایسا خوش گپیاں کرنے والا، بذلہ سنج، مگر ساتھ ہی موقعہ پڑنے پر لڑائی بھڑائی میں ان کی سرداری کرنے والا، اور ان کے لئے پروفیسروں سے بے دھڑک اور بے جھجک لڑنے والا جا رہا ہے، علم دوست اور لائق طالب علم حیران تھے کہ محمد علی ان سے کیوں دور رہتا تھا بلکہ وہ کیوں ان کی ہنسی اڑاتا تھا انگلینڈ روانہ ہونے سے قبل وہ علی گڑھ آئے اور احباب نے انھیں ایک رخصتی ڈنر دیا"

الوداعی نظم اس الوداعی ڈنر میں ایک الوداعی نظم بھی پیش کی گئی جو ان کے یار عزیز، سجاد حیدر یلدرم کے ترشح افکار کا نتیجہ تھی، نظم یہ ہے:

اے خلعت سروری کے شایاں | لے عازم مصر فخر کنعاں
سی، ایس، کی مصر کرو تسخیر | ایسی کر و جاکے کوئی تدبیر
یہ عزم سفر تمھیں مبارک | یہ باب ظفر تمھیں مبارک
این نقد بہ کیسہ درمیان کن | زین بعد ہر انچہ خواہی آں کن

سید صاحب موصوف فرماتے ہیں :۔

"اس وقت یہ دعا دل سے نکلی تھی، مگر شکر ہے یہ دعا قبول نہ ہوئی، خدا کو ان سے زیادہ شاندار، زیادہ اہم، اور زیادہ نتیجہ خیز کام لینے تھے"

شوکت کا ایثار ادھر تو یہ انتظامات ہو رہے تھے، اُدھر ایک خاص وقت بھی تھی، یعنی قیام انگلستان کے مصارف کا انتظام جائداد اگرچہ کافی تھی، لیکن ایک تو وہ خود عبد العلی خاں صاحب مرحوم ہی کے زمانہ سے مقروض تھی، دوسرے علیگڑھ کے زمانۂ تعلیم میں اور زیادہ مقروض ہو چکی تھی، لیکن اس وقت کو محمد علی کے عاشق زار بھائی شوکت علی نے جو اس زمانہ میں محکمۂ افیون کے افسر تھے اس طرح حل کیا کہ خود تو دو سے کے سفر خرچ میں اپنا گزر کریں اور اپنی تنخواہ محمد علی کو دیں، اس طرح "بڑے بھائی" کو لوٹ کر محمد علی ولایت روانہ ہوئے۔ یلدرم صاحب نے سچ فرمایا کہ

"شوکت نے اپنے بھائی کے ساتھ وہ کام کیا جو کم لوگ اپنی اولاد کے لئے بھی کرتے ہیں"

انگلستان محمد علی بڑے شوق و ولولہ کے ساتھ سفر یورپ پر روانہ ہوئے تھے جس کا انھیں خود بھی اعتراف ہے انگلستان کی محیر العقول کرشمہ سازیاں سن سن کر ان کے دل میں طرح طرح کے جذبات موجیں مارتے تھے، پھر جب خدا نے یہ موقع فراہم کر دیا، اور وہ بصد مسرت

ونشاط روا نہ بھی ہو گئے تو ان کو کھل کھیلنے کے کافی مواقع تھے، اور پھر جب جیب میں دام بھی ہوں لیکن محمد علی کے علاوہ ان کا ہر دوست اور دشمن اس کا معترف ہے کہ محمد علی کی زندگی انگلستان

اخلاقی حالت | کی ہوش رُبا اور غارت گر شکیب فضا میں بھی اتنی پاکباز، اتنی بے زنگ اور اتنی صاف رہی کہ ہر شخص انگشت بہ دنداں رہ گیا، اپنی "پاکیٔ دامن" کا خود محمد علی کو بھی اعتراف تھا، چنانچہ مولنا عبد الماجد صاحب دریابادی کے نام اپنے ایک مکتوب میں اس کا تذکرہ کیا ہے کہ

"کالج چھوڑا تو ولایت جانا ہوا یہاں البتہ شاہدان اصلی کی کمی نہیں تھی مگر ذوق نظارۂ جمال لاکھ سہی اور گرہ میں مال بھی سہی، تاہم طبیعت کا میلان خلاف دستور عام زہد و تورع کی طرف تھا"

داخلہ | محمد علی آکسفرڈ کے لنکن کالج میں داخل ہوئے اور چونکہ طبیعت پر علمی ذوق غالب تھا اس لئے ان مضامین سے دلچسپی لیتے رہے جو ان کی افتاد طبع کے موافق تھے اور جن مضامین سے طبیعت نفور تھی، ان کی طرف مطلق التفات نہ کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ جس مقصد یعنی I.C.S.

سول سروس میں ناکامی | کا امتحان دینے گئے تھے، اس میں ناکام ہوئے، مولنا شوکت علی

شوکت پر اثر | نے جب اس خبر وحشت اثر کو پانیر میں پڑھا تو ان کا چہرہ دفور تاثر سے زرد ہو گیا لیکن بی اماں پاس بیٹھی ہوئی تھیں، انھوں نے اپنی جواں ہمتی سے نہ صرف یہ کہ خود اپنے اوپر کوئی اثر نہیں ظاہر ہونے دیا بلکہ مولنا شوکت علی کو بھی ڈھارس دی اور فرمایا کہ اسے بلاؤ منگیتر بیٹھی ہوئی ہے شادی کر دو، پھر دیکھا جائے گا، چنانچہ محمد علی واپس آئے اور شادی کر دی گئی،

بی اے کا امتحان | اب محمد علی انگلستان اس ارادے سے گئے کہ بی۔اے کا امتحان دیں چنانچہ اس میں انھوں نے تیاری بھی کی اور چونکہ مضامین طبیعت سے مناسبت رکھتے تھے اس لئے کامیابی "آنرز میں گریجویٹ" کی حیثیت سے حاصل کی، اس نمایاں کامیابی کے بعد وہ ہندوستان واپس آئے۔

باب ۴

انگریزی قابلیت

محمد علی کے تمام شناسا اس پر متفق ہیں کہ محمد علی اپنی انگریزی استعداد و قابلیت کے اعتبار سے اپنے ہمعصروں میں ہمیشہ نہایت ممتاز رہے، بریلی میں وہ ایک کمسن بچہ کی حیثیت رکھتے تھے، لیکن اپنی جماعت میں انگریزی سب سے اچھی جانتے تھے علیگڑھ آئے تو گر باقاعدہ "کھلندروں" کی صف میں داخل ہوئے، اور وہاں کی تمام تر شہرت ان کی اسی حیثیت سے ہے وہ سب سے کم محنت کرنیوالے کرکٹ کھیلنے والے، یونین میں تقریر کرنے والے، اپنے اساتذہ سے لڑنے والے اور کتابیں تک اپنے پاس نہ رکھنے والے طالب علم تھے، لیکن اس کا بھی سب کو اعتراف ہے کہ وہ اپنی اس مسلمہ "کھلندریت" کے باوجود سب سے اچھی انگریزی بولتے تھے، اور سب سے اچھی لکھتے تھے، پھر جب وہ آکسفرڈ گئے، تو ان کی استعداد میں اور غیر معمولی اضافہ ہوگیا، اب تک وہ ایک قادر الکلام انگلش نگار تھے، لیکن انگلستان سے واپسی کے بعد وہ ایک مسحر ساحر زبان ہوگئے۔

مارین کا خراج تحسین

علیگڑھ کے زمانہ طالب علمی میں انھوں نے "علیگڑھ منتھلی" میں ایک مضمون سپرد قلم کیا تھا، وہ مضمون بیحد پسند کیا گیا اور طلبہ سے گزر کر اساتذہ نے بھی اس کی بہت تعریف کی، علیگڑھ کالج کے مشہور پرنسپل مسٹر مارین نے تو فرط مسرت میں یہاں تک کہہ دیا کہ

"تم ایک زمانہ میں انگریزی کے بے مثل ادیب ہوگے"

اور کون کہہ سکتا ہے کہ مسٹر مارین کی پیشین گوئی غلط ثابت ہوئی؟

شیکسپیر پر عبور محمد علی کے ایک دوسرے "حالات" نگار کا بیان ہے کہ

"تصانیف شیکسپیر کے جیسے محمد علی ماہر ہیں، اس صنف میں ہندوستان میں ان کا کوئی ثانی نہیں ہے چنانچہ آکسفورڈ یونیورسٹی کے زمانہ طالب علمی میں مسٹر موصوف نے "میکلس[۱]" پر ایک نہایت قابلانہ اور شاندار مضمون لکھا جس کے صلہ میں آپ "آکسفورڈ سوسائٹی" کے پہلے ہندوستانی سکرٹری مقرر ہوئے جو ایک ہندوستانی کے لئے اعلیٰ ترین علمی اعزاز کہا جا سکتا ہے"

لارڈ منٹو کا اعتراف آگے چل کر لارڈ منٹو کا ایک دلچسپ اعتراف بھی ہمیں اسی "حالات" نگار سے معلوم ہوتا ہے کہ

(Thaught) اس قدر مقبول ہوا کہ نہ صرف ہندوستان میں وقعت کی نگاہ سے دیکھا گیا بلکہ لارڈ منٹو جو اس زمانہ میں وائسرائے تھے اور انکے چیف سکرٹری نے مولنا ممدوح کی اعلیٰ قابلیت کا اعتراف کرتے ہوئے ان کی کوششوں کو بہت سراہا۔"

میر محفوظ علی کا بیان میر محفوظ علی صاحب جنھوں نے محمد علی کا بچپن بھی دیکھا ہے، اور شیب و شباب کے حالات سے بھی واقف ہیں، نیز محمد علی کے ساتھ ان کی علمی زندگی میں ایک عرصہ تک حق رفاقت ادا کر چکے ہیں، اُردو کے ایک بے نظیر انشا پرداز اور انگریزی کے صاحب ذوق مبصر ہیں، محمد علی کی انگریزی انشا پردازی کے متعلق فرماتے ہیں:

"محمد علی، کی ہمہ گیر ذہانت نے انگریزی ادب و انشا مصطلحات و محاورات

---

[۱] رسالہ میں "میکلس" لکھا ہے لیکن غالباً "میکبتھ" ہے (مؤلف)

طرز ادا وطریقۂ بیان پر اس درجہ عبور وتبحر حاصل کیا کہ ان کے قلم وزبان دونوں کو
جاہلوں سے لے کر عالموں، گنواروں سے لیکر شہریوں، فقیروں سے لیکر امیروں
اور مزدوروں سے لیکر وزیروں تک کے الفاظ وعبارات ادا کرنے پر یکساں
کامل قدرت ومہارت حاصل تھی، ملاحوں کے سرود انھیں یاد تھے، اناؤں کی
لوریاں انھیں یاد تھیں، لیمرک (Limerick) انھیں یاد تھیں
لندن کے مشرقی حصہ (East end) کے آوارہ گرد چھوکروں کی پھبتیاں
انھیں یاد تھیں، بل (Bull) انھیں یاد تھے، معمے اور چیستان انھیں
یاد تھے، اس کے ساتھ انگریزی کے متقدمین متوسطین اور متاخرین شعرا اور مصنفین
کے بہترین علمی وادبی جواہر پارے انکی زبان پر یا ان کی نظر میں تھے انجیل کی
کتب عتیق وجدید پر ان کی نگاہ تھی سیکڑوں علمی لطیفے انکے نوک زبان تھے
طبیعت پر چونکہ بذلہ سنجی، ظرافت اور شوخ نگاری کا رنگ غالب تھا لہذا اس
صنف میں ایسا بے ساختہ اور اتنا بہتر لکھ سکتے تھے کہ بسا اوقات ان میں اور لندن
پنچ کی ظرافت میں مشکل سے امتیاز ہوسکتا تھا، یہ ایک جاہل اور ہیچمدان
ہندی کا خیال نہیں ہے بلکہ بڑے بڑے انگریز ادیبوں کی غیر جانبدارانہ
رائے ہے"

میکڈانلڈ کا خیال مسٹر میکڈانلڈ جو اب وزیر اعظم ہیں ان سے بھی محمد علی کے بہت کافی تعلقات تھے، تعلقات پر گفتگو تو آئندہ کسی موضوع کے ماتحت کیجائیگی، یہاں صرف ان کی رائے محمد علی کی انگریزی انشا پردازی کے متعلق لکھنی ہے۔

۱۳ء میں لارڈ اسلنگٹن کا پبلک سروس کمیشن جب ہندوستان میں دورہ کر رہا تھا

تو اس کے ایک رکن مسٹر میکڈانلڈ بھی تھے مسٹر ریزے میکڈانلڈ سے محمد علی کے تعلقات کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے، کمیشن جب لکھنؤ گیا ہے تو محمد علی بھی اس کے سامنے شہادت دینے گئے تھے، دوران گفتگو میں محمد علی سے

"مسٹر میکڈانلڈ نے بالالتزام اپنے کامریڈ پڑھنے کا ذکر کیا اور میری (محمد علی کی) شوخی تحریر کی بہت کچھ تعریف فرمائی

ٹائمز آف انڈیا کا خیال | ٹائمز آف انڈیا کا لندنی وقائع نگار، جو اس کا کوئی سابق اڈیٹر ہے محمد علی کی وفات پر ان کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے ان کی انگریزی لیاقت کے متعلق کہتا ہے:

"مجھے افسوس ہے کہ انکی تعریف میں جو کچھ کہا گیا اس میں ان کی یہ خوبی نظر انداز کر دی گئی ہے کہ وہ انگریزی زبان پر حیرت انگیز قدرت رکھتے تھے، کوئی ہندوستانی اس میں انکا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا، اور انگریزوں میں شاید بہت ہی کم ان سے بہتر لکھ سکتے تھے، مرحوم نے صحافت کی زندگی شروع کرنے سے پیشتر مجھ سے بہت طویل مشورے کئے تھے۔

ایچ، جی، ویلز | مشہور مصنف ایچ، جی، ویلز نے بھی مولنا محمد علی کی انگریزی قابلیت کا اعتراف کیا ہے اور نہایت شاندار الفاظ میں، محمد علی کا جب انتقال ہوا تو اس نے کہا،

"محمد علی کا دل نپولین کا دل تھا، اس کا قلم میکالے کا قلم تھا، اس کی زبان برک کی زبان تھی"

مصنف موصوف نے اپنے ایک خط میں جو اس نے مولنا عبدالماجد صاحب دریابادی کو لکھا ہے، محمد علی سے اپنی شناسائی اور ملاقاتوں کا تذکرہ بھی کیا ہے۔

برنارڈ شا کی قدردانی برنارڈ شا سے بھی محمد علی کے تعلقات تھے، شا بھی ان کی غیر معمولی قابلیت اور دیگر خصوصیات کی بنا پر ان کا خاص طور سے گرویدہ تھا چنانچہ ۱۹۲۸ء میں جب محمد علی بسلسلہ علاج انگلستان گئے تھے تو شا سے بھی ملاقات کی، گول میز کانفرنس کی شرکت کے لئے جب وہ پھر انگلستان گئے ہیں تو ان کی پھر اس سے متعدد ملاقاتیں ہوئیں۔

مکتوب برنارڈ شا بنام عبدالماجد حال میں جارج برنارڈ شا کا ایک خط مولنا عبدالماجد دریابادی کے نام آیا ہے جو درج ذیل ہے:

"میری محمد علی سے صرف ایک ملاقات میرے ہی مکان پر ہوئی تھی جس میں موضوع گفتگو یہ تھا کہ جس طرح اصلاح کلیسا مارٹن لوتھر نے کی تھی آیا اس قسم کی اصلاح کی اسلام کے اندر گنجایش ہے؟ ہم دونوں اس نتیجہ پر متفق ہو گئے تھے کہ اسلام جن پستیوں میں صدیوں سے گرا ہوا چلا آتا ہے ان سے اسے نکالنے کی صورت یہی ہے کہ محمد والے اسلام کی تحریک و دعوت از سر نو پیش کی جائے، محمد علی کی ملاقات میرے لئے بہت ہی پر لطف تھی اور آپ کے خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ میں بھی ان کے لئے بار خاطر نہیں ثابت ہوا، میں اس پر فخر کرتا ہوں کہ ہماری ملاقات اس قدر دوستانہ رہی۔

محمد علی کی شخصیت کا نقش میرے قلب پر ایسا پڑا تھا کہ جب میں نے ان کی وفات کی خبر سنی تو میں نے محسوس کیا کہ اسلام کا ایک بڑا زبردست و پرجوش خادم اٹھ گیا"

سر مائکل اڈوائر کی قدردانی پنجاب کا مشہور گورنر سر مائکل اڈوائر بھی محمد علی کا خاص قدردان اور بہت مخلص دوست تھا جاڈرہ کی وزارت کے لئے وہی زور دے رہا تھا اور کوشش کر رہا

تھا، لیکن جب محمد علی نے انکار کر دیا اور کامریڈ نکالنے کا عزم مصمم ظاہر کیا تو اس نے ہر قسم کی اخلاقی امداد کی، لیکن آخر میں محمد علی سے اسے تجربہ نہایت "تلخ" ہوا، سید زبیر صاحب ہزاروی ایم اے لکھتے ہیں کہ:

"سر ہائکل اوڈوائر اپنی کتاب" Indian as I know "میں لکھتے ہیں کہ مسٹر محمد علی نے اس اخبار کے اجراء سے پہلے مجھ سے مشورہ لیا، میں نے ان کی حوصلہ افزائی کی، لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ میں خود ہی سب سے زیادہ اس اخبار کا تختۂ مشق بنا رہا"

مسٹر گوکھلے کا اعتراف مدیر انقلاب کا بیان ہے کہ:

"محمد علی، نے اپنی ادبی و سیاسی قابلیت کے تقاضے سے بعض انگریزی اخبارات میں نہایت ہنگامہ خیز مقالات لکھے "ٹائمز آف انڈیا"، "انڈین اسپیکٹیٹر" "ہندوستان ریویو" وغیرہ کے فائل اس کے گواہ ہیں، منٹو مارلے اصلاحات پر آپ کے اور مسٹر گوکھلے کے درمیان ایک تحریری مباحثہ چھڑ گیا جس میں آپ نے انتہائی قابلیت کا ثبوت دیا، یہانتک کہ مسٹر گوکھلے بھی آپ کی قوت استدلال اور زور بیان کے قائل ہوگئے اور لارڈ منٹو نے بھی آپ کی قابلیت کا لوہا مانا"

بمبئی کرانیکل ایک زمانہ میں بمبئی کرانیکل کا ایک دہلی ایڈیشن بھی نکلتا تھا، ایک بار اس کے عملہ ادارت کے ایک رکن، ایم، این، ٹی، نے ایک نہایت دلچسپ، پر لطف اور مفصل مضمون محمد علی کے متعلق لکھا تھا، اس کا ایک اہم حصہ یہ ہے:

"جس شخص نے کامریڈ کے اوراق کا بغور مطالعہ نہیں کیا اس نے محمد علی کی شخصیت کے اسرار کو سمجھا ہی نہیں، مولانا محمد علی نے جو ملک کے سب سے زیادہ روشن

دماغ اخبار نویسی میں اپنے قلم کے ذریعہ سے اپنا دل اخبار میں ٹپکا دیا ہے، اور
اس کے ساتھ انھوں نے ظرافت، مذاق اور تعریض کا ایک ایسا بے پایاں دریا
بہا دیا ہے جو مدتوں تک آئندہ اخبار نویس کے لئے وجہ رشک رہے گا، آدمیوں
کی سیاسیات، انکے طریق کار، اور تحریکوں کا نقشہ کھینچنے میں محمد علی لاثانی ہیں،
اور غالباً لاثانی رہیں گے۔"

سرعت تحریر اس غیر معمولی مہارت اور بصارت کے باوجود محمد علی میں ایک دوسرا وصف
بھی تھا یعنی سرعت تحریر، اہم اہم مضامین کی انھوں نے کم سے کم وقت میں تکمیل کر دی ہے۔

چوائس آف دی ٹرکس اپنا مشہور و معروف مضمون "چوائس آف دی ٹرکس" محمد علی نے
ایک نشست میں جو مسلسل ۴۰ گھنٹے تک قائم رہی تھی، لکھا تھا اور صرف یہی مضمون نہیں اکثر و بیشتر
وہ اسی طرح لکھتے تھے، اور ایسے لکھنے پر مجبور تھے، کیونکہ کثرت مشاغل، کثرت احباب اور کثرت کار سے
ان کے پاس اتنا وقت بچتا ہی نہیں تھا کہ وہ سکون قلب اور اطمینان خاطر سے مضمون لکھ سکیں،

رفتار کار میر محفوظ علی اپنے زمانۂ قیام دفتر ہمدرد کامریڈ کا ایک دلچسپ واقعہ بتاتے ہیں کہ۔

"محمد علی بالطبع سست نہ تھے، مگر کاہل ضرور تھے، منٹوں کا کام دنوں بلکہ ہفتوں
نہیں کرتے تھے، مگر جب کرنے پر آجاتے تھے تو ہفتوں کا کام منٹوں میں نہیں تو
گھنٹوں میں ضرور کر ڈالتے تھے، دہلی آکر کامریڈ کبھی وقت پر نہ نکلا، صبح کا ناشتہ
کرنے کے بعد مضمون لکھنے بیٹھے ہی تھے کہ فلاں صاحب تشریف لائے اب
مجلس گرم ہوئی، پھر، باہر جانے کا وقت ہوا، تشریف لے گئے، کھانے کے
وقت واپس آئے، ہمارے ضبط کا پیالہ چھلک گیا، اور جو کچھ منہ میں آیا بکنا
شروع کیا، صبح کو ناشتہ پر بلائے گئے "بھائی جان کچھ غصہ کم ہوا؟ خفا کیوں

جتے ہوئے یہ تو مضمون لوگے یا کسی کی جان؟ یہ کہہ کر ایک پلندا پھینک دیا، دیکھا تو کامریڈ کے لئے گپ کا ایک نہایت ہی لچھے دار مضمون تھا۔"

باب ۵

ذوق تفحص اور وسعتِ مطالعہ

محمد علی کو قدرت نے غیر معمولی قوت ذہانت ، بلکہ فہم و تدبر اور قوت حافظہ عطا فرمائی تھی لیکن قدرت کے اس عطیہ پر وہ قانع نہیں تھے ، بلکہ اپنی ذہنی و دماغی قوتوں کو برابر استعمال کر کے ان میں جلا دیتے رہتے تھے ۔

بارہا ایسا اتفاق پیش آیا ہے کہ انھوں نے جمہور سے اختلاف کیا ہے اور اختلاف بھی کیسا ؟ مذہبی ! اگرچہ عربی سے تقریباً وہ نابلد تھے ، اس لئے بظاہر ان کی مذہبی استعداد کو بھی بس یوں ہی سا ہونا چاہئے تھا ، لیکن واقعہ ایسا نہیں تھا ۔

قتل مرتد غازی امان اللہ کے عہد حکومت میں ایک قادیانی نعمت اللہ کو سنگسار کیا گیا ، اس پر قادیانیوں نے ایک ہنگامہ برپا کر دیا ، ہندوستان میں جلسے ہوئے ریزولیوشن پاس ہوئے وائسرائے اور ملک معظم سے فریاد کی گئی ، یہاں تک کہ " جمعیۃ الامم " تک اس معاملہ کو پہنچایا گیا اور انسانیت کے نام پر اپیل کی گئی ۔

دوسری طرف علماء ہندوستان نے ایک " قیامت صغریٰ " برپا کر دی ، اور ہر ہر طریقے انھوں نے امان اللہ کے اس فعل کو مستحسن قرار دیا ، اور " شریعت حقہ اسلامیہ " کی اہم ترین دفعہ کی حیثیت سے اس کو پیش کیا ، اور ثابت کیا کہ یہ ایک نہایت اہم ترین اصول اسلامی ہے ۔

محمد علی کی رائے کی صداقت و صحت سے اس جگہ بحث نہیں ، یہاں صرف یہ کہنا ہے

کہ محمد علی نے ان دونوں جماعتوں کے افکار و آرا کا مطالعہ کیا اور پھر اپنا نظریہ یہ پیش کیا کہ اسلام میں قتل مرتد جائز نہیں، ہاں قتل مفسد نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہے۔

یہ رائے محمد علی نے پیش کی حسب توقع اس کی مخالفت بھی ہوئی، لیکن محمد علی اس اختلاف و مخالفت سے متاثر نہیں ہوئے اس لئے کہ انھوں نے اس مسئلہ پر جو رائے قائم کی تھی وہ علی وجہ البصیرۃ تھی، ان کا خیال یہ تھا کہ "لا اکراہ فی الدین" کی رو سے قتل مرتد ناجائز ہے، اور "الفتنۃ اکبر من القتل" کے اعتبار سے قتل مفسد نہ صرف جائز بلکہ بعض صورتوں میں فرض ہے۔

اس مسئلہ پر انھوں نے آیات قرآنی، احادیث رسول، اقوال فقہا، خیالات ائمہ، افکار مجتہدین کا اتنا نادر ذخیرہ جمع کر لیا کہ ایک شخص پوری بصیرت کے ساتھ اس مسئلہ پر "ریسرچ" کر سکتا ہے، اس ذخیرہ سے متمتع ہونے کے بعد انھوں نے اپنی بصیرت کے مطابق ایک رائے قائم کی اور اس پر آخر وقت تک مصر رہے۔

ساردا بل | ساردا بل کی مخالفت سب سے پہلے محمد علی نے کی، اور اپنے متعدد پرزور مقالات سے اس مسئلہ کی سیاسی اور مذہبی اہمیت سمجھائی لیکن حسب عادت اس مسئلہ پر بھی محمد علی نے مخالف اور موافق ہر گروہ کے دلائل کا استقصا کیا، مذہبی حیثیت سے معلومات فراہم کئے، عہد رسالت عہد صحابہ، عہد تابعین کے حالات و واقعات کی جستجو کی، فقہ و احادیث کا ذخیرہ اپنے سامنے رکھا اور اس کے بعد بیانگ دہل اس کی مخالفت کی، ہر شخص سے مناظرہ کیا، مقالات لکھے لوگوں کو اپنی رائے سے موافق بنانا چاہا اور بڑی حد تک اس میں کامیاب بھی ہوئے۔

واقعات دیوبند | ایک اخبار نویس کے لئے سب سے زیادہ دلچسپ چیز یہ ہوتی ہے کہ ملک میں کوئی ہنگامہ ہو اور اس کا قلم پوری روانی کے ساتھ بڑی بڑی "سنسنی خیز" سرخیاں دے کر اپنے "ہمدرد قوم" ہونے کا لوہا منوالے چنانچہ دار العلوم دیوبند کی مشہور اسٹرائک میں تقریباً

تمام اخبارات نے اپنی اپنی راہ عمل متعین کر لی یا تو انھوں نے ارباب دیوبند کی حمایت کی اور یا انھوں نے پھر مہتمم صاحب کو سب و شتم کا ہدف بنالیا، لیکن محمد علی نے اپنی ذمہ داری کا احساس کیا، اور وہ خود اپنی اہم ترین مصروفیتوں اور مشغولیتوں کے باوجود بہ نفس نفیس دیوبند تشریف لیگئے وہاں کے حالات کا مطالعہ کیا، موافق اور مخالف ہر گروہ کے افکار و آراء سے واقفیت حاصل کی، دونوں جماعتوں کا جو تحریری مواد تیار ہو چکا تھا اسے حاصل کیا اور اسے پڑھا، تب جاکر انھوں نے ہمدرد کو اظہار رائے کی اجازت دی، آج تک محمد علی کے دفتر میں تمام کاغذات ان تمام مسائل کے متعلق موجود ہیں اور ہر شخص انھیں دیکھ کر اس دعوے کی تصدیق کر سکتا ہے۔

یہ تو تھا ان کا شوق تفحص اور ذوق طلب اب ان کی وسعت نظر پر ایک نظر ڈالئے تو اور زیادہ وہ کامیاب ثابت ہوں گے، اپنے مخصوص مضامین، تاریخ، صحافت اور انگریزی میں تو خیر وہ فرد فرید تھے ہی لیکن جن چیزوں سے ان کا کوئی خاص تعلق نہ ہونا چاہئے تھا، یا جن چیزوں پر انھوں نے خاص طور سے تیاری نہیں کی تھی ان میں بھی وہ سب سے آگے تھے۔

غالب پر تو ان کی خاص نظر تھی، اس کا فارسی اردو ہر قسم کا کلام انھیں زبانی یاد تھا، یہاں تک کہ اس کے غیر مطبوعہ کلام پر بھی ان کی وسیع نظر تھی۔

براق شریف غالباً ۱۹۲۸ء میں فلسطین کے مسلمانوں اور یہودیوں میں "دیوار گریہ" اور "براق شریف" کے مسئلہ پر نہایت سخت تنازعہ رونما ہوا، محمد علی اس زمانہ میں علیل تھے بمبئی گئے ہوئے تھے، شاید بغرض علاج، لیکن اخبار والے بھلا کسی مشہور لیڈر کو "انٹرویو" لیے بغیر کب چھوڑتے ہیں؟ اچھی طرح یاد نہیں شاید ٹائمز آف انڈیا کا نامہ نگار پہنچا کہ اس اہم مسئلہ پر اپنے خیالات لکھوائیے، محمد علی نے اپنے خیالات تو بعد کو لکھوائے، لیکن "دیوار گریہ" اور "براق شریف" کی تاریخی حیثیت پر اتنا پرمغز، اتنا مدلل، اور اتنا تاریخی بیان دیا، جو غالباً ہمیشہ یادگار رہے گا۔

غور طلب بات یہ ہے کہ محمد علی علیل تھے، بیان دینے کے لئے تیار تھے، لیکن جب اس مسئلہ پر لب کشائی کی تو پھر حقائق و معلومات کا ایک دریا بہا دیا، افسوس ہے کہ جستجوئے بسیار کے باوجود وہ بیان نہ مل سکا ورنہ ناظرین کی خدمت میں اس کے ضروری حصص پیش کر دیئے جاتے۔

محمد علی کی اس خصوصیت کا ان کے حلقۂ تعارف میں ہر شخص معترف تھا، اور بوقت ضرورت انھیں کسی نہ کسی علمی کام میں شریک کرنے کی کوشش ضرور کی جاتی تھی۔

اُردو انسائیکلوپیڈیا | ایک زمانہ میں راجہ صاحب محمود آباد کی عنان توجہ علمی سرپرستیوں کی طرف مبذول ہوئی تھی چنانچہ موصوف نے اپنی جیب خاص سے ایک لاکھ روپیہ اس مد پر صرف کر دینے کی آمادگی ظاہر کی اور اُردو انسائیکلوپیڈیا کی تدوین و تبویب کے مبادی گویا شروع بھی ہو چکے تھے، مولانا سید سلیمان صاحب ندوی اور مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کے سپرد یہ ذمہ داری کی گئی، اور امید بندھ چلی تھی کہ یہ کام انجام پا سکے گا لیکن بعد کو مسلمانوں کے عام منصوبوں کی طرح یہ منصوبہ بھی ناکام ہی رہ گیا۔ بہرحال اس اردو انسائیکلوپیڈیا کی مجلس شوریٰ میں نواب عماد الملک جسٹس (اب سر) عبدالرحیم، ڈاکٹر (اب سر) سپرو، ڈاکٹر (اب سر) اقبال اور راس مسعود وغیرہ جیسی بلند پایہ شخصیتوں کے ساتھ محمد علی کا نام بھی رکھا گیا، اور صرف نام ہی نہیں رکھا گیا بلکہ کام کی دعوت بھی دی گئی چنانچہ مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی مدظلہ اپنے ایک مکتوب میں محمد علی کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"اُردو انسائیکلوپیڈیا کا اعلان آپ نے اخبارات میں پڑھا ہوگا، یہ فرمائیے آپ کا اس میں کیا حصہ ہوگا، آپ کا نام اس کی مجلس شوریٰ میں تو رکھ بھی دیا گیا ہے، اس کے علاوہ جس چیز کی بابت آپ لکھنا پسند فرمائیں ہم لوگ بہ کمال اشتیاق آپ کے خیر مقدم کے لئے تیار ہیں آپ کی شرکت محض مجلس شوریٰ میں کافی نہیں آپ کو اس سے بہت زیادہ حصہ لینا چاہئے تاریخ

لٹریچر، جز بلزم، غرض جس شے کے متعلق آپ چاہیں تحریر فرما سکتے ہیں

مکتوب سید سلیمان | اسی طرح مولنا سید سلیمان صاحب ندوی بھی اپنے ایک مکتوب میں ان سے علمی خدمت کا نہایت اصرار سے تقاضا" کر رہے ہیں کہ

"میں اس وقت ایک خود غرضی سے حاضر ہوا ہوں یہ فرمائیے کہ ایام نظربندی میں کوئی علمی کام بھی آپ کے پیش نظر رہا؟ اس سوال کا جواب مجھے ضرور دیجئے ایک ضرورت خاص ہے، سیرۃ نبوی ملاحظہ سے گزری ہوگی، کہئے کیا خیال قائم کیا؟ کیا امور قابل اصلاح ہیں؟"

باب ۶

قیادت کا رعب و اعتراف!

محمد علی کی ہمہ گیر خوبیوں اور دلفریب خصلتوں کے ساتھ ہر شخص کے دل میں عام اس سے کہ وہ مخالف ہو یا موافق ان کی رہنمائی کا اعتراف عزت واحترام کے ساتھ موجود تھا۔ ہر شخص ان کی زعیمانہ خوبیوں کا معترف تھا اور خوب سمجھتا تھا کہ محمد علی کی ناخدائی کے بغیر بیڑا پار نہیں لگ سکتا۔ اتنا عام اعتراف واحساس تو خیر بعد کو ہوا لیکن شروع شروع میں جب محمد علی نے علمی زندگی میں قدم رکھا اور کامریڈ کے ذریعہ سے اپنے افکار و خیالات کی نشر و اشاعت شروع کی تو تاڑنے والی نظریں تاڑ گئیں کہ یہ "جوہر قابل" آسمان سیاست و صحافت پر مہر و ماہ بن کر چمکے گا چنانچہ اسی وقت سے محمد علی کا دفتر فریادیوں کا مرکز بن گیا تھا اور یہی نہیں کہ "عوام کالانعام" اسے قبلۂ آرزو سمجھ رہے ہوں بلکہ واقعہ یہ تھا کہ وہ خواص کی نظروں کا تارا تھا، عوام تک تو ابھی نہ اس کی رسائی ہوئی تھی نہ عوام اسے پہچانتے تھے، علی گڑھ کی بقا و ترقی کے معاملہ میں اور مسلم لیگ کے قیام و استحکام کے زمانہ میں مرحوم نواب وقار الملک نے اسے اپنا دست راست سمجھا، "مدینہ یونیورسٹی" کی تحریک ایک خاص علمی حلقہ سے جب فروغ پذیر ہوئی تو محمد علی کو ترتیب نصاب وضع دستور العمل، اور تسویہ اسکیم کے لئے ہر طرف سے بلایا جا رہا تھا، کبھی مولانا شبلی اپنے اس عزیز شاگرد کو اپنا مافی الضمیر سمجھا رہے ہیں اور کبھی اس کا نقطۂ نظر سمجھ رہے ہیں، کبھی مولانا حمید الدین فراہی مرحوم "ہمہ وقت حاضری" کو مستعد ہیں، کبھی ڈاکٹر اقبال "ہر طرح سے آمادہ" ہیں اور

کامریڈ کا یہ جوان عمر و جوان سال ایڈیٹر، ان سب پیشوایان قوم کا مرکزِ آرزو بنا ہوا ہے۔ اس مقام پر

مولانا حالی کا خط مولانا حالیؔ مرحوم کے ایک مکتوب بنام محمد علی کا حوالہ دینا ہے جس سے معلوم ہوگا کہ محمد علی سے بزرگان قوم نے کیا توقعات وابستہ کر رکھی تھیں:

"عزیزی و حبیبی

میں اب بہت کمزور ہو گیا ہوں لکھنا پڑھنا بالکل چھوٹ گیا ہے لیکن بعض ضرورتیں مجبور کر دیتی ہیں اور اپنی طاقت سے بڑھ کر کام کرنا پڑتا ہے ہیں اس وقت آپ کو اس معاملہ کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں جو آگرہ میڈیکل ڈیپارٹمنٹ میں مسلمانوں کے برخلاف درپیش ہے، امید ہے کہ آپ اصل واقعات پر روشنی ڈال کر سچ کی مدد کریں گے، اور نہایت متانت، سنجیدگی اور تہذیب کے ساتھ اپنا فرض ادا کریں گے۔"

مولانا ابوالکلام کا خط مولانا ابوالکلام صاحب آزاد جن کا ہاتھ ہمیشہ "زمانہ کی نبض" پر رہتا ہے، اور وقوعِ واقعہ سے کہیں پیشتر مولانا اپنی مخصوص و منفرد بصیرت کی بنا پر آنے والے واقعہ کی حقیقت و ماہیت سے واقف ہو جایا کرتے ہیں، وہ اپنے مکتوب بنام محمد علی میں اس "وقت کے سب سے اہم مسئلہ" یعنی مسلم لیگ پر اظہارِ خیال فرماتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

"خدا نے آپ کے اندر ایک کامیاب اخبار نویس سے زیادہ طاقتیں رکھی ہیں ظلم ہے کہ اگر آپ اپنی قوتوں سے کام نہ لیں، میری تجویز تو یہ ہے کہ لوگ آپ کو جبراً پریسیڈنٹ بنا لیں اور میں اس کو پوری تفصیل سے لکھنے والا ہوں مسلمانوں کی نئی سیاسی زندگی کی تشکیل کے لئے آپ کی غیبت میں ہمیشہ کہتا ہوں کہ آپ سے زیادہ کوئی شخص موزوں نہیں۔"

اور "بالآخر" واقعات نے ثابت کر دیا کہ مولانا موصوف کی رائے کس قدر قرین صواب تھی۔

یہ تو اس زمانے کے واقعات ہیں جب محمد علی لوگوں کی نظر میں چڑھے ہوئے تھے لیکن اس عہد سے قطع نظر کرکے اس زمانہ پر نظر ڈالئے، جب بیجا پور جیل سے رہائی کے بعد محمد علی

ہمہ گیر اختلاف | مخالفتوں اور سازشوں کے شکار ہو رہے تھے، ہندوستان میں تبلیغ و تنظیم اور شدھی و سنگٹھن کی کار فرمائی تھی، اور پھر اسے بھی چھوڑئے جب ابن سعود کی موافقت نے احناف میں انھیں غیر ہر دلعزیز بنا دیا تھا اور پھر مخالفت نے حضرات اہل حدیث کو ان کا دشمن کر دیا تھا یا پھر کتاب راجپال کے زمانہ پر نظر ڈالئے جب محمد علی نے اپنا جدید لیکن قابل قبول نظریہ پیش کرکے سارے اسلامی ہند کی مخالفت مول لے لی تھی، یا پھر سب سے آخر میں جب وہ کانگریس کے مخالف ہوئے ہیں اور علی الاعلان انھوں نے اس کی مخالفت کی ہے اور اپنے دوستوں رفیقوں اور نہ معلوم کتنے "تابع مہمل" ساتھیوں کی مخالفت کا نشانہ بنے ہیں، اس تمام عہد انتشار و شورش میں نہ صرف یہ کہ محمد علی کے پائے استقامت کو جنبش نہیں ہوئی اور نہ صرف یہ کہ انھوں نے سارے مسلم پریس، ہندو پریس، اور اینگلو انڈین پریس کی مخالفت کا تن تنہا مقابلہ کیا، بلکہ یہ بھی ہوا کہ مخالفوں نے ان کو بدنام کرنے والوں نے، ان کی قبا ر قیادت کی دھجیاں اڑانے والوں نے جب وقت پڑا تو محمد علی کی طرف ہی رجوع کیا، انھیں کے سایۂ قیادت میں پناہ ڈھونڈھی اور پائی، یہ تاریخ کا عجیب و غریب واقعہ ہے، لیکن ہے واقعہ کہ ایسا ہوا، لوگوں نے ان کی مخالفت بھی کی، ان کی نیت پر حملے بھی کئے، ان کے وجود کو قوم و ملک کے لئے، باعث ہلاکت بھی سمجھا پھر بھی محمد علی کی ناخدائی سے وہ بے نیاز نہ ہو سکے۔

پنجاب کا ایک واقعہ | کتاب راجپال کے زمانہ میں زعمار پنجاب نے سب سے پہلے "دلیپ سنگھ مستعفی ہو جاؤ" کا نعرہ لگایا تھا اور جب اس پر "مسلم آؤٹ لک" کے ایڈیٹر صاحب گرفتار ہوئے

توسارا پنجاب جوش و ہیجان سے بیقرار ہوگیا، پنجاب کے ایک لیڈر نے اس آگ پر تیل کا کام دیا تھا، اتفاق ایسا پیش آیا کہ مسٹر اوگلوی کی حکومت نے انھیں بھی گرفتار کر لیا، گرفتار ہوتے ہی سارا جوش قیادت کم ہوگیا اور ان کی جانب سے ان کے صاحبزادہ نے لاہور سے محمد علی کو ٹیلیفون دینا شروع کیا اور التجا کرنا شروع کی کہ آپ تشریف لائیے اور ہم سب کی رہنمائی کیجئے اور "والد محترم" کی گرفتاری کے مسئلہ پر بھی اپنی رہنمائی سے مستفید کیجئے، حالانکہ اس استمداد سے پیشتر "والد محترم" اور ان کا "اخبار" سب کے سب مسلسل اور پیہم یہ پروپیگنڈا کر چکے تھے کہ محمد علی کا دماغ ذیابیطس نے خراب کر دیا ہے۔

اسی طرح سائمن کمیشن کے زمانہ میں محمد علی سے اپنی مسلمہ مخالفت کے باوجود اس کی امداد سے احرار پنجاب بے نیاز نہ رہ سکے، سر شفیع نے لاہور میں بیٹھ کر، جو احرار پنجاب کا مرکز ہے مسلم لیگ کے دو ٹکڑے کئے، لاہور ہی میں مسلم لیگ کا جلسہ طلب کیا، خود ہی اس کے صدر ہوئے، اور سائمن کمیشن سے تعاون کی تجویزیں پاس کرائیں، اور سوا "اظہار بیزاری" کے ان کا کوئی کچھ نہ کر سکا۔

لیکن محمد علی کے لغت میں "بیزاری" اور "علیحدگی" کے الفاظ تھے ہی نہیں، اس لئے علی الاعلان سر شفیع کو چیلنج دیا، پنجاب کے دوسرے "سروں" کو دعوت مبازرت دی، اور پنجاب میں دورہ کیا اور سائمن کمیشن کے خلاف اپنے دلائل پیش کئے اور لوگوں سے منوائے، حالانکہ پنجاب کی ایک جماعت کی نظروں میں، محمد علی اس زمانہ میں آبرو باختہ تھا، مجنون تھا اور اس کا دل و دماغ اسے جواب دے چکا تھا۔

دوسرا واقعہ اسی طرح ایک اور اہم موقعہ پر بھی محمد علی سے استمداد کی گئی تھی، راجپال کے قاتل علم الدین شہید کو میانوالی جیل میں پھانسی دی گئی اور وہیں اس کی تدفین بھی کر دی گئی

مسلمانان لاہور اسے لاہور میں لاکر باقاعدہ نماز جنازہ ادا کر کے جلوس کے ساتھ دفن کرنا چاہتے تھے
پنجاب گورنمنٹ نے ہندو مسلم فساد کے اندیشہ کے سبب مسلمانوں کے مطالبات کو ٹھکرا دیا مسلمانوں
نے لاکھ کوششیں کیں مگر اس کی اجازت نہ ملی، اس انکار سے مسلمانوں میں بہت زیادہ ہیجان
پیدا ہو گیا، اور وہ ہر طرح سے اپنے مطالبات پر ایثار و قربانی، سرفروشی و جاں نثاری کے لئے
تیار ہو گئے، لیکن سوال یہ پیدا ہوا کہ اس گروہ عوام کی قیادت کون کرے؟ سوال بہت دلچسپ
تھا، حالانکہ لاہور تو لیڈروں کا مرکز تھا، بہرحال نظر انتخاب محمد علی پر پڑی اور ان سب مخالفوں
نے جو اس کی مخالفت میں پیش پیش تھے، اس کے دماغ و عقل پر حملے کرتے تھے، بلاچون وچرا
اس کی رہنمائی پر صاد کر دیا، اسے مقتدا بنانا چاہا، اور خود مقتدی بننے پر آمادہ ہو گئے، چنانچہ ایک
صاحب جو کبھی محمد علی کی مخالفت میں "مہر و ماہ" کی طرح روشن ہو چکے تھے اور جن کی رائے میں
اب "انقلاب" ہو چکا ہے، محمد علی کو لکھتے ہیں۔

> "یہاں حالات بیحد نازک ہیں، تمام ذی اثر اور ذی حیثیت کارکنوں کی رائے
> ہے کہ اس باب میں وہ آپ کے مشوروں سے مستفید ہوں، آپ کی رائے کے
> مطابق پروگرام وضع کریں اور آپ کی قیادت و رہنمائی میں اس مہم کو اتمام تک
> پہنچائیں"

ایک اور واقعہ اسی طرح الٰہ آباد کے ایک بیرسٹر صاحب جو "ہارنبی روڈ" کے "گدے دار
کوچوں" پر بڑی گہری تنقیدیں فرمایا کرتے ہیں، گزشتہ تحریک کے آغاز کے وقت بیتاب ہو کے
محمد علی کو لکھتے ہیں۔

> "میں نے اس وقت تک وکالت نہیں چھوڑی اور ضمنی حصہ تحریک میں لے رہا ہوں
> مگر اگر آپ سامنے آئیں تو میں وکالت وغیرہ چھوڑ کر کھلم کھلا میدان میں آنے کو

تیار ہوں ۔"

جواہرلال کا اعتراف | اسی طرح گزشتہ تحریک کے موقع پر جب محمد علی نے کانگریس کے جلوس اور مظاہروں میں مسلمانوں کو شریک ہونے سے روکا تو پنڈت جواہرلال نہرو نے اپنے ایک بیان میں اپنے تاثرات قلب کا ان الفاظ میں اظہار کیا ۔

"میں اس بہادر لیڈر کا بہت زیادہ احترام کرتا ہوں اس نے آزادی کی جدوجہد میں جو قربانیاں کی ہیں اور جو کام سرانجام دیا ہے وہ تاریخ آزادی میں جلی حروف سے لکھا جائے گا ، اور سب سے نمایاں جگہ پائے گا ۔"

گاندھی جی کا اعتراف | اسی طرح گاندھی جی نے جب قانون نمک کی خلاف ورزی کا ارادہ کیا ہے تو ان کے ایک معتقد نے ینگ انڈیا میں ان سے استفسار کیا تھا کہ کیا حقیقۃً علی برادران کی شرکت سے بے نیازی آپ مفید سمجھتے ہیں ؟ اس کا انھوں نے جواب دیا کہ نہیں ، علی برادران اگر آج ہم سے اشتراک عمل کر سکیں تو ہماری تحریک میں کہیں زیادہ استحکام پیدا ہو جائے ، اور شوکت صاحب کے متعلق تو متعدد بار انھوں نے حسرت کی کہ کاش وہ انھیں اپنی "جیب" سے نہ نکال پھینکتے ۔

یہ بیان تو تھا ان لوگوں کا جو سرکار پرست نہیں تھے ، بلکہ کسی نہ کسی زمانہ میں محمد علی کے رفیق و شریک کار رہ چکے تھے ، لیکن ایک دفعہ سرکاری حلقہ پر ایک نگاہ ڈال جائیے ، تو وہاں بھی محمد علی کی ہمہ گیر شخصیت سب پر اثر انداز ہو رہی ہوگی وہاں بھی اس کی خصوصیتوں اور صلاحیتوں کا اعتراف ہو رہا ہوگا ، کوئی سب جج صاحب اپنے چیف جسٹس کی فرقہ داری کا استغاثہ محمد علی کے حضور میں پیش کر رہے ہوں گے اور کوئی کلکٹر صاحب اپنی عقیدت و نیازمندی کے پھول ۔

ایک ہوم ممبر کا بیان | محمد علی جب گول میز کانفرنس کے ممبر مقرر ہوئے تو ایک صوبہ کے ہوم ممبر صاحب محمد علی کو بایں الفاظ مبارکباد دیتے ہیں۔

"آپ کی ذات کے ساتھ مسلم قوم کی توقعات ہمیشہ وابستہ رہی ہیں اور خدا کا شکر ہے کہ اس اہم اجتماع کے موقعہ پر بھی آپ کی قوم آپ جیسی عظیم اور با اثر شخصیت کی راہ نمائی سے محروم نہ رہے گی"

اسی طرح ایک اور اہم موقعہ پر وہی" ہوم ممبر صاحب" محمد علی کو مخاطب کرتے ہیں:

"لارڈ اردن کے پاس ایک وفد لیجانیکی بھی ضرورت ہے یہ کام بدون مشورہ کے طے ہونا مشکل ہے، اس لئے، گذارش ہے کہ جس طرح ممکن ہو تشریف لائیے"

ایک ممبر اسمبلی کی فرمائش | اسمبلی کے ایک مشہور ممبر صاحب انسداد توہین انبیا و بزرگان دین کے متعلق اسمبلی میں کچھ سوالات کرنا چاہتے ہیں، لیکن چاہتے یہ ہیں کہ سوالات محمد علی بنائیں۔

"میں اسمبلی کے آئندہ سشن میں اس بارہ میں چند سوالات کرنا چاہتا ہوں، جو جو سوالات کئے جانے مناسب تصور فرمائیں ان کا مسودہ بنا کر میرے پاس جلد سے جلد ارسال فرمادیں تاکہ میں ان کو بھیج دوں"

ایک دوست کا خط | یہ تو تھا رعب قیادت اور اعتراف سیادت عام و خاص طبقوں پر، لیکن وہ لوگ جو ان کے دوست تھے، بے تکلف تھے، ان کے اسرار و رموز سے واقف تھے وہ بھی اور وہ بھی جو گروہ عوام میں شامل تھے، اور اپنی فہم سیاست کا کوئی ثبوت نہ پیش کر سکے تھے، محمد علی پر فدا تھے، اور فدا ہونے کو ہر وقت تیار، دونوں قسموں سے ایک ایک مثال

قاسم حسن صاحب مرحوم تعلقدار پربھنی حیدر آباد، وہ تھے جنھوں نے تحریک خلافت کے شروع ہوتے ہی محمد علی کے ارشاد پر ڈپٹی کلکٹری پر لات ماری اور حیدر آباد میں مقیم ہو گئے۔

اور پھر رفتہ رفتہ وہاں خاصی ترقی کی، وہ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"تمھاری صحت کیسی ہے؟ خدا علیم ہے تم مجھے اتنے عزیز ہو کہ اپنی صحت قربان کرنے کو تیار ہوں"

دوسری مثال | اب دوسری مثال گروہ عوام سے لیجئے، کوئی شخص "میر" نامی تھا پڑھائی کچھ یوں ہی سی ہوئی تھی، معمولی ملازمت کرکے اپنا پیٹ پالتا تھا لیکن محمد علی کا عاشق زار اور ہمدرد کا قدر دان تھا، وہ اپنے بستر علالت پر بلکہ بستر مرگ پر دراز تھا کہ ہمدرد بند ہونے کی اطلاع پہنچی، اس بیماری کے عالم میں اس خبر سے وہ کافی متاثر ہوا، اور اسی حالت میں اس نے محمد علی کو خط لکھا، وہ خط ابھی ڈاک میں ڈالا بھی نہیں گیا تھا کہ مریض کا انتقال ہو گیا، اس سارے واقعہ کی تفصیل مرحوم کے والد نے اپنے ٹوٹے پھوٹے انداز بیان میں مولانا کو لکھی تھی جس سے یہ اقتباس اپنے الفاظ میں لیا گیا، وہ خط اپنی بے نمکی کے باوجود حد درجہ تاثر انگیز ہے۔

ایک اخبار کا خراج تحسین | ایک ہفتہ وار غیر مسلم اخبار (دہلی) جو آخر زمانہ میں مولانا کا ایک بدتہذیب دشمن تھا، ہمدرد جب بند ہوا ہے تو ساری مخالفت کے باوجود یہ الفاظ اس کی زبان قلم پر آہی گئے۔

"مولانا محمد علی کا اخبار ہمدرد روپیہ کی کمی کے باعث آخری لحموں پر ہے، ہم تمام ہندوستان کے رہنے والوں کے لئے شرم کا باعث ہے، مولانا محمد علی اگر حریت و آزادی کی راہ اختیار نہ کرتے تو بلاشبہ آج وہ وائسرائے کی انتظامیہ کونسل کے ممبر یا کسی صوبہ کے وزیر ہوتے اور اگر یہی محمد علی کسی ایسے ملک میں پیدا ہوتے جو آزادی و حریت سے لذت آشنا تھا تو آج محمد علی کی

پوزیشن مصر کے زاغلول، جرمنی کے ہیڈنبرگ، سے کم نہ تھی۔"

پریم چند کا خط محمد علی کی عقیدت سے صرف مسلمانوں ہی کے دل نہیں لبریز تھے بلکہ سمجھدار اور معاملہ فہم ہندو بھی ان کے ویسے ہی قدر دان، اور ان کے اعزاز و احترام میں ویسے ہی پیش پیش تھے جیسے مسلمان، اس سلسلہ میں ہندوستان کے مشہور افسانہ نگار، منشی پریم چند کا ایک خط دلچسپی سے خالی نہ ہوگا، وہ فرماتے ہیں:-

"اگر آپ کے خیالات کی مزید اشاعت کے لئے میں یہاں سے ایک ہفتہ وار "ہندی ہمدرد" کے نام سے شائع کروں تو آپ اسے پسند فرمائیں گے؟
مہاتما گاندھی کے بعد میرے دل میں آپ ہی کی عزت ہے، اور اس کا اظہار کر چکا ہوں۔"

سوویٹ روس کی دعوت یہ تو تھی ہندوستان کی قدر افزائی اور سیادت و قیادت کی ستائش و تعریف، لیکن اس محبوب شخصیت کے اثرات باہر بھی پہنچ چکے تھے، اور ہر شخص اسیر دام محبت ہو رہا تھا، چنانچہ سوویٹ روس کی دسویں سال گرہ کے موقعہ پر حسب ذیل بحری پیام محمد علی کے پاس آیا:

"روس اور دیگر ممالک کے مابین تعلقات مدنیت کو ترقی دینے والی انجمن آپ کو روس آکر سوویٹ کی دسویں سال گرہ میں شریک ہونیکی دعوت دیتی ہے، انجمن مذکور ۳۰ر اکتوبر کو ماسکو میں بطور مہمان کے آپ کا خیر مقدم کرے گی، اور اگر آپ آپ پسند کریں گے تو وہ آپ کے قیام ماسکو کے تمام اخراجات بھی ادا کرے گی آپ اسے سرکاری دعوت تصور کریں، توقع ہے کہ آپ ضرور تشریف لائینگے۔"

علیؓ اور محمد علی ایک طرف تو محمد علی کی قدر دانی اور عزت افزائی، اعتراف سیادت اور رعب قیادت کا یہ عالم تھا، دوسری طرف محمد علی تھا، اور اس کے رفقا کے دل کو کچھ کے

دینے والے نفری، اس کی ہر تحریک کی مخالفت کی گئی، اس کے ہر نظریہ سے شد و مد کی بیزاری کا اظہار کیا گیا، اس کے ہر قدم کو ملک و ملت کے لئے ہلاکت آفریں کہا گیا، اس کے خلاف اس شد و مد، اس زور و شور اور اس بلند آہنگی اور تسلسل سے کیا گیا کہ یقیناً ہندوستان میں اس سے زیادہ کسی کے خلاف اتنا متفقہ پروپیگنڈا کبھی نہیں ہوا، اور نہ شاید ہو، قول و عمل کے اس دلچسپ تضاد و تخالف کو مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی مدظلہ نے اپنے مکتوب بنام محمد علی میں خوب واضح فرمایا ہے۔

مکتوب ماجد

"جی میں آتا ہے کہ ایک مضمون "علی اور محمد علی" کے عنوان سے لکھوں، جس میں یہ دکھاؤں کہ وہی ابتلا وہی خانہ جنگیاں، وہی اندرونی شورشیں وہی قدم قدم پر ناکامیاں جو علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو اپنے دور خلافت میں پیش آئیں ٹھیک انھیں کا اعادہ ایک چھوٹے پیمانہ پر آج محمد علی کے لئے ہو رہا ہے، علیؓ مرتضیٰ کے فضائل و کمالات سے فرداً فرداً کسی صاحب کو بھی انکار نہ تھا، امیر معاویہؓ اور عمر بن عاصؓ تک اپنے کو ان سے بہتر نہیں کہتے تھے، ان کے فضائل کا برابر اعتراف کرتے تھے، پھر بھی عملاً ان کی ہر رائے ہر تحریک، ہر ارادہ کی مخالفت ہی ہوتی رہتی تھی ٹھیک یہی صورت آج محمد علی کے لئے بھی ہے۔"

مولانا عبد الماجد صاحب مدظلہ کی اس رائے گرامی کی صداقت میں کون شبہ کر سکتا ہے، کاش مولانا حسب وعدہ اس عنوان پر مقالہ سپرد قلم فرما سکیں، اگر اس مسودہ کی کتابت تک مولانا نے وہ مقالہ تحریر فرما لیا، تو انشاء اللہ اس کتاب کو اس سے زینت دیجائیگی ورنہ پھر آئندہ ایڈیشن میں۔

تدبر

ہندوستان کے زعماء کی نہایت آسانی کے ساتھ دو قسمیں کی جاسکتی ہیں، ایک تو وہ جو بس لیڈر ہوگئے اور دوسرے وہ افراد جنھوں نے اپنے ذہنی و دماغی خصوصیات، اخلاقی صفات اور عملی خدمات کے اعتبار سے ملک و قوم کے دل میں اپنی جگہ پیدا کی ہے، محمد علی کا شمار اسی دوسری قسم سے تھا، انھوں نے اپنے آپ کو کسی کا مقلد نہیں بنایا، نہ گرمی بازار دیکھ کر وہ کسی تحریک میں شریک ہوئے، بلکہ جس تحریک میں وہ شریک ہوئے اس میں گرمی بازار پیدا محمد علی کی ذات سے ہوئی، وہ اپنے دل و دماغ کے مالک تھے، اس لئے وقت کے ہر "اہم" اور "غیر اہم" مسئلہ پر وہ خود رائے قائم کرتے تھے اور اس کے بعد دوسروں کے سامنے لے استقلال و ثبات عزم کے ساتھ پیش کرتے تھے، انھوں نے کبھی اپنے ضمیر و بصیرت کے خلاف رائے عامہ کی پروا نہیں کی، نہ رائے عامہ سے متاثر ہو کر انھوں نے اپنی رائے میں کبھی تبدیلی کی، بلکہ ہمیشہ وہ اس کے کوشاں رہے کہ رائے عامہ میں وہ خود تبدیلی کریں اور رائے عامہ کو اپنا ہم خیال بنائیں، اس سلسلہ میں ان کو جتنی مخالفتوں اور شورشوں کا مقابلہ کرنا پڑا وہ محمد علی ہی کا دل تھا کہ اس نے برداشت کیں ورنہ اور کوئی ہوتا تو ایسے نازک مواقع پر گوشۂ عافیت تلاش کرتا اور عزلت گزیں ہوجاتا، یا اپنے تئیں "چھٹا ہوا کارتوس" کہتا، اور ایک تماشائی کی حیثیت سے فضا کے درست ہونے کا انتظار کرتا، چنانچہ محمد علی اپنے ایک خط میں جو پنجاب کے

ایک خط | ایک لیڈر کو لکھا گیا تھا لکھتے ہیں کہ:

"میں نے نہیں دیکھا کہ تم نے ہمت وجرأت کے ساتھ کبھی بھی اس رائے سے اختلاف کیا ہو جو رائے عامہ سمجھی جاتی ہے، حالانکہ ایک مصلح کو یہ بھی کبھی کبھی کرنا پڑتا ہے۔"

محمد علی نے ایک "مصلح" کی حیثیت سے کبھی کبھی نہیں، اکثر و بیشتر ایسا کیا؛ اور کامیاب بھی ہوئے۔

کتاب راجپال | جسٹس دلیپ سنگھ نے اپریل ۱۹۲۷ء میں اپنی مشہور فیصلہ میں جب راجپال کو بری کر دیا تو پنجاب میں اک آگ لگ گئی ہر شخص اس سے متاثر تھا، اور دلیپ سنگھ کی مذمت میں مصروف، چونکہ پنجاب ہی سے وہ کتاب شائع ہوئی تھی اور پنجاب ہائی کورٹ ہی سے وہ بری کیا گیا تھا، اس لئے قدرۃً پنجاب والے بہت برہم ہوئے، چنانچہ سب سے پہلے پنجاب کے "مسلم آوٹ لک" نے اس فیصلہ پر شدید نکتہ چینی کی، اور دلیپ سنگھ سے مطالبہ کیا کہ "فوراً مستعفی ہو جاؤ"، گورنمنٹ پنجاب نے توہین عدالت کے الزام میں مدیر مسلم آوٹ لک پر مقدمہ چلایا اور مدیر، طابع، ناشر سب کو سزا دیدی، اس فیصلہ نے اور زیادہ مسلمانوں میں اشتعال پیدا کیا، اب پنجاب کے اخبارات کے علاوہ ہندوستان کے دوسرے اخبارات بھی اس مطالبہ کے ہمدرد ہوگئے اور یہی مطالبہ کرنے لگے کہ دلیپ سنگھ مستعفی ہو جائے چنانچہ پنجاب سے باہر دوسرا اخبار مدینہ تھا جو اس زد میں آیا، اب نوبت اخبارات ہی پر نہیں بلکہ اشخاص پر بھی پہنچی اور مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری غازی عبدالرحمن اور بعض دوسرے احرار پنجاب بھی ماخوذ ہوئے، اور آخر سزایاب بھی ہوئے، محمد علی نے اس نازک موقعہ پر رائے عامہ کی مخالفت کی اور اعلان کیا کہ "قصور قاضی کا نہیں قانون کا ہے" اس رائے کا ظاہر ہونا تھا کہ سارا اسلامی ہند آتش زیر پا کر دیا گیا کہ محمد علی اتنے مسلم آزار، ہندو پرست اور گورنمنٹ دوست ہیں کہ توہین رسول اکرم پر بھی اپنی ذہنیت سے باز نہیں آتے، بات چلتی ہوئی تھی عوام کے دل خوف وغصہ سے بھر دئے گئے تھے، اور بعض حریف تو ادھار کھائے محمد علی پر

بیٹھے ہوئے تھے، ان کی اس رائے کے خلاف خوب پروپیگنڈ کیا گیا، اور جتنے اتہامات لگائے جاسکتے تھے، سب لگائے گئے لیکن محمد علی ٹس سے مس نہیں ہوئے، انھوں نے ان تمام مخالفتوں اور شورشوں کا جواں ہمتی کے ساتھ مقابلہ کیا، اور یہی کہتے رہے کہ قصور قانون کا ہے قاضی کا نہیں اس لئے کہ قانون میں حقیقۃً اتنی لچک موجود ہے کہ راجپال سا مجرم چھوٹ سکتا ہے، لہذا ہماری کوششوں کا منتہائے مقصود یہ ہونا چاہئے کہ ہم ایک جدید قانون کا اضافہ کرائیں نہ یہ کہ دلیپ سنگھ کو مستعفی ہونے پر مجبور کریں، آج دلیپ سنگھ کو تم مستعفی ہونے پر مجبور بھی کر دو لیکن اس کی کیا ضمانت ہے کہ کل ان کی جگہ پر جو دوسرا جج آئے گا وہ یہی فیصلہ نہیں دے گا، جبکہ اس کی گنجایش قانون میں موجود ہے، لہذا اگر حقیقۃً تمھارے قلوب توہین رسول سے متاثر ہیں تو قانون بدلواؤ تاکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایسی گندہ ذہنیوں کا استیصال ہو جائے۔

شروع شروع میں محمد علی کی اس رائے کی سخت مخالفت ہوئی اور ان کے بڑے بڑے رفقا سخت برہم ہوئے اور نہایت دل شکن خطوط لکھے لیکن آخر میں سب نے محمد علی کی بارگاہ سیادت میں گھٹنے ٹیکے، سب نے اس کے نظریہ سے اتفاق کیا اور سب نے قانون بنوانے پر زور دیا۔

ہنگامہ نجد وحجاز اسی طرح آویزش نجد وحجاز کے زمانہ میں اسلامی ہند فوراً دو ٹکڑیوں میں تقسیم ہو گیا، ایک وہ جماعت تھی جو کہتی تھی ابن سعود قابل وار ہے، اور دوسرا وہ گروہ تھا جو اسے تائید وحمایت کا سزاوار سمجھتا تھا لیکن محمد علی نے اس فضائے عام کو بدلا اور کہا مخالفت ہر وقت ہو سکتی ہے لیکن اس موقعہ پر سلطان کی حمایت کر کے حجاز کو اور اسلامی مفاد کو جو فائدہ پہنچایا جا سکتا ہے وہ پھر نہیں حاصل ہو سکتا، اور واقعات بتاتے ہیں کہ اگر ایک مشہور "ٹولی" نے ابن سعود کو جادۂ حق سے گمراہ کرنے کی سعی مسلسل نہ کی ہوتی تو بلاشبہ آج حجاز پر موتمر عالم اسلام کا پرچم لہرا رہا ہوتا اور ابن سعود بجائے "ملک الحجاز و نجد وملحقاتہا" کے تمام عالم اسلام کے قلوب کا حکمراں ہوتا۔

قتل مرتد | قتل مرتد کے مسئلہ میں بھی محمد علی نے نہایت بصیرت اور تفقہ و تدبر کے ساتھ صرف عوام ہی کی نہیں بلکہ علماء کرام کی مخالفت کی، چنانچہ اپنے ایک خط میں جو قیصر کے ایک مدح خواں کو لکھا گیا تھا، لکھتے ہیں :

"مولنا عبدالباری صاحب اور مولنا حسین احمد صاحب کو لکھ رہا ہوں کہ بجائے علماء کرام کی طرح سب و شتم کے اور تکفیر کے تمام احادیث کو جمع کیجئے، اور سب فقہا کے استدلال کو بھی پیش کیجئے، قرآن سب سے پہلے رکھئے پھر تفاسیر، پھر احادیث پھر فقہا کی راؤں کو، پھر بحث فرمایئے، انشاء اللہ یہی رائے صحیح نکلے گی کہ قتل مرتد لا اکراہ فی الدین کے منافی اور حرام ہے، البتہ قتل محارب جائز اور بسا اوقات فرض ہے۔"

مسئلہ اقلیت | ہندوستانی سیاسیات میں سب سے زیادہ مختلف فیہ مسئلہ اقلیتوں کا ہے، اکثریت ابھی تک اس پر آمادہ نہیں ہوئی کہ وہ اقلیتوں کی حفاظت وصیانت حقوق کا کوئی تسلی بخش فیصلہ کرسکے لیکن محمد علی نے اس مسئلہ پر بھی اپنے غور و فکر سے ایک نئی راہ نکالی، ایک تو انھوں نے انتخابات کے لئے ہر فریق کے افراد کو جو امیدوار ہوں اس کا پابند بنانا چاہا کہ وہ اس وقت تک منتخب نہ سمجھے جائیں جب تک دوسری ملت کی ۲/۱ رائے نہ حاصل کرلیں اس طرح سے گویا محمد علی نے اس کا فیصلہ کردیا کہ کسی مجلس قانون ساز میں کوئی ایسا شخص جا ہی نہیں سکتا ہے جو ہر دو اقوام ہند کا معتمد علیہ نہ ہو، اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہمیشہ ایسے افراد منتخب ہوں گے جو صحیح سیاسی ذہنیت رکھتے ہوں گے، اور ایسے لوگ جنھوں نے فرقہ بندی کی آگ کو ہوا دی ہے، ان کو ہمیشہ ناکام و نامراد رکھنا پڑے گا۔

دوسرا طریقہ | اس قابل اطمینان تجویز کے بعد انھوں نے اقلیتوں کی حفاظت کا ایک نہایت

مفید طریقہ پیش کیا یعنی ہندوستان کے کسی ایک مقام پر مسلمان مجموعاً اور مجتمعاً آباد نہیں ہیں بلکہ تمام صوبوں میں پھیلے ہوئے ہیں، کسی صوبہ میں وہ ۲۰ فیصدی ہیں کسی میں ۱۰ فیصدی ہیں اور کسی صوبہ میں وہ ۹۰ فیصدی ہیں اور کسی صوبہ میں ۶۰ فیصدی یعنی بعض صوبوں میں اقلیت کی اکثریت ہو اور اکثریت میں اکثریت کی، تو اگر ہندوستان میں درحقیقت صلح وسلام کی فضا پیدا کرنا ہے تو بہترین لائحہ عمل یہ ہے:

"ایک ہی ملت ہر جگہ اقلیت میں نہ رہے، کہیں ایک کی اقلیت ہو تو کہیں دوسری کی۔"

یہ صورت ایسی ہو کہ ہر صاحب اکثریت مجلس قانون ساز مجبوراً اور فطرتاً دوسری اقلیت کا لحاظ کرے گی اور اگر نہیں کرے گی تو دوسرے صوبوں میں اس کی ہم قوم اقلیت کے ساتھ وہی سلوک ہوگا جو وہ دوسری قوم کی اقلیت کے ساتھ کر رہی ہے۔

محمد علی کی یہ اسکیم اگر عمل پذیر ہو سکتی تو یقیناً ایک بہترین ضمانت اور دستاویز صلح کا کام دے سکتی تھی لیکن افسوس ہے کہ مخصوص مصالح کی بنا پر نہ کانگرس اسے تسلیم کر سکی اور نہ مسلم کانفرنس اور خلافت کانفرنس نے اسے مطالبہ کی صورت میں پیش کیا۔

پہلے کیا؟ ۱۹۲۸ء میں ایک بار پھر استرداد نہرو رپورٹ کے بعد اسلامی ہند میں یہ سوال بڑے زور شور سے گشت لگاتا رہا کہ "تم پہلے کیا ہو، ہندوستانی یا مسلمان؟" جن میں مذہبیت کے اثرات زیادہ تھے انھوں نے اعلان کرنا شروع کیا کہ "ہم پہلے مسلمان ہیں پھر ہندوستانی" جو لوگ کانگرس کی وطنی تحریک سے دلچسپی وہمدردی رکھتے تھے، ان میں سے اکثر نے کہا "ہم پہلے ہندوستانی ہیں پھر مسلمان"، بعض مصلحت شناس حضرات ایسے تھے کہ خاموش رہے لیکن محمد علی نہ خاموش رہا اور نہ اس نے مقدم الذکر دونوں جماعتوں کی ہم آہنگی کی، اس نے کہا "میں مذہبی معاملات میں اول وآخر مسلمان ہوں اور مسلمان کے سوا کچھ نہیں، اور ہندوستانی

معاملات میں اول و آخر ہندوستانی ہوں اور اس کے علاوہ کچھ نہیں ۔"

بلاشبہ یہ الفاظ اسی شخص کی زبان حق ترجمان سے نکل سکتے تھے جس کا عمل بھی قول سے ہم آہنگ ہو جس کا دل ہندوستان کے معاملات پر بھی سب سے زیادہ بیقرار ہو جاتا ہو، اور جس کی روح عالم اسلام کے حادثات پر بھی تڑپنے لگتی ہو، اور کم از کم ہندوستان میں ایسا جامع الصفات صرف محمد علی تھا اور کوئی نہیں اس نے جو کچھ کہا اسے کرکے دکھایا، اسے ہندوستان سے عشق تھا اس لئے ہندوستان کے لئے اس نے ہر مصیبت اور ہر تکلیف کا بخندہ پیشانی مقابلہ کیا، اسے عالم اسلام سے الفت تھی، اس لئے دنیائے اسلام کے ہر حادثہ پر محمد علی کے تمام قوائے عمل میں ایک لہر دوڑ دوڑ گئی ۔

باب ۹

کردار

ہندوستان میں محمد علی سے زیادہ کوئی جنگ جو زعیم مشکل سے پیدا ہوا ہوگا۔ جب کبھی انھوں نے یہ دیکھا کہ باطل حق سے ٹکرا رہا ہے تو انھوں نے ذاتی تعلقات، خاندانی تعلقات اور سیاسی تعلقات کی مطلق پروا نہیں کی اور شمشیر بے نیام بن کر ہمیشہ وہ باطل کے سر پر صاعقۂ جانسوز بن کر چمکتے رہے، ان کی زندگی تمام تر "الحب للہ، والبغض للہ" کا ایک مکمل نمونہ تھی۔

لیکن بایں ہمہ اسلامی اخلاق و محبت کا سرچشمہ بھی ان کے سینہ میں لہریں لے رہا تھا، گو وہ مخالفت سے کبھی باز نہیں آئے لیکن دنیا نے یہ بھی دیکھا کہ اپنی زبردست اور مسلمہ مخالفت کے باوجود اپنے بڑے سے بڑے مخالف کی بھی موقعہ پر انھوں نے ہمدردی کی، غمگساری کی اور حمایت کی۔

خواجہ حسن نظامی کا واقعہ خواجہ حسن نظامی صاحب اور محمد علی کی مشہور عالم مخالفت اور سخت ترین مخالفت سے ایک زمانہ واقف ہے، محمد علی نے ان کی سیاسی اور تبلیغی زندگی پر سخت سے سخت نکتہ چینی کی لیکن جب خواجہ صاحب پر ایک وقت ایسا پڑا کہ اپنے بیگانے ہوگئے، خواجہ صاحب کے رسوخ اور اثر کے باوجود حکام اور گورنمنٹ نے نظریں پھیر لیں تو وہ محمد علی ہی تھا، جو خواجہ صاحب کا حامی بن کر میدان میں آیا، اجمال کی تفصیل یوں ہے۔

خواجہ حسن نظامی صاحب اپنے موٹر پر شام کو دہلی سے نظام الدین واپس آ رہے تھے جب اپنے مکان کے پاس پہنچے تو کسی شخص نے مسلسل پستول سے فیر کرنا شروع کیے حسن اتفاق

سے خواجہ صاحب تو بچ گئے، لیکن ان کے خسر صادق صاحب یا " بھائی سنو لیا "، پر گولیاں پڑیں اور بالآخر وہ انتقال فرما گئے۔

محمد علی اس وقوعہ کے روز تنازعات دیوبند کے سلسلہ میں دیوبند تشریف رکھتے تھے، وہیں انھوں نے اس واقعہ کو سنا اور فوراً ایک تار خواجہ صاحب کو دیا جس میں اپنی عمیق قلبی ہمدردی کا اظہار کیا، دوسرے روز واپسی پر وہ بنفس نفیس خواجہ صاحب کے دولتکدہ پر گئے اور ان سے زبانی تعزیت کی رسم ادا کی، اور انھیں تسکین و تسلی دی۔ خواجہ حسن نظامی صاحب بھی ان کی اس روش سے اتنے متاثر ہوئے کہ اپنے روزنامچہ میں " مسٹر " محمد علی کو " مولنا " لکھ کر انھوں نے اپنی دلی شکر گذاری کا اظہار کیا۔

معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا ہے بلکہ آگے بڑھتا ہے۔ خواجہ صاحب نے اس معاملہ کی تفتیش کرانی چاہی اور جس شخص پر شبہہ تھا اسے گرفتار کرا کے قانونی کارروائی کرانی چاہی، لیکن نہ معلوم کیوں پولیس نے تغافل اور تساہل سے کام لینا شروع کیا۔ خواجہ صاحب پولیس کی اس روش سے سخت ملول اور رنجیدہ تھے۔ انھیں اپنی جان کا بجا طور سے خطرہ نظر آرہا تھا، لیکن پولیس تھی کہ وہ کوئی اقدام کرنے پر آمادہ ہی نہیں ہوتی تھی۔

اس حالت میں محمد علی اگرچہ اس وقت تک پکے " نوچینجر " تھے لیکن پھر بھی انھوں نے ٹیلیفون پر گھنٹوں دہلی کے سپرنٹنڈنٹ پولیس کو سرزنش کی اور اس معاملہ میں پولیس کے تغافل کی سخت شکایت کی اور اس کے اس طرز عمل سے جو عواقب و نتائج پیدا ہونے والے تھے ان سے اسے آگاہ کیا، محمد علی کی اس بروقت تنبیہ سے پھر پولیس میں کچھ عرصہ کے لئے ایک حرکت پیدا ہو گئی۔

دوسرا واقعہ اسی طرح سوامی شردھانند کو دسمبر ۲۶ء میں جب ایک مسلمان نے قتل کر ڈالا

تو سارے ہندو پریس نے اس فعل کو شخصی نہیں بلکہ کسی "گہری سازش" کا نتیجہ بتایا اور اس گہری سازش کا اصلی کارکن سوامی جی کے مشہور حریف خواجہ حسن نظامی صاحب سے بڑھ کر اور کون ثابت کیا جاسکتا تھا چنانچہ تمام ہندو اخبارات نے خواجہ حسن نظامی صاحب پر طرح طرح کی نکتہ آفرینیاں شروع کر دیں یہ وقت بھی بہت نازک تھا اور چونکہ سوامی جی کا زخم ہندوؤں کے دلوں پر ابھی تازہ تھا اس لئے پورا اندیشہ تھا کہ کہیں خواجہ صاحب پر بھی اس قسم کی کوئی "خفیہ، گہری، سازش" نہ شروع ہو جائے اس وقت بھی محمد علی کا ہمت مردو تھا جس نے خواجہ صاحب کی حمایت کی اور کہا کہ یہ محض ظن باطل ہے کہ خواجہ صاحب کو اس قسم کی مفسدانہ تحریکوں میں شریک سمجھا جائے۔

ڈاکٹر کچلو کا ایک واقعہ | ۱۹۲۷ء کے اندور کے مشہور فساد کے بعد مسلمان جس طرح بیدردی سے ہدف بغض وحسد بنائے جارہے تھے، ایک دنیا کو اس کا علم ہے، دہلی کے مشہور بیرسٹر مسٹر آصف علی ایک گرانقدر معاوضہ پر مسلمانان دہلی کی طرف سے اندور بھیجے گئے تھے یا شاید بھیجے جانے کی تجویز تھی اور معاملات "طے" ہورہے تھے، اسی زمانہ میں ڈاکٹر کچلو صاحب مسلمان ملزمین کی پیروی اور صفائی کے لئے اندور تشریف لے گئے، ڈاکٹر صاحب کے جانے سے مسلمانوں کو بڑی تسکین ہوئی تھی، ڈاکٹر صاحب نے ماخوذین و ملزمین سے ملاقات کی، بیانات سنے، شاہدوں پر جرح کی اور مقدمہ کی تیاری و ترتیب میں مشغول ہوگئے کہ دفعتہً و بغتتہً اندور کے "مہاراجہ ہلکر" کا یہ حکم ڈاکٹر کچلو کو پہنچا کہ چوبیس گھنٹہ کے اندر اندور خالی کر دیجئے، اب ڈاکٹر صاحب نے چاہا کہ اندور سے نکل کر حدود ریزیڈنسی میں قیام فرما ہو کر اپنا کام جاری رکھیں، مگر یہاں بھی انھیں قیام کی اجازت نہیں ملی، مجبوراً وہ دہلی تشریف لائے اور محمد علی کو اپنی داستان درد سنائی، محمد علی اگرچہ تعلقات کی زنجیروں سے وابستہ تھے، یعنی اندور سے ان کے خاندانی تعلقات تھے اور پھر اسی زمانہ میں ان کے برادر نسبتی مسٹر معظم علی بیرسٹرایٹ لا سابق پرنسپل ڈھاکہ لا کالج، اس

"ٹریبونل"، کے ایک رکن تھے جو ماخوذین کے انفصال مقدمات کے لئے بیٹھا تھا، لیکن ان تمام تعلقات کی انھوں نے کوئی پروانہیں کی اور اسی وقت ایک ضمیمہ ہمدرد کا شائع کیا، اور اس میں ڈاکٹر کچلو کی حمایت کی، اور حکومت اندور کی حکمت عملی اور روش پر سخت نکتہ چینی کی، حالانکہ یہی محمد علی اس زمانہ میں بھی ڈاکٹر کچلو کے سخت ترین مخالف تھے اور ڈاکٹر صاحب کی تحریک تنظیم سے سخت بیزار، اور ان کی روش کو ہندوستان کے لئے سخت تباہ کن سمجھنے والے لیکن جب انھوں نے یہ دیکھا کہ حق ڈاکٹر کچلو کے ساتھ ہے تو اپنی گذشتہ اور موجودہ اور آئندہ کسی مخالفت کی پروانہیں کی، ان کی حمایت کی اور حکومت اندور کی سخت مذمت۔

ڈاکٹر عالم کا ایک واقعہ ڈاکٹر محمد عالم اور ان کی پارٹی سے صحیح معنوں میں ہم آہنگی تو محمد علی کو شاید کبھی بھی نہیں ہوئی، لیکن نہرو رپورٹ کے بعد سے اختلاف بہت زیادہ بڑھ گیا تھا، اور بعض مرتبہ تو ناگوار صورتیں بھی پیش آجاتی تھیں۔

ایک بار ڈاکٹر عالم لاہور سے کسی اور جگہ ایک تقریب کے سلسلہ میں مع اپنے اہل وعیال کے موٹر میں تشریف لیجا رہے تھے، سوء اتفاق کہ موٹر راستہ میں الٹ گئی، ڈاکٹر صاحب، ان کی اہلیہ اور ان کے صاحبزادہ سخت زخمی ہوئے اور ان کے صاحبزادہ کے اتالیق صاحب تو اتنے زخمی ہوئے کہ جاں بر نہ ہوسکے، اس حادثہ فاجعہ کا علم جب محمد علی کو ہوا، تو وہ بیتاب ہوگئے اور اسی روز مغرب کی نماز کے بعد ڈاکٹر عالم اور ان کے متعلقین کے لئے جامع مسجد میں خود دعا مانگی اور حاضرین سے آمین کہلوائی۔

ایک اور دعا پنجاب کے ایک دوسرے مشہور لیڈر کے لئے بھی محمد علی نے اپنے مجلس میں دعائیں مانگی تھیں کہ ان کی اصلاح حال ہوسکے، چنانچہ محمد علی اپنے ایک مکتوب میں انھیں لکھتے ہیں:-

"میں خدا کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ میں نے مولنا ابو الکلام کے لئے اور تمھارے لئے اور ایڈیٹر سیاست کے لئے جیل خانہ میں اکثر دعا مانگی ہے اور جہاں اپنے لئے اصلاح کی دعا کی ہر وہاں تمھارے لئے اور ان دونوں کے لئے بھی کہ خدا کرے آئندہ سب کے ساتھ مل کر کام کر سکیں، کسی کے کہنی مار کر آگے بڑھنے کا خیال دل میں نہ لائیں، کسی کی پگڑی اچھالنے کی فکر نہ کریں، اپنے ہی کام سے اپنا نام چاہیں، دوسروں کی رسوائی سے اپنی شہرت کے خواستگار نہ ہوں"

مہاراجہ بڑودہ کی حمایت ایک نہایت نازک موقعہ پر محمد علی نے مہاراجہ بڑودہ کی حمایت کی تھی، اور انھیں ایک نہایت سخت خطرہ سے نجات دلائی تھی، بہتر ہو کہ یہ داستان محمد علی کی زبان ہی سے سنئے:

"دہلی دربار کے موقعہ پر ایک نہایت سنگین اور خطرناک الزام مہاراجہ صاحب بڑودہ پر بادشاہ اور ملکہ کی اہانت کا لگایا گیا تھا، ملک بھر کے ایک اخبار نے بھی حق کی حمایت کی ہمت نہ کی اور تعجب ہے کہ کسی ہندو اخبار نے بھی آواز بلند نہ کی مگر میں حق نمک کے خیال سے بلکہ صرف حق حق کے خیال سے میں نے ہندوستان اور ولایت کے انگریزی اخباروں کا مقابلہ کیا اور لارڈ ہارڈنگ کے طرز عمل کو بھی ایک حد تک ذاتی غم و غصہ کا نتیجہ بتایا اور کلکتہ کے ایک انگریزی اخبار نے بھی میرے ہی کہنے پر مہاراجہ گیکواڑ کی تائید کی، اس کے صلہ میں مہاراجہ سے کچھ لینا تو درکنار، میں نے اسی وقت ان کی نوکری سے اس لئے کہ میں دو سال سے بلا تنخواہ رخصت پر تھا اور مہاراجہ صاحب کسی طرح استعفیٰ قبول نہ کرتے تھے استعفیٰ ہو گیا اور یہ کہہ کر ان کو اس کی منظوری پر بالآخر راضی

کرلیا کہ حکومت کے افراد کہیں گے کہ ایسے شخص کی رائے کی کیا وقعت ہے جو خود ریاست کا ملازم ہو"

اس سلسلہ میں سب سے آخری واقعہ فسادات بمبئی کا ہے۔

واقعہ بمبئی | اس واقعہ کی مختصر تفصیل یہ ہے کہ محمد علی کو ذیابیطس کی سخت شکایت تھی بعض احباب کے مشورہ اور شوکت صاحب کے اصرار سے محمد علی بمبئی کے ایک ہسپتال میں داخل ہو گئے ڈاکٹروں کی سخت تاکید یہ تھی کہ بستر سے ہلنا بھی خطرناک ہے جم کر علاج اگر نہیں کیا تو پیر کی ہڈیاں سڑ جائیں گی اور پھر لامحالہ کاٹی جائیں گی۔

یہ واقعہ فروری ۱۹۲۹ء کا ہے جب محمد علی کانگرس کے مخالف ہو چکے تھے اور ہندوؤں میں اور کانگرسی حلقوں میں پورے طور سے غیر ہر دلعزیز۔

محمد علی ہسپتال میں بستر علالت پر دراز ہیں، فساد کی اطلاع آتی ہے، اور تھوڑی دیر میں لاشیں آ رہی ہیں، زخمی آ رہے ہیں، کسی کا ہاتھ ٹوٹا ہوا ہے، کسی کا پیر جھول رہا ہے، غرض تھوڑی ہی دیر میں ہسپتال کے اندر ایک ہنگامہ دار و گیر برپا ہو گیا، ہندوستان کے مرد مجاہد سے کون یہ توقع کر سکتا تھا کہ وہ اپنی صحت کے خیال سے چارپائی پر پڑا رہے گا، وہ اٹھا، اپنی اسی حالت میں اٹھا اور موقعۂ واردات پر پہنچ گیا وہاں پہنچ کر کیا ہوا؟ اسے خود اس کی زبان سے سنئے:

"میں کماٹی پورہ میں گیا، اور مسلمانوں کی ہر گلی میں جا کر خدا و رسول کا ان کو واسطہ دیا اور ان کو مل والوں کے ظلم کی تقلید سے (بمبئی کے ملوں کے ہندو مزدوروں نے اس فساد میں مسلمانوں کو جانی و مالی بہت سخت نقصانات پہنچائے تھے) غرض روکا اور شرم دلائی، میں وہاں سے نکل ہی رہا تھا کہ ہندوؤں کی ایک جماعت

مسلمانوں کی طرف بڑھی، جب مسلمان اپنی گلیوں سے نکل کر اپنے ہم مذہبوں کی حمایت کے لئے آئے تو فوج کی طرف سے گولی چلنا شروع ہو گئی، گولی چل رہی تھی کہ سامنے سے ایک کچرے کی گاڑی والا اپنی گاڑی ہانکتا ہوا نکلا، اس پر چند مسلمانوں نے حملہ کیا، میں فوراً ٹیکسی سے کود پڑا اور ان حملہ آوروں کے پیچھے بھاگا، اور ان کو خدا اور رسول کا واسطہ دے کر منع کیا، اور اس ناکردہ گناہ کو مارے جانے سے بچایا۔"

یہ تھا محمد علی کا وہ کردار جو اس کے بعد ہندوستان کے کسی لیڈر، کسی زعیم اور کسی ناخدا کے ہاں نہیں ملتا، اگرچہ لیڈروں اور ناخداؤں کی کوئی کمی نہیں۔

باب ۱۰

عزم واستقلال

محمد علی کی طبیعت میں یہ بات بھی داخل تھی کہ جب وہ کسی بات کو طے کر لیتے تھے تو عزم استقلال کی ایک چٹان بن جاتے تھے، جو کبھی بھی اپنی جگہ سے جنبش نہ کرتی، احباب واعزہ لاکھ سمجھائیں، عواقب ونتائج ہزار بار اپنا بھیانک نقشہ پیش کریں، اور مآل اندیشی اور مصلحت بینی جس طرح بھی انھیں باز رکھنا چاہے، مگر وہ کبھی بھی ان موانع سے متاثر نہیں ہوئے اور جو کچھ طے کر لیا، اس پر اس وقت تک قائم رہے جب تک کر کے نہ دکھا دیا۔

ایک سخت مضمون میر محفوظ علی صاحب کا بیان ہے کہ:

"ارادے کی مضبوطی کا یہ حال تھا کہ جو بات غور وفکر کے بعد صحیح سمجھ کر طے کر لی اس سے تجاوز کرنا بعید از امکان" محمد علی نے "چوائس آف دی ٹرکس" کے عنوان سے وہ مضمون لکھا جو ان کی زندگی کے دریا کا رخ بدل دینے والا ہوا، راجہ (غلام حسین) مرحوم نے مضمون دیکھ کر حکیم (اجمل خاں) صاحب اور ڈاکٹر انصاری صاحب سے اس کا تذکرہ کیا، ڈاکٹر صاحب نے بھی مضمون پڑھ کر اور حکیم صاحب نے اس کا مطلب سن کر یہی رائے دی کہ مضمون اس وقت ہرگز نہ شائع کیا جائے مگر محمد علی کب ماننے والے تھے، راجہ بیچارہ نے گھبراہٹ میں مجھے بدایوں تار دیا کہ فوراً آؤ، میں پہنچا اور نرم الفاظ میں اپنی ہیچ میرزا رائے دی، مگر محمد علی نے ایک نہ سنی، جب میں نے زیادہ کہا تو کہنے لگے کہ میں

ڈاکٹر انصاری اور حکیم اجمل خاں کی مخالفت

جانتا ہوں کہ میں نے اپنی موت کے وارنٹ پر دستخط کئے ہیں، مگر اب میں
رائے قائم کر چکا اب کچھ نہیں ہو سکتا"

چھنڈواڑہ کا ایک واقعہ مسز بسنٹ وغیرہ کی رہائی کے بعد محمد علی کے نظربندی کے خلاف ملک میں سخت ہیجان پیدا ہوا اور وائسرائے پر بہت زور ڈالا گیا کہ علی برادران بھی رہا ہو جائیں مگر گورنمنٹ نے اس مطالبہ پر کوئی اقدام نہیں کیا، ہاں یہ ضرور ہوا کہ شیخ عبدالمجید صاحب سپرنٹنڈنٹ پولیس خفیہ، محمد علی کے پاس پہنچے اور ایک ایسا بیان لینا چاہا جس سے گورنمنٹ مطمئن ہو جائے اور وعدہ کیا کہ اگر انھوں نے اس قسم کا بیان دیدیا تو گورنمنٹ ان پر سے نظربندی کے قیود و پابندیاں اٹھالے گی، مگر استقلال کے اس کوہ وقار نے ایسا بیان دینے سے قطعاً انکار کر دیا۔ مختصراً یہ سمجھ لینا چاہیے کہ مسٹر جناح، مسٹر مظہر الحق، مہاراجہ صاحب محمود آباد اور دوسرے احباب نے لاکھ لاکھ کوششیں کیں مگر نہ گورنمنٹ بغیر اس مطلوبہ بیان کے نظربندی سے رہا کر سکی اور نہ علی برادران نے کوئی ایسا بیان دیا جس سے ان کی آزادی قلب و ضمیر مجروح ہوتی، اور ہنسی خوشی سے قید و بند کے مصائب پورے پانچ سال تک برداشت کئے اور ماتھے پر شکن تک نہ آنے دی۔

رحمت اللہ کمیشن ہز ہائنس بیگم صاحبہ بھوپال نے جب علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے نازک حالات دیکھ کر رحمت اللہ کمیشن کا تقرر کیا ہے تو محمد علی کے علیگڑھ سے ہمیشہ جو تعلقات رہے تھے، ان کی بنا پر محمد علی کے ہر دوست نے انھیں مجبور کیا کہ وہ کمیشن کے سامنے شہادت ضرور دیں، کہ اصلاح علیگڑھ کا اس سے بہتر موقع کوئی اور نہیں ہو سکتا، چنانچہ بعض "نوخیز علیگ" حضرات نے کمیشن کے سامنے شہادتیں دیں بھی لیکن محمد علی نے طے کر لیا تھا کہ وہ اس قسم کی چیزوں سے اپنے مسلک کے اعتبار سے تعاون نہیں کر سکتے، اس لئے کسی ترغیب اور تحریص سے وہ متاثر نہیں ہوئے

نواب صاحب اور ارکان کمیشن کی خواہش

حالانکہ نواب صاحب بھوپال کی مرضی اور کمیشن کی رائے یہی تھی کہ محمد علی کمیشن کے سامنے رائے ضرور دیں، اس موقع پر ایک اہم خط کا اقتباس غیر دلچسپ نہ ہوگا:

"میرا خیال ہے کہ اگر آپ بھی مسلم یونیورسٹی کمیشن میں شہادت دینے جاتے تو بہت اچھا ہوتا، ترک تعاون کی بحث سے قطع نظر کرکے محض تعلیمی اصول اور قانون کے نقائص پر آپ بحث کرتے، یہ موقع یونیورسٹی کی تعلیمی و اخلاقی اصلاح کا ہے، آپ کا علیگڑھ شہادت کے لئے جانا میرے خیال میں تو بہت ہی ضروری ہے، ہزہائنس نواب صاحب بہادر اور سر ابراہیم رحمت اللہ اور پروفیسر رحمٰن کا خیال ہے کہ اگر آپ شہادت دیں تو بہت ہی اچھا ہو"

ان تمام تحریکوں اور التجاؤں کے باوجود محمد علی کے فیصلہ میں کوئی تغیر نہیں ہوا۔

علی گڑھ جوبلی

ایک موقع اور بھی ایسا ہی سخت آزمائش کا انھیں پیش آیا تھا یعنی علیگڑھ کا پنجاہ سالہ جشن جوبلی، محمد علی کو علیگڑھ سے ہمیشہ سے جو الفت رہی تھی اس کا اقتضا یہ تھا کہ محمد علی اپنی مادر تعلیمی کے اس یادگار جشن میں شریک ہوتے لیکن اصول کا معاملہ یہاں بھی بہت سخت تھا اور یہ وہ چیز تھی جو محمد علی کو بہت مشکل سے ان کے عزم و ارادہ سے پھیر سکتی تھی۔

احسان صاحب کا خط

مسٹر احسان الحق بیرسٹرایٹ لا جج کیمبل پور، محمد علی کے بچپن کے ساتھی اور نہایت عزیز دوست ہیں، انھیں جب محمد علی کے اس عزم کی اطلاع ہوئی، تو لکھتے ہیں۔

"۱۸۹۸ء کے اولڈ بوائز ڈنر کے بعد، میں علیگڑھ نہیں گیا، کچھ واقعات ہی ایسے پیش آتے رہے اب جوبلی میں شامل ہونے کا ارادہ ہے معلوم ہوا ہے کہ تم علیگڑھ جانے پر رضامند نہیں یہ یاد رہے کہ اگر تم نہ گئے تو سیکڑوں اور بھی نہ جائینگے، ہم گمراہ سہی لیکن آخر ہم تمہارے ہیں اور تم ہمارے ہو"

باب ۱۱

مذہبیت

محمد علی کی سیاسی اور علمی زندگی کا ایک اہم جزو، ان کی غیر معمولی مذہبیت ہے، مذہب کا رنگ صحیح طور سے ان میں اتنا رچ گیا تھا، اور اسلام کی تعلیمات نے ان پر اپنا اتنا گہرا نقش قائم کر دیا تھا کہ وہ ایک مومن قانت کی طرح اپنی زندگی کا ہر پہلو، اور سیاسی پیچیدگیوں کا ہر مسئلہ مذہب کی روشنی میں دیکھتے تھے، اور اسی روشنی میں گام فرسا ہوتے تھے،

یہ عجیب بات ہے محمد علی ان لوگوں میں نہیں تھے جو ایک عرصہ دراز تک لا مذہب آشام رہے ہوں، اور پھر بعد کو سیاسی مصالح سے انھوں نے اپنے اوپر مذہبی رنگ چڑھا لیا ہو، بلکہ وہ بچپن سے مذہب کے والہ و شیدا تھے اور مذہبی احساس سے وہ کبھی بھی خالی نہیں رہے۔

سر یعقوب کا بیان سر یعقوب کا بیان ہے کہ:

"علی گڑھ کی طالب علمی کے زمانہ میں شوکت کے اثر اور ولایت جا کر وہاں کی فضا میں محمد علی پر ظاہری انگریزیت کا غلبہ تھا، سوٹ، بوٹ اور ہیٹ میں وہ بڑے چوکس رہتے تھے لیکن باوجود اس کے مذہبی عقائد میں وہ ہمیشہ سے مضبوط تھے، اور ولایت میں بھی انھوں نے کبھی رمضان کے روزے قضا نہیں کئے"

محمد علی کا بیان محمد علی خود اپنی مذہبی استقامت پر مصر تھے چنانچہ فتنہ شریف و ابن سعود کے زمانہ میں جب انھوں نے اپنے مرشد مولانا عبد الباری مرحوم سے اختلاف کیا، تو اپنی مذہبیت پر ان الفاظ میں اظہار خیال کیا:

"بحمداللہ میں مولنا صاحب کے ہاتھ پر بیعت کرنے سے پیشتر بھی مسلمان تھا، آج بھی مسلمان ہوں، اور انشاء اللہ ہمیشہ مسلمان رہوں گا، جب آٹھ برس علیگڑھ اور چار برس آکسفورڈ میں رہ کر مجھ میں کفر و الحاد نے سرایت نہ کی تو اب جبکہ اسلام کی خاطر میں نے علیگڑھ سے منہ موڑ لیا اور آکسفورڈ پر بھی لات مار دی، کیا خداوند کریم مجھے کفر و الحاد کی طرف لیجائے گا؟ اب تو یہی دعا ہے کہ مجھ سے سب بیزار ہو جائیں مگر تو اور تیرا رسول نہ بیزار ہوں، کسی سے نکث عہد ہو مگر تجھ سے اور تیرے رسول سے نہ ہو دنیا بھر کی بیعتیں فسخ ہو جائیں مگر وہ بیعت فسخ نہ ہو جو سب سے پہلی بیعت ہے، خداوندا! میں اقرار کرتا ہوں کہ میں تجھ سے راضی ہوں اور تیرے رسول پاک سے، تیرے قرآن سے اور تیرے رسول کی سنت سے۔ اے کاش تو اور تیرا رسول بھی مجھ سے راضی ہو جائیں۔"

مولنا عبدالماجد کا بیان مولنا عبدالماجد صاحب دریابادی کے ایک ضمنی بیان سے بھی محمد علی کی مذہبیت پر کافی روشنی پڑتی ہے، وہ فرماتے ہیں:

"۱۹۱۶ء میں راقم سطور کا ایک فلسفیانہ رسالہ انگریزی زبان میں شائع ہوا، چھنڈواڑہ کے اسیر فرنگ نے اس پر اپنے عنایت ناموں میں نہایت تفصیلی تبصرہ کیا، راقم پر اس وقت تک "عقلیت" کی لعنت مسلط تھی، اسے یہ دیکھ کر حیرت پر حیرت ہوتی تھی کہ کامریڈ کے ایڈیٹر کی ایک ایک سطر عشق رسول میں ڈوبی ہوئی ہے۔"

کراچی جیل میں داخلہ خوش قسمتی سے ہمیں محمد علی کی کراچی جیل کی ڈائری کے چند اوراق اور بعض دوسری ڈائریوں کے بھی چند اوراق مل گئے ہیں، جو اگرچہ اس لئے تشنہ ہے

جاسکتے ہیں کہ وہ بطور ڈائری ہی کے لکھے گئے تھے، کسی کو دکھانے کی غرض سے نہیں ضبط تحریر میں آئے تھے اس لئے بہت بے ترتیبی، بے پروائی اور صد درجہ شکستہ خط میں پنسل سے گھسیٹے گئے ہیں، تاہم کچھ نہ کچھ مواد حاصل ہی ہو گیا ہے، کراچی جیل میں جب محمد علی داخل ہوئے ہیں تو کہتے ہیں:

> "۔ بجے جیل میں داخل ہوا، رب ادخلنی مدخل صدق واخرجنی مخرج صدق واجعلنی من لدنک سلطاناً نصیرا، پڑھ کر داخل ہوا .. .. .. بستر وغیرہ جیل کا ہے، آتے ہی دو رکعت دوگانہ شکر پڑھی،"

پھر آگے چل کر دوسرے ورق پر:

> "نیند آرہی تھی مگر عشا کے خیال سے نہ سویا، عشا سے فارغ ہو کر لیٹا، رات کو پہرے والے چلاتے تھے، آنکھ کھل کھل جاتی تھی، غلام مجدد صاحب بزرگ ہیں، ہمت، حوصلہ، صبر، ضبط، سکون سب ہی کچھ ہے ......
> ..... شام کو ۵½ بجے بند ہوئے، کھانا رات کو نہ کھایا، عشا سے فارغ ہو کر رات کو سو گیا ۳½ بجے اٹھا، تہجد کی توفیق عطا ہوئی۔"

مفتی فلسطین کا انکشاف

سنت یوسفی کے پیرو اعظم کی زندگی کا یہ صفحہ ابھی ختم نہیں ہوا، بلکہ ایک سے ایک بڑھ کر واقعات سامنے آتے جا رہے ہیں، سب سے زیادہ قابل توجہ وہ واقعہ ہے جو مفتی فلسطین امین الحسینی صاحب نے ظاہر فرمایا ہے، اصل ماخذ نہ مل سکنے کے سبب یادداشت کے بھروسہ پر جس کی تفصیل یہ ہے کہ محمد علی شرکت موتمر کے لئے جب حجاز تشریف لے گئے ہیں تو ایک روز رات کو بہت دیر کے بعد امین الحسینی صاحب کا مسجد حرام کے اندر خانۂ کعبہ کے پاس گزر ہوا، تو دیکھتے کیا ہیں کہ رات کی اس تاریکی میں غلاف کعبہ پکڑے ہوئے

ایک شخص خانہ کعبہ میں، صاحب خانہ سے مصروف راز و نیاز ہے، اس کی آواز بیٹھی ہوئی ہے، گریہ گلوگیر ہے، گردن سجدہ میں جھکی ہوئی ہے اور وہ گڑگڑا کر، رو رو کر، عرض کر رہا ہے کہ اے کارساز عالم مجھے تو جہنم میں جھونک دے، میری کسی آرزو کو پورا نہ کر، لیکن ایک بار ان آنکھوں کے سامنے احیاء خلافت راشدہ کر کے وہ مبارک و مسعود زمانہ پھر واپس لادے جس کو کانوں نے سنا ہے مگر آنکھیں اب تک محروم ہیں، ہندوستان کو آزادی عطا فرما تاکہ وہ پنجۂ اغیار سے آزاد ہو کر اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکے،

مفتی صاحب کا بیان ہے کہ میں حیرت سے یہ عجیب و غریب منظر دیکھ رہا تھا جب اس شخص نے اپنی پیشانی سجدہ سے اٹھائی تو دیکھتا کیا ہوں وہ تو زعیم شرق محمد علی ہے جس کا نورانی چہرہ آنسوؤں سے تر ہے!

کتاب ”اجیال“ پر تاثرات اسی طرح جب وہ رسوائے عالم کتاب ”اجیال“ منظر عام پر آئی، تو محمد علی بیقرار و مضطر ہو گئے، اور اس قسم کی نوعیتوں کے انسداد کے لیے جو آئینی و قانونی معقول و سنجیدہ کوششیں وہ صرف کر سکتے تھے، وہ انھوں نے صرف کیں، لیکن اس واقعہ سے ان کے دل و دماغ پر بہت زیادہ اثر پڑا تھا چنانچہ ایک موقعہ پر اپنے تاثر کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> ”جہاں تک خود میرا تعلق ہے مجھے نہ قانون کی ضرورت ہے نہ عدالتوں کی حاجت اگر کوئی ہندوستانی بھائی اس قدر شقی القلب ہے کہ مجھ سے تو ایک معمولی جانور کا تقدس منوا کر اس سے متمتع ہونے کے حق سے میری دست برداری کا طالب ہے، لیکن انسان جو اشرف المخلوقات ہیں، ان میں سے سب سے اشرف نبی سرور کونین اور باعث تکوین دو عالم کا جو تقدس میرے دل میں کوٹ

کوٹ کر بھرا ہوا ہے، اس کا اتنا پاس بھی نہیں کرتا کہ اس برگزیدہ ہستی کی توہین کرکے میرے
قلب کو چور چور کرنے سے احتراز کرے تو ہندوستان کو اس غلامی سے نکالنے کے لئے جس
میں آج وہ مبتلا ہے اور جو گاؤ پرست ہندوؤں کے وجود سے کہیں زیادہ ہمارے مذہب اور ہماری
ملت کی بے حرمتی کا سبب ہے، مجھ سے جہاں تک صبر ہو سکے گا صبر کروں گا اور جب صبر کا جام
لبریز ہو جائے گا تو اٹھوں گا اور یا تو اس گندہ دل، گندہ دماغ، گندہ دہن کافر کی جان خود
لے لوں گا یا اپنی جان اس کوشش میں کھو دوں گا۔"

اس موقعہ پر یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ محمد علی اپنی قابل فخر و رشک مذہبیت
اور صداقت کا اس وقت اعلان کر رہے ہیں جبکہ وہ پکے کانگرسی ہیں، اور یہ وہ زمانہ ہے کہ
اس فتنہ پر بڑے بڑے لوگوں کی زبانیں گنگ تھیں، محمد علی کے علاوہ اسلامی ہند کے سنجیدہ
متین اور بہترین زعما قفل خاموشی لگائے بیٹھے تھے، اسی طرح ہندوؤں کی بھی یہی حالت
ہو رہی تھی، یہاں تک کہ ایک بار اتفاقاً ایسوشی ایٹیڈ پریس کا نمائندہ پنڈت موتی لال نہرو
کے پاس پہنچ گیا اور اس نے اس مسئلہ پر ان کی رائے مانگی تو پنڈت جی نے اس مسئلہ پر
لب کشائی کرنے سے قطعاً انکار کر دیا،

پارلیمنٹ کی گیلری میں نماز

سنہ ۲۸ء میں جب محمد علی بغرض علاج یورپ گئے ہیں تو
کچھ عرصہ تک علاج کرنے کے بعد وہ کچھ دنوں کے لئے انگلینڈ بھی چلے گئے تھے، وہاں ایک
بار پارلیمنٹ کے وزیٹرس گیلری میں بیٹھے ہوئے کارروائی کا مطالعہ کر رہے تھے کہ نماز
کا وقت آگیا، اسی وقت وہ محمد کا ہمنام اور اللہ کا غلام اٹھا، گیلری کے ایک گوشہ میں اپنی
عبا بچھائی اور ماسوا اللہ سے بے نیاز و مستغنی ہو کر، اللہ کی طرف متوجہ ہو گیا، لوگوں نے اس واقعہ
کو بہت تعجب سے دیکھا، لندن کے ایک اخبار نے اس واقعہ کو شائع کیا تھا کہ آج ایک آدمی

سے یہ "حرکت" سرزد ہوئی، محمد علی کے شناسا سمجھ گئے کہ وہ "آدمی" محمد علی کے سوا کون ہوسکتا ہے؟ واپسی پر "سچ" کے محترم اڈیٹر نے اس کی تصدیق چاہی تو محمد علی نے اعتراف کیا کہ وہ "آدمی" وہی تھے!

خود ہندوستان میں ان کے دیکھنے والوں نے اکثر دیکھا ہے کہ خلافت کانفرنس ہو رہی ہو، یا کانگرس، مسلم لیگ ہو رہی ہو یا کوئی اور مجلس، نماز کا وقت آیا اور محمد علی نے ڈائس کے ایک گوشہ پر اپنی عبا بچھائی، اور نماز پڑھ لی، "خندۂ اہل جہاں" اور "انگشت نمائی احباب" کا اس نے کبھی بھی خیال نہیں کیا۔

ایک مذہبی اصلاحی تحریک یہ تو تھا ان کا ذاتی جذبۂ عمل لیکن اگر کوئی تحریک مذہبی حیثیت سے یا کسی اور خاص حیثیت سے انھیں مفید نظر آتی تھی تو ہمدرد اور کامریڈ کے صفحات اس کے لئے وقف کر دیتے تھے اور خود بھی جہاں تک ہو سکتا تھا، مدد کرتے تھے، ایک بار حسن نظامی صاحب نے ایک مفید اصلاحی کام شروع کیا، یعنی انسداد آتشبازی، محمد علی کو اس معاملہ میں مسلمانوں کی بے راہ روی کا احساس تھا اور وہ جانتے تھے کہ اس لغو رسم کو مذہب کا جھوٹا نام دے کر کس طرح مسلمانوں کا لاکھوں بلکہ کروڑوں روپیہ برباد ہوتا ہے، اس لئے وہ تن، من، دھن ہر طرح سے خواجہ صاحب کے معاون ثابت ہوئے، ہمدرد کے سب اڈیٹر کو انھوں نے حکم دیا کہ خواجہ صاحب کے اس قسم کے تمام اصلاحی اعلانات و اشتہارات اور پوسٹر ہمدرد میں بلا معاوضہ شائع ہوں، نیز دہلی خلافت کمیٹی کو خواجہ صاحب کے اس نیک کام کی حمایت کے لئے وقف کر دیا، کہا جا سکتا ہے کہ اگر دہلی خلافت کمیٹی کی امداد شامل نہ ہوتی تو خواجہ صاحب کو اتنی غیر معمولی کامیابی نہ حاصل ہوتی۔

اور پھر خواجہ صاحب کی دلچسپ اور جدت آفریں طبیعت نے ایک اور تجویز آتشبازی کے

جنازہ کی پیش کی تو بقول خواجہ صاحب محمد علی نے اس کی بھی حمایت کی اور خود اس جلسہ اور جلوس میں شریک ہوئے جو اس جنازہ کو جمنا کے کنارہ دفن کرنے گیا تھا۔

تنازعۂ دیوبند اسی طرح اسلامی ہند کے مشہور دارالعلوم دیوبند میں جب اختلاف و شقاق پیدا ہوا تو محمد علی نے اپنی تمام سیاسی مشغولیتوں کے باوجود وقت نکالا اور خود دیوبند پہنچے حالات کا معائنہ کیا اور صحیح معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی، اور اس سعی مسعود میں لگے رہے کہ ہو سکے تو جانبین میں صلح کرا دی جائے۔

برلن کی مسجد ۱۹۲۸ء میں جب وہ یورپ گئے ہیں تو اپنی علالت کے باوجود برلن کی مشہور مسجد کو دیکھنے تشریف لے گئے اور وہاں اسلام و ہندوستان پر لیکچر دیا، حالانکہ ان کی حالت کا اقتضا یہ تھا کہ وہ پورے طور سے سکون و اطمینان کے ساتھ آرام کریں لیکن اس قسم کے مواقع جب انھیں مل جاتے تھے تو وہ کب چھوڑتے تھے۔

دعا ہمدرد کی نشأۃ ثانیہ کے موقعہ پر محمد علی نے جو دعا مانگی ہے وہ ان کی خالص مذہبیت اور غیر معمولی خشیت باللہ کا نہایت کامیاب نمونہ ہے، ادب و انشا اور درد و اثر کے اعتبار سے بھی اس دعا کو خاصی اہمیت حاصل ہے، دعا تو بہت طویل ہے اس لئے مجبوراً "قاش ہائے دل" میں سے بھی انتخاب کرنا پڑتا ہے، ملاحظہ ہو:-

> "اے رب ذوالجلال، اے وہ کہ تیری لطف فرمائی اور کرم گستری کے بغیر ارادے ناکام، حوصلے پست، اور آرزوئیں صحرائے نامرادی میں تشنۂ تکمیل رہتی ہیں، تیرا ایک عاجز و خطاکار بندہ محمد علی تیرے حضور میں حاضر ہوا ہے کہ دل کی تڑپ اور روح کی بے چینی کے ساتھ دستِ دعا دراز کرے ......
>
> میں تو ایک گدائے بے نوا ہوں، ساز و سامان کی جگہ بے سروسامانی کے

گرداب میں پھنسا ہوا ہوں، میرے پاس تو اگر کوئی پونجی ہے تو صرف اس قدر
کہ دل میں چند ارمان اور دماغ میں چند افکار ہیں، اس کے سوا نہ کوئی ساز
رکھتا ہوں نہ سامان، پھر اے عطا بار و خطا پوش خدائے رحمٰن و رحیم میرے
لئے یہ کیونکر ممکن ہو کہ تجھ سے بے نیاز ہو جاؤں جبکہ ہر نیاز مند کا مرکز ناز تو
ہی ہے .... میرے سامنے کنعاں کے مقدس و محترم قیدی
کی پوری تاریخ تھی اور جانتا تھا کہ تو قید و بند کی سختیوں کو بادشاہت کے
جلال و جبروت سے بھی بدل سکتا ہو، اسی لئے جب قید فرنگ پر قید تنہائی متزاد
کی گئی تو میں نے پورے غرور اور گھمنڈ کے ساتھ عرض کیا تھا کیونکہ اس تاریک
کوٹھری میں بھی تو ساتھ تھا،

ہو متزاد قید پہ تنہائی بھی تو کیا ہے بات جب کہ یاد خدا بھی نہ آسکے
اگلا سا زور شور جنوں میں نہ ہو مگر اتنا تو ہے کہ عرش کو اب بھی ہلا سکے

.... میں اپنی چھوٹی سی پونجی لے کر بازار جہاں میں نکلا ہوں جو
چند ارادوں اور چند افکار سے زیادہ نہیں، اس کے سوا میرے ہاتھ خالی
ہیں نہ تو میری جیب میں دولت ہو جس کا مجھے غرور ہو، نہ میرے پاس طاقت
ہے جس کا مجھے گھمنڈ ہو، نہ اعوان و انصار کی کوئی فوج ہے جس کا بھروسہ
ہو، باوجود ان بے سروسامانیوں کے ایک تیرا وجود ہو جس پر مجھے بھروسہ
اور ایک تیری ذات ہو جس پر تکیہ اور سہارا ہے اور یہ اتنا بڑا بھروسہ اور سہارا
ہے کہ اگر دنیا کی ہر ایک چیز مجھ سے چھین لی جائے، میرا تمام ساز و سامان
بے سروسامانیوں سے بدل دیا جائے، اور میں دنیا سے اور دنیا مجھ سے

باب ۱۲

شوخیٔ طبع، نفاستِ ذوق، نکتہ رسی اور اقوال نادرہ

محمد علی اپنی مسلمہ قیادت، اور مشہور مذہبیت کے سبب ایک "عبوسا قمطریرا"، بنے ہوئے، ہر شخص کو نگاہ خشم آلود سے دیکھنے والے لیڈر نہیں تھے، بلکہ ان کے پہلو میں ایک شوخ دل تھا، وہ خود لطائف و ظرائف کے خوگر تھے اور دوسروں کی پر لطف باتوں سے محظوظ ہونا جانتے تھے۔ وہ ایک پاکیزہ ذوق کے مالک تھے، اس لئے آرٹ اور فنون لطیفہ کے قدر دان تھے، وہ چونکہ ایک بلند تر دل و دماغ کے مالک تھے اس لئے ان کی زبان سے ایسے آبدار کلمے بھی نکل جاتے ہیں جو ضرب الامثال کا کام دے سکتے ہیں اور اپنی گیرائی مفہوم اور وسعت خیال کے اعتبار سے اس قابل ہیں کہ ان کو سمجھا جائے، اور ان کی وسعتوں پر عمل کرنے کی کوشش کی جائے۔

ہم کوشش کریں گے کہ محمد علی کے ان خصوصیات پر بھی کچھ روشنی ڈال سکیں۔

ضیاء الدین برنی کا بیان مسٹر ضیاء الدین برنی محمد علی کا ایک دلچسپ واقعہ بیان کرتے ہیں کہ:

"مسجد کانپور کی ایجی ٹیشن کے زمانہ میں ایک مرتبہ علامہ شبلی مرحوم دہلی تشریف لائے، مولانا محمد علی نے شب کی دعوت ان کے اعزاز میں کی، بہت سے اصحاب مدعو تھے، سب کی فرمائش سے علامۂ موصوف نے اپنی چند رباعیات

سنائیں جو سب کی سب کانپور کے واقعہ ہائلہ سے متعلق تھیں، اس کے بعد علامہ موصوف نے مولانا محمد علی کی ساعی کا ذکر اپنے مخصوص انداز میں کیا، جو وہ کانپور کی مسجد کی بحالی کے لئے کر رہے تھے، پھر چند تاریخی مثالیں پیش کر کے فرمایا کہ میں نے جن جن اشخاص کے ناموں میں محمد اور علی کا اجتماع دیکھا ہے انھیں ہمیشہ ممتاز پایا، محمد علی نہایت خاموشی سے پہلے تو اپنی تعریف کو سنا کئے اور پھر یوں گویا ہوئے کہ "محمد علی، والی ایران کو شاید آپ بھول گئے؟ اس پر قہقہہ بھی ہوا"

ایک اور لطیفہ | مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی ایک اور حد درجہ دلچسپ لطیفہ کی روایت فرماتے ہیں:

حکیم اجمل خاں مرحوم نے ایک بار خلافت کمیٹی کی مجلس مرکزیہ کے جلسہ کے موقع پر رہنمایان خلافت کو اپنے ہاں مدعو فرمایا، محمد علی بھی تھے، دوسرے رہنمایان خلافت بھی اور بعض احرار پنجاب بھی، حکیم صاحب نے مہمانوں کی تربوزے بھی تواضع فرمائی تھی، تربوز تمام حاضرین نے بالاتفاق پسند کیا، اور اسی کی تعریف ہونے لگی، ایک صاحب نے فرمایا، دہلی کے تربوز بہت اچھے ہوتے ہیں، محمد علی نے اپنے ایک پنجابی دوست اور لیڈر کی طرف دیکھ کر کہا لیکن پنجاب کے "خر" بوزہ بھی بہت اچھے ہوتے ہیں، اس پر ایک فرمائشی قہقہہ پڑا۔

"پینے" کی دیر | ایک مرتبہ ایک سخت نزاع کے موقع پر ایک مختصر جلسہ شوریٰ منعقد تھا، موضوع بحث ایسا مختلف فیہ مسئلہ تھا کہ گفتگو بڑھتی گئی، رات بڑھتی گئی، مگر اختلاف کم نہ ہوا، آخر ہندوستان کے ایک مشہور لیڈر کھڑے ہوئے اور انھوں نے تحریک فرمائی کہ چونکہ رات زیادہ ہو چکی ہے اور کھانے کو دیر بھی ہو رہی ہے، اس لئے اب جلسہ ملتوی کر دیا جائے، محمد علی نے

ہوگئی، محمد علی کے ڈرائنگ روم میں جو صاحب نظر اسے دیکھتا تھا ممکن نہ تھا کہ ایک گرم آنسو، یا ایک ٹھنڈی سانس اسے بطور خراج نہ پیش کرتا۔"

نکتہ رسی | محمد علی نے بہت نکتہ رس طبیعت پائی تھی، جس فن سے انھیں کوئی خاص لگاؤ نہیں ہوتا تھا اس میں بھی اپنی طبیعت کی رسائی کا اتنا نادر نمونہ پیش کرتے تھے کہ لوگ دنگ رہ جاتے تھے مثلاً قانون میں انھیں کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی، لیکن خواجہ حسن نظامی صاحب ایک دلچسپ روایت

خواجہ حسن نظامی کی روایت | یہ کرتے ہیں کہ:

"مولانا محمد علی صاحب نے ایک نہایت دلچسپ قانونی بات پیدا کی کہ یہ واقعہ[1] شہادت کی دفعہ میں آتا ہے، کہ مسجد کے اوپر لفظ اللہ، اسلام کی شہادت دے رہا تھا، اس کو مٹا کر "اوم"، لکھا گیا، گویا ایک شہادت بدل کر دوسری شہادت پیش کی گئی، اس لئے اس پر شہادت بدلنے کا جرم عائد ہوتا ہے، حاضرین اس عجیب نکتہ آفرینی سے پھڑک گئے، میں نے کہا ہم کو اسی واسطے آپ جیسے لیڈر کی ضرورت ہے، مولانا محمد علی کا دماغ کیسا لاجواب ہے، وہ آج کی باتوں سے معلوم ہوا۔"

اقوال و حکم | محمد علی کی زبان سے بیساختہ ایسے مختصر سے جملے نکل جاتے تھے جو ایک مستقل حیثیت رکھتے ہیں، اور اپنے اختصار کے باوجود اتنا بلند مفہوم، اور اتنی گیرائی و وسعت رکھتے ہیں کہ اس قابل ہیں کہ انھیں ہمیشہ یاد رکھا جائے۔

جدید طریقۂ علاج | سشن سپرد ہونے سے پیشتر محمد علی نے مجسٹریٹ کے روبرو کتنی حکیمانہ

---

[1] واقعہ یہ تھا کہ قلعہ کے پاس ایک مسجد تھی، اسے ہندوؤں نے "اپنا لیا" تھا، اس کے کتبہ کو مٹا کر دوسرا پتھر لگا دیا تھا جس پر "اوم"، لکھ دیا تھا، دہلی کے مسلمانوں میں اس سے بہت ہیجان پیدا ہوا تھا۔ (مؤلف)

بات فرمائی کہ

"ایک طریقۂ علاج یہ ہے کہ جو مرض ہو، اس کا اسی مرض سے علاج کرنا چاہئے ہندوستان کو بدیسی سوت اور کپڑے نے غلام بنایا ہے، لہذا اگر ہم اپنے چرخے اور کرگھے سنبھال لیں تو ہماری آزادی کے لئے یہی کافی ہے۔"

سوراج کی تشریح | مجسٹریٹ ہی کے روبرو اپنے بیان میں فرماتے ہیں کہ

"سوراج کا مقصد Servo No Raj ہے یعنی کسی حکومت کی تابعداری نہ کرنا۔"

تشدد اور عدم تشدد | ۱۹۲۳ء میں ایک موقعہ پر محمد علی نے فرمایا تھا کہ:

"غضبناک مجمعوں کا تشدد ایک طرف رکھو اور ان قوانین کو دوسری طرف رکھو جن سے قوم کو غلام بنایا جا رہا ہے تو میں کہوں گا کہ باوجود اس کے کہ مجھے تشدد سے نفرت ہے لیکن میں قیامت کے روز عرش الٰہی کے نیچے تشدد کے مجرم کی حیثیت سے کھڑا ہونا پسند کروں گا، بہ نسبت اس کے کہ نامردانہ اطاعت کے جرم کا ارتکاب کروں۔"

وزیر ہند کے نام مکتوب | مسٹر ویجوڈ بن وزیر ہند کو اپنے خط میں فرماتے ہیں

"میری گفت و شنید کی ناکامی کے بعد، جنگ ممکن ہو سکتی ہے، لیکن جنگ کی سرگرمی ناکام رہے تو پھر صلح غیر ممکن ہو جاتی ہے۔"

ایک اہم تقریر | ۲۰ر اکتوبر ۱۹۲۰ء کو لاہور کے ایک عظیم الشان جلسہ میں تقریر فرماتے ہوئے محمد علی نے اپنی قوم کو نصیحت کی:

"اپنا جوش اس قدر دریا دلی سے خرچ نہ کرو، ہمیں اتنا بڑا شعلہ نہیں چاہئے

جو ایک ہی دفعہ بھڑک کر ختم ہو جائے، نہیں تو وہ ٹمٹماتا ہوا چراغ چاہیے جو ساری اندھیری رات میں روشنی دے، تاوقتیکہ (سوراج) کا آفتاب نہ طلوع ہو جائے۔"

اچھا وکیل | اپنی کراچی جیل کی ڈائری میں تحریر فرماتے ہیں:

"سپرنٹنڈنٹ آکر ایک تحریر سنا گیا کہ ۲۶ کو مقدمہ ہے تیار ہو جاؤ، الحمد للہ اس کی ضرورت ہی نہیں، ضرورت اس کو ہو جو پیروی مقدمہ کرے، ہم کو تو اللہ سا "نعم الوکیل" چاہیے۔"

باب ۱۳

قومیت اور ملیت

ہندوستانی سیاسیات میں قومیت اور ملیت کا مسئلہ بیحد نازک ہے، عام طور پر سیاسیین ہند کے اس بارہ میں دو گروہ ہیں، ایک وہ ہے جو ملیت کا حامی ہے اور اسے مدارج حیات کے ارتقا و استحکام کے لئے بطور اساس کے تصور کرتا ہے، دوسرا وہ گروہ ہے جو ملیت کے نام سے بیزار ہے اور وطنیت کا عاشق ہے، اس کے نزدیک ملیت ایک ایسا بے معنی مہمل اور لغو مفہوم ہے۔ جس کی متنور الفکر انسانوں کو ضرورت ہی نہیں یہ تو پست خیالی، دون ہمتی اور تنگ نظری کا حاصل ہے، لہذا جس قدر جلد ممکن ہو سکے اس لفظ کو ہندوستان کے سیاسی لغت سے خارج کر دینا چاہیئے۔

دلیل اس کی یہ ہے کہ ملیت ایک ایسی چیز ہے جو ہر آن، ہر لمحہ اور ہر وقت تبدیل کی جا سکتی ہے، لیکن وطنیت ایک ایسا جوا ہے جو اگر انسان کی گردن میں پڑ گیا تو ایسا "گلوگیر" ہوتا ہے کہ کبھی بھی نہیں نکل سکتا، اس لئے ہمیں وطنیت کی تو پرستش کرنی چاہیئے لیکن ملیت کے بت کو چکنا چور کر دینا چاہیئے۔

محمد علی پہلے گروہ کے ہمنوا تھے، وہ سمجھتے تھے کہ انسانی ترقی و تکمیل کے لئے یہی پابندی ایک اہم پابندی ہے، اور جغرافی حدود کا پابند ہو جانا اور محض اس لئے کہ ایک شخص کا ایک مخصوص خطۂ ارض سے کوئی تعلق نہیں ہے، اس لئے اسے ناقابل معافی مجرم سمجھ لینا غلطی ہے، وطنیت کے جنون نے لوگوں کی آنکھوں پر ایک پردہ ڈال دیا ہے جس سے وہ حقائق

کا مطالعہ اور معائنہ نہیں کر سکتے، ان کا خیال تھا کہ ملیت کی مخالفت کرنا بالکل ایسا ہے جیسے کوئی شخص اس کی مخالفت کرنے لگے کہ تم اپنے خاندان، اپنے کنبہ اور اپنے "عائلہ" سے دستبردار ہو جاؤ، یہ وطن پروری اور وطنیت نہیں ہوئی بلکہ ایک ایسا مراق جس کا علاج نہ لقمان کے پاس تھا اور نہ موجودہ زمانہ کے کسی "مسیح الملک" یا "شفاء الملک" کے پاس۔

اپنے خیالات کا اظہار اس باب خاص میں اُنھوں نے متعدد بار فرمایا ہے۔

خلافت کانفرنس میں تقریر خلافت کانفرنس کلکتہ کی صدارت فرماتے ہوئے انھوں نے فرمایا کہ:

"میں انسانیت کا قائل ہوں، وطنیت کا نہیں، خدا نے انسان کو بنایا اور شیطان نے انسان کو مختلف جماعتوں میں متفرق اور منقسم کر دیا۔"

گول میز کانفرنس میں اظہار خیال اسی طرح گول میز کانفرنس میں انھوں نے بلا تامل اور بلا تذبذب اپنے خیال کا اس باب میں اعلان فرما دیا کہ:

"میں کہتا ہوں کہ خدا نے انسان کو بنایا اور شیطان نے قوموں کو، قومیت، وطنیت، انسانوں کو ایک دوسرے سے جدا کر دیتی ہے، لیکن مذہب انسانوں کو ایک دوسرے سے وابستہ کرتا ہے۔"

انڈین نیشنل یونین پر تنقید پنڈت موتی لال نہرو نے ۱۹۲۸ء میں "انڈین نیشنل یونین" کے نام سے ایک جدید انجمن کی تاسیس کرنا چاہی تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ تمام فرقہ وارانہ انجمنوں سے مستعفی ہو کر اس کی ممبری کا فخر حاصل کیا جا سکتا ہے، محمد علی نے اس پر کتنی سچی تنقید کی ہے کہ:

"بے سوچے سمجھے، کمال تعمیم کے ساتھ یہ کہہ دینا کہ "کمیونلزم" یا ملیت "نیشنلزم" یا قومیت کے منافی ہے، اس سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا کہ کوئی شخص قوم

پروری کے جوش میں لوگوں کو اپنے کنبہ اور خاندان کی پرورش اور ان کی تنظیم سے منع کرتا پھرے، قومیت کو انتہائے نظر بنانا یورپ کی تقلید جامد ہے اور وطنیت خود "وثنیت" یعنی بت پرستی ہے، اسلام وطن پرور ہے مگر وطن پرست نہیں"

"اسلام وطن پرور ہے مگر وطن پرست نہیں" کتنا جامع اور کتنا صحیح خیال ہے؛ اور یہی وہ مستقل نظریہ تھا، جس کی محمد علی ہر وقت، ہر موقعہ اور ہر اسٹیج پر تبلیغ کیا کرتے تھے، خواہ وہ گول میز کانفرنس ہو خواہ کانگرس کمیٹی کا اسٹیج، خواہ خلافت کانفرنس کا پنڈال ہو خواہ مسلم لیگ کا ہال۔

باب ۱۴

وطن پروری

سطور بالا سے یہ غلط فہمی نہ ہونا چاہئے کہ محمد علی کا دل اگر وطن پرستی سے خالی تھا تو وطن پروری بھی اس کے جذبہ عمل سے خارج تھی۔

محمد علی یقیناً وطن پرست کسی معنی میں بھی نہیں تھا، ہاں وہ وطن پرور تھا اور اتنا صحیح الخیال وطن پرور کہ وطنیت کی قبا پہنے ہوئے اس وقت جو لوگ نظر آرہے ہیں ان سے کسی حالت میں اور کسی درجہ میں بھی وہ کم نہ تھا، وطن کے لئے اس کا دل اسی طرح کڑھتا تھا جس طرح ہندوستان کے کسی بڑے سے بڑے "مہاتما" کا کڑھ سکتا ہے، وطن کے لئے وہ اسی طرح سرکف تھا جس طرح کوئی بڑے سے بڑا وطن پرست ہر آن اپنا سر ہتھیلی پر لئے رہتا ہو اور وطنی خدمت اس نے اسی طرح کی جس طرح اس جیسے بطل حریت سے توقع ہو سکتی تھی۔

سائمن کمیشن | سائمن کمیشن کے زمانہ میں محمد علی نے جو انتھک کوششیں کیں وہ کبھی بھی فراموش نہیں ہو سکتیں، اس نے سارے ملک کا دورہ کیا، مقالات و مضامین لکھے، دوستوں کی مخالفت اور "ہم وطنوں" کے سب و شتم کو برداشت کیا اور اپنی پوری کوشش صرف کر دی کہ سائمن کمیشن سے تعاون نہ ہونے پائے۔

افغانستان کا حملہ | اپنی مسلمہ مذہبیت کے باوجود جب انڈپینڈنٹ کے نمائندہ نے محمد علی سے استفسار کیا کہ اگر امیر کابل ہندوستان پر حملہ آور ہوں تو آپ کی روش کیا ہو گی؟ اس نے صاف جواب دیا کہ اگر امیر کابل ہندوستان پر اس لئے حملہ آور ہوں کہ ہندوستانیوں کو انگریزوں

کی غلامی کی لعنت سے نجات دلائیں، تو میں ان کی مدد کروں گا، لیکن اگر ان کی یہ نیت ہو کہ وہ ہندوستان کو اپنا غلام بنالیں اور یہاں اپنی حکومت قائم کریں تو میں ان کی مدد نہیں کرونگا بلکہ ان کے خلاف صف آرا ہو کر ان کا مقابلہ کروں گا، اور اپنے وطن کو کسی غیر کا غلام نہ ہونے دوں گا،

جنگ چین | اسی طرح چند سال پیشتر ۱۹۲۶ء میں یہ اندیشہ ہو چلا تھا کہ برطانیہ اور چین میں جنگ ہوا چاہتی ہے اور برطانیہ نے کارروائی کا آغاز بھی کر دیا تھا، یعنی کچھ فوج روانہ کر دی تھی اور کچھ روانہ ہونے والی تھی تو محمد علی پھر اپنی پوری طاقت کے ساتھ رونما ہوا، کانگرس نے برطانیہ کی اس روش کے خلاف جو تجویز پاس کی تھی، محمد علی نے اس کی تائید کی، حمایت کی اور اپنی ساری طاقت اس پر صرف کر دی کہ ہندوستانی فوجیں، برطانوی "امپریلیزم" کا شکار ہونے چین کے میدان میں نہ جائیں، محمد علی نے خلافت کمیٹی کی طرف سے مسٹر شعیب قریشی کی اس آمادگی کا خیر مقدم کیا جب وہ اپنی خدمات اس لئے پیش کر رہے تھے کہ چین تشریف لیجائیں اور مجروحین و مقتولین کی دیکھ بھال اور مدد کریں گو پاسپورٹ نہ ملنے کی وجہ سے وہ وفد جا نہ سکا۔

دہلی کا ایک جلسہ | اسی زمانہ میں دہلی میں ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا تا کہ گورنمنٹ کی اس روش پر اپنے غم و غصہ کا اظہار کرے، جلسہ میں مسٹر سرینواس آئنگر صدر کانگرس، پنڈت موتی لال نہرو، اور مسٹر سوباش چندر بوس بھی موجود تھے، محمد علی نے اس جلسہ میں ایک

ایک جسارت انگیز تجویز | ولولہ انگیز تقریر کی اور گورنمنٹ کی روش پر بڑے سخت انداز میں تنقید کی، اور آخر میں یہ تجویز پیش کی کہ اگر گورنمنٹ اپنی حرکت سے باز نہ آئے اور برابر اپنی امن سوز اور ہندوستان آزار مساعی کا سلسلہ جاری رکھے تو ہمارا فرض ہو گا کہ ہم ریل کی

ان پٹریوں پر لیٹ جائیں اور اپنے آپ کو اس گاڑی سے کٹوا دیں جس میں ہمارے ہندوستانی بھائیوں کو چین بھیجا جا رہا ہو کہ وہ دوسروں کا حق آزادی سلب کریں اور اپنی غلامی کا اتنا بھونڈا ثبوت دیں کہ ہر شخص کو اس سے شرم آئے۔

محمد علی کی اس ولولہ انگیز تقریر کا کوئی اردو دوسری تقریر مقابلہ نہیں کر سکی!

ایک خط | ان صفحات میں محمد علی کی مذہبی حمیت اور احساس کا تذکرہ ہو چکا ہے، ایکبار جب موصل میں جنگ چھڑ جانے کا اندیشہ تھا اور فوجیں لامحالہ ہندوستان ہی سے بھیجی جانیوالی تھیں تو اس زمانہ میں محمد علی حج کا عزم کر رہے تھے، لیکن اس "عزم" کے ساتھ کہ اگر جنگ چھڑ گئی تو حج سے مقدم ہندوستان میں رہ کر کام کرنا ہو گا، چنانچہ اپنے ایک مکتوب میں مشہور "یکے از اسیران کراچی" مولانا نثار احمد صاحب کو لکھتے ہیں:

"حج کے لئے جانے کی نیت رکھتا ہوں، ڈر موصل کا ہے اگر وہاں جنگ چھڑ گئی تو ہندوستان میں رہ کر کام کرنا، حج پر بھی مقدم ہو گا"

باب ۱۵

جمہوریت بہ حیثیت عقیدہ کے

بعض عقائد وخیالات انسان کی طبیعت میں اس طرح مرتسم ہوجاتے ہیں کہ کسی ترغیب و تحریص، کسی جاہ وجلال، اور کسی فسوں گری اور سحر کاری سے وہ صفحۂ قلب سے محو نہیں ہوتے اور ہمیشہ اظہار واعلان کے لئے مضطر رہتے ہیں۔

ملوکیت: وہ لفظ تھا جس کے محمد علی کسی حال میں روادار نہیں تھے، اور اس کے خلاف اظہار خیال میں وہ کسی چیز کی پرواہ نہیں کرتے تھے، اور برابر ملوکیت کے نقائص ومفاسد کا اظہار کیا کرتے تھے، خواہ وہ حلقۂ احباب ہو یا مجمع اعدا۔

مہاراجہ الور کا ایک ڈنر مہاراجہ الور محمد علی کے خاص کرمفرماؤں میں تھے، انھوں نے محمد علی کو بغرض علاج یورپ بھیجا، نواب صاحب رامپور سے دشمنی مول لی، محض اس لئے کہ نواب صاحب مرحوم محمد علی کے اوپر سے وہ پابندیاں اٹھانا نہیں چاہتے تھے، جو وہ عائد کرچکے تھے، اور جن کی مخالفت مہاراجہ صاحب الور کررہے تھے، مہاراجہ صاحب ممدوح نے اپنی سالگرہ کے جشن میں ہندوستان کے سرکاری ونیم سرکاری حضرات کے علاوہ اپنے دوستوں کو بھی مدعو کیا تھا جن میں محمد علی بھی تھے۔

ڈنر کے اختتام پر محمد علی نے بھی ایک دل نشین اور دلچسپ تقریر کی، ضمناً اپنے اور مہاراجہ صاحب کے تعلقات کا بھی ذکر کیا اور پھر ملوکیت پر اظہار خیال!

محمد علی نے کہا، مہاراجہ الور میرے گہرے دوست ہیں اور میں ان کی ذہنی ودماغی

خصوصیات کا قدردان ہوں، لیکن ملوکیت میرے حلقہ اطاعت سے خارج ہے، میں ملوکیت کا دشمن ہوں اور اس کی حمایت نہیں کر سکتا، میرا اگر بس چلے، تو میں مہاراجہ صاحب الور کو ”دولت متحدہ ہندوستان“ کا پریسیڈنٹ بنادوں، میں انھیں ”جمہوریہ ہند“ کا صدر بنادوں لیکن ”مہاراجہ“ نہیں، محمد علی کی افتاد طبع سے چونکہ مہاراجہ صاحب بھی واقف تھے اس لئے ان کی تقریر سے وہ بدمزہ نہیں ہوئے!

ابن سعود کی مخالفت سلطان ابن سعود سے جب تک محمد علی کے یہ توقعات وابستہ رہے کہ ان سے تطہیر حجاز ممکن ہے اس وقت تک وہ برابر ابن سعود کی حمایت کرتے رہے، اور ذاتی طور پر انھوں نے ہر قسم کے شدائد و مصائب کا مقابلہ کیا، لیکن جب انھوں نے یہ دیکھا کہ توقعات پامال ہو رہے ہیں، امیدیں شکست ہو رہی ہیں، اور مواعید کو پس پشت ڈالا جا رہا ہے تو انھوں نے مخالفت کی اور سلطان ابن سعود کو مخاطب کر کے کہدیا کہ یہ قیصر و کسری کی سنت ہے، ابوبکرؓ عمرؓ، عثمانؓ و علیؓ کی نہیں۔

احیار خلافت راشدہ کی کوشش چونکہ وہ ملوکیت سے حد درجہ بیزار اور متنفر تھے، اور نظام خلافت راشدہ کو وہ بہترین انداز جہاں بانی و جہاں آرائی سمجھتے تھے، اس لئے وہ ایک سکنڈ کے لئے بھی ملوکیت کے ہم آواز نہ ہوئے۔

جب محمد علی نے ابن سعود کی طلب کردہ شرکت موتمر کا دعوت نامہ قبول کرلیا، اور عازم سفر ہوئے، تو انھوں نے بمبئی میں روانگی سے پیشتر ان خیالات کا اظہار کیا:-

”میں نے نیت کرلی ہے کہ اس سال حج بیت اللہ سے سعادت اندوز ہوں تطہیر حجاز ہو چکی ہے، اگر اس کے بعد حکومت غلط طریقہ پر تشکیل ہوئی تو نہ معلوم مسلمان کتنے عرصہ دراز تک ایک آفت سے نکل کر دوسری میں مبتلا

مسلمانوں نے واقعۂ کربلا کی اہمیت کو نہ سمجھا، ہمیں اس واقعہ پر صرف سبط رسول اور جگر گوشہ بتول کی جانکاہ موت کا ماتم کرنا نہیں ہے، بلکہ نظام خلافت راشدہ کی موت پر بھی سینہ کوبی کرنا ہے تطہیر حجاز نے ایک موتمر کے انعقاد کا موقعہ بہم پہنچا دیا ہے اور امیدیں بندھ گئی ہیں کہ خلافت راشدہ کے منہاج پر ایک صحیح جمہوری حکومت کی تشکیل ہو سکے گی، آج ابن سعود کے کئے ہوئے انتظامات بہتر سے بہتر سہی لیکن ملوکیت میں جو نقائص مضمر ہیں وہ اصلاح نہیں بلکہ افساد کے لازمی طور پر محرک ہوں گے، امیر معاویہ کی غلطی کے باعث مسلمان تیرہ سو برس تک خراب اور پریشان حال رہے کہیں ایسا نہ ہو کہ اسی قسم کی ایک غلطی آج ہم سے ہو جائے اور پھر تیرہ سو برس تک ہم ذاتی اور خاندانی اغراض کے چکر میں گھومتے رہیں، اب نہ بنو امیہ کا دور ہو سکتا ہے نہ بنو عباس کا نہ خاندان عثمان کا، اب حکومت، اسلام ابن اسلام کی ہوگی۔"

گول میز کانفرنس میں محمد علی کا یہ اظہار خیال کہ "میں اپنے نہاں خانۂ تصورات میں شاہوں اور شاہزادوں کا تصور نہیں پاتا"، آپ پڑھ ہی چکے ہیں کہ شہنشاہیت پرستوں کے مجمع میں اس "غلام" نے کیونکر اپنی آزادی رائے اور حریت قلب وضمیر کا ثبوت دیا۔

ابن سعود کی ایک اور مخالفت سلطان ابن سعود نے جب ایک "بلاغ عام" کے ذریعہ ہتھیاروں اور آتشیں اسلحہ کے لئے لائسنس کی شرط لگا دی تو محمد علی نے اس استبداد کی پرزور مخالفت کی، ان کا جمہوری احساس اس کا مخالف تھا کہ عوام پر اس قسم کی مہمل اور لغو پابندیاں عائد کی جائیں اور انھیں رفتہ رفتہ بزدل اور نامرد بنا دیا جائے، ابن سعود کے اس

حکم پر وہ اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ہم اس بلاغ عام پر کس طرح مطمئن ہو سکتے ہیں جو اہل حجاز کو بھی ہماری طرح بزدل بنا دے، خالد و ضرار کی قوم کو ترکوں نے بھی اس طرح بزدل بنانے کی کوشش نہیں کی"

بہر حال محمد علی کا یہ مستقل عقیدہ تھا کہ اسلام میں مسولینی کی گنجائش بالکل نہیں!

باب ۱۶

شاعری

آیئے اس مختصر صحبت میں ایک سرسری نظر محمد علی جوہر کی شاعری پر بھی ڈال لیں۔

محمد علی کو شعر و شاعری سے بچپن ہی سے لگاؤ تھا، شاید یہ ماحول کا اثر ہو کہ رامپور تو اس وقت مرکز شعرا تھا پھر بریلی اور علیگڑھ میں بھی اس قسم کے اثرات پیدا ہوتے رہے کہ ان کی طبیعت میں تحریک پیدا ہو، بہرحال یہ واقعہ ہے کہ محمد علی شعر کہتے تھے، انھیں شاعری سے دلچسپی تھی اور جب ان کی طبیعت کھلتی تھی تو کہتے تھے اور خوب کہتے تھے۔

جوہر کی شاعری کے نشو و نما اور آغاز سے متعلق ہمیں دلچسپ معلومات خود جوہر ہی کے قلم سے معلوم ہو گئے ہیں، شان نزول یہ ہے کہ مولنا عبدالماجد صاحب دریابادی کے ایک استفسار کے سلسلہ میں چھنڈواڑہ کے نظر بند نے خود اپنے قلم سے اپنی شاعری کے متعلق اظہار خیال کیا جس کے اہم اجزا یہ ہیں: | مکتوب بنام عبدالماجد

"آپ میری شاعری کو کیا پوچھتے ہیں؛ بچپن میں تو بہت سے ایسے سامان بہم ہو گئے تھے کہ میں آج زلف و ابرو کی تعریف میں خاصے شعر نکال لیا کرتا، رامپور میں اس زمانہ میں پیدا ہوا تھا جب گھر گھر مشاعرہ ہوتا تھا، داغ، امیر، تسلیم، جلال، عروج، دہلی اور لکھنؤ کے آسمانوں کے ٹوٹے ہوئے تارے سب رامپور کے آسمان سے نور افشانی کر رہے تھے، خود میرے خاندان میں بھی شعر گوئی کا شوق ہوا، تین چار عزیز استاد داغ کے شاگرد ہوئے جن میں ایک میرے

حقیقی بھائی ذوالفقار علی خاں صاحب گوہر اور میرے چچازاد بھائی اور خسر
عظمت علی خاں صاحب اور ان کے بھائی حافظ احمد علی صاحب شوق شامل
تھے، گھر پر بارہا مشاعرہ ہوا، پھر داغ کو نواب کلب علی خاں مرحوم نے جن کی
نظر ہمیشہ کفایت شعاری پر رہتی تھی، ازراہ پرورش سرکاری اصطبل کا داروغہ بھی
کر دیا تھا تاکہ وظیفہ محض کار بیکاراں کی نظر نہ ہو، ذوالفقار، روزانہ داغ کے
گھر جاتے تھے، اور مجھے بھی لے جاتے تھے، داغ نے پہلے دن پوچھا، کہو کچھ
شعر بھی یاد ہیں، میری عمر بہت ہی کم تھی، مگر بھائی نے کچھ شعر یاد کرا دیے
تھے جنھیں میں نہایت زور اور شان سے کڑک کڑک کر پڑھا کرتا تھا، میں نے داغ
ہی کے چند شعر انھیں سنا دیے، سن کر پھڑک گئے اور اس کے بعد ہمیشہ اصرار
رہا کہ اس بچے کو ضرور لایا کرو، جناب والا! اس کے بعد اگر میں یہ دعویٰ
کروں کہ شعر و سخن کی گود میں پلا ہوں، تو بیجا نہ ہوگا، مگر میرا دعویٰ تو اس سے
بھی بڑھ چڑھ کر ہے، سنئے! میں نہ صرف شعر و سخن کی گود میں پلا ہوں بلکہ اس
کی توند پر کودا ہوں، اسے ہاتھی بنا کر پیٹھ پر سوار رہا ہوں"

مولانا عبدالماجد کی رائے یہ تو تھا خود جوہر ہی کی زبان سے اپنی شاعری کے آغاز و ابتدا
کا بیان لیکن ان کی شاعری کے خصوصیات کیا ہیں؟ رنگ کیا ہے؟ پیام کیا ہے؟ انداز بیان
اور طریقۂ ادا کیسا ہے؟ اسے جوہر کے ایک بہت بڑے قدر شناس اور اس سے زیادہ دوست
اور اس سے زیادہ نقاد فن مولانا عبدالماجد صاحب کی زبان سے سنئے۔

"جوہر کی شاعری ان کے قلب کی زبان، ان کے جذبات کی ترجمان اور
ان کے واردات کا بیان ہے، آورد، تصنع اور تکلف کا ان کے ہاں گزر

نہیں، ان کے قلب پر جو کچھ گزرتی رہتی ہے وہ بلا تکلف زبان قلم پر آجاتی ہے، تاثیر اس طرز سخن کا لازمی نتیجہ ہے، اور یہ وصف ان کے کلام میں بدرجۂ اتم موجود ہے، ان کی شاعری گل و بلبل، زلف و کاکل خط و عارض سے یکسر تہی ہے، ان کا کلام ایک حقیقی مسلم کا کلام ہے، ان کے جذبات تمام تر وہ ہیں جو ایک مسلم صادق کے ہونے چاہئیں، بے شبہ ان کی شاعری بھی چاشنی عشق سے بیگانہ نہیں بلکہ سچ یہ ہے کہ عشق کی کسک ان کے ایک ایک مصرع میں موجود ہے، البتہ ان کا معشوق نہ ایران کا "سبز خط" ہے نہ ہندوستان کا "بت سیمیں بدن" ان کا معشوق مردہ نہیں، زندہ ہے، فانی نہیں باقی ہے، سفاک و ستمگر نہیں، رحمٰن و رحیم ہے، ان کا محبوب وہ ہے جو ہر مسلم بلکہ ہر سلیم الفطرت کا ہوتا ہے"

اگر جوہر کی شاعری کی تحلیل کیجائے، تو وہ اسی مذکورۂ بالا اصول کے مطابق محدود ہوگی، اس سے باہر نہیں جاسکتی۔

انتخاب کلام طوالت کے اندیشہ سے ہم خود جوہر کی شاعری پر کوئی اظہار نہیں کرتے اس لئے کہ نہ وہ مذکورہ بالا رائے سے بہتر ہو سکتی ہے، نہ اس سے زیادہ عمدہ پیرایۂ بیان میں ظاہر کی جاسکتی ہے، اس لئے اظہار رائے سے قطع نظر کرتے ہوئے ہم ان کے کلام کا عطر پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اب انتخاب کلام شروع ہوتا ہے:

غزل بہ زمانہ طالب علمی علیگڑھ کالج ۱۸۹۷ء

کیوں مے پرست دیکھ کے مدہوش ہوگئے شیشہ میں مے بھری تھی کہ اللہ کا نور تھا

کس زور کی لڑائی تھی اللہ ری کشمکش　　تھی رات یاس اور دل ناصبور تھا

کیوں تاب دید حضرت موسیٰ نہ لا سکے　　کیا پہلوئے عدو کی طرح کوہ طور تھا

خوش قسمتی کے آگے جھکایا کبھی نہ سر　　اس خانماں خراب کو کتنا غرور تھا

میں تیرا گھر سمجھ کے سر راہ گر پڑا　　دیکھا جو آنکھ اٹھا کے تو دروازہ دور تھا

ایضاً

ارادہ تھا یہ نالوں کا ہلا دیں ربع مسکوں کو　　مگر اے ہم نفس دل کی تھکن کچھ اور کہتی ہے

یقیں آنے کو تو آجائے تیرے عہد و پیماں پر　　تری آنکھ اے بت وعدہ شکن کچھ اور کہتی ہے

حرم میں تو کرے اظہار ترکِ مے کشی جوہر　　مگر کمبخت کی بوئے دہن کچھ اور کہتی ہے

رائے بریلی اپریل ۱۸۹۵ء

غیر کا خط ہے کہ دل ہے کسی دلدادہ کا　　کچھ تو ہے تم نے جو مٹھی میں چھپا رکھا ہے

یہ ستانے کی نکالی ہے انوکھی ترکیب　　ظلم کا نام ستمگر نے حیا رکھا ہے

آپ آئے ہیں عیادت کو دمِ نزع عبث　　جوہر خستہ میں اب کہیے تو کیا رکھا ہے

بعد امتحان بی اے

جنوں باقی ہے اتنا کہ گو تری محفل میں بیٹھا ہوں　　کہ رہ رہ کر خیال آتا ہے جوہر کو بیاباں کا

خوف غماز، عدالت خطر، دار کا ڈر　　ہیں جہاں اتنے وہاں خوف خدا اور سہی

رب عزت کیلئے بھی کوئی ہے نئے دو خطاب　　تم خداوند ہی کہلاؤ خدا اور سہی

دور حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد　　ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد

تجھ سے مقابلہ کی کسے تاب ہے ولے　　میرا لہو بھی خوب ہے تیری حنا کے بعد
قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے　　اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

نورِ حق وہ شمعِ انور ہے جو بجھ سکتی نہیں　　ہے خدا حافظ چراغِ رہگزارِ باد کا
آج تک ہے ایک کنعانی سے شہرت مصر کی　　فیض سے حسرت[1] کے ہوگا نام فیض آباد کا

ہے رشک کیوں یہ ہم کو سرِ دار دیکھ کر　　دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر
اس شانِ امتیاز کو دیکھو کہ اہلِ کفر　　مومن سمجھ رہے ہیں ہمیں خوار دیکھ کر
تیرِ نگہ نے کر دیا دونوں کا فیصلہ　　باہم دل و جگر میں یہ تکرار دیکھ کر
ہم خاصگانِ اہلِ نظر اور یہ قتلِ عام　　جور و ستم بھی کر، تو ستمگار دیکھ کر
ہر سینہ آج ہے ترے پیکاں کا منتظر　　ہو انتخاب، اے نگہِ یار دیکھ کر

یادِ وطن نہ آئے ہمیں کیوں وطن سے دور　　جاتی نہیں ہے بوئے چمن کیا چمن سے دور
گر بوئے گل نہیں، نہ سہی یادِ گل تو ہے　　صیاد لاکھ رکھے قفس کو چمن سے دور
آساں نہ تھا تقربِ شیریں تو کیا ہوا　　تیشہ کو کوئی رکھ نہ سکا کوہکن سے دور
ہم تک جو دورِ جام پھر آئے تو کیا عجب　　یہ بھی نہیں ہے گردشِ چرخِ کہن سے دور
شاید کہ آج حسرتِ جوہر نکل گئی　　اک لاش تھی پڑی ہوئی گور و کفن سے دور

لہ مولانا حسرت موہانی اس زمانہ میں فیض آباد جیل میں اسیر تھے!

ہر رنگ میں راضی بہ رضا ہو تو مزا دیکھ
دنیا ہی میں بیٹھے ہوئے جنت کی فضا دیکھ

ہے سنت ارباب وفا صبر و توکل
چھوٹے نہ کہیں ہاتھ سے دامان رضا دیکھ

دشت رہ غربت میں اکیلا تو نہیں تو
بطحا کے مہاجر کا تو نقش کف پا دیکھ

اللہ کے بانکوں کا بھی ہے رنگ نرالا
اس سادگی پر سرخی خون شہدا، دیکھ

یہ نور خدا کا ہے بجھائے نہ بجھے گا
کچھ دم ہے اگر تجھ میں تو آ، تو بھی بجھا دیکھ

ہوں لاکھ نظر بند، دعا بند نہیں ہے
اللہ کے بندوں کو نہ اس درجہ ستا دیکھ

ہو حسن طلب لاکھ مگر کچھ نہیں ملتا
ہو صدق طلب پھر اثر آہ رسا، دیکھ

سونے کا نہیں وقت یہ ہشیار ہو غافل
رنگ فلک پیر، زمانہ کی ہوا دیکھ

تشنہ لب ہوں مدتوں سے دیکھئے
کب در میخانۂ کوثر کھلے

طاقت پرواز ہی جب کھو چکے
پھر ہوا کیا گر ہوئے بھی پر کھلے

چاک کر سینہ کو پہلو چیر ڈال
یوں ہی کچھ حال دل مضطر کھلے

لو وہ آپہنچا جنوں کا قافلہ
پاؤں زخمی، خاک منہ پر سر کھلے

ہوں جو کثرت ہی کے قائل ان پہ کیا
راز فتح سبط پیغمبر کھلے

رو نمائی کے لئے لایا ہوں جان
اب تو شاید چہرۂ انور کھلے

اب تو کشتی کے موافق ہے ہوا
ناخدا کیا دیر ہے لنگر کھلے

یہ نظر بندی تو نکلی رد سحر
دیدہ ہائے ہوش اب جا کر کھلے

اب کہیں ٹوٹا ہے باطل کا طلسم
حق کے عقدے اب کہیں جا کر کھلے

اب ہوا ہے ماسوا کا پردہ فاش
معرفت کے اب کہیں دفتر کھلے

فیض سے تیرے ہی اے قیدِ فرنگ
بال و پر نکلے قفس کے در کھلے
جیتے جی تو کچھ نہ دکھلایا مگر
مر کے جوہرؔ آپ کے جوہر کھلے

خاک جینا ہے اگر موت سے ڈرنا ہے یہی
ہوسِ زیست ہو اس درجہ تو مرنا ہے یہی
قیدِ گیسو سے بھلا کون رہے گا آزاد
تیری زلفوں کا جو شانوں پہ بکھرنا ہے یہی
نقدِ جاں نذر کرو سوچتے کیا ہو جوہرؔ
کام کرنے کا یہی ہے تمہیں کرنا ہے یہی

تم یوں ہی سمجھنا کہ فنا میرے لئے ہے
پر غیب سے سامان بقا میرے لئے ہے
پیغام ملا تھا، جو حسین ابن علی کو
خوش ہوں وہی پیغام قضا میرے لئے ہے
کیوں جان نہ دوں غم میں ترے جبکہ ابھی سے
ماتم یہ زمانہ میں بپا میرے لئے ہے
میں کھو کے تری راہ میں سب دولت دنیا
سمجھا کہ کچھ اس سے بھی سوا میرے لئے ہے
توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے
سرخی میں نہیں دستِ حنا بستہ بھی کچھ کم
پر شوخی خون شہدا میرے لئے ہے
اے شافعِ محشر جو کرے تو نہ شفاعت
پھر کون وہاں تیرے سوا میرے لئے ہے
کیا ڈر ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف
کافی ہے اگر ایک خدا میرے لئے ہے
ہیں یوں تو فدا ابرِ سیہ پر سبھی میکش
پر آج کی گھنگھور گھٹا میرے لئے ہے

ہوں لائق تعزیر یہ الزام ہے جھوٹا
مجرم تو ہوں بے شک پہ خطا اور ہی کچھ ہے
خود خضر کو شبیر کی اس تشنہ لبی سے
معلوم ہوا آبِ بقا اور ہی کچھ ہے

نے سائل دولت ہیں نہ عزت کے طلبگار — اس در کے فقیروں کی صدا اور ہی کچھ ہے
یوں قید سے چھٹنے کی خوشی کس کو نہ ہو گی — پر تیرے اسیروں کی دعا اور ہی کچھ ہے
یہ صدر نشینی ہو مبارک تمہیں جوہر — لیکن صلۂ روز جزا اور ہی کچھ ہے

الوداع اے ماہ رمضاں الوداع — بہترین غمگساراں الوداع
ان دنوں تھا بحر رحمت جوش پر — اے زمان عفو عصیاں الوداع
قید تنہائی کی رونق تجھ سے تھی — اے شریک بزم زنداں الوداع
شدت غم سے زباں گر بند ہے — تو ہی کہہ دے چشم گریاں الوداع

کیا ڈھونڈتے ہو فصل خزاں میں بہار کو — اب وہ چمن کہاں ہے وہ رنگ چمن کہاں
سن لیجے خلوتوں میں انا الحق کا ادعا — سولی پہ چڑھ سکے وہ اب نعرہ زن کہاں
فرصت کسے خوشامد شمر و یزید سے — اب ادعائے پیروی پنجتن کہاں

تنہائی کو سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں — اب ہونے لگیں ان سے خلوت میں ملاقاتیں
ہر آن تسلی ہے، ہر لحظہ تشفی ہے — ہر روز یہی چرچے، ہر روز یہی باتیں
معراج کی سی حاصل سجدوں میں ہے کیفیت — اک فاسق و فاجر میں اور ایسی کراماتیں
بے مایہ سہی لیکن، شاید وہ بلا بھیجیں — بھیجی ہیں درودوں کی کچھ ہم نے بھی سوغاتیں
بیٹھا ہوا توبہ کی تو خیر منایا کر — ٹلتیں نہیں یوں جوہر اس دیس کی برساتیں

پھر ہو رہا ہے شورِ صلائے نبردِ عشق — ہاں اے دہانِ زخم جواب، الاماں، نہ ہو
سنتے ہی جس کے خلق میں کہرام مچ گیا — جو ہر وہ تیری ہی تو کہیں داستاں، نہ ہو

بے خوفِ غیر دل کی اگر ترجماں نہ ہو — بہتر ہے یہ کہ ایک سرے سے زباں نہ ہو
اک تو جو مہرباں ہو تو ہر اک ہو مہرباں — اور یوں نہ ہو بلا سے کوئی مہرباں نہ ہو
ہمت نہ ہارے کوئی منزل کے سامنے — پروردگار یوں بھی کوئی ناتواں نہ ہو

مستحقِ دار کو حکمِ نظر بندی ملا — کیا کہوں کیسی رہائی ہوتے ہوتے رہ گئی

میرے لہو سے خاکِ وطن لالہ زار دیکھ — اسلام کے چمن کی خزاں میں بہار دیکھ
کیا عشقِ ناتمام کی بتلاؤں سرگزشت — دار و رسن کا اور ابھی انتظار دیکھ

پیامِ مرگ ہی پیغامِ یار و مژدۂ وصل — وہ کام اجل نے کیا جو صبا سے ہو نہ سکا

قید ہے، قیدِ غلامی دو برس کی قید کیا — دیکھو کب ہو خاتمہ اس قیدِ بے میعاد کا

رہے گی اٹھ کے یہ اک دن نقاب دیکھو تو — ہمارے رب ہو ہمیں بے حجاب دیکھو تو

اس دردِ لا دوا کی دوا ہو تو جانیے — دستِ مسیح میں یہ شفا ہو تو جانیے

ہر شے کو لیکے شکر کیا بھی تو کیا کیا　　جان دیتے وقت شکر ادا ہو تو جانئے

مہمان قفس کیا ترے فریاد کریں گے　　اتنی بھی نہ اب خاطر صیاد کریں گے
وہ جس سے کہیں ہم تجھے دل شاد کریں گے　　سمجھو کہ اسے اور بھی برباد کریں گے
جو وحشت کہ آرام گہ بسط بنی ہے　　اس دشت کو لاکھوں ابھی آباد کریں گے

گلہ اے دل ابھی سے کرتا ہے　　عشق کا دم اسی پہ بھرتا ہے
جان دیتا ہے عیش فانی پہ　　بس، اسی زندگی پہ مرتا ہے
جس کو دنیا نے نامراد کہا　　وہی ناکام، کام کرتا ہے
آج کر لو جو کر سکو کل تک　　کون جیتا ہے، کون مرتا ہے
قلزم عشق میں گرا سو گرا　　اس کا ڈوبا کہیں ابھرتا ہے
اس قدر احتیاط اے صیاد　　کہ قفس میں بھی پر کترتا ہے
وہی دن ہے ہماری عید کا دن　　جو تری یاد میں گزرتا ہے

بیتاب کر رہی ہے تمنائے کربلا　　یاد آ رہا ہے بادیہ پیمائے کربلا
روز ازل سے ہے یہی اک مقصد حیات　　جائیگا سر کے ساتھ ہی سودائے کربلا
جو ہر مسیح و خضر کو ملتی نہیں یہ چیز　　اور یوں نصیب سے تجھے ملجائے کربلا

ہرگز نہ ہو اے دل غم جاناں کی شکایت　　کرتا ہے بھلا کوئی بھی مہماں کی شکایت

ہیں عشق کے بیمار بھی دنیا سے نرالے — ہے درد کے بدلے انہیں درماں کی شکایت

غافل خدا کے قہر سے دیتی نہیں پناہ — سد سکندری ہو کہ دیوار چین کی

اگلی سی اب وہ زعم میں طغیانیاں کہاں — شب بھر میں کیا بھری ہوئی ندی اتر گئی
صیاد کیا ہوئی وہ تری خوئے احتیاط — مرغ خیال کے نہ مرے پر کتر گئی
مانا کہ یاں تک آنیکی فرصت نہیں انہیں — پوچھو تو آج موت کہاں جا کے مر گئی

ہیں یہ انداز آزمانے کے — اور ہی ڈھنگ ہیں ستانے کے
کربلا ہے بہانۂ کوثر — جائیے صدقے اس بہانے کے
گھر چھٹا یوں کہ چھوڑنے والے — تھے نہ ہم اس کے آستانے کے
ایک اک کرکے سب کے سب تنکے — کئے برباد آشیانے کے
دیکھئے اب یہ گردش تقدیر — کہیں آنے کے ہیں نہ جانے کے
پوچھئے کیا ہو بود و باش کا حال — ہم ہیں باشندے جیل خانے کے
قید میں اور اتنی بے باکی — سب یہ لچھن ہیں مار کھانے کے

نعلین ہی یہ ہو نہ کہیں اکتفا کلیم — اس آستاں پہ آئے تو سر بھی اتار دے
دے نقد جان تو بادۂ کوثر ابھی ملے — ساقی کو کیا پڑی ہے کہ یہ مے ادھار دے
رہرو تھا راہ عشق کا منزل کو پالیا — اب اور کیا نشاں مری لوح مزار دے

ہے رشک ایک خلق کو جوہر کی موت پر
یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

ہے بات تو جب نزع میں تمکیں رہے قائم
مقتل ہے دلا! رقص کی محفل تو نہیں یہ

نالے کی غنیمت ہے اب اتنی بھی رسائی
وہ پوچھ رہے ہیں کوئی سائل تو نہیں یہ

آئی نہ ہو زنداں میں خبر، موسم گل کی
سننا تو ذرا، شور عنادل تو نہیں یہ

یاں قافلہ لٹتا ہے بس اب یاں سے چل اے دل
تو آپ ہی کہہ دے گا کہ منزل تو نہیں یہ

مجنوں ہے تو کیا عشق کا احساس بھی کھویا
جس میں تری لیلیٰ ہو وہ محمل تو نہیں یہ

چھوڑ میری فکر غافل، رو خود اپنی قید پر
جس کو تو زیور سمجھتا ہے وہی زنجیر ہے

نہ اُڑ جائیں کہیں قیدی قفس کے
ذرا پر باندھنا صیاد کس کے

گراں ہو اب تو شاید سیر گل بھی
کچھ ایسے ہو گئے خوگر قفس کے

قید اور قید بھی تنہائی کی
شرم رہ جائے شکیبائی کی

سوجھتا کیا ہمیں ان آنکھوں سے
شرط تھی قلب کی بینائی کی

عقل کو ہم نے کیا نذر جنوں
عمر بھر میں یہی دانائی کی

کر گئی زندۂ جاوید ہمیں
تیغ قاتل نے مسیحائی کی

کل کو ہے پھر وہی زنداں جوہر
ٹھیک کیا آپ سے سودائی کی

دعویٰ توحید کا تو کرتا ہے — نفس کو مت خدا بنا لینا
ہو ادھر بھی کبھی نگاہ کرم — ہم غریبوں کی بھی دعا لینا
ایک ہی جام اور یہ سرمستی — ساقیا، دیکھ، میں چلا، لینا
تم کو زیبا نہ تھا وداع کے وقت — آنکھ جوہر سے یوں چرا لینا

تجھے تسکین دل پایا، تجھے آرام جاں پایا — نہاں بھی ہو تو کیا تجھکو جہاں ڈھونڈا وہاں پایا
ہمیں ہر چیز میں آئی نظر، یارب ادا تیری — وہ کیسے ہوں گے جن لوگوں نے تجکو بے نشاں پایا
ترا وہ مبتلا ناکام سمجھا جس کو دنیا نے — اسی کو سرخرو دیکھا اسی کو کامراں پایا
نہیں معلوم کیا ہو حشر جوہر کا پہ اتنا ہے — کہ ہاں نام محمدؐ مرتے دم ورد زباں پایا

کبھی جوہر کے پہلو میں بھی اک آتش فشاں دل تھا — پر اکی بار جو دیکھا تو یونہی سا دھواں پایا

عشق ہی باعث تکوین جہاں ہے غافل — تو نے جانا کہ یہ اک شغل ہی بیکاری کا

جوہر سا سیہ کار اور انجام شہادت — اس سے تو کسی کو بھی نہ تھا اسکا گماں تک

جیل میں اپنی صاحبزادی آمنہ بیگم کی علالت کی خبر پاتے ہیں، بے بال و پری کے عالم میں صبا یہ پیام اسیر متعلقین تک پہنچاتی ہے۔

میں ہوں مجبور پر اللہ تو مجبور نہیں — تجھ سے میں دور سہی وہ تو مگر دور نہیں

امتحاں سخت سہی پر دل مومن ہے وہ کیا | جو ہر ایک حال میں امید سے معمور نہیں
ہم کو تقدیر الٰہی سے نہ شکوہ نہ گلا | اہل تسلیم و رضا کا تو یہ دستور نہیں
تیری صحت ہمیں مطلوب ہے لیکن اسکو | نہیں منظور تو پھر ہم کو بھی منظور نہیں

تتمہ | جوہر کی شاعری کا انتخاب آپ کے سامنے پیش کیا جا چکا، ارباب نظر اور ماہرین فن سے ایک بزرگ کی رائے ان کی شاعری سے متعلق اور خود جوہر کا بیان اپنی شاعری کے محرکات و آغاز پر آپ کے سامنے ہے، اب آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جوہر کی شاعری کس پایہ کی تھی، آمد ان کی شاعری کا طغرائے امتیاز تھا یا آورد؟

یہاں انتخاب کلام کے متعلق ایک بات عرض کرنی ہے، یہ کہ انتخاب کلام متفرق سرخیوں میں منقسم کر کے پیش نہیں کیا گیا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ مقصود یہ تھا کہ ان کا کلام شروع سے آخر تک جو مدارج اور مراحل طے کر چکا ہے، اور ان کے رنگ میں جس طرح تدریجی تغیر ہوا ہے، وہ بھی آپ کے سامنے رہے۔

دوسری اہم وجہ یہ ہے کہ اس کتاب کی مختصر ضخامت اس کی متحمل نہیں ہو سکی کہ ایک طویل تبصرہ کے ساتھ ان کا کلام پیش کیا جا سکتا، یہی وجہ ہے جو ان کے انتخاب کلام میں بھی ایک حد تک بخل سے کام لیا گیا ہے، اور اکثر اشعار آبدار محض قلت گنجائش کی وجہ سے چھوڑ دینے پڑے۔

انشاءاللہ آئندہ ایڈیشن میں جس کو ہر اعتبار سے زیادہ مکمل کرنے کی کوشش کی جائے گی، ان ناگزیر کوتاہیوں کی تلافی بھی کی جا سکے گی۔

باب ۱۷

طول نویسی

محمد علی اگرچہ ایک وسیع النظر ادیب، اور زبان و ادب سے خاص دلچسپی رکھنے والی طبیعت کے مالک تھے، اور ان کا طرز انشا بھی اپنے اندر ایک مخصوص اسلوب رکھتا تھا، لیکن بایں ہمہ اس کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ محمد علی کی تحریر خواہ وہ کتنی ہی دلچسپ اور جاذب توجہ ہو، ضرورت سے کہیں زیادہ طویل ہوتی تھی، مکرّرات کی تعداد بھی خاصی ہوتی تھی، اور سب سے بڑھ کر ستم یہ تھا کہ گزشتہ روز جو مقالہ افتتاحیہ وہ تحریر فرما چکے ہوتے تھے اسی کو بہ تغیر خفیف ڈیڑھ ڈیڑھ، دو دو کالم تک پھر بیان کرتے تھے اور اس کے بعد اصل موضوع پر گفتگو کرتے تھے، اور اس میں بھی گفتگو کرتے کرتے وہ دوسرے غیر متعلق لیکن نہایت مفید و کارآمد اور دلچسپ پہلوؤں پر بھی گفتگو کرنے لگتے تھے، جس سے کم صبر پڑھنے والوں کو باوجود عقیدت اور دلچسپی کے بعض اوقات تکلیف ہوتی تھی۔

بات بھی کچھ ایسی ہے کہ موضوع چاہے جتنا دلچسپ اور شگفتہ ہو، اور لکھنے والا بھی چاہے جس قدر شوخ اور دلچسپ انداز بیان رکھتا ہو مگر ایک ہی موضوع پر زیادہ طوالت ناظرین کو عاجز کر دیتی ہے، اور پھر محمد علی کا سا غضب کا لکھنے والا کہ لکھنے بیٹھ گئے تو ہمدرد کی باریک کتابت میں ۹، ۹-۱۰، ۱۰ کالم کے مضامین لکھ ڈالے،

لیکن کیا محمد علی کا ہمیشہ سے یہی انداز تحریر تھا؟ نہیں! جب پہلے پہل انھوں نے میدان عمل میں قدم رکھا ہے اور ان کی خداداد قابلیت اور ذہانت کا ہر طرف سے

نعرۂ تحسین اور مرحبا کے ساتھ خیر مقدم کیا گیا جس وقت ان کے ولولے تازہ تھے اور قوتِ عمل جوان، اس وقت محمد علی کا انداز یہ نہیں تھا اس وقت ان کے مقالات افتتاحیہ اور بیانات معیارِ عام کے موافق ہوتے تھے، لیکن آخر عمر میں جب وہ نرغۂ اعداء میں گھرے ہوئے تھے اور ان کی ہر بات ٹھکرائی جا رہی تھی، ان کے احباب و رفقا ایک ایک کرکے ان سے الگ ہو رہے تھے اور ان کے متبعین اور مریدین ان کی اطاعت سے منہ موڑ رہے تھے، ان کی اچھی سے اچھی بات پر کان نہیں دھرے جاتے تھے اور ان کی بہتر سے بہتر تجویز کی مخالفت "آزادی رائے"، "حریت ضمیر" اور "عدم تقلید" کا ثبوت تھی اس وقت ان میں یہ نقص پیدا ہوا اور اُس وقت ان کی تحریریں بارِ نظر ثابت ہونے لگیں۔

محمد علی بھی اپنی طول نگاری کے نقص سے ناواقف نہیں تھے۔ وہ خود بھی اسے محسوس کرتے تھے اور نہایت شدت کے ساتھ سمجھتے تھے کہ میں ایک ادبی جرم کا مرتکب ہو رہا ہوں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ معذور تھے، وہ چاہتے تھے کہ اپنے خیالات واحساسات اور اپنے اعتقادات ونظریات کو قبول کرائیں، کہ ایک "زعیم" کی یہی خصوصیت ہوتی ہے لیکن وہ یہ بھی دیکھتے تھے کہ ان کی مخالفت بھی قدم قدم پر ہوتی تھی، اس لئے مجبوراً وہ طوالت سے کام لیتے تھے تاکہ اپنا مفہوم پڑھنے والے کے دل میں پوری طرح اتار دیں ایک مرتبہ شدت تاثر میں اس موضوع پر انھوں نے خود بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے جو ان کی طرف سے بہترین صفائی ہو سکتی ہے۔

محمد علی کا "بیان" | "میرے مضامین کی طوالت کچھ اس باعث ہوتی ہے کہ میں ملک وملت ہی کے اور کاموں میں الجھا رہتا ہوں اور مضمون نگاری کے لئے اتنا وقت نہیں ملتا کہ سوچ کر ایسے الفاظ اور فقرے تلاش کروں جن سے مطلب

بھی ادا ہو جائے اور اختصار بھی ہو جائے، ایک صاحب نے اپنے ایک دوست کو بالکل درست لکھا تھا کہ "معاف کرنا، خط بہت طویل ہو گیا مختصر لکھنے کے لئے وقت نہیں نکال سکا،" جو میری طرح قلم برداشتہ لکھنے پر مجبور ہو وہ بیچارہ کیا اختصار کر سکتا ہے؟ لیکن میرے مضامین اور میری تقریروں کی طوالت کی سب سے بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ میں چاہتا ہوں اپنے قارئین و سامعین کے دلوں میں بھی وہی خیالات بھر دوں جو میرے دل میں بھرے پڑے ہیں یہی خواہش مجھے بیچین کئے رہتی ہے اور ہر وقت خوف دامنگیر رہتا ہے کہ شاید ابھی یہ میرا مفہوم نہیں سمجھے، ابھی یہ میرے دلائل و براہین سے قائل نہیں ہوئے ابھی میرے دلی احساسات نے ان کے دلوں میں وہی احساسات پیدا نہیں کئے انھیں ادھ کچرا چھوڑنا جائز نہیں، دو فقرے ان کو اور لکھدوں، جو سبق ان کو پڑھانا چاہتا ہوں وہ ابھی انھیں یاد نہیں ہوا ہے، اسے پھر ایک دفعہ آموختہ میں خود ہی نہ پھیردوں؟ کاش میرے بھائی اسے مان لیں کہ میری ساری طوالت اور میری ساری علالت اسی لئے ہے کہ

من قاش فروش دل صد پارۂ خویشم

یہ ہیں محمد علی کی "طوالت اور علالت" کے اسباب جنھیں ان کی زندگی میں کسی نے نہیں سمجھا، جو شخص تار پر کامریڈ کا "لیڈنگ آرٹیکل" بھیجتا ہو، وہ اتنا وقت کہاں سے نکال سکتا ہے، کہ سکون خاطر اور اطمینان قلب سے ہمدرد کے لئے مضامین لکھے، اور جن کے الفاظ بالکل نپے تلے ہوں؟

باب ۱۸

رفق ومحبت اور "جذباتیت"

جلوت میں محمد علی کا معائنہ کرو، تو وہ ایک جنگجو، بپھر بپھر کر لڑنے والا، باطل کے لئے صاعقۂ موت، اور اشرار صفت احرار کے لئے پیام ہلاکت تھا۔

لیکن اگر خلوت کے آئینہ خانہ میں اس کی تصویر دیکھو تو اپنی آل اولاد، اپنے اعزاز اقربا، اور اپنے دوست احباب کے ساتھ وہ ایک محبت کرنے والا، ان کی مصیبت پر خود بیقرار ہو جانے والا، ان کی تکلیف کا احساس کرنے والا اور ان کے ہر دکھ درد کا شریک نظر آئے گا۔

وہ ایک سنجیدہ مدبر، وسیع النظر ادیب، بلند آہنگ خطیب، اور سحر نگار انشا پرداز تھا، لیکن جب کبھی تھوڑی دیر کے لئے اس کو یہ موقع مل جاتا کہ وہ سیاسی اور پبلک مشغولیتوں سے الگ ہو کر اپنی کچھ ساعتیں بسر کر سکے، تو وہ ایک ہنس مکھ، بچوں کے ساتھ کھیلنے والا، اور زندہ دل آدمی تھا۔

اسے اپنے بھائی سے عشق تھا، اپنی ماں پر وہ پروانہ وار نثار ہوتا تھا، اپنی بچیوں سے اسے دیوانہ وار الفت تھی اور اپنے احباب سے نہایت گہرا تعلق تھا۔

بچوں سے محبت | محمد علی کو چھوٹی عمر کے بچوں خصوصاً بچیوں سے بہت محبت تھی، جہاں ان کے سامنے کوئی بچہ آگیا، بس پھر وہ اپنے بے پناہ جذبۂ مہر و محبت کو ضبط نہیں کر سکتے تھے، اور یہ جذبۂ مہر و محبت "وطنیت اور ملیت" کے دائرہ میں محدود نہیں تھا بچے

ہوں، اور محمد علی ہوں، پھر ان کی محبت اور شفقت کا کوئی منظر دیکھ لے!

جامعہ ملیہ کے بچے | محمد علی کو جامعہ ملیہ اسلامیہ سے جو گہرا تعلق تھا، وہ سب کو معلوم ہے، کوچہ چیلاں سے جب قرولباغ میں انھوں نے قیام فرمایا ہے تو قرب مکانی کے باعث جامعہ اکثر تشریف لاتے تھے اور جامعہ کی ہر تقریب میں وہ شریک ہوتے تھے اور جب کبھی وہ چھوٹے بچوں کے ہوسٹل "خاکسار منزل" میں پہنچ جاتے تھے، تو بس جاتے ہی وہ بھی "بچہ" بن جاتے تھے اور فرمایا کرتے کہ کاش اپنے "سینگ" کٹا کر میں بھی ان "بچھڑوں" کے ساتھ شامل ہو جاتا! آخر عمر میں تو اکثر وہ اپنے اس عزم کا اظہار فرمایا کرتے تھے کہ وہ سیاسی مشغولیتوں سے قطع نظر کر کے بس جامعہ ہی کے ایک گوشہ میں عزلت گزین ہو جائیں گے، گو موت کے بے درد ہاتھوں نے ان کی یہ تمنا اور جامعہ کی یہ خواہش دیرینہ پوری نہ ہونے دی!

ایک اور واقعہ | مولانا عبدالماجد صاحب مدظلہ روایت فرماتے ہیں کہ وہ ایک بار محمد علی کے ہاں مقیم تھے، کسی سلسلہ میں نواب اسمٰعیل خاں بیرسٹرایٹ لا موجودہ خازن مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کے متعلقین بھی محمد علی کے ہاں فروکش تھے، کمرہ میں محمد علی بیٹھے ہوئے تھے اتنے میں نواب صاحب کی چھوٹی بچی آگئی، محمد علی اس کے ساتھ بالکل "بچہ" بن گئے اور کمرہ بھر میں کبھی محمد علی دوڑتے تھے تو وہ بچی ان کا پیچھا کرتی تھی اور وہ بچی دوڑتی تھی تو محمد علی اس کا تعاقب، کبھی محمد علی کسی طرف چھپ جاتے تھے، اور وہ بچی انھیں ڈھونڈھتی تھی، اور کبھی وہ بچی چھپنا چاہتی تھی تو محمد علی اسے پکڑ لیتے تھے، مولانا ممدوح فرماتے ہیں کہ بڑی دیر تک یہ دلچسپ سلسلہ جاری رہا۔

بی اماں سے محبت | یہ تو تھا بچوں سے ان کی محبت کا حال لیکن اپنے بھائی، ماں اور دوسرے احباب سے بھی ان کو غایت درجہ کی محبت تھی، میر محفوظ علی صاحب، مولانا شوکت علی

میر محفوظ علی کا بیان | صاحب کے نام ایک مکتوب میں ضمناً ایک بہت موثر واقعہ لکھتے ہیں، یعنی جب بی اماں سفر حج سے واپس تشریف لائی ہیں، اس وقت محمد علی کی کیا کیفیت تھی؟ وہ فرماتے ہیں:

"مجھے اب تک یاد ہے کہ جب بی اماں مرحومہ، حج بیت اللہ سے واپس آرہی تھیں، اور بمبئی میں محمد علی ایک لبادہ پوش ضعیفہ کو جہاز سے اتارنے گئے تھے، تو وارفتگی جنوں کی کیا کیفیت تھی"

مکتوب محمد علی | اتفاقاً ہمیں خود محمد علی کا ایک مکتوب مل گیا، جو میر محفوظ علی کے نام ہے اور جس میں وہ خود ان الفاظ میں اپنے تاثرات بیان کرتے ہیں، یہ مکتوب اس زمانہ کا ہے جب وہ بڑودہ میں ملازم تھے:

"رمضان گزشتہ سے دل بیت اللہ کی طرف تھا اور نعوذ باللہ من ذلک نہ اس وجہ سے کہ خدا کا گھر ہے بلکہ اس خیال سے کہ میری ماں وہاں خدا کی مہمان ہے۔ ۳۰ / اپریل سے بمبئی میں تھا، اس سے قبل دوڑا ہوا رامپور گیا تھا کہ کہیں وطن نہ پہنچ گئی ہو، ۵ / اپریل کو جہاز آیا، کوئی عاشق اپنی معشوقہ سے ملنے کے لئے اتنا بیتاب نہ ہوا ہوگا، جس قدر اس ضعیفہ سے میں گلے لپٹنے کے لئے بیتاب تھا"

ایک اور واقعہ | میر محفوظ علی صاحب کے اس بیان سے راقم الحروف کو بھی ایک واقعہ یاد آگیا، کانپور میں محمد علی نے جب "علماء کانفرنس" اور "موتمر اسلامی" منعقد کرائی ہے تو ندوہ سے راقم سطور بھی اس میں شرکت کے لئے گیا تھا، شوکت صاحب اس زمانہ میں جنوبی افریقہ میں تشریف رکھتے تھے، لیکن عین انھیں تاریخوں میں وہ ہندوستان واپس تشریف لائے

تھے اور سیدھے کانپور پہنچے تھے، پنڈال میں شوکت صاحب آئے تو محمد علی اتنے عرصہ کی مفارقت کے بعد جس بیتابی، محبت اور جوش کے ساتھ شوکت صاحب سے بغلگیر ہوئے ہیں وہ منظر زبان وقلم بیان نہیں کرسکتی، نہ اس کی اثر آفرینی الفاظ وعبارت کا جامہ پہنکر اس صورت میں نمایاں ہوسکتی ہے، یہ ضرور ہے کہ وہ سین دیکھنے والے کی نظر سے ابتک محو نہیں ہوا ہے۔

مولٰنا عبدالماجد کے ساتھ ایک واقعہ

مولٰنا عبدالماجد دریابادی اپنا ایک واقعہ بیان فرماتے ہیں کہ محمد علی لکھنؤ آئے، راجہ (مہاراجہ) صاحب محمود آباد کے ہاں فروکش تھے، مولٰنا موصوف دریاباد سے صرف محمد علی کی ملاقات کے لئے تشریف لائے تھے، ابھی پورے طور پر لطف ملاقات بھی نہ حاصل ہونے پایا تھا کہ مکان سے ایک آدمی آیا، جس نے مولٰنا کی اہلیہ کی سخت اور خطرناک علالت کی اطلاع دی۔ قدرۃً مولٰنا ممدوح سخت پریشان ومضطر ہوئے، مہاراجہ صاحب محمود آباد اور دوسرے حاضرین مجلس نے ممدوح کو بہت کچھ تسلی دی، لیکن محمد علی کا اضطراب مولٰنا عبدالماجد سے کم نہیں تھا۔ اس خبر وحشت اثر نے محمد علی کی ساری نشاط ومسرت چھین لی، انھوں نے فوراً مولٰنا عبدالماجد صاحب کو واپس بھیجا اور برابر خط اور تار کے ذریعہ سے ان کی خیریت دریافت کرتے رہے اور جب تک وہ پورے طور سے صحت کی طرف سے مطمئن نہ ہوگئے یہ سلسلہ برابر جاری رہا

جذبانیت

جس شخص میں رقت ومحبت کا مادہ اس قدر کوٹ کوٹ کر بھرا ہو، ظاہر ہے وہ بہت زیادہ سریع الاحساس اور نازک جذبات کا ہوگا، چنانچہ محمد علی بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں تھے، ان پر جب جذبات غالب ہوتے تھے تو وہ قابو سے باہر ہوجاتے تھے اور کسی طرح بھی اپنے احساس وجذبات کو چھپا نہیں سکتے تھے، میر محفوظ علی صاحب کے معلومات سے اس عنوان کے ماتحت بھی بہت فائدہ پہنچا، وہ فرماتے ہیں:-

"محمد علی مرحوم بھی جذبات کا مجموعہ تھے، اور اسے خامی کہو یا پختگی، وہ اپنے جذبات کو ضبط نہیں کر سکتے تھے میں نے انقباضی اور انبساطی، دونوں حالتوں میں دیکھا مسلم یونیورسٹی کے سلسلہ میں جلسہ ہوا، راجہ محمود آباد نرم جماعت کے قائد تھے، اور محمد علی گرم جماعت کے روح رواں مگر صبح کو ان کی رائے میں نرمی آگئی، اس پر الہلال نے ایک مضمون لکھا، جس میں یہ شعر لکھ دیا۔

معشوق ما بہ مذہب ہر کس موافق است   با ما شراب خورد و بزاہد نماز کرد

محمد علی نے یہ مضمون دیکھا تو چونکہ ان کے خیال سے واقعات کو الٹ پھیر کر دکھایا گیا تھا، لہذا غصہ سے عجیب حالت تھی کہنے لگے، محفوظ اس کے جواب میں کوئی شعر بتاؤ، میں نہ شاعر نہ شعرا کے کلام کا حافظ، بھلا ایک منٹ میں شعر کیا بتا سکتا تھا، مگر ان کی حالت دیکھ کر، کہہ دیا، اچھا ابھی بتاتا ہوں، اتفاق کی بات سعدی کا ایک شعر ذہن میں آگیا، اگرچہ بہ تکلف مناسب موقع ہو سکتا تھا مگر اس وقت اقتضائے مصلحت یہی تھا کہ شعر پڑھ ضرور دیا جائے چنانچہ میں نے کہا ؎

بر کفے جام شریعت بر کفے سندان عشق   ہر ہوس ناکے نداند جام و سنداں باختن

یا تو وہ حالت تھی کہ غصے میں آنکھوں سے شعلے برس رہے تھے یا دفعتًہ منہ سے پھول جھڑنے لگے، مسکرائے، ہنسے، قہقہہ لگایا، پھڑک اٹھے، اور جوش میں آکر مجھے گود میں اٹھا کر سارے ہال میں گھومتے پھرے۔"

ہر کرن ناتھ کے ساتھ ایک واقعہ | اس جگہ بھی راقم الحروف کو ایک واقعہ یاد آگیا، وہ بھی اپنی نوعیت کے اعتبار سے دلچسپ ہے، یہ واقعہ اس زمانہ کا ہے جب آویزش نجد و حجاز کا

مسئلہ بہت زور سے ہندوستان کی اسلامی سیاسیات میں ایک ہنگامہ پیدا کر رہا تھا، محمد علی سے اوران کے مرشد مولانا عبدالباری مرحوم سے اختلاف شدید رونما ہو چکا تھا، ادھر دوسری طرف ہندو مسلم تعلقات بھی از حد کشیدہ ہو رہے تھے اور شدھی و سنگٹھن اور تبلیغ و تنظیم میں پورے طور سے ٹکر ہو رہی تھی۔

محمد علی ایک جلسہ کے سلسلہ میں لکھنؤ آئے اور چودھری خلیق الزماں صاحب کے دولتکدۂ خیالی گنج میں مقیم ہوئے، ٹھاکر (راجہ) نواب علی خاں صاحب نے جو محمد علی کے سخت مخالف تھے، فرنگی محل میں ایک جلسہ کر کے محمد علی کو اظہار خیال کی دعوت دی، مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی مدظلہ نے مولانا عبدالرحمٰن صاحب نگرامی مرحوم کے ذریعہ ندوہ سے دو ایسے طالب علم منگوائے جو نسبتہً تیز دست اور زود نویس ہوں اس سلسلہ میں مجھے خیالی گنج میں محمد علی کے جائے قیام پر حاضری کا شرف حاصل ہوا، وہ جلسہ تو نہ ہو سکا، مگر کئی گھنٹہ تک محمد علی سے شرف حضوری حاصل رہا، اسی اثناء میں لکھنؤ کے مشہور، سابق، سیاسی کارکن، پنڈت ہرکرن ناتھ مصرا بیرسٹرایٹ لا محمد علی سے ملنے تشریف لائے، محمد علی کو چودھری صاحب اور پنڈت جی سے جو اختصاص تھا، اس کی بنا پر وہ بیساختہ اٹھے اور فرمایا "دیکھو "مسلم ہندو نما" آرہا ہے"، اور جب وہ قریب آگئے، تو محمد علی بغلگیر ہو کر، بے تحاشہ اور مسلسل پنڈت جی کے رخساروں پر اپنی "صدق وفا" کی مہر لگاتے رہے، اسی طرح بمبئی میں غازی امان اللہ خاں کے رخسار بھی اس کشمکش" کے آماجگاہ بن چکے ہیں!

امان اللہ خاں کے ساتھ

باب ۱۹

اخلاق و رواداری

محمد علی ان لوگوں میں تھے جو "معاف" تو کر دیتے تھے، لیکن "بھولتے" کبھی نہیں تھے، سیاسی زندگی میں بار ہا انھیں اپنے عزیز دوستوں اور رفیقوں سے اختلاف کرنا پڑا لیکن ایسا بہت کم ہوا کہ ذاتی تعلقات اور مراسم میں بھی کبھی فرق آیا ہو، اور یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جس میں محمد علی اگر منفرد نہیں تو ممتاز ضرور ہیں۔

سر یعقوب کا بیان | سر محمد یعقوب فرماتے ہیں:

"مجھ سے اور محمد علی سے اگرچہ بعض اوقات پبلک معاملات میں اختلاف رائے بھی ہوتا تھا اور آپس میں خوب نوک جھونک رہتی تھی، لیکن ان کے اور میرے ذاتی تعلقات اور باہمی معاملات میں کبھی فرق نہیں آیا، اور ملاقاتوں میں وہی گرم جوشی اور بے تکلفی قائم رہی، جو طالب علمی کے زمانہ سے شروع ہوئی تھی۔"

سجاد حیدر سے تعلقات | سید سجاد حیدر صاحب یلدرم سے محمد علی کے نہایت عزیزانہ تعلقات طالب علمی کے آغاز ہی سے تھے اور عجیب بات یہ ہے کہ دونوں کی راہ عمل الگ تھی، جس زمانہ میں محمد علی علیگڑھ کو توڑ کر جامعہ ملیہ قائم کر رہے تھے اور اپنی "اولڈ بوائز لاج" سے یہ نوک سنگین نکالے جا رہے تھے، اس وقت سجاد حیدر صاحب پرانے کالج کے امنا کی طرف سے محمد علی کو "سمجھانے" تشریف لائے تھے کہ اپنی حرکت سے باز آجاؤ

لیکن محمد علی تحریک خلافت کے علمبردار رہے، جامعہ ملیہ قائم کی، یونیورسٹی اور ارباب یونیورسٹی سے سخت ترین مخالفتیں رہیں، سب کچھ ہوا لیکن محمد علی اور سجاد حیدر کے مراسم وتعلقات تادم مرگ اسی طرح قائم رہے جس طرح علی گڑھ کے زمانہ طالب علمی میں تھے۔

مسٹر جناح کے ساتھ ایک واقعہ غالباً ۱۹۲۵ء میں آنریبل رضا علی کی صدارت میں بمقام بمبئی مسلم لیگ کا جلسہ ہوا تھا، محمد علی اور مسٹر جناح بھی اس میں شریک تھے، دوران مباحثہ میں ان "محمد علیین" میں خوب خوب اختلافات ہوئے، نونک جھونک ہوئی طعن وتعریض ہوئی، سب ہی کچھ ہوا لیکن جب جلسہ ختم ہو گیا تو خود محمد علی اٹھے اور نہایت محبت اور گرمجوشی سے مسٹر جناح کو سینہ سے لگایا اور ان کے رخساروں کو بوسہ دیا۔

مسٹر داس کا ایک واقعہ مسٹر سی، آر، داس نے گاندھی جی کے سیاسی پروگرام "ترک موالات" سے ناگپور میں سخت اختلاف کیا تو طرح طرح کے اثرات ان پر ڈالے گئے لیکن محمد علی نے اپنے تعلقات وتوقعات کی بنا پر داس کو نہ صرف پروگرام کے قبول کر لینے پر مجبور کیا بلکہ اس پر بھی سخت اصرار کیا کہ وہ اپنی پریکٹس ترک کر دیں، داس ان دونوں شقوں سے اختلاف رکھتے تھے، داس کے اور محمد علی کے دوستوں نے بھی محمد علی کو سمجھایا کہ وہ داس کو ترک وکالت پر مجبور نہ کریں، لیکن محمد علی اپنی طے کی ہوئی بات سے کب باز آنے والے تھے، آخر کار محمد علی کا خود بیان ہے کہ:

"ایک شب کو رات کے تین بجے کے قریب جب میں مہاتما جی کے پاس سے داس کے پاس آیا تو داس نے مجھے علٰحدہ لیجا کر کہا "محمد علی تمہاری رائے ٹھیک تھی میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ بیرسٹری ترک کر دوں جس وقت داس نے مجھے اپنا یہ فیصلہ سنایا، میں نہیں کہہ سکتا کہ مجھے کس قدر مسرت ہوئی

میں اُس وقت واس سے لپٹ گیا، اور اس کے گالوں کو بار بار بوسے
دیتا رہا۔"

ایک دلچسپ "مقابلہ" محمد علی ارباب علیگڑھ کی آنکھوں میں ہمیشہ کھٹکے، ان کی آزادی
رائے اور حریت ضمیر وہ چیز تھی جس نے بہتوں کو ان کا دشمن بنا دیا تھا لیکن محمد علی ان باتوں
سے آزردہ خاطر کبھی نہیں ہوئے بلکہ نہایت خندہ پیشانی سے انھوں نے اس قسم کی تمام
مخالفتوں کا مقابلہ کیا۔

اسی قسم کا ایک دلچسپ مقابلہ یہ ہے کہ علیگڑھ کی ٹرسٹی شپ کے لئے محمد علی کا نام پیش
ہوا، ارباب کالج نے مخالفت کی، علیگڑھ کے انگریزی اسٹاف نے مخالفت کی اور تعجب یہ
ہے کہ کالج کے سکرٹری نواب اسحٰق خاں مرحوم نے مخالفت کی، اور ان کے بجائے میجر
سید حسین بلگرامی کا نام پیش کر دیا گیا۔

پہلے تو محمد علی پر یہ زور ڈلوایا گیا کہ وہ میجر بلگرامی جیسی صاحب علم و فضل شخصیت
کے مقابلہ میں خود ہی دست بردار ہو جائیں لیکن محمد علی نے صاف انکار کر دیا۔

اب دوسری زبردست ترکیب یہ چلی گئی کہ ہز ہائنس نواب سر حامد علی خاں مرحوم
والی رامپور سے زور ڈلوایا گیا کہ محمد علی اس مقابلہ کے لئے نہ کھڑے ہوں، چنانچہ ایک روز
ہز ہائنس نے نواب اسحٰق خاں، شوکت صاحب اور بعض دوسرے لوگوں کی موجودگی
میں اس کا تذکرہ کیا اور اپنی خواہش ظاہر کی کہ محمد علی مقابلہ نہ کریں تو اچھا ہے، لیکن
اب محمد علی کو اور اصرار ہو گیا اور وہ کسی طرح بھی "دستبرداری" پر راضی نہیں ہوئے
نتیجہ یہ ہوا کہ مقابلہ ہوا اور نہایت دلچسپ و کامیاب! فیصلہ یہ ہوا کہ محمد علی ممبر منتخب ہو گئے!
لیکن اب محمد علی کی بلندی اخلاق، وسعت ظرف اور علوئے ہمت ملاحظہ ہو

کہ کامیابی کے بعد وہ خود سید بلگرامی کے علم و فضل کے مقابلہ میں مستعفی ہو گئے اور اپنی جگہ ان کے لئے خالی کر دی۔

یہ تھا محمد علی کا کردار، یہ تھی محمد علی کی رواداری!

لاجپت رائے سے محمد علی کو اپنی زندگی میں کتنا سخت و شدید اختلاف رہا، اس سے ہر اخبار بیں شخص واقف ہے لیکن بایں ہمہ لاجپت رائے کی خوبیوں کا اعتراف بھی ہمیشہ فرماتے رہے۔

سائمن کمیشن کے سلسلہ میں لاجپت رائے نے اسمبلی میں دسمبر ۲۷ء ایک مدلل زبردست اور دلنشیں تقریر کی تھی جس میں ہندو مسلم اختلافات کی ساری ذمہ داری گورنمنٹ پر ڈالی تھی محمد علی کو انکی تقریر اتنی پسند آئی کہ انھوں نے ہمدرد میں کئی مقالات اس موضوع پر سپرد قلم فرمائے اور لالہ جی کی تقریر کی دل کھول کر تعریف و توصیف اور مدح و ستائش کی۔

۲۸ء میں سائمن کمیشن کی آمد کے سلسلہ میں لاجپت رائے لاہور میں پولیس کے ہاتھوں لاٹھیاں کھاکر کچھ عرصہ کے بعد وفات پا گئے۔ محمد علی اس زمانہ میں بغرض علاج یورپ گئے ہوئے تھے لیکن واپس آتے ہی انھوں نے ہندوستان میں جو سب سے پہلا بیان دیا ہے اس میں انھوں نے لاجپت رائے کی وفات کو قابل رشک بتایا، اور اپنے لئے تمنا کی کہ کاش ایسی سعادت انھیں بھی حاصل ہوتی۔

مالوی جی کا واقعہ مالوی جی کی مہاسبھائی ذہنیت کا محمد علی نے ہمیشہ ماتم کیا، اور اپنی ان کی راہ عمل ایک ہونے کے باوجود جب کبھی ان کے اور انکے مقاصد میں تصادم ہوا، تو انھوں نے سخت سے سخت مخالفت کی اور کبھی کوئی رعایت نہیں کی، لیکن سائمن کمیشن کی آمد کے سلسلہ میں جب مالوی جی جیسے معتدل بزرگ بھی اس کے مخالف رہے اور مدراس

کانگریس میں انھوں نے ایک موثر اور دلگداز تقریر کی اور گورنمنٹ کی پالیسی "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی تشریح کی، اور اپنی بے بسی کا اظہار کیا کہ ہم ہندوستانی کس طرح "اشاروں" پرناچ رہے ہیں، محمد علی کو مالوی جی کی یہ دلگداز تقریر بہت مرغوب خاطر ہوئی اور انھوں نے مالوی جی کے قدم لے لئے اور اپنی تقریر میں فرمایا کہ اگر مالوی جی نے اپنی سچی ذہنیت کا اظہار کیا ہے تو حضرات! سائمن کمیشن کو آنے دیجئے ہمیں اس کی کوئی پرواہ نہیں ہے جس طرح مصر میں ملنر کمیشن سے کہدیا گیا تھا کہ جو کچھ پوچھنا ہو سعد پاشا زاغلول سے پوچھو، اسی طرح ہم بھی کہدیں گے کہ ہم کچھ نہیں جانتے، اقلیتوں کے امین مالوی جی ہیں، جو کچھ ہو ان سے پوچھو"

سر عبدالقیوم کا واقعہ ساردابل کے سلسلہ میں محمد علی سے اور سر عبدالقیوم و مسٹر جناح سے ایک موقعہ پر مباحثہ ہونے لگا، رمضان کا زمانہ تھا، تھوڑی دیر کے بعد وہ "گرمیٔ بحث" نے دوسری صورت اختیار کرلی لیکن خیر تھوڑی ہی دیر کے بعد یہ تندی و ترشی ختم ہوگئی لیکن محمد علی کے دل پر اس کا اثر نہیں ہوا وہ مسٹر جناح اور سر عبدالقیوم سے حسب سابق ملتے رہے اور اپنے تعلقات میں کسی قسم کا فرق نہیں آنے دیا۔

یہ تھا، محمد علی کے اخلاق و رواداری کا ایک دھندلا سا مرقع!

باب ۲۰

ایثار و استغنا

محمد علی کی پرورش اگرچہ ناز و نعم میں ہوئی، اور ان کا ماحول ہمیشہ ایسا رہا جس میں روپیہ کی پرستش ہوتی تھی اور خود ان کی طبیعت بھی کسب زر سے نفور نہیں تھی، لیکن پھر بھی ان کی طبیعت میں شاہانہ استغنا اور غیر معمولی ایثار و سیر چشمی کا جوہر مضمر تھا۔

آکسفورڈ کے "آنرز میں گریجویٹ" کو دنیا کی دلفریبیوں نے قدم قدم لبھایا اور سیم و زر کے انباروں نے ان کے قدموں کو چھوا، لیکن دل اتنا مستغنی تھا طبیعت میں ایثار کا ایسا مادہ تھا کہ کبھی بھی اس کی پروا نہیں کی، اگر انھیں صرف روپیہ کی ہوس ہوتی تو بڑودہ سے وہ مستعفی نہ ہوتے، رامپور کی ملازمت نہ ترک کرتے، جاؤرہ کی وزارت کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے، بھوپال کی چیف سکریٹری شپ اپنے قبضہ میں رکھتے یا پھر سرکاری مناصب میں سے کسی رتبۂ بلند پر سرفراز ہوتے۔

لیکن طبیعت کو ان چیزوں سے کوئی ایسا لگاؤ نہیں تھا کہ ان کی خاطر وہ اسی گورکھ دھندے میں پھنس جاتے، اور ملک و قوم کی جو خدمت ان سے بن آنے والی تھی اسے نذر تغافل کر دیتے۔

انھوں نے ایسا نہیں کیا، روپیہ کی انھیں ہمیشہ ضرورت رہی، مصارف ان کے ہمیشہ بڑھے چڑھے، آمد و خرچ کا توازن وہ کبھی نہیں قائم کر سکے، اس لئے انھوں نے سر آغا خاں سے امداد بھی لی، اور مہاراجہ صاحب محمود آباد سے بھی، مہاراجہ الور سے

بھی، اور سیٹھ عبداللہ ہارون سے بھی اپنی ضروریات کے لئے ان کا دست سوال ہمیشہ دراز رہا، لیکن استغنا و ایثار کا یہ عالم تھا کہ آغا خاں سے اختلاف شدید کیا اور ان کی اعانت سے محروم ہو گئے، مہاراجہ محمود آباد سے جب ان کی رائے ٹکرائی، انھوں نے بلا تامل ان کی مخالفت کی اور بالآخر انھوں نے بھی اپنا دست اعانت کھینچ لیا، ڈاکٹر انصاری نے بہت زیادہ محمد علی کی مدد کی، لیکن جب حق و ضمیر کا معاملہ آن پڑا تو محمد علی سے زیادہ اصول کے معاملہ میں ڈاکٹر انصاری کی مخالفت دائرہ انسانیت میں رہ کر کسی نے نہیں کی، محمد علی ہمیشہ فقیر رہے لیکن للکھ لٹ بھی رہے، ہمیشہ حاجتمند رہے لیکن بے نیاز بھی رہے، یعنی وہ رائے فروش کبھی نہیں رہے، گو ان کا دست سوال ہمیشہ احباب و شناسا کے سامنے دراز رہا۔

اور انسان کے کردار کا یہی زوردار پہلو ہے کہ وہ حاجتمند ہو، اپنی ضروریات کے لئے دوسروں سے طالب اعانت ہو، لیکن اصول کے معاملہ میں کبھی ان باتوں کی پروا نہ کرے اور مردانہ وار اپنے اختلافات کا اظہار کرے۔

محمد علی کی سیرت اسی اصول کا ایک نمونہ تھی۔

بیگم غلام حسین سے سلوک | راجہ غلام حسین محمد علی کے دست راست تھے، کامریڈ کی ترقی اور شہرت میں راجہ مرحوم کی کوششیں کسی طرح نظر انداز نہیں کی جا سکتیں، اپنے ایسے عزیز رفیق کار سے محمد علی کو محبت بھی بہت زیادہ تھی، چنانچہ ایک اتفاقی حادثہ سے راجہ غلام حسین کا انتقال ہوا تو محمد علی نے ان کی یاد میں نہایت درد انگیز اور موثر مرثیہ لکھا، اور جب نظر بندی سے رہا ہوئے نظر بندی کے زمانہ میں کافی نقصان اٹھا چکے تھے، اور تمام کاروبار تباہ ہو گیا تھا لیکن بیگم غلام حسین کی اعانت سے وہ کیسے باز رہ سکتے تھے، چنانچہ اپنی تہیدستی اور پریشان حالی کے باوجود بیگم غلام حسین کو پانچ سو

کی رقم اور ایک مشین پریس عطا فرمائی، اس پر ایک شخص نے اعتراض بھی کیا لیکن وہ کب باز رہ سکتے تھے؟

زمیندار کی امداد ہندوستان کے اخبارات میں "زمیندار" نے قوم وملک کی راہ میں جن شدائد ومصائب کا مقابلہ کیا ہے اور جس حیرت انگیز استقامت اور استقلال کا ثبوت دیا ہے وہ ہر شخص مانتا ہے، محمد علی کو اس کی پالیسی اور اس کے انداز صحافت سے ہمیشہ شدید اختلاف رہا۔ لیکن انھوں نے اس کے مصائب ونوائب پر کبھی خندہ نہیں کیا، بلکہ ہمیشہ اس کی اعانت کی، اس کے لئے چندہ جمع کیا اور خود اپنی مفلس اور قلاش جیب سے بھی جو کچھ ہو سکا مدد کی۔

خلافت کمیٹی کا سب سے پہلا چندہ محمد علی جس وقت نظر بند کئے گئے ہیں اور پورے پانچ سال تک انھوں نے یہ ایام محن اسی قید میں بسر کئے ہیں، اس وقت گورنمنٹ ہند کی طرف سے انھیں ڈھائی سو کی حقیر رقم ملتی تھی اور چھند واڑہ میں محمد علی مع اپنے پورے خاندان کے مقیم تھے، ظاہر ہے کہ یہ مختصر رقم اتنے وسیع کنبہ کے لئے کیونکر کافی ہو سکتی تھی، ذرائع آمدنی بالکل مسدود تھے، "ہمدرد" کا مرثیہ بند کر دئے گئے تھے، پریس سے ضمانت طلب ہو چکی تھی، اور کوئی دوسرا ذریعہ آمدنی نہیں تھا، مجبوراً قرض سے کام چلایا گیا، پھر مراد آباد میں جو جاگیر تھی رفتہ رفتہ وہ ختم ہو گئی، غرض ان مصائب کے ساتھ محمد علی نے اپنے ایام نظربندی ختم کئے، اور جب وہ رہا ہوئے ہیں تو روٹی کو محتاج تھے، قرض میں بال بال بندھا ہوا تھا، دہلی کے مکان کا کرایہ بھی برسوں سے ادا نہیں ہوا تھا، ہر طرح کی مصیبت اور پریشانی کا سامنا تھا۔

جب رہا ہوئے تو قوم نے ان کی عزت افزائی بھی کی اور ان کے نقصانات کی

تلافی بھی کرنا چاہی، یعنی ڈاکٹر انصاری اور حکیم اجمل خاں مرحوم کی کوششوں اور دوسرے ہمدردان خلافت کی سرگرمیوں سے ایک رقم خطیر جمع ہوگئی اور طے کیا گیا کہ جب علی برادران دہلی آئیں تو وہ رقم ان کی خدمت میں پیش کردی جائے تاکہ وہ اس سے اپنا قرض ادا کرسکیں اور اپنا کام چلا سکیں۔

چنانچہ جب وہ دہلی پہنچے تو یہاں ان کا نہایت عدیم المثال شاہانہ استقبال ہوا اور ایک ہزار اشرفیوں کا ہار ان کے گلے میں ڈالا گیا، لیکن ایثار، استغنا، توکل اور سیر چشمی کا یہ عدیم النظیر نمونہ دیکھنا! کہ اس گدائے بے نوا نے اسی وقت اشرفیوں کے اس ہار کو سترہ ہزار میں فروخت کیا اور اسی سلسلہ میں دوسری جو رقمیں جمع ہوئی تھیں انھیں جمع کیا کل انتیس[۱۹] ہزار کی گراں قدر رقم ہوئی جس میں سے ایک پائی بھی نہیں لی اور وہ سب کی سب خلافت فنڈ میں داخل کر دی گئی، یہ خلافت کمیٹی کا سب سے پہلا چندہ تھا! جو دو فاقہ مست لیکن دریا دل بے نواؤں کی طرف سے پیش کیا گیا تھا!

چاندی کا سٹ اسی طرح غالباً حیدرآباد میں ایک موقعہ پر ایک قدردان اور عزیز دوست نے "ایک نہایت قیمتی، بھاری چاندی کا نہایت خوبصورت چار کا سٹ، مع چاندی کی چائے کی پیالیوں کے پیش کیا، مگر جس کو اب جام سفال نے اپنا گرویدہ بنالیا ہو، وہ چاندی کے برتنوں میں چائے کس طرح پی سکتا تھا، اس لئے وہ خلافت کو دیدیا گیا۔"

یہ تھا محمد علی کی سیر چشمی اور دریا دلی کا ایک معمولی سا نمونہ

ندوہ کو چندہ دینا کانپور میں دار العلوم ندوۃ العلماء کا سالانہ جلسہ حکیم اجمل خاں مرحوم کی صدارت میں منعقد ہوا، اپنی خصوصیت کے اعتبار سے وہ عجیب وغریب جلسہ تھا ایک طرف تو اس میں بڑے بڑے سیاسی زعما، مثلاً ظفر علی خاں صاحب، ڈاکٹر کچلو حسرت

موہانی وغیرہ موجود تھے دوسری طرف علما، وفضلا کی ایک خاصی جماعت بھی رونق افروز مجلس تھی، مثلاً حکیم اجمل خاں، قاری شاہ سلیمان پھلواروی وغیرہ، تیسری طرف اس میں حامیان تعاون کی بھی ایک خاصی جماعت موجود تھی، مثلاً حافظ ہدایت حسین صاحب ممبر گول میز کانفرنس سر رحیم بخش، اس "مجموعہ اضداد" میں محمد علی کی شخصیت سب سے نمایاں تھی!

دوسرے دن جب عام چندہ شروع ہوا تو صاحب مقدرت لوگوں نے یا تو چندہ دینا شروع کیا اور یا اعلان کرنا شروع کیا، سب سے پہلے تو محمد علی نے اپنے مخصوص عقیدتمندوں سے "بہرا چندہ" کا اعلان کرایا اور پھر اپنی بے بضاعتی اور بے توائی کے باوجود غالباً ڈیڑھ سو روپیہ سالانہ چندہ کا اعلان فرمایا۔

ایک اور واقعہ ۱۹۲۸ء میں جب محمد علی عازم انگلستان ہوئے ہیں، اس زمانہ میں مسز سروجنی نائڈو بھی وہیں تشریف رکھتی تھیں، لندن میں مسٹر سکلاتوالا کی کوششوں سے ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں سائمن کمیشن کے تقرر پر مسز سروجنی نائڈو اور محمد علی نے ولولہ انگیز تقریریں کیں اور ہندوستانی مسائل و معاملات پر گورنمنٹ کے اس غیر مدبرانہ اور ایک اخبار کی زبان "مضحکہ خیز" طرز عمل پر سخت نکتہ چینی کی، اسی وقت اسی جلسہ میں ایک انجمن کی تشکیل بھی ہوگئی جس کا مقصد یہ قرار پایا کہ وہ ہندوستان کے نقطۂ نظر اور برطانوی ہوس استعمار کے متعلق پروپگنڈا کرے۔

محمد علی اگرچہ دوسرے کے خرچ پر ولایت اپنا علاج کرانے گئے تھے، لیکن اس موقعہ پر ان کا فیاض دل بھی متاثر ہوا اور انھوں نے ایک خاصی رقم چندہ میں عطا فرمائی۔

باب ۲۱

رائے عامہ پر رائے

رائے عامہ پر نظریہ

محمد علی عقیدۃً جمہوری خیال کے آدمی تھے، ملوکیت اور استبداد سے انھیں قطعی نفرت تھی، خود اپنی ذات کے لئے بھی وہ یہ نہیں پسند کرتے تھے کہ محض ان کی شخصیت سے مرعوب ہو کر ان کی ہاں میں ہاں ملادی جائے!

وہ جمہور کو آزاد خیال بنانا چاہتے تھے، ان کی خواہش تھی کہ جمہور میں حریت رائے اور اور آزادی ضمیر کے جذبات پیدا ہوں، لوگ خود معاملات کی حقیقت و اصلیت اور اسباب و علل پر غور کرنا سیکھیں اور پھر خود ہی اپنے دماغ کی ہدایت اور اپنے ضمیر کی رہنمائی میں رائے دیں!

یہی وجہ ہے کہ محمد علی نے کبھی اپنی شخصیت کا واسطہ دلا کر لوگوں سے رائے نہیں حاصل کی، نہ اپنی مرعوب کن شخصیت کو بیچ میں ڈال کر لوگوں سے اپنی حمایت میں رائے لینا چاہی، وہ چاہتے تھے کہ لوگ سحر کاری سے مرعوب و متاثر نہ کئے جائیں بلکہ ان میں پختہ کاری کے عناصر ہوں، کہ ملک و قوم کی ترقی کے لئے یہ ازبس ضروری ہے۔

لاہور کا ایک واقعہ

نجد و حجاز کی ہنگامہ آرائیوں کے زمانہ میں محمد علی کو بار بار التجائیں کر کر کے لاہور طلب کیا گیا، اس لئے کہ وہاں کے "احرار" اس صورت حال پر قابو نہیں پا سکے تھے جو وہاں کے خوش عقیدہ حضرات نے پیدا کر دی تھی، پھر نت نئی خبروں سے اور زیادہ عوام کو سلطان ابن سعود کے متعلق گمراہ کیا جاتا تھا کہ آج قبۂ خضرا پر حملہ ہوا چاہتا ہے، اور آج

فلاں بزرگ کی قبر مسمار کر دی گئی اور آج "حضرت" ابوطالب کا مزار کھود کر پھینک دیا گیا!

ان حالات میں مولانا ظفر علی خاں صاحب نے انھیں لاہور طلب کیا، محمد علی گئے جلسہ کی شرکت کے لئے مولانا احمد سعید صاحب اور مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری بھی پہنچ گئے تھے، محمد علی، ظفر علی خاں صاحب کے ہاں فروکش ہوئے اور انھیں کی صدارت میں جلسہ کیا گیا۔

مولانا احمد سعید کی تقریر حالات حاضرہ پر مولانا احمد سعید صاحب نے ایک تقریر کی جو اپنے انداز کے اعتبار سے بہت پسند کی گئی۔

بخاری صاحب کی تقریر پھر پنجاب کے مشہور خطیب مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری نے اپنی پوری شان خطابت سے تقریر کی، ان کی تقریر کیا تھی، سحر و اعجاز تھی، تمام مجمع گوش بر آواز تھا، اور یا تو مخالفت ہو رہی تھی یا موافقت ہونے لگی کہاں "غالب کے پرزے اڑنے کی خبر گرم تھی" اور کہاں ایک دوسرا ہی "تماشہ" ہونے لگا۔

محمد علی اس کامیابی سے بہت مسرور ہوئے کہ مخالفت کے اس شدید اندیشہ کے باوجود نہ صرف یہ کہ مخالفت نہیں ہوئی بلکہ صدارت احمد سعید صاحب کی خطابت اور سب سے بڑھ کر عطاء اللہ شاہ کی سحر کاری نے یہ رنگ پیدا کر دیا کہ مجمع مٹھی میں آگیا، لیکن اس واقعہ سے محمد علی کو اپنی "کامیابی" کا یقین نہیں آیا۔

محمد علی کا "وعظ" انھوں نے بخاری صاحب کو مخاطب کر کے فرمایا:

"بھائی: میں تمھاری تقریر سے بہت خوش ہوا تم نے سامعین کو بالکل مسحور کر دیا تھا، اگر اس کے بعد تم ان سے کوئی غلط کام بھی کرانا چاہتے تو وہ فوراً کر بیٹھتے، جو قدرت تم کو اپنی زبان پر ہے وہ خداداد ہے اور خدا کی ایک بڑی نعمت ہے، مگر ایک بڑی خطرناک نعمت ہے اور تمھاری مسئولیت اس کے

باعث اور بڑھ گئی ہے جب تک تم اسے حق کی راہ میں استعمال کروگے، فلاح دارین حاصل کروگے لیکن اگر کبھی یہ باطل کی راہ میں استعمال کی گئی تو ہزاروں بندگان خدا کے گمراہ کرنے کے لئے بھی کافی ہوگی لوگوں کا مسحور کرنا اچھا نہیں، سحر کاری میں نہ ساحروں کے لئے نہ مسحوروں کے لئے فلاح ہے ضرورت اس کی ہے کہ ہر مسئلہ کے دونوں پہلو سامعین کے سامنے پیش کر دو، اور انھیں سے اس کا حل اور فیصلہ کراؤ، اس طرح تم عوام کی قوت فیصلہ کو ترقی دے سکوگے ورنہ عوام کالانعام مشہور ہیں، آج تم نے انھیں مسحور کر دیا تو کل اسی چرب زبانی اور ظرافت کے باعث ان پر کسی دوسرے کا جادو بھی چل سکے گا اور اس طرح انھیں حق و باطل کی تمیز تا قیامت نہ آئے گی، کبھی تمہارے ساتھ ہوں گے کبھی تمہارے مخالفین کے، آج تم کو تخت پر بٹھائیں گے، کل تمہیں اتار کر دوسرے کو سریر آرا بنا دیں گے۔"

رائے عامہ پر محمد علی کے یہ خیالات ہر زعیم قوم اور سالک راہ قیادت کے لئے ہمیشہ شمع ہدایت کا کام دیں گے۔

باب ۲۲

مایوسی

آخری ایام حیات میں محمد علی بہت زیادہ مایوس ہو گئے تھے، وہ جانتے تھے کہ آج ان کی بات سنی نہیں جا رہی ہے، کل تک جو لوگ محمد علی کے لئے فرش راہ ہوتے تھے، وہی آج تیز و تند نظروں سے دیکھ رہے ہیں، کل جو لوگ محمد علی کی قیادت کے گن گایا کرتے تھے، آج وہ اپنے تئیں خود سب سے بڑا لیڈر سمجھ رہے ہیں، کل جن لوگوں کی زبان محمد علی کے ذہن و دماغ، زبان و قلم اور جوہر قیادت کے بیان میں تر ہو رہی تھی، آج انھیں کے نزدیک محمد علی کی آواز بالکل بے وقعت تھی، کل تک علی برادران کی عقیدتمندی اور پیروی رواج عام کے "فیشن" میں داخل تھی لیکن، انقلاب دہر دیکھئے! آج ان کی مخالفت، حریت ضمیر کا سب سے بڑا ثبوت تھی۔

ایک زعیم کے لئے یہ حالات حد درجہ حوصلہ شکن اور ہوش ربا ہوتے ہیں اس کی قوت فہم و فکر زائل ہو جاتی ہے۔ وہ "مایوس" ہو کر عزلت گزین ہو جاتا ہے یا کم از کم اپنی زبان پر مہر سکوت لگا لیتا ہے۔

لیکن محمد علی اس کلیہ سے بھی مستثنیٰ تھے، انھیں اگرچہ اس کا احساس تھا کہ اب ان کی قدر کم ہو گئی ہے اور لوگ ان کی ہر ہر طرح سے مخالفت کر رہے ہیں لیکن پھر بھی اپنی قوت عمل پر انھوں نے تعطل کبھی نہیں طاری کیا، اور برابر سرگرم جہد و عمل رہے تا آنکہ موت کے زبردست ہاتھ نے ان کی سرگرمی کا رکا خاتمہ کر دیا۔

محمد علی کا بیان | ایک موقعہ پر محمد علی نے خود ان ناسازگار اور دل شکن حالات کا اعتراف کیا ہے وہ کہتے ہیں۔

"مجھ سے زیادہ اسے کوئی محسوس نہیں کرتا کہ ہندوستان میں میرے ہم خیال بہت کم ہیں اور جو میرے ہم خیال ہیں بھی وہ بھی عملاً میرے ساتھ تعاون کی زحمت گوارا نہیں فرماتے کچھ میرے لئے دعا کر لیا کرتے ہیں، زیادہ تر لائق ہیں جو میرے ہم خیال نہیں وہ خود تو اس کی کیا معذرت کرتے کہ کیوں ہم خیال نہیں ہیں، لیکن طرفہ تر یہ ہے کہ الٹی مجھ سے شکایت کرتے ہیں کہ تو ہمارا ہم خیال کیوں نہیں ہے؟ اور جس چیز کو اپنے لئے استقامت اور آزادی رائے کے نام دیتے ہیں میرے لئے اسی چیز کو ضد اور خود رائی کے لقب عطا فرماتے ہیں۔"

ایک دوسرا بیان | فتنۂ راجپال کے زمانہ میں محمد علی کی پنجاب نے بہت سخت مخالفت کی تھی، لیکن محمد علی کے حامیوں نے لاہور میں ایک جلسہ محمد علی کی صدارت میں کرنا چاہا محمد علی آمادہ بھی ہو گئے، ایک صاحب نے محمد علی کی روش پر نکتہ چینی کرتے ہوئے انھیں چند اہم "مشورے" دئے کہ یہ کام کیجئے گا اور وہ کام نہ کیجئے گا، اس کی حمایت کیجئے گا اس کی مخالفت کیجئے گا، اس کے ہاں جائیے گا اور اس سے ملئے گا بھی نہیں۔

محمد علی نے اس "ہدایت نامہ" کو اپنے اخبار میں شائع کر دیا، اور حسب ذیل رائے کا اظہار کیا۔

"ملاحظہ ہو کہ یہ خط ایک ایسے شخص کا لکھا ہوا ہے کہ جو مجھے "محترم" بھی کہتا ہے اور اپنے تئیں میرا "عقیدتمند" بھی ظاہر کرتا ہے، لیکن سارا خط ایسا ہے کہ

مجھ سے کاتب کے "احترام" کا پرزور مطالبہ کرتا ہے اور مجھے اس کا "عقیدت مند" بنانے پر مصر ہے "احکام عشرہ ربانی" کے انداز میں میرے لئے احکام صادر فرمائے گئے ہیں کہ یہ ضرور کرنا اور یہ ہرگز نہ کرنا یہی وہ "نیم حکیم خطرۂ جان" اور "نیم ملا خطرۂ ایمان" ہیں جو آج مسلمانوں اور ہندوؤں کو گمراہ کر رہے ہیں یہی وہ تعلیم یافتہ حضرات ہیں جو اپنے زعم باطل کے باعث "پبلک" بن بیٹھے ہیں اور خادمان ملک وملت کو دبانا، ڈرانا، دھمکانا اور لالچ دلانا چاہتے ہیں، ان کو راضی کر لیجئے پھر آپ کی "لیڈری" مسلم، یہ اور ان کے بنائے ہوئے "لیڈر" ہی وہ لوگ ہیں جن کی شان میں آیا ہے کہ "پیران نمی پرند، مریداں می پرانند" میں ایسی پیری سے باز آیا، اور ایسے مریدوں کو دور ہی سے سلام کہتا ہوں۔"

مدیر انقلاب کی روایت | انقلاب کے مدیر روایت فرماتے ہیں کہ:

"(محمد علی) نے دہلی میں ایک دوست سے دوران گفتگو میں فرمایا تھا کہ افسوس مسلمانوں نے میری قدر نہ کی ہندوستان کے مسلمان زندہ پرست نہیں، مردہ پرست ہیں، جب میں مرجاؤں گا تو یاد کریں گے، مگر میں بھی ان سے تنگ آیا ہوا ہوں کہ ہندوستان میں مرنے ہی کا نہیں، خدا کرے کہ مجھے ہندوستان میں موت ہی نہ آئے۔"

سطور بالا سے یہ عبرتناک حقیقت واضح ہو گئی ہو گی کہ محمد علی اپنی قوم سے کس قدر مایوس ہو گئے تھے اور ان کی آخری زندگی کس قدر تلخ گزری کہ نہ دوستوں اور عزیزوں کی کوئی جماعت خاص رہ گئی تھی جس پر اعتماد کیا جا سکتا، اور نہ متبعین اور معتقدین کا کوئی ایسا گروہ

رہ گیا تھا جوان کے بتائے ہوئے لائحہ عمل اور ان کی پیش کی ہوئی تجویزوں کو قبولیت اور عمل کا جامہ پہناتا۔

لیکن محمد علی کا یہ کردار بھی عجیب و غریب ہے کہ مایوس ہو جانے کے باوجود وہ اپنے زریں خدمات سے دستکش نہیں ہوئے، امان اللہ خاں کا یہ شعر محمد علی پر کتنا صادق آتا ہے

اے قوم گرچہ سنگ جفا بر دلم زدید   ایں شیشہ شکستہ ہنوز از وفا پرست

باب ۲۳

ہندوؤں سے دل برداشتگی کے اسباب

وفات سے کچھ عرصہ پیشتر محمد علی کانگرس کے مخالف ہو گئے تھے، اور ان کا حکم مسلمانوں کو یہ تھا کہ وہ کانگرس کی سرگرمیوں میں قطعاً کوئی حصہ نہ لیں۔

بہ ظاہر یہ بہت تعجب خیز بات ہے کہ محمد علی کانگرس اور ہندوؤں سے برداشتہ کیوں ہوئے، ان کی ساری سیاسی جدوجہد کا ایک خاص مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کو پنجۂ اغیار سے نجات دلا سکیں اور پھر اس طرح بالواسطہ سارے عالم سے انگریزوں کی ”خدمت اور استبداد“ کا خاتمہ کر دیں۔ پھر انھوں نے اپنے مقصد کے خلاف کانگرس سے جنگ کیسے کی؟ اور کسی نہ کسی حد تک انگریزوں کی اعانت کیونکر ان سے کی گئی۔

جو لوگ مغز حقیقت تک نہیں پہنچ سکتے یا نہیں پہنچنا چاہتے ان کا فیصلہ تو یہ ہوتا ہے کہ انھیں موتی لال وغیرہ سے دشمنی تھی، اس لئے وہ کانگرس کے مخالف ہو گئے!

دعوی جتنا دلچسپ ہے دلیل اس سے کہیں زیادہ پرلطف!

اصل واقعہ خفیف سے تامل اور فکر کے بعد معلوم کر لیا جا سکتا ہے، محمد علی کانگرس میں اُس وقت تک شریک رہے اور اپنے بے پناہ جذبۂ عمل اور غیر معمولی شخصی اثرات کے ساتھ شریک رہے، جب تک وہ اسے ”انڈین نیشنل کانگرس“ سمجھتے رہے اور اپنی اس وفاداری پر انھوں نے اتنی استقامت کا ثبوت دیا کہ اس کی نظیر ملنی مشکل ہے، غور کی بات ہے کہ وہ کانگرس میں اس وقت تو شریک رہے جب اس کی ”سرد بازاری“

شروع ہوگئی تھی، اور تحریک شدھی و سنگٹھن اور تبلیغ و تنظیم نے ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو کانگرس سے بیزار اور متنفر کر دیا تھا اور علیحدہ کس وقت ہوئے؟ جب اس کی "گرمیٔ بازار"، پھر عود کر آئی تھی، اور بہت سے گوشہ نشین افراد پھر قومیت کے روپ اور کھدر کے لباس میں اسٹیج پر نظر آنے لگے تھے۔

جب اوںھوں نے انتہائے خلوص اور نیک نیتی سے یہ سمجھا کہ یہ کانگرس اب، "انڈین نیشنل"، نہیں بلکہ "ہندو مہاسبھا"، کا نقش ثانی"، ہے تو وہ علیحدہ ہوگئے، اور اوںھوں نے اس کی ذرا بھی پروا نہ کی کہ ہوا کا رخ کدھر ہے بلکہ اس کی کوشش کی کہ ہوا کا رخ جدھر بھی ہو اسے قبضہ میں کرنا چاہیئے!

دوسری غور طلب بات یہ ہے کہ ہندوستان میں بدقسمتی سے ایسے انداز میں حکومت کیجا رہی ہے اور ہندو مسلمان دونوں قوموں کو ایسے سانچہ میں ڈھال لیا گیا ہے کہ ایک قوم دوسری کو سخت نفرت، کراہیت اور حقارت کی نظر سے دیکھتی ہے، ہندوستان میں کانگرس ہی وہ "بیت السلام" ہو سکتا تھا جس میں ہر دو اقوام کے نیک نیت، سمجھدار معاملہ فہم، دور اندیش اور غیر متعصب حضرات مصروف عمل ہوں، لیکن جب اوںھوں نے دیکھا کہ یہاں بھی مہاسبھائی ذہنیت چھائی ہوئی ہے، اکثر کانگرسی جب امتحان کی کسوٹی پر کسے جاتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے جوش عمل کی بہترین جولانگاہ مہاسبھا کا پلیٹ فارم تھا، تو آخر وہ کیوں نہ کانگرس سے دل برداشتہ ہو جاتے۔

اور پھر یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے اور یاد رکھنا چاہیئے کہ محمد علی کی قوت عمل اسلام کے لئے وقف تھی، اگر کانگرس نے تعاون کا ہاتھ بڑھایا تو اوںھوں نے اپنا ہاتھ کبھی نہیں کھینچا، اور انگریز نے تعاون کرنا چاہا تو اوںھوں نے اسے بھی موقعہ دیا، اگر وہ صرف "ہندوستانی"

ہوتے اور مذہب کو پس پشت ڈال کر کانگرس میں شریک ہوئے ہوتے تو ان کی علیحدگی موجب حیرت ہو سکتی تھی۔

گاندھی جی کا بیان ہندوستانی سیاسیات میں گاندھی جی کو جو عظمت و بزرگی اور جو اقتدار و نفوذ حاصل ہے وہ محتاج بیان نہیں، وہی ایک ایسے شخص ہیں جن کے متعلق اکثر مسلمانوں کا یہ خیال ہے کہ ان سے بڑھ کر غیر متعصب، بہی خواہ قوم، اور ہمدرد اسلام کوئی نہیں۔

سنہ ۲۴ء کے مشہور فساد کوہاٹ کے اختلاف سے بھی پیشتر گاندھی جی کی بات جو محمد علی کے لئے دل شکن ثابت ہوئی، وہ گاندھی جی کا وہ بیان تھا جو انھوں نے جو ہو سے ۲۹ مئی سنہ ۲۴ء کو اپنی رہائی سے ایک ماہ بعد شائع فرمایا تھا، اور جس میں ارشاد ہوا تھا کہ۔

"مسلمان ڈنگئی ہیں اور ہندو بزدل"

یہ بیان محمد علی کے لئے اس لئے اور زیادہ دل شکن ثابت ہوا کہ اب تک ان کا طرز عمل یہ رہا تھا کہ جوش رواداری میں ہمیشہ ہر غلطی کا الزام وہ مسلمانوں کے ہی سر رکھتے تھے محض اس امید پر کہ ہندو مسلم تعلقات خوشگوار رہیں، لیکن گاندھی جی کا یہ بیان ان کے لئے بہت افسردہ کن ثابت ہوا۔

صوبہ متحدہ کی سیاسی کانفرنس محمد علی نے مسٹر جناح کی رفاقت میں "تجاویز دہلی" تیار کی تھیں، جنکا اہم جزو مخلوط انتخاب تھا، اب تک مسلمان مخلوط انتخاب سے بیزار تھے لیکن محمد علی نے اسے مسلمانوں سے منوایا پھر کانگرس سے قبول کرایا، یہ پہلا موقعہ تھا کہ ہندو مسلمانوں نے مشترکہ طور پر صحیح قومیت کے تخیل کو پیش نظر رکھ کر جداگانہ انتخاب سے

اپنی بیزاری کا اظہار اور مخلوط انتخاب پر آمادگی کا ارادہ کیا تھا، ہندوستان کا قوم پرور طبقہ اس پر بہت مسرور تھا اور سب محمد علی کو مبارک باد دے رہے تھے کہ انھیں کے تدبر اور جذبۂ عمل نے اس مشکل کو بھی حل کیا، لیکن بعد کو یہ صورت نہیں قائم رہی جس کی ضروری تفصیل حسب موقعہ آئے گی یہاں اتنا کافی ہے کہ محمد علی نے اسے مسلمانوں سے منظور کرایا اور کانگرس سے اسے منظور کرانے میں اپنا سارا زور ختم کر دیا اور بالآخر اس میں وہ کامیاب بھی ہوئے، یعنی مجلس عاملہ نے منظور کیا، پھر کانگرس کے اسپیشل اجلاس نے منظور کیا اور کانگرسی لیڈروں نے منظور کیا، پھر مہاسبھائیوں نے منظور کیا، حتی کہ موتی لال نہرو اور پنڈت مالوی اور ڈاکٹر مونجے تک نے منظور کیا، لیکن یہ اس زمانہ کا واقعہ ہے جب سری نواس آئنگر جیسا صحیح الخیال شخص صدر نشین تھا، لیکن بعد کو جو دوسرے تغیرات ہوئے ان کا ذکر آگے آئے گا۔ اس جگہ ربط کے لئے یہ خیال رکھئے کہ محمد علی نے اسے سب جگہ سے منظور کرایا، کچھ عرصہ کے بعد "صوبہ متحدہ کی سیاسی کانفرنس" کا ۲۶ - ۲۷ - ۲۸ نومبر ۱۹۲۵ء کو انعقاد بمقام علیگڑھ طے پایا، اس میں زیر بحث مسائل میں "وہ سمجھوتہ" بھی تھا جسکی تصدیق و توثیق سری نواس آئنگر صدر کانگرس نے کلکتہ میں کرائی تھی۔

محمد علی جب علیگڑھ پہنچے تو ان کے مشاہدات و تاثرات کیا ہوئے؟ اسے انھیں کی زبان سے سنئے۔

"آمنہ مرحومہ کی قبر پر فاتحہ پڑھ کر جلسہ میں آیا جو باتیں وہاں پہنچ کر سننے میں آئیں انھوں نے قلب کو اور بھی مضمحل کر دیا، معلوم ہوا کہ ابھی تک سبجکٹ کمیٹی میں ہی بحث رہی، جب سبجکٹ کمیٹی کی کارروائی کا حال سنا تو سوچنے لگا کہ آمنہ مرحومہ کے لئے روؤں یا اپنے صوبہ کا غم کروں، یہ جلسہ صوبہ کی ہندو

سبھا یا مسلم لیگ کا نہ تھا، کانگرس کا جلسہ تھا، اگر یہاں بھی باوجود آل انڈیا
کانگرس کمیٹی کے جلسہ ہائے منعقدہ بمبئی و کلکتہ، ہندو مسلم تعلقات کے بارے
میں اسقدر شدید اختلافات موجود ہیں خود صوبہ کی کانگرس کمیٹی میں ہندو مسلمان
اس طرح دست و گریبان ہیں تو اس ملک میں امن و امان کب قائم
ہوگا اور اس ملک والوں کو آزادی کب نصیب ہوگی، جلسہ گاہ سے حاجی
موسیٰ خاں صاحب کے مکان پر آیا، جہاں ڈاکٹر (انصاری) صاحب اور
شعیب قریشی صاحب نہایت افسردہ دل بیٹھے ہوئے تھے، جوں ہی کلکتہ
والے آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے جلسہ کے رزولیوشن کا وقت آیا صاف
معلوم ہونے لگا کہ اکثریت کی ذہنیت بالکل ہندو سبھائی ہے"

موتی لال کا تغیر وسط مئی ۱۹۲۷ء میں جب کانگرس کے اجلاس منعقدہ بمبئی میں "تجاویز دھلی" پیش ہوئیں تو مجلس عاملہ میں جس شخص نے ان کے منظور کرانے میں سب سے زیادہ حصہ لیا وہ خود پنڈت موتی لال نہرو تھے اور پھر یہ وہی پنڈت موتی لال نہرو تھے جنھوں نے اپنی "نہرو رپورٹ" میں بعض اہم امور میں اس کے خلاف فیصلہ دیا اور سارے ہندوستان سے اور خود مسلمانوں سے بھی منظور کرانا چاہا۔

اب اسے جو کچھ بھی کہیے، اس "تغیر رنگ" سے محمد علی متاثر ضرور ہوئے۔

جے رام داس کا اختلاف کانگرس کے اسی جلسہ میں جس میں موتی لال جی یہ "تجاویز دہلی" منظور کرا رہے تھے، اس میں اسے ان مہا سبھائیوں نے بھی منظور کیا، جو وہاں موجود تھے لیکن جے رام داس دولت رام صاحب جو اس جلسہ میں موجود بھی نہیں تھے انھوں نے ہی سب سے پہلے ان تجاویز کی مخالفت کی۔

گاندھی جی اور دوسرے کانگریسیوں کا اختلاف

یہ دردناک اور افسوس ناک صورت حال ابھی ختم نہیں ہوئی محمد علی کا بیان ہے کہ

"سری نواس آئنگر نے، کلکتہ میں کانگرس کمیٹی کا جلسہ منعقد کیا جس میں گائے اور باجے کے متعلق ایک مدبرانہ فیصلہ کیا گیا تھا وہاں بھی دو ہندو مہاسبھائی آخر وقت تک لڑتے رہے، جن میں سے ایک اخبار سوراجیہ کے مالک اور ایڈیٹر پرکاشم صاحب اور دوسرے سندھ کے جے رام داس صاحب (بمبئی کے جلسہ میں، مجلس عاملہ کی منظوری کے بعد یہ تجویز سبجکٹ کمیٹی میں پیش ہونے والی ہی تھی کہ مہاتما جی اپنے گوشۂ تنہائی سے برآمد ہوئے اور ڈاکٹر انصاری کو بلا کر فرمایا کہ میں اس لئے آیا تھا کہ کچھ تمہاری مدد کروں اور ہندو مسلم تنازعات کا آخری فیصلہ کراؤں لیکن جب میں نے اس تجویز کو دیکھا جسے مجلس عاملہ نے سبجکٹ کمیٹی میں پیش کرنے کے لئے تیار کیا ہے اور جسے بمبئی اور کلکتہ کی آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے جلسوں نے منظور کیا تھا تو میرے ہوش اڑ گئے، اس گائے والے حصہ پر تو میں نہ کوئی اور ہندو راضی ہو سکتا ہے وہ تو بالکل ہمارے مذہبی فرائض کے منافی ہے، مجھے رات بھر اس جنجال کے باعث نیند نہیں آئی کہ میں تو تمھیں مدد دینے کے بجائے فیصلہ پر پہنچنے میں ایک روک بن جاؤں گا تم علی برادران کے پاس جاؤ، انھیں بھی میرے پاس لاؤ، ہم حاضر خدمت ہوئے اور مہاتما جی کے مذہبی خیالات کا ایک بار پھر اعادہ کیا گیا، میں نے مہاتما جی کی منطق پر اعتراض کیا، اور بالآخر انھیں ایک ایسی چیز پر لے آیا جو انھیں

بھی قبول تھی اور ہیں بھی۔"

یہ تو تھے محمد علی کے ذاتی مشاہدات و تاثرات لیکن باہر سے ان کو جو اطلاعات ان کے رفقا کی طرف سے ملتی تھیں وہ بھی ایسی ہی دردانگیز حقیقت کا مظہر ہوتی ہیں، یہ اطلاعیں ان کو ان رفقا کی طرف سے ملتی تھیں جو خود عقیدۃً کانگرسی ہوتے تھے اور ہندو مسلم اتحاد جن کی زندگی کا مقصد ہوتا تھا، لیکن اعتراف حقیقت پر وہ بھی مجبور ہوتے تھے اور فریاد محمد علی ہی کے حضور میں پیش کرتے تھے!

اس قسم کے متعدد افسوسناک واقعات پیش کئے جا سکتے ہیں جن سے اس عہد کی ہندو ذہنیت کا صحیح مرقع آنکھوں کے سامنے آسکے، لیکن بہر حال یہ اوراق ایک کتاب کے لئے صرف ہو رہے ہیں، کسی اخبار کے کالم نہیں ہیں، اس لئے مجبوراً تفصیل واقعات سے گریز کرنا پڑتا ہے "محمد علی میوزیم" میں ان کے خطوط کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ چیز بہت زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے، کچھ مصلحۃً اور کچھ ضرورۃً اس قسم کے تکلیف دہ واقعات کی مثال سے ہم چشم پوشی کرتے ہیں، لیکن یہ ایک واقعہ ہے کہ محمد علی کے ثقہ اور معتمد رفقا نے، ان رفقا نے جن کی زبانیں اس وقت ہندوؤں کی شکایت کر رہی تھیں اور آج جو قید و بند کے مصائب تحریک وطنی کے سلسلہ میں پھر جھیل رہے ہیں، محمد علی کے حضور میں اپنی شکایتیں پیش کیں جن سے محمد علی کا متاثر ہونا یقینی تھا، مختصراً یہ اور اسی قسم کے دوسرے اسباب تھے، جنھوں نے محمد علی کو ہندوؤں سے اور آخر میں کانگرس سے اور سب سے آخر میں گاندھی جی سے دل برداشتہ کر دیا تھا،

باب ۲۴

علالت

یوں تو کئی سال سے ان کی طبیعت خراب تھی، سنہ ۲۸ء میں یورپ وہ علاج ہی کے لئے گئے تھے مگر وفات سے ڈیڑھ سال بیشتر سے محمد علی کی طبیعت اور صحت پر حد درجہ برا اثر پڑا تھا، ان کی ذیابطیس کی شکایت پھر زور شور سے شروع ہو گئی تھی، آنکھوں کی بینائی پر بھی سخت اثر ہوا تھا چنانچہ ایک آنکھ کی بینائی تو جاتی ہی رہی تھی اور دوسری آنکھ بھی خطرہ میں تھی، قلب کی حرکت بھی بہت خراب ہو رہی تھی اور شاید ذیابطیس کی وجہ سے ان کی ہڈیاں بھی خراب ہو رہی تھیں، چنانچہ ان کے پیر متورم رہنے لگے تھے اور ڈاکٹروں کی طرف سے انھیں ہدایت تھی کہ اگر جان عزیز ہے تو سکون اور فراغ خاطر کے ساتھ کسی گوشہ میں تمام عملی سرگرمیوں سے کنارہ کش ہو کر بیٹھ جاؤ۔

لیکن ملکی اور قومی معاملات نے انھیں اس درجہ مضطرب نا رکھا تھا کہ ان سے خاموشی اور سکوت کی توقع کرنا ایک امر محال تھا، بالخصوص مسلمانوں کی حالت زار نے ان میں اگرچہ ایک حیرت انگیز قوت عمل تازہ کر دی تھی، لیکن اسی سرعت کے ساتھ ان کی صحت انحطاط کے منازل طے کر رہی تھی۔

دہلی میں | جب تک وہ دہلی میں علیل اور صاحب فراش رہے اُس وقت تک ڈاکٹر انصاری ان کی صحت کے نگراں رہے اور برابر مشورہ دیتے رہے کہ گوشہ گیر ہو جاؤ، صحت حاصل ہو جانے کے بعد پھر جو جی میں آئے وہ کرنا، مگر محمد علی اپنے درد قوم اور پاس

ملت کی بنا پر یہ سچا مشورہ نہ قبول کر سکے، پھر آب وہوا اور تبدیلی علاج کی خاطر شملہ چلے گئے۔

شملہ میں ضمناً یہ فائدہ حاصل ہونے کی توقع بھی تھی کہ نسبتہً اطمینان وسکون رہے گا مگر وہاں بھی وہ اپنے اشغال ملکی سے باز نہ آئے، نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں ان کی صحت اور زیادہ خراب ہوگئی، اور دل کے متعدد دورے اس قدر سخت پڑے کہ حالت نازک ہوگئی

وائسرائے کا طبیب خاص اسی زمانہ میں محمد علی کی حالت سے متاثر ہو کر لارڈ ارون وائسرائے ہند نے اپنا پرسنل سرجن محمد علی کی خدمت میں بھیجا تاکہ صحیح تشخیص کے بعد کوئی معقول علاج کیا جا سکے، اصل غرض لارڈ ارون کی یہ تھی کہ کم از کم محمد علی کی صحت اس قابل ہو جائے کہ وہ گول میز کانفرنس میں شرکت کر سکیں اس لئے کہ وہ بہت مصر تھے کہ محمد علی گول میز کانفرنس میں ضرور شریک ہوں۔

ہنگامۂ اختلاف وائسرائے کے سرجن کا دیکھنا غضب ہو گیا اور مخالفین کو موقعہ ہاتھ آ گیا کہ وہ محمد علی کی "ٹوڈیت" اور "گورنمنٹ پرستی" پر جس طرح چاہیں اپنے اشہب قلم کو بڑ لگام کریں چنانچہ لوگوں نے اس بہانے سے خوب اپنے دل کی دیرینہ تمنائیں پوری کیں اور پورے طور سے محمد علی کو آماجگاہ سب وشتم بنا لیا۔

ایک اخبار کا طنز محمد علی کی علالت کے زمانہ میں سب سے زیادہ افسوس ناک اور قابل ملامت نکتہ چینی اس اخبار کی تھی جو پنجاب کے ایک "آقا" کی ملکیت میں نکل رہا تھا، اس کو اس کا خیال بھی نہیں رہا کہ ایک بیمار پر اور ایسا بیمار جس کو نقل وحرکت بھی دشوار ہو، اس دلشکن اور "سنسنی خیز" انداز میں تنقید کرنا صحافی ذمہ داری، شرافت اور انسانیت کا نہایت بے دردی سے خون کرنا ہے۔

بہرحال اس نے محمد علی کی "اس منفعت بخش" علالت پر خوب خوشیاں منائیں اور علی الاعلان ان کی اس علالت کو ایک ڈھونگ سمجھا جو جلب زر یا کسی اور مقصد کی خاطر رچایا گیا تھا۔

سر یعقوب کا مشاہدہ اسی زمانہ میں سر محمد یعقوب محمد علی کو دیکھنے گئے اور ان تاثرات کے ساتھ واپس آئے۔

"محمد علی سے میری آخری ملاقات گزشتہ جولائی میں شملہ کے رپن ہسپتال میں ہوئی، آخر جون میں جب میں شملہ پہنچا تو معلوم ہوا کہ محمد علی وہاں مقیم ہیں دوسرے روز شام کو میں ان سے ملنے گیا، "دھول پور ہاؤس" میں وہ ٹھہرے ہوئے تھے، میرے آواز دینے پر ایک نوکر لڑکا باہر آیا، اس نے کہا کہ رات میاں کی طبیعت بہت خراب ہوگئی تھی اور اس وقت ذرا آنکھ لگ گئی ہے، اپنا کارڈ چھوڑ کر میں واپس ہو رہا تھا کہ اوپر سے محمد علی کی آواز آئی یعقوب، یعقوب، یہاں آجاؤ، میں اوپر پہنچا، دیکھا کہ محمد علی پلنگ پر بیٹھے ہیں، سائمن کمیشن کی رپورٹ ہاتھ میں ہے اول حسب معمول نہایت گرمجوشی سے مصافحہ اور علیک سلیک ہوئی، میں نے مزاج کا حال پوچھا کہنے لگے "کہ کل شام سائمن رپورٹ ہاتھ میں آئی رات کو دو بجے تک میں اس کو پڑھتا رہا، اسی حالت میں دورہ ہوگیا اور دل میں تکلیف پیدا ہوگئی، رات بھر اس رپورٹ کو پڑھتا رہا، اور اب قریب ختم پہنچ گیا ہوں"، قریب ایک گھنٹہ کے بڑے جوش کے ساتھ رپورٹ پر نکتہ چینی اور تنقید کرتے رہے، میرے واپس آنے کے بعد اسی شب میں پھر دل کا دورہ پڑا۔"

گول میز کانفرنس | اس حالت میں لارڈ ارون نے انھیں گول میز کانفرنس کے لئے مدعو کیا، واقعہ یہ تھا کہ اپنی صحت کے باعث محمد علی قطعاً اپنا سفر ملتوی کر دیتے لیکن انھوں نے دیکھا کہ کانفرنس کے مسلم مندوبین میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو ان کی جماعت کا ہو، ان کا ہم خیال ہو، یا کم از کم ایسا ہو جس پر وہ اپنے عقائد سیاسی میں پورے طور سے اعتماد کر سکیں اس لئے مجبوراً انھوں نے اپنی سخت ترین علالت کے باوجود شرکت کا ارادہ کیا اور ہزاروں مخالفتوں اور نکتہ چینی کے باوجود وہ شریک ہوئے، جب وہ عازم انگلستان ہوئے تو ان کی حالت کیا تھی؟

ایک شاہد عینی | ایک صاحب جو محمد علی کو رخصت کرنے اور الوداع کہنے بمبئی آئے تھے وہ کہتے ہیں کہ:

"(محمد علی) کی روانگی (گول میز) کا نظارہ بڑا رقت انگیز تھا جس وقت آپ کو اسٹریچر پر لٹا کر ساحل بمبئی سے وائسرائے آف انڈیا جہاز پر سوار کرایا گیا، اس وقت تمام حاضرین کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے، گویا زندہ جنازہ جا رہا ہے"

مولانا عبدالماجد بدایونی کا سوال | مولانا عبدالماجد صاحب بدایونی مرحوم نے جب مولانا (محمد علی) سے پوچھا کہ آپ اتنا طویل سفر کیوں اختیار کر رہے ہو تو آپ نے عجیب مسکراہٹ سے جواب دیا "مرنے کے لئے" جس وقت راقم الحروف آپ کو الوداع کہنے کے ارادہ سے بمبئی گیا تو مرحوم دار الخلافت کے بالاخانہ پر خون کی قے کر رہے تھے۔"

ان حالات میں ملک وملت کا یہ فدائی اور اخلاص و ایثار کا یہ مجسمہ متحرک، دوسروں کے کندھوں پر لد کر جہاز پر پہنچایا گیا اور بالآخر انگلستان روانہ ہو گیا، "کاش محمد علی کو لندن نہ جانا پڑتا، لندن خود محمد علی کے قدموں میں آ گیا ہوتا۔"

پیرس | جب محمد علی پیرس پہنچے تو ان کی حالت وہاں پھر خراب ہو گئی اور اتنی زیادہ

خراب ہو گئی کہ ڈاکٹروں نے لندن جانے سے منع کر دیا لیکن محمد علی نے اس قدغن کا جواب یہ دیا کہ پیرس ہی میں اپنا مشغلہ شروع کر دیا یعنی پیرس کے طلبہ کے سامنے اسلام اور قومیت وغیرہ پر تقریر۔

وہاں علاج میں بہت سرگرمی اور تندہی کا اظہار کیا گیا، دماغ، زبان، دل، نبض تھوک، پاخانہ، پیشاب ہر چیز کے ماہروں نے ہر چیز کا الگ الگ "ٹسٹ" کیا۔ اور پھر علاج شروع ہوا، نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی صحت اتنی سنبھل گئی کہ وہ لندن جا سکیں چنانچہ ڈاکٹروں کی اس "دبی دبی رائے" سے بھی محمد علی نے پورا فائدہ اٹھایا اور لندن چل کھڑے ہوئے، وہاں پہنچ کر ایک بہت ہی عجیب وغریب اور دلنواز تقریر کر کے پھر علیل ہو گئے اب کی مرض نے پہلے سے زیادہ سخت حملہ کیا۔

مکتوب بنام عرفان | چنانچہ مولانا عرفان صاحب کو محمد علی لکھتے ہیں۔

"جب سے یہاں آیا ہوں دو بار صاحب فراش ہو چکا ہوں ۱۹ر کو اپنی تقریر کرنے کے بعد سخت تکلیف اٹھائی اور شب کے بارہ بجے تک درد قولنج میں مبتلا رہا، دل کی خرابی کے باعث دوران خون ٹھیک نہیں ہے اس لئے نیچے کا سارا جسم سخت ورم میں مبتلا ہے، دمہ والوں کی طرح شب میں سانس چلتی ہے، اس لئے لیٹ بھی نہیں سکتا ۲۴ گھنٹہ برابر پلنگ پر بیٹھا رہنا پڑتا ہے۔"

تقریر میں تذکرہ | اپنی مشہور گول میز والی تقریر میں ضمناً نواب صاحب بھوپال کی اس عنایت کا کہ شملہ میں وہ اپنے سابق "ٹیوٹر" کی علالت سخت دیکھ کر اپنے ساتھ بھوپال لے گئے اور "گسٹ ہاؤس" کو ایک "ہسپتال" میں تبدیل کر دیا، گو وہاں بھی

ان کی حالت خراب ہی رہی لیکن بہر حال شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنی علالت کا تذکرہ دیکھئے کیسے دلچسپ انداز میں کرتے ہیں، بیمار ہیں، زار ونزار ہیں لیکن اپنی تقریر میں ابر بہار ہیں ہر شخص خوش، ہر شخص مسرور۔ فرماتے ہیں:۔

"جب مجھے شملہ کے شفاخانہ میں بھیجا گیا تو ایک یوریین خاتون نے ہمارے ڈاکٹر سے دریافت کیا کہ بڑے میاں کو کس مرض کی شکایت ہے؟ ڈاکٹر نے جواب دیا کہ یہ نہ پوچھو کہ اسے کیا شکایت ہے بلکہ یہ پوچھو کہ اسے کون شکایت نہیں ہے

علالت کی تفصیل

میری یہ کیفیت ہے کہ قلب کی حالت درست نہیں، بینائی میں فرق آگیا ہے پانوں متورم ہیں، ذیابیطس کا عارضہ ہے بیماریوں کی اس طویل فہرست سے جو میں نے پیش کی ہے، میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ کہیں کرنل گڈنی ایک طبیب کی حیثیت سے تشریح امراض کے معاملہ میں مجھے اپنا رقیب نہ سمجھ لیں (قہقہہ) میں کہتا ہوں کہ جس آدمی کے حواس بجا ہیں وہ ان بیماریوں کے ساتھ، میل کا سفر بھی نہیں طے کر سکتا، لیکن پھر بھی میں خشکی اور سمندر کے سات ہزار میل کا سفر طے کر کے یہاں پہنچ گیا ہوں کیونکہ جہاں ہندوستان اور مسلمان کا معاملہ آجاتا ہے وہاں میری حالت دیوانوں کی سی ہوجاتی ہے۔"

غرض اس نازک حالت میں بھی محمد علی اپنی کارگذاری اور عملی قوت کا برابر ثبوت دیتے رہے۔

باب ۲۵

وفات

صفحات ماقبل میں آپ محمد علی کی علالت کے مفصل حالات پڑھ چکے ہیں۔

جو شخص اتنی مسلسل علالت کے باوجود ڈاکٹروں اور طبی مشیروں کی مخالفت کے باوجود سرگرم رہے اور وہ بھی اس طرح کہ نہ دن کا خیال نہ رات کا، نہ کھانے کی فکر نہ پانی کی، نہ اعزا و اقربا کی طرف توجہ نہ دوست احباب کی طرف، صرف ایک دھن ہو اور اسی محور پر ساری قوت عمل گردش رہی ہو تعجب ہے کہ اس کی وفات اتنی دیر میں کیوں ہوئی! اسے تو شملہ میں ختم ہو جانا چاہئے تھا! یہ خدا کی مشیت ہے جب تک وہ کسی سے کام لینا چاہتا ہے اس وقت تک موقع دیتا ہے اور وہ چراغ صبح کی طرح بھڑک بھڑک کر اپنی مضمحل اور افسردہ روشنی سے کسی نہ کسی حد تک ضیا باری کرتا ہے، پھر جب وقت آجاتا ہے تو باد صبا کا ایک جھونکا اس جھلملاتے ہوئے چراغ کو ختم کر دیتا ہے، محمد علی کی مثال ایسی ہی تھی!

تقریر کے بعد | گول میز کانفرنس کی تقریر کے بعد سے محمد علی کی حالت جو گری تو پھر نہیں سنبھلی اور اس کا کوئی امکان بھی نہیں باقی رہ گیا تھا۔

وفات کی شب بلا سے بیشتر وہ رات بھر کام کرتے رہے۔

ہندو مسلم اسکیم | ہندو مسلم تعلقات پر جو انھوں نے ایک مفصل اسکیم تیار کی تھی، اس کا مسودہ ٹھیک کراتے رہے، اور وزیر اعظم کے پاس اس کے بھیجنے کی فکر کرتے رہے۔

وفات | حالت بظاہر اگرچہ اتنی تشویش انگیز نہیں تھی کہ ان کی جان کا خطرہ کیا جاتا

اسی لئے شوکت صاحب ایک دوست سے ملنے آئرلینڈ تشریف لے گئے تھے لیکن اپنی اس اسکیم کے بعد وہ بیہوش ہوگئے، اور کئی گھنٹہ کی بیہوشی کے بعد صبح کو کچھ دیر کے بعد آنکھ کھلی، اس وقت تھکا ماندا بوڑھا بھائی بھی پہنچ چکا تھا کہ دیکھتے دیکھتے محمد علی کی روح عالم بالا کو سدھاری! انا للہ و انا الیہ راجعون۔

دیارِ غیر میں موت سے "بیکسی" کی خواہ کتنی ہی "شرم" رہ جائے لیکن ہوتی بڑی عبرتناک ہے۔ اس بیوی پر کیا کچھ نہ گزر گئی ہوگی جو ان امیدوں اور آرزوں کے ساتھ تیمارداری اور چارہ سازی کرتی ہوئی گئی تھی کہ اپنے محبوب شوہر کے ساتھ واپس ہوگی لیکن آہ! اب اس کے ساتھ محمد علی کے بجائے ایک جسد بے روح ہے جس کے سرہانے بیٹھی وہ حق وفا ادا کر رہی ہے لیکن کب تک؟

اس بچی پر کیا نہ بیتی ہوگی، جو باپ کے ساتھ نہ جا سکی تھی اور دہلی ہی میں بیٹھی ہوئی روزانہ خطوط کا انتظار کیا کرتی تھی، خبر صحت کی جویا رہتی تھی اور اس کی منتظر کہ عنقریب مہر پدری سے پھر لطف اندوز ہوگی! لیکن آہ جب اسے زبان برق نے اس کے پیارے باپ کی خبر وفات سنائی ہوگی، اس وقت اسے اپنی محرومی پر کتنی حسرت، کتنا تاسف اور کتنا ناقابل برداشت صدمہ ہوا ہوگا کہ وقت آخر بھی وہ اپنے پیکر رفق و محبت باپ کی زیارت نہ کر سکی!

اور آہ! اس بوڑھے لیکن جواں ہمت بھائی کی کیا کیفیت ہوئی ہوگی جس کا وہ دست راست تھا، دل کی طاقت تھا اور وجہ شکیبائی تھا، دونوں بھائیوں کی داستان محبت کیسی کچھ مشہور ہے؟ شوکت نے سچ کہا کہ محمد علی اس کا بھائی بھی تھا، بیٹا بھی، عاشق بھی تھا اور معشوق بھی! اس بڑے بھائی نے اپنے سامنے اپنی زندگی کی کمائی کو لٹتے ہوئے دیکھا اور خاموش رہا۔

یہ سب کچھ ہوا، نالہ و شیون بھی ہوا، نوحہ و ماتم بھی ہوا، سینہ کوبی اور چاک دامانی کا مظاہرہ بھی ہوا، لیکن اس کا کیا علاج کہ محمد علی ہم سے ایسا جدا ہوا کہ اب اس عالم خاکی میں، آنکھیں اس کی کبھی بھی زیارت نہ کر سکیں گی، فیا للحسرۃ۔

باب ۲۶

قابلِ رشک کشمکش

خبر وفات | محمد علی کی خبر وفات آناً فاناً سارے ملک میں پھیل گئی اور جوق در جوق لوگ آنا شروع ہوئے کہ مراسم تعزیت ادا کریں۔

مہاراجہ الور کی حالت | علالت کے زمانہ میں مہاراجہ صاحب الور کی یہ حالت تھی کہ اضطراب و اضطرار کے عالم میں ننگے سر اور ننگے پیر بار بار دوڑ دوڑ کر آتے تھے، وفات جب ہوئی تو انھیں اور بھی صدمہ ہوا، وفورِ رنج و تاثر کا یہ عالم تھا کہ وہ شوکت علی صاحب سے آنکھ نہیں ملا سکتے تھے۔

التوا | اب زیر بحث مسئلہ یہ تھا کہ لاش دفن کہاں کی جائے؟ بعض احباب کا خیال تھا کہ تدفین لندن ہی میں ہونی چاہئے لیکن گھر والے اس کے خلاف تھے، بیگم محمد علی انھیں ہندوستان

ہندوستان سے طلبی | لیجانا چاہتی تھیں اور خود ہندوستان سے سیکڑوں تار پہنچے کہ نعش یہاں لائیے تاکہ ہم تشنہ کامان زیارت آخری زیارت ہی سے مشرف ہو جائیں، لیکن ابھی

استحقاق | اس کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں ہوا تھا کہ ہندوستان کے مختلف شہروں سے دعوتیں پہنچیں کہ محمد علی کی نعش یہاں آئے اور اس سرزمین سے بڑھ کر کوئی دوسری سرزمین نہیں ہو سکتی

رامپور | رامپور نے یہ استحقاق پیش کیا کہ اسے محمد علی کے وطن ہونے کا فخر حاصل ہے اس لئے محمد علی کو وہیں سپرد خاک ہونا چاہئے، جہاں سے ان کا خمیر ہے۔

لکھنؤ | لکھنؤ نے یہ استحقاق باصرار پیش کیا کہ اس سے بڑھ کر اس امانت کا حق دار کوئی نہیں ہو سکتا کہ یہیں ان کے مرشد مولانا عبدالباری مرحوم کی آخری آرامگاہ ہے، یہیں محمد علی نے انجمن خدام کعبہ کی تاسیس اور جمعیۃ خلافت کے قیام کی کوششیں کیں اس لئے محمد علی کو اپنے مرشد کے پاس آسودۂ خاک بھی ہونا چاہئے۔

اجمیر | اجمیر نے استدعا پیش کی کہ محمد علی کو سلطان الہند غریب نواز خواجہ معین الدین اجمیری قدس اللہ سرہٗ کے سایہ ہما پایہ میں آخری موقع استراحت ملنا چاہئے اس لئے بھی کہ خود محمد علی کو درگاہ خواجہ سے بہت عقیدت تھی اور وہ اکثر یہاں حاضری دیا کرتے تھے اور اس لئے بھی کہ ہندوستان سے اس آستانہ سے بڑھ کر کوئی اور ایسا آستانہ نہیں کہ اس خصوصیت میں اس کا ہم سر ہو سکے۔

کلکتہ | کلکتہ نے کہا کہ آرزوؤں اور تمناؤں، حوصلوں اور کوششوں، سرگرمیوں اور کارگزاریوں نے یہیں عمل کی صورت اختیار کی اور یہیں ان کی ابتدا ہوئی، کامریڈ بھی یہیں سے نکلا اور ان کی پبلک زندگی کا آغاز بھی یہیں سے ہوا لہذا واجب ہے کہ اس کی آرزوؤں اور اس کے جسد خاکی کا مدفن وہی قرار دیا جائے جو مطلع رہ چکا ہے۔

علیگڑھ | علی گڑھ آگے بڑھا اور اس نے کہا کہ محمد علی کے ذہن و دماغ کی نشو و نما یہیں ہوئی، تعلیم و تربیت یہیں ہوئی، حوصلوں اور ولولوں نے یہیں پرورش پائی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ محمد علی طلوع بھی یہیں سے ہوا تھا، لہذا غروب بھی یہیں ہو۔

دلی | شاہان مغلیہ کی راجدھانی، دلی ایک سوگوارانہ انداز سے آگے بڑھی اور اس نے کہا محمد علی چکے یہیں، پھلے پھولے یہیں، کامیاب و کامگار یہاں ہوئے، ناکام و نامرادی کی زندگی یہاں بسر کی، چھندواڑہ کی رہائی کے بعد دلی ہی نے سب سے زیادہ عدیم المثال

شاہانہ استقبال کیا تھا، اور اب وہی ہی اپنی اس متاع عزیز کو جس نے اسے اپنے وطن ثانی کی حیثیت دیدی تھی، اپنے آغوش لحد میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آرام کی نیند سلائے گی اور پھر یہ استحقاق بھی اسے حاصل ہے کہ محمد علی کی چہیتی ماں آبادی بانو کی آغوش تمنا یہیں اس کے لئے کھلی ہوئی ہے

بیت المقدس | لیکن بیت المقدس کی سرزمین نے اپنے مقدس بازوؤں کو پھیلایا اور محمد علی سے کہا، تیری ساری زندگی اور ساری جد وجہد، تیری دوستی اور دشمنی اللہ کے لئے تھی، دیکھ یہ برگزیدہ انبیاء مرسلین کے جسد پاک اور بیشمار اولیا مقبولین کے اجسام مطہرہ میرے سینہ میں محفوظ ہیں، آ میں تجھے ایک گوشہ عافیت اسی سرزمین امن وسلام کا دیتی ہوں بول منظور ہے؟ محمد علی کی روح مسکرائی اور آگے بڑھی، مسجد عمر نے اپنا سینہ شق کیا اور محمد علی اُس میں سما گیا، کیا قسمت تھی!

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا!

یاں کی زمین سے مرتبہ پست آسماں کا ہے   کہتے ہیں جس کو عرش وہ فرش اس مکاں کا ہے

(میر انیس)

باب ۲۷

تکفین و تدفین

بیت المقدس کی دعوت منظور | بالآخر بہت غور و فکر اور کشمکش کے بعد سرزمین قدس کی دعوت منظور کر لی گئی اور اس کے انتظامات ہونے لگے کہ محمد علی کو اس سرزمین کفر و الحاد سے اُس سرزمین قدس میں منتقل کر دیا جائے۔

نماز جنازہ | جس ہوٹل میں مولانا مقیم تھے وہاں سے نعش رات کے بارہ بجے لفٹ سے نیچے اتاری گئی، نعش ایسی معلوم ہوتی تھی کہ جیسے کوئی شخص سکون و آرام سے سو رہا ہے، نعش کو دوا کا انجکشن دے کر ایسا کر دیا گیا تھا کہ دس برس بھی نہ بگڑے، نعش پر شب و روز قرآن خوانی ہوتی رہی، ۵ جنوری ۱۹۳۱ء کو شوکت علی، عبد الرحمٰن صدیقی اور مظفر نے نعش کو غسل دیا اور شام کے چھ بجے حسب اعلان لیڈ بگٹن ہال میں نماز جنازہ ادا کی گئی۔

شرکا | جس میں اراکین گول میز کانفرنس، سفرا ایران، مصر، کابل وزیر ہند لارڈ سینکے، وزیر اعظم کا نمائندہ اور دیگر معززین شریک تھے۔

پورٹ سعید اور مصر | نعش بذریعہ نارکنڈا جہاز ٹیلری بندر سے بیت المقدس روانہ کی گئی، ۱۲ جنوری کو پورٹ سعید پہنچی۔

حکومت مصر کا استقبال | شاہ مصر کے نمائندے وزیر اعظم مشائخین شہر پورٹ سعید جلوس میں شامل تھے، مسجد عباس میں نماز جنازہ ادا کی گئی، مصری پولیس

نے سلامی دی اور جنازہ اپنے کندھوں پر اٹھایا، شہزادہ محمد علی نے

شہزادہ محمد علی کا تحفہ

محمد علی مرحوم کے لئے غلاف کعبہ کا ایک ٹکڑہ تابوت پر رکھنے کے لئے مرحمت فرمایا، مرحوم کا کفن خالص کھدر کا تھا"

بیت المقدس میں

"یروشلم ۲۳ جنوری آج شہید ملت مولنا محمد علی کا تابوت یہاں پہنچا، پبلک کا ایک جم غفیر اس عظیم الشان جلوس کے چاروں طرف موجود تھا، تمام عربوں، مسلمانوں، عیسائیوں اور یہودیوں وغیرہ کی دوکانیں شہید ملت کے اعزاز میں بند تھیں، یہودیوں نے عربی پریس کو چاروں طرف سے ہمدردی اور تعزیت کے پیام بھیجے ہیں، مولنا شوکت علی نے اعلان کیا ہے کہ میرے عزیز بھائی کا یروشلم میں دفن ہونا مشرقی ممالک کے ابدی اور مستحکم اتحاد پر دلالت کرتا ہے، جلوسوں میں مولنا شوکت علی اور یروشلم کے مفتی اعظم پیش پیش تھے اور ان کے پیچھے تمام دنیا کے ماتم کرنے والے ہزاروں کی تعداد میں ساتھ آرہے تھے، تابوت بالکل مقبرہ تھا، قاہرہ، عمان، ٹیونس وغیرہ ممالک سے آئے ہوئے اصحاب نے پر درد مرثیئے پڑھے، جب تابوت بیت المقدس میں پہنچا تو مجمع اس قدر بڑھ گیا تھا کہ بہت مشکل سے تابوت گاڑی سے باہر نکالا جا سکا، مسلمانوں، عیسائیوں اور خواتین کے وفد بیگم صاحبہ محمد علی کی خدمت میں حاضر ہوئے دو لاکھ سے زیادہ مردوں عورتوں کا مجمع تھا جو جلوس کی صورت میں اسٹیشن سے حرم شریف تک تابوت کے ساتھ آیا، سڑکوں کے دونوں طرف مکانوں کی

نظارہ

کھڑکیاں اور چھتیں آدمیوں سے پٹی پڑی تھیں، ہر طرف آدمیوں کے

سر ہی سر نظر آتے تھے، لوگوں کا سڑک پر سے گذرنا مشکل ہو رہا تھا، تابوت کوئی تین گھنٹہ میں حرم شریف پہنچا، سب قوموں کے معززین، برطانوی حکومت کا نمائندہ، امیر عبداللہ اور شاہ حسین کے قونصل اور ہر شہر کے پروٹسٹنٹ اور گریک چرچ کے مذہبی پیشوا اس وقت موجود تھے اور سب نے تعزیت کی، بعد نماز جمعہ جنازہ کی نماز پڑھی گئی، مسجد اقصیٰ کے اندر اور باہر سارے صحن میں مردوں اور عورتوں کا بڑا زبردست مجمع تھا، ہزاروں خواتین کی موجودگی جو چار چار کی صورت میں برقعہ اوڑھے صف بستہ کھڑی تھیں، نہایت متاثر کن تھی، تابوت صخرہ شریف کے آگے رکھا گیا اور تمام مشہور مسلمانوں نے آخری تقریریں کیں۔"

اور اس طرح بالآخر ہندوستان کا یہ سپوت آب و گل کے جھگڑوں اور آلائشوں سے چھوٹ کر ہمیشہ کے لئے مطمئن ہو گیا۔

مولانا سید سلیمان ندوی کا تاثر مولانا سید سلیمان ندوی نے بالکل صحیح ارشاد فرمایا کہ

"تو ملت کا عزادار تھا، حق ہے کہ ساری ملت تیری عزادار ہو، تو امت محمدیہ کا سوگوار تھا، فرض ہے کہ پوری امت محمدی تیرا سوگ کرے، تو نے دنیائے اسلام کا ماتم کیا تھا، سزاوار ہے کہ دنیائے اسلام تیرا ماتم کرے، ہندوستان کا ماتم دار، طرابلس کا سوگوار، عراق کے لئے غمزدہ، بلقان کے لئے اشکبار، شام پر گریاں، انگورہ پر مرثیہ خواں، حجاز کا سوختہ غم اور بیت المقدس کے لئے وقف الم، اے ہند کے آوارہ گرد مسافر، تیرا حق سرزمین اسلام کے چپہ چپہ پر تھا، مناسب یہی تھا کہ تیرے لئے اولین قبلۂ اسلام کا سینہ پھٹ جائے اور تو اسی میں سما جائے"

باب ۲۸

جلوس اور جلسے

عام حالت | محمد علی کی خبر وفات ایسی نہیں تھی کہ اپنا اثر ظاہر کئے بغیر رہتی، اس کی شخصیت ایک عالم سے اپنا لوہا منوا چکی تھی، اسی لئے ایک عالم نے اس کا ماتم کیا ممالک غیر میں جہاں جہاں محمد علی کا نام اور محمد علی کی شہرت پہنچی تھی، وہاں اس کی وفات پر ماتم کیا گیا۔

کابل میں ماتم | ہندوستان کے پڑوسی ملک "افغانستان" نے بھی محمد علی کا دل کھول کر ماتم کیا، مہاجرین ہند کے اس جلسہ تعزیت میں ہزمجسٹی شاہ نادر خاں فرمانروائے افغانستان نے بہ نفس نفیس شرکت کا ارادہ کیا اور بعد کو ایک خاص مانع کے سبب وہ نہ آسکے تو اس جلسہ میں اپنے وزرا ء اور اسٹاف کو اپنی نمائندگی کے طور پر شرکت کے لئے بھیجا۔

ہندوستان میں ماتم | ہندوستان میں جب یہ خبر پہنچی ہے تو سارے ہندوستان پر ایک سناٹا چھا گیا، اور گو اس زمانہ میں تحریک سول نامتابعت جاری تھی جس کے محمد علی سخت مخالف تھے، مگر پھر بھی ہندوستان بھر میں ان کا زبردست ماتم کیا گیا جلوس نکالے گئے، تقریریں کی گئیں، ان کے خدمات سراہے گئے اور ان کے کارنامے بیان کئے گئے اور اس اظہار غم والم میں ہندو مسلمان دونوں برابر کے شریک تھے جس طرح خلافت کمیٹیوں اور محمد علی کے ہم خیالوں نے ان کا سوگ منایا، بالکل اسی طرح کانگرس کمیٹیوں اور ہندوؤں نے محمد علی کے ماتم میں حصہ لیا اور ہڑتال وغیرہ سب میں انھوں

نے اپنے کو برابر کا شریک وسہیم ثابت کیا۔

لکھنؤ کا جلسہ لکھنؤ کا جلسہ چونکہ راقم الحروف کے سامنے ہوا تھا اس لئے اس کے متعلق تفصیل سے بتایا جا سکتا ہے تاکہ لکھنؤ کے جلسہ سے دوسرے جلسوں کی نوعیت کا اندازہ ہو سکے۔

اس خبر کے پھیلتے ہی لکھنؤ پر حزن والم کا بادل چھا گیا، ہر شخص متاثر تھا، عام اس سے کہ وہ محمد علی کے خیالات سے اتفاق رکھتا ہو یا اختلاف۔

مولٰنا ظفر الملک کا تاثر چنانچہ راقم الحروف مولٰنا ظفر الملک کی خدمت میں حاضر ہوا اس خبر بد کی اطلاع کو دو روز گزر چکے تھے، بر سبیل تذکرہ محمد علی کا ذکر آ گیا تو ظفر الملک صاحب کی یہ حالت ہو گئی کہ وہ آنسو روکنا چاہتے تھے مگر نہیں روک سکے، انھوں نے بولنا چاہا مگر گریہ گلو گیر ہو گیا، یہ منظر اتنا مؤثر تھا کہ بیان نہیں کیا جا سکتا، یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ مولٰنا ظفر الملک صاحب کو محمد علی کی آخری آرا و افکار سے سخت اختلاف تھا اور کچھ ہی عرصہ پیشتر وہ گزشتہ تحریک سول نافرمانی (نمک سازی) کے سلسلہ میں جیل سے رہا ہوئے تھے۔

دوسرے روز پھر حاضری کا اتفاق ہوا، پھر اس روز بھی ممدوح کے دفور تاثر کا یہی عالم تھا۔

جلسہ کے انتظامات مسلمانان لکھنؤ کے اظہار غم والم کے لئے لکھنؤ کے ہر طبقے کی طرف سے ایک جلسہ کا اعلان کیا گیا، اور ہڑتال کا مطالبہ کیا گیا۔

ایک دوسرا جلسہ اس جلسے کے انتظامات ابھی مکمل نہیں ہوئے تھے لیکن سلسلہ جاری تھا، اس سے ایک روز پیشتر لکھنؤ کی "اسٹوڈنٹس یونین" نے ایک عظیم الشان جلسہ کے انتظامات کئے، جس میں لکھنؤ یونیورسٹی، دار العلوم ندوۃ العلماء، کرسچین کالج، جوبلی کالج شیعہ کالج، امین آباد مسلم ہائی اسکول حسین آباد ہائی اسکول کے تمام طلبہ نے نہایت

سرگرمی و مستعدی سے حصہ لیا اور شام کو ۵ بجے نظیر آباد سے طلبہ کا ایک جلوس ہزاروں تماشائیوں کے ساتھ ننگے سر، بازو پر سیاہ نشان باندھے، دو دو کی صف میں چلا، اس نے قیصر باغ، روشن دولہ، گولہ گنج، مولوی گنج، خیالی گنج، اور امین الدولہ پارک کی طرف کے تمام حصوں میں گشت کیا، اور پھر گنگا پرشاد میموریل ہال میں داخل ہوا، حاضرین کی کثرت سے ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، تل رکھنے کی گنجائش نہیں تھی اوپر کی گیلریاں بھی آدمیوں سے پر تھیں۔

لکھنؤ یونیورسٹی کے ایک طالب علم کی صدارت میں وہ جلسہ ہوا اور بہت دیر تک جاری رہا، لکھنؤ یونیورسٹی دار العلوم ندوۃ العلما اور دوسری درسگاہوں کے طلبہ نے نہایت پرجوش اور دردانگیز تقریریں کیں، خوش قسمتی سے راقم الحروف کو بھی اس جلسہ میں تقریر کرنیکا اعزاز حاصل ہوا

اصل جلسہ دوسرے روز اصل جلسہ بڑی شان و شوکت سے منعقد ہوا، پہلے تو رضاکاروں کے تمام دستے جنھوں نے سارے شہر میں گشت کیا تھا آئے پھر کانگرس کے والنٹیر آئے، پھر دوسری انجمنوں کی کوریں آئیں اور پھر حاضرین آنا شروع ہوئے، حالت یہ تھی کہ امین الدولہ پارک میں آدمیوں کا سمندر لہریں مار رہا تھا، اور اس میں ہندو مسلمان کی کوئی تفریق نہیں تھی، ہر فرقہ، ہر جماعت، ہر خیال اور ہر مسلک کے عام و خاص خصوصًا عام لوگ موجود تھے۔

شرکاء جلسہ کے مخصوص و ممتاز حاضرین میں بھی مختلف الخیال اور مختلف العقائد حضرات کا گروہ نظر آ رہا تھا، مثلاً قطب الدین عبد الوالی صاحب، صبغۃ اللہ صاحب شہید، عنایت اللہ صاحب فرنگی محل، مولانا ظفر الملک صاحب، مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی، چودھری خلیق الزماں صاحب، مولانا عبد الحلیم صاحب صدیقی پنڈت ہرکرن ناتھ مصرا، اس کے

علاوہ اور بہت سے معززین ہندو مسلم شریک تھے۔

مولانا صفی کی نظم | مولانا صفی نے اپنی دلگداز نظم سے حاضرین کو تڑپا دیا، وہ نظم اپنے موقعہ سے آئے گی، اسی طرح اور دوسرے حضرات نے تقریریں کیں اور مرثئے پڑھے اور اپنے غیر معمولی غم والم کا اظہار کیا۔

جلسہ نہایت کامیابی کے ساتھ بڑے عرصہ تک ہوتا رہا۔

راقم الحروف نے مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی سے اپنی حیرت کا اظہار کیا کہ اتنی غیر معمولی کامیابی کی ہرگز توقع نہیں تھی، انھوں نے فرمایا "حضرت جوہر خود فرما گئے ہیں۔

ہو تم تو نذر عشق نہ لکھیں وہ مرثیہ — یہ بات ہے مروت اہل سخن سے دور

باب ۲۹

عام اظہار آرا

اخبارات :۔

محمد علی کی وفات کے بعد ملک کے اکثر اخبارات و رسائل نے "رئیس الاحرار نمبر" نکالے، اور ان میں محمد علی کے سوانح و کوائف ان کے خدمات اور ان کی ایثار و قربانی پر زبردست مقالات لکھے، ان میں خاص طور پر قابل ذکر انقلاب، مدینہ اور خلافت کے نمبر کہے جا سکتے ہیں، انھوں نے مواد پیش کرنے کی کوشش کی تھی۔

اس کے علاوہ عربی اخبارات نے بھی ان پر بہت کافی معلومات جمع کئے اور شایع کئے۔ مصر وغیرہ کے تمام اخبارات نے بڑے بڑے مقالات سیاہ جدولوں میں شایع کرے۔ اور بلا تفریق عیسائیوں اور یہودیوں اور مسلمانوں کے اخبارات نے اس حادثہ فاجعہ پر اپنے دلی تاسف کا اظہار کیا۔

مصر کی قوم پرور پارٹی "وفد" کا آرگن اخبار لکھتا ہے۔

المسا، " دو دن ہوئے ہندوستان کے قلب و جگر پر ایک گہرا زخم لگا ہے، ایسا زخم جو مدتوں مندمل نہ ہو سکے گا۔ یہ زخم مولانا محمد علی کی انتہائی افسوسناک موت کی وجہ سے لاحق ہوا ہے، مرحوم ہندوستان کے ایک نہایت ہی جلیل القدر اور شاید سب سے زیادہ جری رہنما تھے، خدمت وطن میں انھوں نے بے شمار مصائب برداشت کیں اور بالآخر میدان جہاد ہی میں جام شہادت

نوش کیا۔

محمد علی فطرۃً انقلابی تھے اور جب ہم کسی کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ وہ انقلابی ہے تو پھر یہ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ وہ برطانیہ کا دشمن ہے کیونکہ برطانیہ ہی سب سے بڑی ملک گیر طاقت ہے، محمد علی کی پوری زندگی برطانیہ کے خلاف جہاد میں گزری، یقیناً ہندوستان انھیں مدتوں یاد رکھے گا۔

اے مجاہد اعظم فردوس میں لازوال زندگی حاصل کر اور پروردگار سے التجا کر کہ تیرا وطن اور سارا مشرق جلد آزاد ہو جائے، وہ مقصد جس کے لئے تو نے جان دی ہے"

المقطم | عیسائیوں کا اخبار المقطم لکھتا ہے :۔

"لندن سے ہمیں یہ جانکاہ خبر پہنچی ہے کہ مولائی محمد علی کا انتقال ہو گیا مولائی محمد علی ہندوستان میں مسلمانوں کے سب سے بڑے رہنما اور دنیا کے مسلم رہنماؤں میں ایک بلند رتبے کے مالک تھے، انھوں نے اسلام ہندوستان اور پورے مشرق کی خدمت کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی تھی"۔

یہ تو تھے عربی اخبارات کے دو بلند تر اخبارات کے افکار و آرا، اب انگریزی اخبارات پر بھی ایک سرسری نظر ڈال لیجئے۔

ڈیلی اکسپریس | ڈیلی اکسپریس لکھتا ہے :۔

"مولانا محمد علی موت کی آغوش میں انگلستان تشریف لائے، تاکہ گول میز کانفرنس کی شمولیت کر کے اپنے ملک وملت کی بہترین خدمات انجام دیں، ان کو اچھی طرح معلوم تھا کہ آخری وقت بالکل قریب ہے اور

ان کو بتایا گیا تھا کہ وہ چند گھنٹوں سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتے لیکن باوجود اس
کے روحانیت کے اس جذبہ کے ماتحت جو اہل مشرق سے مخصوص ہے آپ نے
اپنی زندگی کی آخری رات بھی ڈیلی گیٹوں کو اپنا آخری اور الوداعی پیغام
لکھوانے میں گزار دی تاکہ کسی طرح فرقہ وارانہ پیچیدگی کو سلجھا کر وطن کی آخری
خدمات سرانجام دیں، آپ نے لندن ہوٹل میں داعی اجل کو لبیک کہا، والیان
ملک اس قائداعظم کی بالیں پر اشکبار تھے، ایک ہاتھ اپنی عاشق زار بیگم کے ہاتھ
میں اور دوسرا اپنے شیدائی برادر بزرگ کے ہاتھ میں جو تمام رات آئرلینڈ میں سفر
کرتے ہوئے موت سے چند ہی گھنٹے پہلے پہنچے تھے ہندوستانی شہزادہ بار بار کمرہ
میں آتے تھے اور دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتے تھے۔"

ٹائمز آف انڈیا ٹائمز آف انڈیا کا لندنی وقائع نگار جو غالباً اس کا کوئی سابق ایڈیٹر ہے لکھتا ہے:-

"مرحوم کے ساتھ میری دوستی سالہا سال سے چلی آرہی تھی جبکہ وہ مہانہ
ریاست بڑودہ میں محکمۂ افیون کے افسر تھے اور اس تنگ حلقے کی
بے لطفیوں کی تلافی مضمون نگاری سے کیا کرتے تھے، جب وہ (ابکی)
لندن آئے اور میں ان سے ملا تو مجھے ان کی صورت دیکھ کر بہت صدمہ
ہوا، وہ اصل میں برلب مرگ تھے اور اس حقیقت سے خود بھی آگاہ تھے
لیکن وہ کانفرنس کی ایک نہایت طویل اور بیحد دل کش تقریر کرنے تک زندہ
رہے مرحوم نے مجھ سے کہا کہ میں امن اور صلح کے لئے آیا ہوں۔"

باب ۳۰

عام اظہار آرا

اقوال مشاہیر:

ملک معظم اور مسٹر میکڈانلڈ وزیر اعظم کے علاوہ خاص خاص حضرات کے تاثرات یہ ہیں:-

مولانا شوکت علی - میرا بھائی ایک بہادر اور شجاع سپاہی تھا جس نے لڑتے لڑتے میدان جنگ میں جان دی۔

مولانا حسرت موہانی - اسلام کے سپاہی کے لئے اس سے بہتر اور کیا انجام ہو سکتا ہے کہ اس نے لڑتے ہوئے اپنی جان دی۔

مولانا حسین احمد - مولانا محمد علی آزادی کے سب سے بڑے علمبرداروں میں سے تھے اور انھیں اپنے ملک کی سیاسی نجات کے ساتھ خاص شغف تھا، ان کی نظر، سیاسی، مذہبی اور فقہی معاملات میں اس بلندی پر پہنچ جاتی تھی، جہاں تک ہر شخص کی نگاہ کا پہنچنا محال ہے۔

سوباش چندر بوس (میر کلکتہ کارپوریشن) - مولانا ایک بلند ارادہ اور عدیم النظیر قائد تھے جو صف اول میں مصروف جنگ تھے، آپ کی سرگرمیاں صرف مادر وطن تک محدود نہ تھیں بلکہ آپ کی نگاہ وسیع ترقی اور اتحاد مشرق آپ کی زندگی کا خواب تھا، مولانا میرے ذاتی دوست تھے، حال ہی میں چند امور میں مولانا

محمد علی سے اختلاف ہوگیا تھا لیکن بلاشبہ اور بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ ان امور میں جن میں لوگ ان سے متفق نہیں تھے، مولانا کا مقصد محض خدمت خلق تھا، مولانا کی زندگی آنے والی نسلوں کے لئے ہمیشہ ایک قابل تقلید مثال ہوگی۔

فیڈرل سب کمیٹی کے ارکان۔ مولانا محمد علی ایک ایسی شخصیت تھے جنھوں نے اپنے فرض کی حمایت میں اپنی کمزوری اور تکالیف کا مطلق پاس نہ تھا۔

مسٹر جیکر۔ مولانا محمد علی ہندوستانی سیاسیات میں ایک اہم ہستی تھے اور انھوں نے قومی مفاد کی زبردست خدمت انجام دی۔

سر، سی پی، راما سوامی، آئر۔ مولانا محمد علی ایک طاقتور اور باا ثر شخصیت تھی۔

لارڈ ریڈنگ۔ مولانا محمد علی زبردست قوت عمل کے مالک تھے، وہ اپنے عقائد کو نہایت پختگی کے ساتھ پیش کرتے تھے ان کی ہمت اور جرأت کو دیکھتے ہوئے ہمارے قلوب میں تعریف و توصیف کا جذبہ موجزن ہے۔

سر جارج لینے رکن حکومت ہند۔ مولانا محمد علی نے ملک و قوم کو اپنی مشکلات پر ترجیح دی اور بالآخر ملک و وطن پر فدا ہوگئے۔

مسٹر آرتھر مور۔ مولانا محمد علی ایک شیر دل سپاہی تھے۔

سر ہری سنگھ گوڑ۔ مولانا محمد علی نے ہندوستان کی جو خدمات انجام دیں، وہ تاریخ ہند کے صفحات پر ہمیشہ یادگار رہیں گی، ہندوستان اور بیرون ہندوستان میں ایک شخص بھی ایسا نہیں جو مرحوم کی حب الوطنی سے انکار کر سکے۔

سر تیج بہادر سپرو۔ میں مولانا محمد علی سے تیس سال سے واقف تھا، ان کی شخصیت شاندار اور زوردار تھی، اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اپنے ملک سے

بہت محبت کرتے تھے اور ان کی وفات ایسے وقت میں ہوئی جبکہ ہندوستان کو ان
کی اشد ضرورت تھی۔

سر اکبر حیدری۔ مولانا محمد علی نے اپنی زندگی کے آخری لمحوں تک ملک کی خدمت کی۔

مشہور مصنف ایچ، جی، ویلز۔ مولانا محمد علی کا دل نپولین کا دل تھا، ان کی زبان
برک کی زبان تھی، ان کا قلم میکالے کا قلم تھا۔

مسٹر بن وزیر ہند۔ محمد علی ایک جلیل القدر مسلمان، ایک زبردست محب وطن اور عام
انسانیت کے ایک عظیم القدر پیشوا تھے۔

لارڈ پیل سابق وزیر ہند۔ مولانا محمد علی میرے رفیق کار تھے، اور مجھے ان کے انتقال
سے بے انتہا رنج ہوا ہے۔

مسٹر فزبراکوے ممبر پارلیمنٹ۔ مولانا محمد علی بہترین دل و دماغ کے مالک تھے۔

لارڈ سینکے۔ مولانا محمد علی اول و آخر ہندوستان کی فلاح و بہبود کے طالب تھے

سر محمد شفیع۔ مولانا محمد علی محب وطن اور ایثار شعار انسان تھے۔

پنڈت موتی لال نہرو۔ مولانا محمد علی میرے پرانے دوست، پختہ مسلمان اور زبردست
شخصیت تھے۔

کلکتہ کارپوریشن کے ارکان۔ مولانا محمد علی کی قبر پر امن، اتحاد اور رواداری کا مندر
تعمیر ہو۔

امین الحسینی مفتی فلسطین۔ محمد علی ان لوگوں میں سے تھے جنھوں نے سب کچھ قوم و ملت
اور اسلام کے لئے قربان کر دیا۔

مہاراجہ بیکانیر۔ مولانا کا کیرکٹر اعلیٰ اور اوصاف پسندیدہ تھے۔

مسٹر بھروچہ ۔ مولنا ایک سحر بیان مقرر، صاحب قلم، بہادر جنگجو، اسلام کے پرجوش اور سچے پیرو تھے ۔

مدیر ٹائمس (لندن) ۔ محمد علی اصول کے لئے جئے، اصول کے لئے مصیبت اٹھائی اور اصول کے لئے مرے ۔

مولنا سید سلیمان ندوی ۔ افسوس وہ پردرد آواز جو ۱۹۱۱ء سے ۱۹۳۰ء تک ہندستان اور دنیائے اسلام کے ہر قیامت آفریں سانحہ میں صدائے صور بن کر بلند ہوتی رہی ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگئی، وہ بے قرار دل جو اسلام اور مسلمانوں کی ہر مصیبت کے وقت بیتاب ہوجاتا تھا اور اوروں کو بیتاب کرتا تھا قیامت تک کے لئے ساکن ہوگیا، وہ اشک آلود آنکھیں جو دین وملت کے ہر ماتم میں آنسوؤں کا دریا بن جاتی تھیں، حسرتا کہ ان کی روانی ہمیشہ کے لئے بند ہوگئی، وہ مترنم جب جو ہر بزم میں خوشنوا بلبل بن کر چہکتے تھے، ان کے ترانے اب ہمارے کان نہ سنیں گے، وہ آتش زبان جو ہر رزم میں تیغ براں بن کر چمکتی تھی، اس کی تابش اب کسی معرکہ میں ہماری آنکھوں کو نظر نہ آئے گی، وہ پرجوش سینہ جو ہمارے مصائب کے پہاڑوں کو سیلاب بن کر بہالیجاتا تھا، اس کا تلاطم ہمیشہ کے لئے تھم گیا، وہ پرزور دست وباز و جو شب وروز کی خدمتگزاری اور نبرد آزمائی میں مصروف تھے۔ وہ اب ایسے تھکے کہ پھر نہ اٹھیں گے اور افسوس کہ شکست خوردہ فوج کا وہ آخری سپاہی جو اعدا کے نرغہ میں تنہا لڑ رہا تھا، آخر زخموں سے چور ہوکر ایسا گرا کہ پھر نہ کھڑا ہوگا۔ الوداع! محمد علی، الوداع! والسلام الی یوم القیام!

مسٹر بریلوی ایڈیٹر بمبئی کرانیکل ۔ مولنا محمد علی کی وفات سے صرف مسلمانان ہند ہی کو

نہیں بلکہ تمام ہندوستان کو ایک نقصان عظیم پہنچا ہے۔ ان کی زندگی ہمارے لئے ایک انمول تحفہ تھا۔

مسٹر جی کے ،نریمان - میرے قلب پر محمد علی کی صاف گوئی، اور کشادہ دلی کا بہت اثر ہے، محمد علی زبردست سیاست داں تھے اور بہت سی سیاسی مجالس میں ان کی فتح کا باعث ان کا وہ بیمثال کیرکٹر ہوتا تھا جس نے ملک معظم تک سے خراج تحسین حاصل کر لیا، مجھے محمد علی کی وہ مخصوص خصائل پر رشک آتا تھا ایک یہ کہ وہ خطرہ کے نازک ترین وقت پر بھی اپنی عقل و حواس کو قابو میں رکھتے تھے اور دوسرے یہ کہ ان کی طاقت کا خزانہ ہمیشہ معمور رہتا تھا۔

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی - مولانا ممدوح اپنے ایک گرامی نامہ میں مولانا عبدالماجد صاحب مدیر سچ کو تحریر فرماتے ہیں :-

"محمد علی کی وفات کا میرے قلب پر جو اثر ہے بیان نہیں کر سکتا، خدا جانے کتنی دفعہ دعا کر چکا ہوں اور کر رہا ہوں، مجکو مرحوم کی جس صفت کا اعتقاد اور اس اعتقاد کی بنا پر محبت ہی۔ وہ صرف ایک صفت مسلمانوں کی سچی محبت بے غرض ہے، باقی دوسری صفات دیکھنے والے جانتے ہیں میں نے کبھی دیکھا نہیں، اس لئے ایک ہی صفت سے محبت ہے اور اس کو میں روح الصفات سمجھتا ہوں" اشرف علی

باب ۳۱

نذر عقیدت

مرثیوں کی صورت میں!

محمد علی کی وفات ایک ایسا سانحۂ کبریٰ تھا کہ ہر طبقہ اور ہر جماعت نے ان کے غم و الم میں نمایاں حصہ لیا، چنانچہ ان کی وفات پر جہاں تقریریں ہوئیں، جلسے ہوئے، تجویزیں پاس ہوئیں، مضامین و مقالات لکھے گئے، اکابرین ملک نے بیانات کی صورت میں اپنے غم و الم کا اظہار کیا، وہاں شعرا نے اپنے جذبات کو اشعار کی صورت میں مدون کیا، اور محمد علی کے حضور میں اپنا یہ خراج عقیدت، بصد رنج و تعب پیش کرنے کا افتخار حاصل کیا۔

ان محدود صفحات میں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ وہ سارے مرثئے آپ کی خدمت میں پیش کئے جاسکیں، مجبوراً چند پر قناعت کرنی پڑتی ہے اور ان میں بھی اخذ و التقاط سے کام لینا پڑتا ہے، سیرۃ کے آئندہ مطول ایڈیشن میں کوشش کیجائے گی کہ تمام قابل ذکر مرثئے، بتمامہ شائع کئے جاسکیں۔

اس سلسلہ کا آغاز مشرق کے زبردست شاعر علامہ اقبال کے ان چند اشعار سے کیا جاتا ہے جو گو تعداد میں کم ہیں لیکن یہ واقعہ ہے کہ ان چند اشعار کے اندر محمد علی کی سیرۃ اور خصوصیت کا پورا مرقع علامۂ ممدوح نے پیش کر دیا ہے۔

۱۔ اقبال

یک نفس جان نزار او تپید اندر فرنگ　　　تا مژہ برہم زنیم از ماہ و پرویں در گذشت

اے خوشا مشت غبار او کہ از جذب حرم — از کنار اندلس و از ساحل بربر گزشت
خاک قدس او را بہ آغوش تمنا در گرفت — سوئے گردوں رفت ز انجا کہ پیغمبر گزشت
می نہ گنجد جز بہ آں خاکے کہ پاک از رنگ بوت — بندۂ کو از تمیز اسود و احمر گزشت

جلوۂ او تا ابد باقی بہ چشم آسیاست
گرچہ آں نور نگاہ خاور از خاور گزشت

۲- مرگ غربت

(از مولانا صفی لکھنوی)

کیوں اشکبار ہند نہ ہو صورت سحاب — مغرب میں جب غروب ہو مشرق کا آفتاب
وہ مرد ذی کمال کہ جس نکتہ سنج کی — تحریر بے نظیر تھی تقریر لاجواب
اسلامیوں کے واسطے سینہ سپر وہ شیر — تیغ زباں سے معرکہ آرا و فتحیاب
آزادی وطن کی تمنا کا خضر راہ — وابستہ جس کے شیب سے تھا قوم کا شباب
مسلم ہوں یا ہنود ہوں وہ چاہتا یہ تھا — اپنے وطن کے دونوں نہیں مالک الرقاب
وہ پختہ مغز قائد اعظم ، بلند فکر — ہر دم تھا جس کے پیش نظر جادۂ صواب
وہ حق پسند جس کی زباں پر چڑھی ہوئی — اللہ کے رسول پر اتری ہوئی کتاب
آزادی وطن کے لئے دے کے نقد جان — لیٹا ہے وہ مسافر اخلاص انتساب
ہر صوبہ دے رہا ہے جسے دعوت قیام — آنکھیں بچھا رہی ہے لحد بہر فرش خواب
جس بے نوا کی قبر پہ چھڑکاؤ کے لئے — آمادہ طفل اشک بھرے شیشۂ گلاب
بیساختہ زباں پہ یہ جاری ہوا صفیؔ — دہشت اثر خبر سے بڑھا جبکہ اضطراب
ہنگام نزع قوم ہی کا دل میں درد تھا — حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

۳ - جوش

ہندوستان کے مشہور شاعر حضرت جوش ملیح آبادی نے بھی محمد علی پر چند اشعار کہے ہیں اور حق یہ ہے کہ جوش نے اپنے اشعار میں سوز و گداز اور حقیقت و بیان واقعہ کا جتنا مکمل امتزاج کیا ہے، اس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔

اے متاعِ بردۂ ہندوستان و ایشیا
اے کہ تھا ناخن پہ تیرے عقدۂ حق کا مدار

غش تھا کاوش پہ تری اندازۂ صبح و مسا
ختم تھی قدموں پہ تیرے نیرنگیٔ لیل و نہار

اے غرورِ ملک و ملت تو وہاں لیتا تھا سانس
موت جس عالم میں بنتی ہے حیاتِ پائدار

وقت کے سیلاب سے تیرا سفینہ ہے بلند
سیرتِ پیغمبرِ اسلام کے آئینہ دار

تجھکو بخشی تھی مشیت نے وہ برتر زندگی
جس بہادر زندگی کو موت پر آتا ہے پیار

تیرے آگے لرزہ براندام تھی روحِ فرنگ
اے دلِ ہندوستاں کے عزمِ تند و استوار

طنطنے سے تیری ہیبت آفریں آواز کے
تھی حسین ابن علی کی استقامت آشکار

ڈوب جاتی تھی دلِ باطل میں لہراتی ہوئی
تیرے لہجے میں لچکتی تھی وہ تیغِ آبدار

موڑ کر رکھدی تھی تو نے جنگ کے میدان میں
اہلِ بدعت کی کلائی خنجرِ قاتل کی دھار

تجھ سے آتا تھا پسینہ قیصر و اورنگ کو
اے کہ ہمت تھی تری قوت شکن سلطاں شکار

خون میں تیرے نہاں تھی جنبشِ نبضِ علی
خون میں تیرے ودیعت تھا مزاجِ ذوالفقار

تیری سیرت میں تھی مضمر صولتِ پیغمبری
تیری فطرت میں تھی پنہاں سطوتِ پروردگار

روئے ملت پر ہے تیری موت کی تابندگی
کج ہوئی جاتی ہے ماتھے پہ کلاہِ افتخار

۴۔ سرپھرا ملاح

(از حفیظ جالندھری)

حضرت حفیظ نے اپنی یہ نہایت ہی پسندیدہ نظم یہاں جامعہ میں جامعہ کے یوم تاسیس ۲۹ اکتوبر سنہ ۳۱ء کے موقع پر سنائی تھی امیر جامعہ ڈاکٹر انصاری صاحب بھی موجود تھے۔

حفیظ صاحب نے جس وقت نظر سے محمد علی کے ماحول اور کردار کی نقاشی کی ہے وہ ہر شخص کا کام نہیں، یہ انھیں کے موقلم کو قدرت حاصل ہے۔

نظم اپنے کیف و تاثر کے اعتبار سے اس کی مستحق ہے کہ وہ بلاکم و کاست پوری کی پوری شائع کر دی جائے لیکن قلت گنجایش کی وجہ سے ہم اپنی یہ تمنا بھی آئندہ ایڈیشن کے لئے اٹھائے رکھتے ہیں اور اس صحبت میں صرف چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔

شب تاریک بیم موج، گردابے چنیں حائل
نہنگان اجل کی نیتیں بیداد پر مائل

غضب تھا اک شکستہ ناؤ کا منجدھار میں پھنسنا
فضا کی سسکیاں، قسمت کا رونا، موت کا ہنسنا

فقط اک سرپھرا ملاح طوفانوں سے لڑتا تھا
ہوا کے آب کے جنوں سے شیطانوں سے لڑتا تھا

اگرچہ ناؤ میں انبوہ در انبوہ انساں تھے
یہ سب ملاح کے ہم قوم تھے یعنی مسلماں تھے

یہ سب تھے عقل و جرات میں ارسطو و اسکندر
مگر آرام سے لیٹے ہوئے تھے ناؤ کے اندر

چلی جاتی تھی کشتی خشمگیں موجوں سے ٹکراتی
ابھرتی، بیٹھتی، دبتی، دباتی اور چکراتی

کہیں گرداب کے منہ پر کہیں پرشور دھارے پر
کبھی اس کے اشارے پر کبھی اس کے اشارے پر

ہوائی دوش پر خونخوار عفریتوں کی فوجیں تھیں
پہاڑ اٹھ اٹھ کے ٹکراتے تھے پانی کی جو موجیں تھیں

تعجب ہے کوئی پروا نہیں تھی ناؤ والوں کو
کہ طوفاں میں نظر آتی تھی خامی باکمالوں کو

انھیں معلوم تھا طوفان نے کشتی کو گھیرا ہے
گھڑی بھر میں یہ بیڑا اب نہ تیرا ہے نہ میرا ہے

انھیں وعوے تھے بحر زندگی میں ناخدائی کے
انھیں گریا وتھے گرداب میں مشکل کشائی کے

یہ طوفانوں پہ کر سکتے تھے لچھے دار تقریریں
دکھا سکتے تھے تقریروں میں طوفانوں کی تصویریں

ہوا کا رخ ذرا بدلے تو سب کچھ جان جاتے تھے
تہ دریا نہنگوں کی نظر پہچان جاتے تھے

یہ سب جو پانوں پھیلائے ہوئے کشتی میں بیٹھے تھے
پرانے ناخداؤں اور ملاحوں کے بیٹے تھے

مگر وہ سر پھرا ملاح تنہا تھا اکیلا تھا
ادھر پانی کی شدت تھی اُدھر موجوں کا ریلا تھا

وہ چلاتا تھا اٹھو، بھائیو، ہمت کرو، آؤ
ذرا ہمت دکھاؤ دست و بازو کام میں لاؤ

ادھر سیلاب پھر آتا ہوا معلوم ہوتا ہے
اُدھر گرداب بل کھاتا ہوا معلوم ہوتا ہے

مبادا ناؤ اب کی اور بھی کمزور ہو جائے
یہ گرداب بلا شاید دہان گور ہو جائے

نہیں ہنگام سونے کا کھڑے ہو جاؤ تن جاؤ
حوادث کے مقابل آہنی دیوار بن جاؤ

وہ چلایا وہ چیخا منتیں کیں آہ وزاری کی
مگر بے سود تھا سب کچھ کسی نے بھی نہ یاری کی

نہ آمادہ ہوا کوئی بھی جرأت آزمائی پر
سبھی ہنستے رہے ملاح کی ہرزہ سرائی پر

شکستہ ناؤ کا ملاح بیدم ہو گیا آخر
بڑھا کر حوصلہ تن میں لہو کم ہو گیا آخر

گرا دریا میں چپو ہاتھ سے پتوار بھی چھوٹی
شکستہ ہو گئے بازو مگر ہمت نہیں ٹوٹی

تھکن کا ہو رہا تھا اب اثر آہستہ آہستہ
لگا جھکنے وہ سرافراز سر آہستہ آہستہ

وہی سر جو ہواؤں سے نہ طوفانوں سے جھکتا تھا
نہ فرعونوں سے جھکتا تھا نہ ہامانوں سے جھکتا تھا

نہ جھکتا تھا کبھی میر و وزیر و شاہ کے آگے
وہ سر اک مرتبہ پھر جھک گیا اللہ کے آگے

تعجب سے ردائے ابر میں سے برق نے جھانکا
کہ یہ اک آخری سجدہ تھا اس مرد مسلماں کا

شکستہ ناؤ میں طوفاں کی اس چیرہ دستی میں

وہ اپنا فرض پورا کرچکا تھا اس بحر ہستی میں

یہ تو تھے ہندوستان کے شعراء نامدار کے نالہ ہائے دل فگار، لیکن ممالک اسلامی کے شعرا نے بھی اپنے قطرت اشک کی نذر اس بارہ گاہ عالی میں چڑھائی ہے۔

۵ - امیر الشعراء مصر کا مرثیہ

اخبار "الشوریٰ" مصر میں احمد شوقی کا یہ بلند پایہ مرثیہ شائع ہوا تھا جس کے جستہ جستہ اشعار کا ترجمہ ہدیۂ ناظرین ہے، پورا مرثیہ طوالت کے خیال سے نظر انداز کیا جاتا ہے۔

اے قدس! تو اپنی تربیت کے مہمان کی وجہ سے قابل مبارکباد ہے، آج تو اس کی ملاقات سے سرفراز ہو۔

نبیؐ نے اس کے لئے اپنے براق کے بیٹھنے کی جگہ کھول دی اور اس کے آنے کا مقام وہ ہی جہاں سے نبی رات کو گئے تھے۔

مشرق کے حقوق کے لئے لڑنا اس کا کام تھا اور اسلام کا قضیہ اس کی عبا۔

مشرق کے لئے جو اسے تڑپ تھی یا ہندوستان کے واقعات کے لئے اس کی بے خوابی اسے عزیز ہندوستان فراموش نہیں کرسکتا۔

نیل اپنی مصیبتوں میں اس کی آواز کو یاد کرے گا، اور ترک اس کی سچی تڑپ کو فراموش نہیں کریں گے۔

آپ نے زندگی میں وہاں کے باشندوں کی مدد و معاونت کی تو آپ وہاں کے لئے اجنبی کیسے ہوسکتے ہیں؟

باب ۳۲

لمحے چند

بیت المقدس میں جب محمد علی لائے گئے اور ان کی نماز جنازہ ادا ہوئی تو مشرق کے چند بڑے بڑے بزرگوں نے تابوت کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے احساس قلب کا اظہار کیا تھا جن میں سے دو کے تاثرات مختصراً ہم آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

۱۔ احمد زکی پاشا

آپ نے مسجد اقصیٰ میں کھڑے ہو کر فرمایا۔

اے بزرگان مسجد اقصیٰ! اے ابنائے عرب! اور اے امت اسلام!

مولانا محمد علی کی زندگی جہاد کی ایک مسلسل لڑی تھی، زمانہ نے اسے دیکھا اور تاریخ نے اسے محفوظ کیا اور یہی نہیں بلکہ آج کے بعد لوگ ہمیشہ یہ دیکھیں گے کہ ہمیشہ کیلئے وہ قربانی کی انمٹ یادگار رہے گا وہ اس امر کا عنوان رہے گا کہ وہ شخصیت کا سخت دشمن تھا۔

ہم اس کے گواہ ہیں کہ شہید اپنے ہمعصروں میں لسان صدق تھا اور ہمارے دل اس ایمان سے پر ہیں کہ خدا نے اس پر انعام کیا اور اس کو آخر میں بھی لسان صدق بنا دیا۔

اس ہندوستانی لیڈر نے اپنی زندگی ملک کے لئے وقف کر دی تھی، اس نے اپنے ملک کی آزادی کے لئے وہ وہ جہاد کیا کہ جہاد کا حق ادا کر دیا۔

فقید علم اور خادم اسلام پر خدا کی سلامتی۔

۲- شہزادہ محمد علی پاشا

محمد علی پاشا سابق وزیر اوقاف وزعیم جماعت احرار مصر نے کھڑے ہو کر فرمایا۔

جنگ بلقان میں، جنگ عظیم میں، ترکوں اور یونانیوں کی لڑائی میں محمد علی نے جو کچھ کیا وہ ہمیشہ محفوظ رہے گا اور اس غرض کے لئے جو کچھ اسے جیلخانوں اور مالی تکلیفوں کا مقابلہ کرنا پڑا وہ بھلایا نہیں جا سکتا۔

اس کا شعور اس خیال سے اس پر حاوی تھا کہ:

"قوت حق نہیں، لیکن حق قوت ہے"

اے معزز مسافر، یہ مصیبت بڑی ہے، تکلیف بھاری ہے، لیکن ہم صبر کے اجر سے برداشت کرلیں گے، میں اس لئے آیا ہوں کہ تم کو سلام کہوں، تم مرے نہیں بلکہ زندہ ہو۔ ہماری تسلی تمہارے بعد تمہارے کام ہیں جو ہمیشہ رہیں گے، تیرے جانے سے قبل تیرے اعمال آگے چلے گئے، انھوں نے جنات کے دروازے تیرے لئے کھول دئے اور تیرے اقرباء کے لئے بزرگی کو چھوڑ گئے۔

باب ۳۴

یادگار کی تجویزیں!

محمد علی کی وفات کے بعد سارے ہندوستان میں ان کی یادگار کا مسئلہ اٹھایا گیا اور ہر طرف سے مختلف تجویزیں پیش ہوئیں۔

مجسمہ کی تجویز | جناب نیاز فتحپوری نے نگار میں محمد علی کا ماتم کرتے ہوئے یہ تجویز پیش کی کہ "زندہ" قوموں کی طرح محمد علی کے لئے ایک مجسمہ تیار کرایا جائے جو ان کی یادگار کا کام دے۔

دائرہ سیاسیہ | مولانا حسرت موہانی اور بعض دوسرے زعماء نے یہ تحریک کی محمد علی کی یادگار میں ایک دائرہ سیاسیہ کی بنیاد ڈالی جائے جس میں محمد علی کے نظریہ سیاست کی تعلیم و تبلیغ ہو۔

جامعہ ملیہ | ملک کے ایک بڑے گروہ نے یہ تجویز پیش کی، کہ محمد علی کو جامعہ سے جو تعلق تھا اور جامعہ کو اپنی تاسیس میں محمد علی کے شرف وجود سے جو بزرگی حاصل ہوئی تھی اس کا اقتضا یہ ہے کہ جامعہ ملیہ کو محمد علی کی یادگار بنایا جائے، اور اسی پر ساری کوششیں صرف کردی جائیں جملہ زعماء قوم نے اس کی تائید کی اور "برکت" کے لئے مجلس کارکن میں ان تمام بزرگوں کے اسمائے گرامی بھی رکھے گئے، لیکن ان تجاویز کا جو نتیجہ ہوا، انھیں ناظرین ہم سے زیادہ جانتے ہیں۔

متفرق یادگاریں | لیکن اس بڑی یادگار کے علاوہ مختلف شہروں اور میونسپلٹیوں نے اپنی اپنی بساط کے موافق جو کچھ امکان میں تھا اس سے دریغ نہیں کیا۔

دہلی میونسپلٹی | دہلی میونسپلٹی نے یہ یادگار مناسب سمجھی کہ اس کے ایوان میں محمد علی

کی تصویر آویزاں کر دی جائے۔

بمبئی کارپوریشن | بمبئی کارپوریشن نے دو سڑکیں "محمد علی روڈ" کے نام سے نامزد کر دیں، ابھی وہاں ایک "محمد علی ہال" کی تجویز بھی زیر غور ہے اس کا نتیجہ دیکھئے کب نکلتا ہے۔

الہ آباد میونسپلٹی | الہ آباد میونسپلٹی میں بھی یہ مسئلہ اٹھایا گیا، چنانچہ اس کے غیور ارکان نے فوراً یہ تجویز منظور کر لی اور ایک پارک "محمد علی پارک" کے نام سے اور ایک سڑک "محمد علی روڈ" کے نام سے نامزد کر دی۔ لکھنؤ میونسپلٹی کی خاموشی پر تعجب ہے۔ شاید اس کے صدر محمد علی کے ایک مشہور رفیق کار تھے۔

محمد علی میموریل ہائی اسکول | اجمیر کے مسلمانوں نے مرزا عبد القادر ایم اے ال ال بی (علیگ) اور معین الدین صاحب بی اے ال ال بی کی مساعی سے نہایت عمدہ یادگار قائم کی، یعنی بیاور میں ایک "محمد علی میموریل ہائی اسکول" قائم ہو گیا جس میں تعلیم جاری ہے۔

علی گڑھ میں یادگار | علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن میں محمد علی کے پرانے دوست اور ساتھی مسٹر احسان الحق جج نے ایک تجویز ان کی یادگار کے متعلق پیش کی تھی۔

محمد علی کو علی گڑھ سے جو تعلق ہمیشہ رہا اس کا اقتضا یہ تھا کہ محمد علی کی ایک یادگار وہاں ضرور قائم کی جائے چنانچہ سنا ہے کہ وہاں بھی یہ معاملہ "زیر غور" ہے۔

تبصرہ | حقیقت یہ ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی اور تلخ اور پژمردہ کن حقیقت نہیں ہو سکتی کہ مسلمان قوم نے اپنے پیشواؤں اور رہنماؤں کی یادگار قائم کرنے میں ہمیشہ بخل اور تغافل سے کام لیا، گو اس نے ماتم میں سینہ بہت زور زور سے کوٹا اور گریبان

بھی خوب چاک کئے۔

وقار الملک، محسن الملک، خود سرسید، سید محمود، شبلی، حالی، آزاد، نذیر احمد، اجمل خاں اعظم، ان بزرگوں میں کس کی "یادگار" قوم نے تیار کر دی جو خواہ مخواہ اغیار کے شماتت کا لطف اٹھانے کے لئے محمد علی کی یادگار کا مسئلہ پیش کر دیا گیا نتیجہ وہی ہوا جو اس قسم کی "آل انڈیا میموریل" کمیٹیوں کا ہمیشہ سے ہوا کرتا ہے۔

کمیٹی بنی ہوئی ہے اس کے ارکان مصروف خواب ہیں، انھیں نہ یادگار کے مسئلہ سے کوئی خاص عملی دلچسپی ہے نہ فکر، پھر محمد علی کی یادگار قائم ہو تو کیونکر؟

حصۂ دوم

جہد و عمل

باب (۱)

ملازمت

پہلے حصہ میں محمد علی کی سیرۃ کا وہ مرقع پیش کرنیکی کوشش کی گئی تھی جس میں محمد علی کے وہ خدوخال نمایاں ہوسکیں جن کا تعلق ان کی ذاتی زندگی سے تھا، یعنی اخلاق وعادات افتادطبع اور رنگ مذاق، ابتدائی نشوونما وغیرہ۔

لیکن اس حصہ میں یہ بتانا مقصود ہو کہ محمد علی کی عملی زندگی کن کن صبر آزما ادوار سے گزری، ان کو ملک وقوم کی خدمت کی راہ میں کیسے کیسے ہمت شکن حالات ومصائب سے دوچار ہونا پڑا، اور ساتھ ہی ساتھ انھوں نے اپنی بے نظیر قوت عمل، قوت فیصلہ اور قوت تدبر سے کیا کیا کارہائے نمایاں انجام دیے، نیز ان کی عملی زندگی کی ابتدا کس طرح ہوئی اور کس طرح رفتہ رفتہ وہ "مسٹر" محمد علی سے "مولنا" محمد علی ہوگئے۔

انگلستان سے واپسی سول سروس کے امتحان میں ناکامی کے بعد محمد علی واپس بلائے گئے اور رامپور میں ان کی شادی کردی گئی، اب وہ تلاش معاش میں سرگرداں ہونے والے ہی تھے کہ ایک بار ان کے برادر بزرگ مولنا شوکت علی نے ہمت کی اور دوبارہ انگلستان بھیجا تاکہ وہ بی۔اے کی ڈگری آکسفورڈ یونیورسٹی سے حاصل کرسکیں۔

انسپکٹر جنرل تعلیمات رامپور وہاں سے قابل رشک کامیابی کے ساتھ وہ واپس آئے اور نواب صاحب رامپور نے انھیں اپنی ریاست میں سب سے بڑا افسر تعلیمات بنادیا اور اسی کے ساتھ رامپور ہائی اسکول کی پرنسپل شپ کے فرائض بھی محمد علی سے متعلق ہوگئے۔

سازش محمد علی اپنے یہ دوگانہ فرائض خوش اسلوبی کے ساتھ ادا کر رہے تھے، لیکن جیسا کہ ریاستوں میں عام قاعدہ ہے، ان کے خلاف سازشیں ہونے لگیں کہ کسی طرح انھیں اس منصب سے معزول کر دیا جائے، اس لئے کہ ریاست کے ان لوگوں کی جو دربار میں کسی نہ کسی حد تک رسائی رکھتے ہیں یہ سب سے بڑی خوشگوار خدمت ہوتی ہے کہ وہ اہلِ ریاست کو اعلیٰ عہدیداروں اور ریاست کے بہی خواہوں کے خلاف بھڑکاتے رہیں

نواب ناصر علی سے تعلقات نواب ناصر علی خاں صاحب، جناب نواب حامد علی خاں صاحب والی رامپور کے برادرِ خورد بھی اس زمانہ میں آکسفورڈ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے غیر ملک میں قدرۃً اپنے ہموطنوں سے زیادہ خصوصیت ہو جاتی ہے لہٰذا فطرۃً محمد علی کو نواب ناصر علی کے ساتھ زیادہ ارتباط اور انس ہو گیا، اور جب محمد علی ہندوستان واپس آئے تو نواب صاحب رامپور کی خدمت میں انھوں نے پھر اور معتوب بھائی کا ہدیۂ عقیدت و محبت پیش کیا۔

بس یہ چیز محمد علی کے لئے غضب ہو گئی اور اسی پر ساری سازش کی عمارت تیار ہو گئی۔ نواب صاحب کے کان اس طرح بھرے گئے کہ محمد علی نے اپنے زمانہ قیام انگلستان میں ناصر علی خاں سے سازش کر لی ہے اور یہ چاہتے ہیں کہ بندگان عالی متعالی کو تختِ حکومت سے محروم کر کے نواب ناصر علی خاں کو فرماں روائے رامپور بنا دیں۔

نواب صاحب مرحوم کے دل میں یہ بات جم گئی اور وہ محمد علی سے کبیدہ خاطر رہنے لگے اور اپنی کشیدگی کا اظہار اپنے طرزِ عمل سے ظاہر فرمانے لگے، یعنی ہر ایٹ ہوم، ڈنر، یا اور سرکاری تقریب پر تمام قابلِ ذکر لوگ بلائے جاتے تھے، لیکن محمد علی کو عمداً نظر انداز کر دیا جاتا تھا۔

دل برداشتگی | ان حالات سے محمد علی بہت دل برداشتہ ہوئے، اور اپنے لئے انھوں نے
کوئی دوسرا گوشۂ عمل اختیار کرنا چاہا کہ وہاں وہ بے غل وغش اپنی محنت، قابلیت، ذہانت
مستعدی اور ایمانداری کا ثبوت دے سکیں۔

شوکت کی طلبی | چنانچہ انھوں نے مولانا شوکت علی صاحب کو جو اس وقت محکمۂ افیون
کے ایک افسر اعلیٰ تھے تار دے کر بلایا، شوکت صاحب بھائی کا تار پاکر فوراً عازم رامپور
ہوئے۔

محمد علی نے ان سے تمام حالات بیان کئے اور اس ہمت شکن صورت حال کا تدارک

نواب صاحب سے ملاقات | کرنا چاہا، چنانچہ شوکت صاحب ہز ہائنس نواب صاحب رامپور
سے ملے۔ ہز ہائنس شوکت صاحب پر بچپن ہی سے بہت مہربان تھے، ہم عمر اور ساتھ کے
کھیلے ہوئے بھی تھے، اس لئے شوکت صاحب نے بے تکلفی کے ساتھ نواب صاحب کی
خدمت میں عرض حال کر دیا۔ اس وقت تو نواب صاحب مطمئن ہو گئے لیکن ایسی باتیں
دل سے نکلتی کم ہیں، رفتہ رفتہ پھر وہی طرز عمل ان کے کردار سے ظاہر ہونے لگا۔

شوکت صاحب کا مشورہ | آخر شوکت صاحب کی یہی رائے قرار پائی کہ محمد علی رامپور
سے استعفیٰ دیدیں اور کہیں اور قسمت آزمائی کریں۔

چنانچہ وہ استعفیٰ دے کر شوکت صاحب کے پاس چلے گئے اور ایک عرصہ تک شوکت
صاحب ہی کے "مہمان" رہے اور فکر روزگار میں سرگرداں، اسی زمانہ میں الہ آباد یونیورسٹی
سے وکالت کا امتحان بھی دیا لیکن ایک مضمون میں ناکام رہے۔ بالآخر وہ برسر روزگار
ہو ہی گئے۔

کنور فتح سنگھ سے تعلقات | کنور فتح سنگھ ولیعہد حکومت بڑودہ اور محمد علی سے دوران قیام

انگلستان میں بہت گہرے اور مخلصانہ تعلقات قائم ہو گئے تھے، کنور صاحب موصوف کی ایک عرصہ سے یہ تمنا تھی کہ وہ محمد علی کو اپنی ریاست بڑودہ میں بلوالیں۔

بالآخر انھوں نے اپنے والد کو مجبور کر دیا کہ محمد علی بڑودہ ضرور بلوائے جائیں اور ان کی خدمات سے فائدہ اٹھایا جائے۔

بڑودہ میں تقرر | چنانچہ مہاراجہ صاحب بڑودہ نے انھیں نہایت شفقت سے بلایا اور بڑی محبت سے رکھا، اور محکمۂ افیون میں ایک اعلیٰ منصب پر تقرر کر دیا۔

حیرت انگیز ذہانت | محمد علی وہاں کی زبان سے ناآشنائے محض تھے، اس لئے ان کے تقرر کے وقت یہ شرط بھی لگا دی گئی تھی کہ جب تک وہ وہاں کی زبان سے واقف نہ ہو جائیں اور عرائض وغیرہ خود نہ سمجھ سکیں، اس وقت تک فیصلہ پر محمد علی کے ساتھ ایک دوسرے افسر کے دستخط بھی ہوا کریں گے تاکہ کسی قسم کی غلطی نہ ہونے پائے۔

محمد علی اس شرط کو اپنے اوپر ایک پابندی خیال کرتے تھے، اس لئے انھوں نے چند ہی مہینہ کے اندر اس زبان پر اتنی دست رس حاصل کر لی کہ عرائض وغیرہ کو پورے طور سے سمجھنے لگے، اس کے بعد وہ شرط منسوخ ہو گئی۔

کارگزاری | محمد علی نے وہاں جاتے ہی اپنی کارگذاری اور مستعدی کے حیرت انگیز ثبوت دینا شروع کئے، محمد علی نے بڑودہ میں کم و بیش سات سال تک ملازمت کی اور ۱½ سال کی قلیل مدت میں انھوں نے سترہ لاکھ کا خالص منافع کرایا، جو گزشتہ سالوں کے اوسط منافع سے دو ہزار پندرہ فیصدی کی تعداد میں زیادہ تھا۔

یہ غیر معمولی کارگذاری اور حسن انتظام کا کارنامہ ایسا تھا جس نے مہاراجہ کی نظر میں محمد علی کو اور زیادہ وقیع اور زیادہ محبوب بنا دیا، اور "گیکوار بڑودہ" کی شفقتیں بہت زیادہ

بڑھ گئیں، چنانچہ اسی کارگذاری کے صلہ میں محمد علی کو ریاست کے ضلع نوساری کا کمشنر مقرر کر دیا گیا۔

نوساری کی کمشنری | اس منصب جلیل پر پہنچ کر محمد علی کی قوت عمل میں اور اضافہ ہو گیا یہاں انھوں نے متعدد اصلاحات نافذ کیں اور خصوصاً گراں قیمت پر زمین خریدنے کے متعلق غربا پر جو ظلم ہو رہا تھا اس کا پورے طور سے استیصال اور قلع قمع کر دیا، اس کارروائی نے انھیں اور زیادہ مقبول، ہر دلعزیز، اور لوگوں کی نظروں میں محبوب بنا دیا۔

دیانت و امانت | "دوران ملازمت میں آپ کی دیانت و امانت کے متعدد ثبوت ملے، مثلاً ایک دفعہ ایک ٹھیکے کے سلسلہ میں آپ کو ایک بہت بڑی رقم بطور ہدیہ مل رہی تھی، آپ کو بتایا گیا کہ یہ ریاست کا ایک دستور قدیم ہے، اور سب افسر اس قسم کے ہدایا قبول کر لیا کرتے ہیں، لیکن آپ نے بہت سختی سے انکار کر دیا، بلکہ دوسرے افسروں کو بھی اس "لقمہ تر" کے اُگلنے پر مجبور کیا"

نوساری کی کمشنری کے زمانہ میں دولتمند اور ذی اثر پارسیوں کا ایک وفد آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور زمین کی جبری خریداری کے دستور قدیم کو قائم رکھنے کی استدعا کی، لیکن آپ نے فرمایا کہ "جب ظلم معلوم ہو جائے تو پھر مجھ سے اس کی پردہ پوشی نہیں ہو سکتی"

پرسنل اسسٹنٹ | اس کے بعد محمد علی ولیعہد ریاست (کنور فتح سنگھ) کے پرسنل اسٹنٹ مقرر کر دئے گئے، اور اس حیثیت سے بھی بہت مفید خدمتیں انجام دیتے رہے

اس عہدہ پر تقرر اس لئے ہوا کہ کنور موصوف شراب کے بہت زیادہ عادی ہو گئے تھے، ہزاروں جتن کئے گئے مگر یہ لت نہیں گئی، پھر محمد علی کو ان کا پرسنل اسسٹنٹ مقرر

کیا گیا تاکہ وہ اپنے دوستانہ تعلقات کا اثر ڈال کر اس عادت قبیحہ کو ان سے ترک کرا سکیں، مگر یہ عادت مشئومہ کہیں چھٹتی ہے، بالآخر کنور صاحب موصوف کثرت شراب نوشی کے باعث انتقال فرما گئے۔

مشغلۂ تحریر | محمد علی کی تخلیق اس لئے نہیں ہوتی تھی کہ وہ ایک ریاست میں کمشنری یا محکمۂ افیون کی افسری میں اپنے ایام حیات بسر کریں، قدرت کو ان سے بڑے بڑے کام لینے تھے، اپنی ملازمت کی کثیر مصروفیتوں کے باوجود وقت نکال کر ملکی و قومی مسائل پر وقتاً فوقتاً ٹائمز آف انڈیا بمبئی وغیرہ میں مضامین لکھا کرتے تھے۔

گپ | اپنی ملازمت سے پیشتر دوران قیام الہ آباد میں انھوں نے اپنی اس دلچسپی کو مستقل طور پر قائم رکھنے کے لئے ایک مختصر سا تفریحی انگریزی رسالہ گپ اپنے رفیق آکسفورڈ کنور جگدیش پرشاد (سابق چیف سکرٹری یو پی گورنمنٹ) کی رفاقت میں نکالا، مگر افسوس کہ اس کے صرف دو پرچے نکل سکے، اور اس کے بعد کوئی نمبر نہ نکلا[۱]۔

ملازمت سے بیزاری | اس عرصہ میں کچھ ایسے واقعات پیش آئے کہ پہلے تو محمد علی نے ریاست کی ملازمت سے نکل کر گورنمنٹ کی ملازمت کے حلقہ میں داخل ہونا چاہا اور اس کے لئے شملہ کے بعض ذمہ دار انگریزوں نے ان سے وعدہ بھی کر لیا کہ ہم عنقریب کوئی اعلیٰ عہدہ دلوائیں گے، مگر پھر ان کا ملازمت ہی سے جی ہٹ گیا اور ان کی طبیعت اپنے لئے ایک وسیع تر میدان عمل تلاش کرنے لگی۔

افسر اعلیٰ سے مخالفت | محمد علی انھیں تفکرات میں تھے کہ ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے انھیں ملازمت سے بالکل بیزار کر دیا۔

---

[۱] ایک پرچہ (پہلا نمبر) میر محفوظ علی صاحب کی عنایت سے "محمد علی میوزیم" جامعہ ملیہ میں موجود ہے۔ مؤلف

مکتوب بنام محفوظ علی | چنانچہ نوساری سے اپنے رفیق قدیم میر محفوظ علی صاحب کو ایک مکتوب میں وہ اس کی تفصیل واسباب کا ذکر یوں کرتے ہیں۔

"میں نے اپنی ترقی کی درخواست دی، ٹالم ٹولا ہوتی رہی مگر اس عرصہ میں مسٹر دت کا نزول ہوا، اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ ان کی رائے میری ترقی کے خلاف ہوئی، اس لئے مجھے کوئی جواب نہ ملا، اس عرصہ میں ٹائمز آف انڈیا میں چند مضامین میرے شائع ہوئے جس میں مسلمانوں کے حقوق کی پیروی کی گئی تھی اور مسٹر گوکھلے کی دوست نما دشمنی کا پردہ فاش کیا گیا تھا۔ مسٹر دت سخت ناراض ہوئے اور میرا جواب طلب کیا، میں نے جواب اس قدر دنداں شکن دیا کہ کچھ بن نہ پڑی، کونسل میں جواب پیش ہوا اور کچھ نتیجہ نہ نکلا سوائے اس کے کہ ایک عام سرکلر شائع کیا جائے اور وہ بھی خفیہ کہ سرکاری عہدیداروں کو ایسے مضامین لکھنا مناسب نہیں جن کی وجہ سے مختلف مذاہب اور اقوام میں مخالفت پیدا ہو۔ سر ہیرلڈ اسٹورٹ کوشش کر رہے ہیں کہ سکریٹریٹ میں کوئی عمدہ عہدہ دلادیں، اگر چاہتا تو کچھ کام نہ کرتا مگر عادت کو

احساس فرض | کیا کروں سست بیٹھا نہیں جاتا، حرام کی روٹی کھانا منظور نہیں دوسرے یہ بھی خیال ہے کہ چلو ایک اور محکمہ کے کام سے واقفیت ہو جائے گی کام کی وجہ سے سر کھجانے کی مہلت نہیں ہے، اس ریاست سے سخت بیزار ہوں، اور در اصل نوکری سے بیزار ہوں"

اجرار کامریڈ کا خیال | بالآخر ان پر یہی خیال غالب آیا کہ وہ نوکری ہی سے اپنی بیزاری کا اعلان کر دیں چنانچہ انھوں نے ۱۰ جنوری ۱۹۱۰ء کو یہ خط میر محفوظ علی صاحب کو لکھا تھا،

اور ۱۹۱۰ء کے اختتام تک پورے طور سے یہ طے کرلیا کہ وہ اب ملازمت نہیں کریں گے بلکہ اخبار نکالیں گے اور اس ذریعہ سے قوم و ملک کی خدمت کریں گے، چنانچہ حسب بیان میر محفوظ علی صاحب لکھنؤ میں ایک اسکیم تیار ہوئی کہ اخبار کلکتے سے نکالا جائے، محمد علی اس کے ایڈیٹر ہوں اور میر محفوظ علی صاحب اس کے منیجر۔ مولوی عزیز مرزا مرحوم بھی اس مشورہ میں شریک تھے

جاؤرہ کی وزارت | لیکن ابھی قدم قدم پر محمد علی کے لئے موانع موجود تھے، وہ اس حلقہ سے نکلنا چاہتے تھے، لیکن یہ حلقہ تھا کہ خود محمد علی کو لپیٹ رہا تھا۔

سر مائیکل اڈوائر کا اصرار | سر مائیکل اوڈوائر سے محمد علی کے خاص تعلقات تھے، اس زمانہ میں وہ پنجاب کے ایک اعلیٰ عہدہ دار تھے، نواب صاحب جاؤرہ نے محمد علی کو جاؤرہ کی وزارت پیش کرنی چاہی اور سر مائیکل اوڈوائر نے نواب صاحب سے تائید اور محمد علی سے اصرار کیا، دوسری طرف بیگم صاحبہ بھوپال نے بھی محمد علی کو اپنی ریاست میں چیف سکرٹری کا عہدہ دینا چاہا، مگر محمد علی طے کرچکے تھے کہ وہ اب ملازمت نہیں کریں گے، اس لئے انھوں نے ان دونوں "پیش کش عہدوں" کو قبول کرنے سے انکار کردیا اور کامریڈ کے اجرار کا انتظام کرنے لگے۔

بڑودہ سے علیحدگی | چنانچہ محمد علی نے پہلے تو دو سال کی رخصت لی، اور اس کے بعد مہاراجہ بڑودہ پر ملک معظم کی توہین کا جو الزام لگا تھا، اور محمد علی نے جس کی صفائی دی تھی اس واقعہ کے بعد وہ مستعفی ہوگئے، اگرچہ مہاراجہ صاحب ان کا استعفیٰ کسی طرح منظور کرنے پر آمادہ نہ ہوتے تھے۔

صلۂ کارگزاری | محمد علی نے سات سال تک وہاں ملازمت کی اور نہایت امتیاز و شان کے ساتھ وہاں اپنی زندگی بسر کی، لیکن جب وہاں سے وہ علیحدہ ہوئے ہیں تو

سات سال کی مدت کارگزاری پر انھیں پنشن تو کسی طرح بھی نہ مل سکتی تھی، ہاں ان کے افسر بالادست نے حسن خدمات کے صلہ میں یہ تجویز کی کہ سات ہزار کی رقم محمد علی کو بطور انعام پیش کیجائے، اور پھر محمد علی نے اس رقم کو بھی حاصل کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔

مدیر "سچ" کی رائے | سچ کے محترم ایڈیٹر نے بالکل سچ فرمایا کہ

"کامریڈ کے ایڈیٹر کے لے دنیوی ترقی کے بہتر سے بہتر مواقع موجود تھے ہندوستان کا ذکر نہیں انگلستانی صحافت میں بلند سے بلند کرسی ادارت اس کے لئے خالی تھی، مناصب سرکاری میں بڑی سے بڑی رفعت اس کے لئے چشم براہ تھی، عزت، ثروت، اقتدار، وجاہت کے اصنام کبیرہ نے قدم قدم پر اسے لبھایا، لیکن اس کشتۂ عشق نے ماسوا کی جانب نظر اٹھانا بھی گناہ سمجھا اور سارے رشتے چھوڑ کر صرف ایک کا ہو رہا۔"

باب ۲

کامریڈ

بڑی آرزوؤں اور تمناؤں، بڑی کوششوں اور صبر آزمائیوں کے بعد بالآخر کامریڈ کلکتہ کی افق سیاست سے طلوع ہوا۔

ہاتھ بے تاب ہو ہو کر بڑھے کہ کامریڈ کو حاصل کریں نظریں بڑھ بڑھ کر پڑیں کہ کامریڈ کے "جنت نگاہ" صفحات سے لطف دید حاصل کریں، اور لوگوں نے دوڑ دوڑ کر کامریڈ کو لینا چاہا کہ کہیں ادب و سیاست کی اس متاع گرانمایہ سے وہ محروم نہ رہ جائیں

اس اشتیاق و کشمکش کا مظاہرہ ہندوستان کے "کالے" لوگوں نے نہیں کیا بلکہ "انگلستان" کے "گوروں" نے کیا، حکومت کے افسروں نے کیا، اور بڑے بڑے صاحب بہادروں نے کیا۔

میر محفوظ علی کا بیان میر محفوظ علی صاحب فرماتے ہیں کہ:

"انگریزوں کی اچھی خاصی تعداد کامریڈ کی خریدار، اس کے مضامین کی عاشق اور اس کے طرز نگارش کی مداح تھی۔"

ہر ایکسیلنسی کا اضطراب وائسرائے (لارڈ ہارڈنگ) کی بیگم صاحبہ وقتاً فوقتاً ٹیلیفون پر دریافت کرتی رہتی تھیں کہ "کامریڈ کس وقت چھپ کر ان کے پاس پہنچ جائے گا۔"

محمد علی کا بیان خود کامریڈ کے ایڈیٹر کا بیان ہے کہ:

"کامریڈ نے ارباب حکومت کی ایک بڑی اور نہایت مقتدر جماعت کو اپنی

طرف مبذول کرالیا، لارڈ ہارڈنگ (وائسرائے ہند) کے نام جو اعزازی پرچہ جاتا تھا اس کو وہ خود ہفتہ بھر تک نہ چھوڑ سکتے تھے۔

لیڈی ہارڈنگ کی خریداری | اس لئے بیچاری لیڈی ہارڈنگ نے خود ایک پرچہ دام دے کر اپنے نام الگ جاری کرایا۔

ولیعہد جرمنی کی خریداری | اور ان کے یہاں ولی عہد جرمنی نے (جو اسی زمانہ میں ہندوستان بغرض سیاحت آئے تھے) بھی دام دے کر اپنے نام ایک پرچہ جاری کیا۔

حکومت ہند کا کوئی محکمہ ایسا نہ تھا جس کے عمال نے ممبر اور سکرٹری سے لے کر انڈر سکرٹری تک کامریڈ کو نہ منگایا ہو۔

گورنر کی قدردانی | اور یہی حال صوبہ کے حکمرانوں اور ان کے مشیروں (اگزیکٹو کونسل کے ممبران) کا تھا۔"

مسٹر میکڈانلڈ کی قدردانی | اسلنگٹن کمیشن (جس کا ذکر کہیں حسب موقعہ آچکا ہے) جب ہندوستان آیا تو مسٹر میکڈانلڈ (موجودہ وزیر اعظم) جو اس وقت پارلیمنٹ کے لیبر ممبر تھے، ہندوستان تشریف لائے تھے لکھنؤ میں انھوں نے محمد علی سے اپنی ملاقات کے وقت اس کا بہ مسرت ذکر کیا تھا کہ وہ کامریڈ کو بالالتزام پڑھتے ہیں، اسی طرح اور بہت سے انگریز انشا پردازوں نے محمد علی کے کامریڈ کو بہت زیادہ سراہا، اور اس کے حسن انشاء، اصابت رائے اور غیر معمولی مہارت زبان کا اعتراف کیا۔

ہدیہ | میر محفوظ علی صاحب ایک دلچسپ ہدیہ کا تذکرہ کرتے ہیں کہ:

"سر فلیٹ وڈ ولسن ہندوستان کے وزیر مالیات، جب ولایت جانے لگے تو محمد علی ان سے ملنے گئے،

باتیں کرتے کرتے وہ محمد علی کو اس کمرہ میں لے گئے جہاں ان کا سامان سفر بندھا رکھا تھا کھلوا کر کہنے لگے، محمد علی، دیکھو اس میں کیا ہے، دیکھا تو کامریڈ کے پرچے تھے، کہنے لگے "میں لندن پنچ کے ایڈیٹر کو یہ تحفہ لئے جا رہا ہوں" محمد علی بولے "پنچ کے ایڈیٹر کو تو کامریڈ برا برجاتا ہے، کہنے لگے، وہ اور بات ہے، میں اپنے دوست سراون سیمن

ایڈیٹر پنچ کو ان کے مذاق کے لائق اس سے بہتر ہدیہ ہندوستان سے نہیں لے جا سکتا، تمہارے اور ان کے طرز تحریر میں جو یک رنگی ہے کہ بعض اوقات تمہارے اور ان کی تحریر میں تمیز کرنا مشکل ہے، اس کی داد وہی دے سکتے ہیں"۔

غرض اس محیر العقول اور شاندار انداز میں کامریڈ چلتا رہا۔ اور ملک اس کی قدر افزائی کرتا رہا تا آنکہ وہ پریس ایکٹ کے منحوس ہاتھوں بند ہو گیا جس کا پبلک اور پریس نے بہت شاندار طریقے پر احساس کیا۔

نشأۃ ثانیہ بیجاپور جیل سے رہائی کے ایک سال بعد اکتوبر ۱۹۲۴ء میں محمد علی نے اپنی صدارت کانگریس کے دوران میں کامریڈ نکالا تھا، لیکن اب ملک کی سیاسیات میں اتنا تغیر ہو چکا تھا، ان کے مشاغل میں اتنا اضافہ ہو چکا تھا اور ان کی ذمہ داریاں اس قدر بڑھ گئی تھیں، نیز راجہ غلام حسین، اور ولایت علی بمبوق جیسے یگانۂ روزگار رفقا سے وہ اس طرح محروم ہو گئے تھے کہ کامریڈ جیسا نکلنا چاہئے تھا ویسا نہیں نکال سکے، اور اس کا خود انہیں بھی سخت احساس تھا۔ لیکن عالم یہ تھا کہ تن تنہا وہ کامریڈ کا بار اٹھائے ہوئے تھے۔ سب ایڈیٹر کی لاکھ تلاش کی مگر جیسا سب ایڈیٹر وہ چاہتے تھے نہ مل سکا، اس لئے اکثر اس دوسرے دور میں کامریڈ

بعد از وقت نکلتا تھا۔

اپنے طور پر وہ بہت کوشش کرتے تھے کہ اس کی شان برقرار رہے، اس میں تنوع پیدا کیا جائے، اور وہ وقت پر نکل سکے، لیکن انصاف شرط ہے، جو شخص مسلسل بیمار بھی رہتا ہو، یونٹی کانفرنس میں بھی شریک ہوتا ہو، ہندو مسلم فسادات کے موقعہ پر، محل واردات پر بھی جسے پہنچنا پڑتا ہو، کانگرس کے جلسوں میں بھی جسے شرکت کرنی پڑتی ہو، نظام خلافت کے استحکام و ترقی کی ذمہ داریاں بھی جس شخص پر ہوں، مسلمانوں کو تبلیغ و تنظیم کے پھندے میں جس جس طرح پھانسا جا رہا تھا اس کی گرہ کشائی بھی اسی کو کرنی پڑتی ہو، غرض ہر قومی اور ملکی معاملہ میں اسے پیش پیش رہنا پڑتا ہو اور ہندوستان کا دورہ کرنا پڑتا ہو اور پھر سب سے بڑھ کر ستم یہ کہ سب ایڈیٹر نہ ملتا ہو اس سے یہ توقع ہی غلط تھی کہ وہ سابقہ معیار پر کامریڈ کو نکال سکے گا۔

ذاتی کوششیں | پھر بھی محمد علی اپنی طرف سے کبھی غافل نہیں ہوئے، کسی جلسہ کی صدارت کے لئے، کسی مسئلہ کے حل کرنے کے لئے، کسی قضیہ کے تصفیہ کے لئے محمد علی باہر گئے، بلکہ جانا پڑا، کامریڈ کی تاریخ اشاعت سر پر آ رہی ہے تو جہاں وہ گئے وہاں انھوں نے رات کی نیند حرام کر دی، دن بھر جلسہ میں تھکے اور رات کو بیٹھے ہوئے رات بھر کامریڈ کا "لیڈنگ آرٹیکل" لکھ رہے ہیں اور بلگام کانگرس دسمبر ۲۴ء کے موقعہ پر یہاں تک ہوا کہ بصرف زر کثیر اپنی ناداری و افلاس کے باوجود تار پر پورا مضمون بھجوایا، کچھ تار "بابو" صاحب کی غیر معمولی "انگریزیت" نے اور کچھ بعض اور حضرات کی کرمفرمائیوں نے دفتر ہی میں مضمون مسخ کر دیا۔ اب کامریڈ جو شائع ہوتا ہے تو محمد علی نے جو کچھ لکھا تھا، اس کے علاوہ سب کچھ ہے اور نہیں ہے تو وہ جو انھوں نے لکھا تھا!

بی اماں کی وفات محمد علی کو بی اماں سے جو غیر معمولی محبت تھی اس کا ہر شخص کو علم ہوگا اپنی ماں پر وہ فدا تھے اور ذرا بھی ان کی تکلیف ان سے نہیں دیکھی جاتی تھی، لیکن احساس فرض کا یہ نادر نمونہ ملاحظہ ہو کہ اس چہیتی ماں کا انتقال ہو چکا ہے، لوگ تعزیت اور شرکت جنازہ کے لئے آرہے ہیں، تجہیز و تکفین کا سامان ہو رہا ہے لیکن محمد علی ہیں کہ ایک گوشہ میں رو بھی رہے ہیں اور کامریڈ کے پروف کی تصحیح بھی کر رہے ہیں کہ اخبار وقت پر شائع ہو جائے۔

التوا آغاز ۱۹۲۶ء سے صحت بہت خراب ہوئی تو بالآخر ان ناساز گار حالات سے مجبور ہو کر محمد علی نے کامریڈ کی اشاعت اس امید پر ۱۹۲۶ء میں ملتوی کر دی کہ جب تک کوئی قابل اور مستعد سب اڈیٹر نہیں ملے گا وہ اجرا کامریڈ کا خیال بھی دل میں نہیں لائیں گے، چنانچہ نہ سب اڈیٹر ملا اور نہ محمد علی کامریڈ کا سہ بارہ اجرا کر سکے۔

لیکن اس گئی گزری حالت میں بھی کامریڈ نقصان میں نہیں چل رہا تھا، نہ صرف یہ کہ وہ اپنا خرچ پورا کرتا تھا بلکہ ہمدرد کے غیر معمولی خسارہ کا بوجھ ہلکا کرنے میں بھی محمد علی کی مدد کرتا تھا۔

باب ۳

مسلم یونیورسٹی

سرسید کے بعد | سرسید کے زمانہ تک تو مسلمانوں کا یہ "مدرستہ العلوم" ایک خاص اسلوب اور ایک خاص شان کے ساتھ چلتا رہا، لیکن ان کی وفات کے بعد ہی سے اس میں گھن لگنا شروع ہوگیا، اگرچہ ان کے لائق اور نادر روزگار جانشینوں نے اپنی پوری زندگی ان کے اس مشن کے لئے وقف کردی، اور اپنے ذاتی مصالح وحالات کو بالکل پس پشت ڈال دیا، اور پوری مستعدی وسرگرمی سے علیگڑھ کی خدمت منہمک ہوگئے، لیکن یہ ایک واقعہ ہے کہ علیگڑھ کالج پھر وہ رنگ حقیقتاً نہیں قائم کرسکا، جس کی اس سے توقع تھی۔

انگریزی اسٹاف | سب سے زیادہ جس جماعت نے علیگڑھ کو محمد علی کے معیار سے نقصان پہنچانے میں حصہ لیا وہ وہاں کا انگریزی اسٹاف تھا!

انگلش اسٹاف تنخواہ دار ملازم تھا لیکن اس ہیبت آفریں نام کی ہیبت خود اس کے ٹرسٹی صاحبان پر چھائی ہوئی تھی اور اس کے وجوہ بھی تھے، اس جماعت کو نظم وانتظام کا دعویٰ تھا۔ یہ غرہ تھا کہ علیگڑھ کی ساری شہرت اس کے دم سے وابستہ ہے اور سب سے بڑھ کر یہ گھمنڈ تھا کہ اس کا تعلق حکمراں قوم سے تھا اور "حکمراں" قوم نے بھی اپنی "سرپرستیوں" سے ثابت کردیا تھا کہ علیگڑھ کی سیاسیات میں اگر وہ دخل دے سکتی ہے تو اسی معاملہ میں جب انگریزی اسٹاف کے ارکان شاکی ہوں، "ہزاکسیلنسی پیٹرن" کی توجہ اس وقت پورے ادائے حکمرانی سے منعطف ہوتی تھی، جب ٹرسٹیوں اور انگلش اسٹاف کے درمیان کشمکش ہورہی ہو۔

مسٹر آرچبولڈ لیکن سب سے پہلے اس طلسم سامری کو سرسید کے لائق، جری اور "مسلمان" جانشین نواب وقار الملک مرحوم نے توڑا، مسٹر آرچ بولڈ اس وقت علیگڑھ میں پرنسپل تھے۔ اور سکریٹری کے احکام و ہدایات ان کے لئے سامان تفریح سے زیادہ نہیں تھے، نواب صاحب مرحوم نے انھیں اطاعت پر مجبور کیا، انھوں نے قانون و آئین کے بالکل خلاف براہ راست اپنے اختلاف کا معاملہ "ہزاکسیلنسی ہیڑن" کی خدمت میں پیش کر دیا اور ہزاکسیلنسی نے بھی از راہ انصاف پروری و عدالت پژوہی اس معاملہ میں اپنی پوری سرگرمی ظاہر فرمائی، مگر وقار الملک کی کوہ وقار ہمت میں جنبش نہیں ہوئی اور وہ یقیناً کسی تہدید و ترغیب سے متاثر نہیں ہوئے۔ (۱۹۰۹ء)

خود سری یہ اسٹاف "ڈسپلن" کے مبلغ ہونے کے باوجود "ڈسپلن" کا سب سے بڑا دشمن تھا تعلیمی و انتظامی ہر معاملہ میں اس کا وقار اور اس کی ہیبت کام کر رہی تھی اور لوگ مجبور تھے کہ اس کے جذبات و خیالات کا احترام کریں اور خود گورنمنٹ نے بھی اپنے طرز عمل سے اسے ثابت کر دیا تھا کہ علی گڑھ کالج کا وہ انگریز پروفیسر جسے علیگڑھ سے شکایت ہو اس کے لئے حکومت ہر قسم کی آسانیاں پیدا کرنے کو مستعد تھی، اور گورنمنٹ کی اسامیاں اس کے استقبال کے لئے چشم براہ۔

اندرونی حالات دوسری طرف اندرونی حالات نہایت نازک ہو رہے تھے، فرقہ بندیاں تھیں، قدم قدم پر جتھے تھے، تفرقے تھے، ہنگامے تھے، ایک جماعت چاہتی تھی کہ علیگڑھ میں اسی کا اقتدار رہے، دوسری جماعت کی خواہش یہ تھی کہ پہلی جماعت کو زک دے کر خود برسر اقتدار ہو جائے، غرض مقصد حقیقی خدمت کسی کا بھی نہیں تھا، سب اپنا اقتدار اور اپنا تسلط چاہتے تھے۔

اولڈبوائز ایسوسی ایشن | اولڈ بوائز ایسوسی ایشن قائم اس لئے ہوئی تھی کہ اولڈ بوائز میں ارتباط پیدا کرے، انھیں علیگڑھ کی خدمت پر آمادہ کرے، ان کے لئے مواقع بہم پہنچائے کہ کہ وہ علیگڑھ آئیں اور اپنی تعلیمگاہ کے انحطاط یا ارتفاع کا معائنہ کریں تاکہ ان کے دلوں میں خدمت کا جذبہ پیدا ہوا۔

مگر اسے بھی خودغرضیوں اور نفس پرستیوں کا اکھاڑہ بنالیا گیا، سمجھا یہ گیا کہ اولڈبوائز ایسوسی ایشن پر جس جماعت کا قبضہ ہوگا، وہی کالج میں بھی ایک خاص رسوخ کی مالک ہوگی اور وہی جماعت ٹرسٹیوں میں بھی ممتاز و وقیع ہوگی، اسی کو کارگذاری کا زیادہ موقع ملے گا۔ اس لئے قوم میں بھی وہ اپنی جگہ پیدا کرے گی۔

بس اس خیال نے منافقت کی تخم پاشی کی اور اختلاف میں اضافہ ہوتا رہا، اور اس کی کوششیں ہونے لگیں کہ اس جماعت پر بھی ہمارا ہی قبضہ ہو۔

ٹرسٹیوں کی حالت | تیسری طرف ٹرسٹیوں کی حالت اور زیادہ ابتر ہورہی تھی، ٹرسٹی شپ ہمیشہ سے ایک خاص اعزاز کی مرادف تھی اور پھر ملک و سرکاری دونوں حلقوں میں اس لئے ہر "صاحب دل" کا یہ حوصلہ تھا کہ وہ ٹرسٹی ضرور منتخب ہو، اور اس رتبۂ بلند پر فائز ہوجانے کے بعد وہ مطمئن ہوجاتا تھا اور اس کی قوت عمل سرد پڑجاتی تھی اس لئے کہ اسے اطمینان ہوجاتا تھا کہ اب تو "تاحین حیات" وہ اس منصب رفیع سے معزول ہوتا نہیں اس لئے کہ بورڈ آف ٹرسٹیز کا ایک قاعدہ یہ بھی تھا کہ اس کے ارکان دوامی ہوتے تھے، دوسرے ٹرسٹی خود ہی ٹرسٹی منتخب کرتے تھے اس لئے زید نے عمر کو رائے دی اور عمر نے اپنا ہاتھ زید کے لئے اٹھادیا، حساب کتاب برابر۔

خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گل کوزہ!

سب سے زیادہ جو جماعت علیگڑھ کی سیاسیات پر قبضہ رکھتی تھی اور علیگڑھ کالج پر قبضہ کرنا چاہتی تھی، وہ وہی جماعت تھی، جسے اصطلاح میں "ارباب علیگڑھ" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، اور بالخصوص اپنی کوششیں صرف کرنے والا۔

ان میں کوئی قمر تھا، کوئی آفتاب تھا!

یہ تھے علیگڑھ کے سیاسی حالات جن کا محمد علی نے مقابلہ کرنا چاہا، اور جن کی اصلاح کرنی چاہی۔

محمد علی کی دلچسپی | محمد علی کو علی گڑھ کالج سے مرتے دم تک بڑی دلچسپی رہی اور وہ نہایت خلوص و محبت سے اس کی خدمت کرنے کا ولولہ اپنے دل میں موج زن پاتے رہے، اور جب کبھی بھی انھیں موقعہ حاصل ہوا انھوں نے نہایت جوش اور تندہی کے ساتھ اپنی اس تعلیمگاہ کی خدمت کی جس میں وہ پروان چڑھے تھے اور جہاں ان کے ذہن و دماغ کی نشو و نما ہوئی تھی۔

پیش کش | اس اقتضائے وفا و محبت کے خیال سے سب سے پہلے محمد علی نے اپنے کالج کے لئے اپنی خدمات پیش کیں، اور چاہا کہ اس طرح کالج کے ان احسانات کی جو اس نے ان کے قلب و دماغ پر کئے تھے، تلافی کریں خود نواب محسن الملک مرحوم کی دلی خواہش تھی کہ محمد علی علیگڑھ کالج میں رہیں اور ان کے بیش قیمت خدمات سے پورا پورا فائدہ اٹھا کر علی گڑھ کو فائدہ پہنچایا جائے۔

مسٹر مارین کی مخالفت | لیکن مسٹر مارین جو طالب علمی کے زمانہ میں محمد علی کو عزیز رکھتے تھے، ان کی ترقیوں سے خوش ہوتے تھے، اور ان کے ایک مضمون کی طالب علمی ہی کے زمانہ میں نہایت زبردست داد دے چکے تھے، وہ اپنے اس شاگرد کی ذہنیت سے بھی واقف

تھے، علیگڑھ کی طالب علمی کے زمانہ کی اس کی رہنمائیاں، یونین میں اس کی تقریریں، اور انگریزوں کی خودسری اور آزادہ روی کے متعلق اس کا مسلک بھی انھیں معلوم ہوتا تھا، اس لئے انھوں نے سخت مخالفت کی اور کسی طرح بھی اس پر راضی نہ ہوئے کہ محمد علی علی گڑھ کالج کے اسٹاف میں داخل ہوسکیں، اور اپنے اس مقصد میں وہ کامیاب بھی ہوئے، اس لئے کہ ان کی ہیبت اور ان کی رائے کی "عظمت" سب کے دلوں پر تھی اور جن پر نہیں تھی ان پر ہز اکسیلنسی پیڑن کی تھی۔

اصل اختلاف | محمد علی کو اصل اختلاف یہ تھا کہ وہ چاہتے تھے کہ ٹرسٹیوں کا انتخاب ٹرسٹی ہی نہ کرلیا کریں بلکہ اس کا تعلق دوسروں سے ہونا چاہئے، دوسرے ٹرسٹی دوامی طور پر نہ منتخب ہوا کریں کہ اس صورت میں ان کی قوت عمل مضمحل ہوجاتی ہے اور کوئی کام ان سے بن نہیں آتا۔

چونکہ براہ راست شہ رگ پر حملہ تھا اس لئے اس کی سزا یہ دی گئی کہ کوشش ہوئی کہ محمد علی رکن ہی منتخب نہ ہوسکیں اور جب کبھی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن میں یہ سوال پیدا ہوتا تھا تو ایک دوسرے بزرگ کا نام "مقابلہ" کے لئے پیش کردیا جاتا تھا اور جب محمد علی ٹرسٹی منتخب بھی ہوگئے تو انھیں دوامی رکن نہیں بنایا گیا۔

ایام ملازمت کی کوششیں | اپنے بڑودہ اور نوساری کے زمانۂ قیام و ملازمت میں بھی محمد علی علی گڑھ کی خدمت سے باز نہیں آئے اور جو کچھ کرسکتے تھے کرتے رہے، وہاں رہ کر مضمون نگاری کے علاوہ اور ذریعۂ خدمت کیا تھا؟ اس کو انھوں نے اختیار کیا۔

مکتوب بنام محفوظ علی | چنانچہ اپنے ایک مکتوب مورخہ ۲۷ اپریل سنہ ۱۹۰۰ء میں اپنے عزیز دوست محفوظ علی صاحب کو لکھتے ہیں:

"علی گڑھ سخت آفت میں مبتلا ہے، نادر شاہی حکم کی پابندی ہوتی ہے، وقار الملک پر ضعف غالب ہی، عزیز مرزا علیگڑھ آئے تھے مگر نواب صاحب نے یہ مناسب نہ سمجھا کہ جو اعزاز انھیں ملتا تھا اس سے انھیں محروم رکھیں اس لئے ان کو دیس نکالا ملا اور اب لکھنؤ میں مسلم لیگ کی سرداری کرتے ہیں افسوس ہے کہ جس ایک شخص پر اس قدر بھروسہ تھا اس جاٹ سے وہ بھی نہ بچ سکا، آفتاب کو عزیز مرزا کا آنا سخت شاق گزر رہا تھا اور جب یہ معلوم ہوا کہ مسلم لیگ لکھنؤ جائے گا تو اس اعزازی نخیل کو اور بھی شاق گذرا، دہلی مسلم لیگ میں شریک ہونے کو آیا تو تہیۂ طوفاں کئے ہوئے لیکن جب یہ سنا کہ عزیز مرزا سکرٹری ہو کر لکھنؤ جاتے ہیں تو فوراً خاموش ہو گیا، اگر مسلم لیگ ہاتھ سے گیا تو گیا کالج اور کانفرنس تو بدستور اسی کے قبضۂ قدرت میں رہے، میں نے عزیز مرزا کو علیگڑھ سے علٰحدہ کرنے کی سخت مخالفت کی مگر یہ عزیز مرزا کو بری معلوم ہونے لگی، اب علیگڑھ اور آفتاب اور اس نادر شاہی کی مخالفت کے لئے سر کیف فقط ایک تمھارا بھائی اور ذات الٰہی ہی، ریفارم لیگ نے سوتوں کو ضرور جگایا ہے، مگر نہ ہر شخص میں خلوص ہے نہ ہمت اور جوش و عملی کام کرنے کا شوق شاذ ہے اس لئے آفتاب اور نظام شمسی کے ماتحت سیاروں کی چالیں کارگر ہو جاتی ہیں، اس وقت تمھاری مدد کی سخت ضرورت ہے، اگر تم نے قدم اٹھایا اور چند اردو اخبارات میں خطوط لکھے تو بیحد مفید ثابت ہو گا، اپنے گزشتہ سال کے مضامین کی نقلیں بھیجتا ہوں اُن سے میری اسکیم اصلاحی کی

تفصیل مل جائے گی "

اس خط سے علی گڑھ کی سیاسی پیچیدگیوں اور محمد علی کی سرگرمیوں پر کافی روشنی پڑتی ہے، اب ایک دوسرے مکتوب کا ایک اہم حصہ بھی ملاحظہ ہو، جو میر محفوظ علی صاحب کو لکھا گیا تھا۔

دوسرا مکتوب

"تعجب یہ ہے کہ کالج پر اس قدر سخت مصیبت آئی ہوئی ہے اور تم علیگڑھ تک نہ گئے اور نہ ابتک اس قلم سے کام لیا ہے جس کا چلانا ازل سے تمھیں بہتر آتا ہے، میں نے اس عرصہ میں ٹائمز میں ایک مضمون علیگڑھ پر لکھا تھا جس کا ایڈیٹر نے بھی حوالہ دیا اور اسی دن نوٹ لکھا جس میں تحریر کیا کہ ہماری رائے دینے کی ضرورت نہیں ہے، ہمارے کارسپانڈنٹ نے نہایت منصفانہ طور پر ہر معاملہ پر بحث کی ہے آج ایک مضمون پیسہ اخبار کو اسی پر لکھا ہے، مگر حالات سے بحث نہیں کی ہے صرف قانون ٹرسٹیان کی اصلاح پر لکھا ہے تم کس دن کام آؤگے اور دو تین مضمون ہر اردو اخبار میں لکھ ڈالو اور اس کی تائید کرو، روزانہ پیسہ اخبار اگر بدایوں میں نہ آتا ہو تو لکھو کہ جاری کرا دوں مگر ذوالقرنین کے آفس میں ضرور مل جائے گا، انھیں بھی کہو کہ وہ بھی تائید کریں اور عبدالحق (اب پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی اور سکرٹری انجمن ترقی اردو) کو تکتا کا ہیں تنہا کبتک لڑتا رہوں گا، کیا تم چاہتے ہو کہ ہتھیار ڈال دوں میں واقعی تھک گیا ہوں اور ممکن ہے اس سال کے بعد اس تمام جھگڑے کو خیرباد کہدوں "

ان خطوط سے اندازہ ہو گیا ہوگا کہ محمد علی کو علی گڑھ سے کتنی غیر معمولی محبت تھی اور

اس کے نقائص پر کس طرح ان کا دل کڑھا کرتا تھا اور اپنی مجبوریوں اور معذوریوں کے باوجود مشغولیتوں اور مصروفیتوں کے ہوتے ہوئے وہ وقت نکال کر اس کی خدمت کے مواقع تلاش کیا کرتے تھے۔

ملازمت کے بعد جیسا کہ اپنے ایک خط میں انھوں نے اشارہ کیا ہے کہ "ممکن ہو اس سال کے بعد تمام جھگڑوں کو خیرباد کہہ دوں" اس پر بھی عمل کیا اور اسی سنہ کے اواخر میں مستعفی ہو کر اجرار کا مرید کے انتظام میں مصروف ہو گئے۔

اب نسبتہً ان کے لئے علی گڑھ کی خدمت کے زیادہ مواقع تھے اس لئے کہ ریاست کی ملازمت چھوڑ کر وہ باقاعدہ "پبلک مین" بن گئے تھے، چنانچہ اس زمانہ میں انھوں نے بہت زیادہ جوش اور محنت سے علیگڑھ کے لئے کام کیا۔

اولڈ بوائز کی تعمیر و استحکام میں غیر معمولی محنت دکھائی، ہر تقریب کے موقعہ پر محمد علی کا علیگڑھ پہنچنا لازمی تھا، اس کے علاوہ کانسٹی ٹیوشن اور دوسرے اہم کاموں میں بھی محمد علی نے بہت نمایاں حصہ لیا۔

کورٹ کی ممبری اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کو اپنی طرف سے چند نمائندے بھیجنے کا اختیار حاصل ہو گیا تھا اور اسے محمد علی سے بڑھ کر مستعد اور پر جوش، معاملہ فہم اور دور اندیش نمائندہ کون مل سکتا تھا، لہذا اولڈ بوائز ایسوسی ایشن نے اپنی طرف سے کورٹ کی ممبری کیلئے انھیں کو منتخب کیا، جیسا کہ اس سے پیشتر اشارہ کیا جا چکا ہے کہ محمد علی کورٹ کی چند بنیادی خرابیوں مثلاً حق انتخاب اور طریقۂ انتخاب وغیرہ میں تبدیلی کرانا چاہتے تھے اس لئے نظام آفتابی کے ماتحت گردش کرنے والے سیاروں نے اس کی "سزا" یہ دی کہ انھیں باقاعدہ دوامی ممبر نہیں بنایا، محمد علی کو اس کی کوئی پرواہ نہیں تھی اور نہ باقاعدہ وہ اس کے

متمنی تھے کہ دوامی طور پر ممبر منتخب کر لئے جائیں

دوبارہ امیدواری | لیکن اپنی مدت ممبری ختم کرنے کے بعد محمد علی پھر اسی نشست کے امیدوار کی حیثیت سے کھڑے ہوئے۔

ایک اولڈ بوائے کا مراسلہ | خوش قسمتی سے ہمیں ایک اولڈ بوائے کا مراسلہ مل گیا ہے، جو زمیندار میں شائع ہوا تھا اور جس میں محمد علی کے دوبارہ انتخاب کی حمایت کی گئی تھی، مراسلہ نہایت اہم اور معلومات افزا واقعات پر مشتمل ہے، اس لئے ہم اس کے اہم اجزا یہاں پیش کرتے ہیں، جن سے بہت سی چیزوں پر روشنی پڑے گی۔

> "مجھ سے پہلے تین اصحاب اولڈ بوائز کی طرف سے ٹرسٹی مقرر ہو چکے تھے اور چوتھے سال یعنی سنہ ۱۰ء میں نئے قواعد کے مطابق پانچ سال کے لئے مسٹر محمد علی ٹرسٹی منتخب ہوئے، یہ امر خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے کہ جو اصحاب اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کی طرف سے اب تک ٹرسٹی منتخب ہوئے ان میں سے اکثر کو قبل اختتام میعاد بعد میں خود ٹرسٹیوں نے اپنے طور پر منتخب کر کے دوامی ٹرسٹی مقرر کر لیا ہے لیکن مسٹر محمد علی کے متعلق کسی ٹرسٹی کی طرف سے اس قسم کی تحریک بھی نہیں ہوئی ہے، اس پانچ سال کی مدت میں کالج کی فلاح و ترقی کے لئے مسٹر محمد علی نے جو کوششیں کیں ہیں وہ چار مدوں میں تقسیم کی جا سکتی ہیں۔
>
> (۱) ٹرسٹیوں کے کانسٹی ٹیوشن کی اصلاح
>
> (۲) کالج کے مالیات کا احتساب
>
> (۳) کالج کے مختلف اجزا یعنی گورنمنٹ، ٹرسٹیوں، پروفیسروں اور طالبعلموں

کے باہمی تعلقات کو صحیح طور پر ایک دوسرے کو سمجھانا اور اس مقصد کو واضح کرنا جس کے حصول کے لئے سر سید نے اس کالج کی بنیاد ڈالی تھی۔

(۴) کالج کی تکمیل یعنی اسے یونیورسٹی کے درجہ تک پہنچانا۔

(نیز) سائنس کالج کے وہ سب سے پہلے محرک ہیں۔

کالج کی مالی حالت کا تذکرہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا، کالج کی مالیات کے جانچ پڑتال کے یہی معنی نہیں ہیں کہ صرف آمد و خرچ کی مدات کی جانچ سالانہ کر لیجائے بلکہ اصل مقصد یہ پیش نظر رہنا چاہئے کہ روپیہ کسی بیجا مصرف پر نہ صرف کیا جائے اسراف کی روک تھام کے لئے سب سے پہلی ضرورت اس بات کی ہے کہ کالج کا بجٹ کافی غور اور پوری چھان بین کے ساتھ تیار کیا جائے، بجٹ کے جلسوں کی یہ کیفیت تھی کہ اگرچہ قواعد کے مطابق ہر سال اپریل سے پہلے بجٹ کا جلسہ منعقد ہونا چاہئے تھا لیکن کبھی بھی یہ جلسہ وقت پر نہیں ہوا، اور بعض موقعوں پر اپریل کا ملتوی شدہ جلسہ دوسرے سال کی جنوری میں منعقد ہوا اور یہ عجیب و غریب صورت پیش آتی ہے کہ سالانہ جلسوں میں صرف ۴۸ گھنٹہ کا فرق ہوا ہے بجٹ کے جلسوں کے التوا کا ایک ناگوار اثر یہ تھا کہ اخراجات کی کوئی روک تھام ناممکن تھی، مسٹر محمد علی کی بار بار کی نکتہ چینیوں سے بہ تدریج یہ تاریخیں مقررہ تاریخوں کے قریب آنے لگیں، اور بالآخر گذشتہ بجٹ کے جلسہ میں یہ بات قرار پائی کہ نیا مالی سال شروع ہونے سے قبل بجٹ کی تیاری لازمی ہے جس میں حکومت ہند کے مروجہ دستور کے مطابق نو ماہ کے اصل حسابات اور تین ماہ کے تخمینی حسابات شامل ہوں گے اور حسب معمول آئندہ سال کی آمدنی و خرچ

کا تخمینہ درج ہوگا، کالج کے بعض بے قاعدہ اخراجات کی جس وقت جانچ کی گئی
تو یہ معلوم ہوا کہ خرچ کرنے سے پہلے اس بات کی تحقیقات نہیں کی جاتی کہ جس
مدسے صرف کیا جا رہا ہے اس میں بجٹ نے کوئی رقم بھی منظور کی ہے یا نہیں
اور اگر منظور کی ہے تو اب اس میں کوئی رقم اتنی باقی بھی ہے کہ نہیں جو
مطلوبہ خرچ کے لئے کافی ہو سکے اور نہ کبھی اس طرف توجہ کی جاتی تھی کہ جس
مصرف کے لئے مطالبہ کیا جا رہا ہے وہ کہاں تک مناسب ہے، اس کمزوری
کا ایک لازمی نتیجہ یہ تھا کہ بعض چھوٹے اور غیر ضروری کاموں میں روپیہ صرف
ہو جاتا تھا، اور ضروری کام رہ جاتے تھے۔

اساتذہ کی تنخواہیں جن محترم گمنام مراسلہ نگار صاحب کے خیالات سے اوپر استفادہ کیا
گیا ہے آگے چل کر وہ فرماتے ہیں۔

"کالج کے اخراجات میں ایک بہت بڑی رقم استادوں کی تنخواہ میں صرف ہوتی
ہے، یوربین پروفیسرس اور بعض استادوں کی ترقی تنخواہ کی ایک اسکیم مقرر ہے
جس کے مطابق اپنے وقت پر ان کی تنخواہوں میں اضافہ ہوتا رہتا ہے، لیکن
استادوں کی ایک بڑی تعداد ایسی بھی ہے جن کی ترقی کے لئے کوئی معیار مقرر
نہیں ہے، ان لوگوں کو مجبوراً یا تو عمائد کالج کی تائید اور رضامندی حاصل کرنے
کے لئے غلط طور پر کوششیں صرف کرنی پڑتی ہیں یا انھیں اپنی ترقی سے
ہاتھ دھونا پڑتا ہے، مسٹر محمد علی نے ہمیشہ اس بات کی مخالفت کی کہ ذاتی اثرات
کے ذریعہ سے ترقی کی کوشش کی جائے۔"

سطور بالا سے اندازہ ہو گیا ہوگا کہ محمد علی نے اپنی ٹرسٹی شپ کے زمانہ میں کیا کیا خدمتیں

انجام دیں اور اولڈ بوائز کے حلقہ میں وہ کس قدر ہر دلعزیز اور محبوب تھے، نیز کس طرح اولڈ بوائز کی طرف سے ٹرسٹی شپ کے لئے محمد علی پر نظریں جاجا کر جم جاتی تھیں۔

یونیورسٹی کی اسکیم | اب ان کوششوں اور قابل تعریف کارگذاریوں کے بعد محمد علی کی ان مساعی پر نظر ڈالئے، جو انھوں نے علیگڑھ کو کالج سے یونیورسٹی کے درجہ تک پہنچانے کی مسلسل انتھک اور نہایت گرانقدر خدمتیں کیں۔

جسٹس محمود کی اسکیم | اصل میں جس وقت اس مدرسۃ العلوم کی تعمیر ہو رہی تھی، اسی وقت سرسید کے حاشیۂ خیال میں اور بعد کو ان کے مقلدین و متبعین کے نقطۂ نظر میں یہ بات شامل رہی کہ جلدسے جلد اسے حقیقی معنی میں اگر قرطبہ اور غرناطہ زور کلام میں نکل گیا تھا تو کم از کم آکسفورڈ اور کیمبرج کے نمونہ پر ضرور لا کھڑا کیا جائے۔

اور یہی وہ چیز ہے جس کے لئے حالی کی نظمیں، نذیر احمد کے لیکچرز، محسن الملک کی تقریریں وقار الملک کی کوششیں، شبلی کی مثنویوں اور تصانیف کے علیگڑھ کے لئے "جملہ حقوق محفوظ" رہے۔

چنانچہ جسٹس سید محمود نے اسی زمانہ میں ایک اسکیم تیار کی تھی اور اس میں اس ہونے والی یونیورسٹی کا ایک نہایت مکمل خاکہ تیار کیا تھا لیکن افسوس ہے کہ پھر ان کی زندگی ایسے حوادث سے دوچار ہوئی کہ وہ اپنے والد کی بنائی ہوئی شاہ راہ کی تکمیل نہ کر سکے، اس کی تکمیل گو وہ نامکمل ہی سہی، دوسروں کی قسمت میں لکھی تھی۔

یونیورسٹی کی تحریک | ۱۹۱۱ء کے آغاز میں جب یونیورسٹی کی تحریک عالم وجود میں آئی کہ ایم اے او کالج کو یونیورسٹی کے درجہ تک جلد از جلد پہنچا دیا جائے تو محمد علی کی زبان اور محمد علی کا قلم اس تحریک کی حمایت کے لئے وقف تھا۔

شوکت صاحب کو آمادہ کرنا انھوں نے اپنے برادر محترم مولنا شوکت علی سے درخواست کی کہ فرلو لے کر وہ اس کار اہم کو انجام تک پہنچائیں، چنانچہ موصوف نے دو سال کی فرلولی اور ہز ہائنس سر آغاخاں کی معیت اور سرگردگی میں سارے ہندوستان کا دورہ کیا اور اپنی بے نظیر قوت عمل کا ثبوت یہ دیا کہ تیس لاکھ کی جو رقم فراہم کرنا تھی اس میں بیس پچیس لاکھ سے کسی طرح کم نہ فراہم کرایا۔

اختلاف بٹلر صاحب (سر ہارکورٹ بٹلر) اس زمانہ میں ممبر تعلیمات تھے، یہ مسئلہ ان کے ہاتھ میں آیا ادھر مسلمانوں نے اپنی پوری قوت عمل اس پر صرف کر دی کہ وہ گورنمنٹ کے مطلوبہ بیس لاکھ پھر تیس لاکھ جمع کر دیں تاکہ "یونیورسٹی" پالیں۔ چندہ جمع ہو رہا تھا اور بہت کچھ جمع ہو گیا تھا کہ دفعۃً وائسرائے کی سفارش کے خلاف وزیر ہند صاحب نے جن شرائط کے ساتھ "مکمل" یونیورسٹی مسلمان مانگ رہے تھے اس کے دینے سے انکار کر دیا اور اپنی طرف سے چند سخت شرائط پروفیسروں کے تقرر اور کورٹ کے اختیارات، دوسرے کالجوں کے الحاق اور یونیورسٹی کے نام کے متعلق پیش کر دئے جنھیں مسلمان کسی طرح بھی منظور نہ کر سکتے تھے۔

مہاراجہ محمود آباد کی رہنمائیاں اس زمانہ میں مہاراجہ صاحب محمود آباد پبلک معاملات میں ہمیشہ پیش پیش رہتے تھے اس مسئلہ میں بھی انھوں نے بہت دلچسپی کا اظہار کیا تھا، اس لئے بالاتفاق وہ "لیڈر" تسلیم کر لئے گئے اور کانسٹی ٹیوشن کمیٹی (مجلس ترتیب ضوابط) کے صدر بنا دئے گئے! انھوں نے ممبر تعلیمات سے وعدہ کر لیا کہ وہ فاؤنڈیشن کمیٹی کے ممبروں کی رائے میں تبدیلی کرا سکیں گے۔

مہاراجہ صاحب کے ساتھ علیگڑھ کے اکثر بزرگ، اور رؤسائے قوم اور آخر میں ڈاکٹر انصاری صاحب وغیرہ تھے۔

محمد علی کے ساتھ ابوالکلام صاحب آزاد، نواب وقار الملک مرحوم اور دوسرے حضرات تھے قیصر باغ لکھنؤ میں یونیورسٹی کے لینے یا نہ لینے کا جب مسئلہ پیش ہوا تو بہت زیادہ اختلاف کا اندیشہ تھا اور طرح طرح کے خطرات تھے کہ خدا معلوم یہ اسکیم کامیاب بھی ہو سکے گی یا نہیں۔

محمد علی کی "نرمی" جس صبح کو یہ معاملہ پیش آنے والا تھا، اس کی رات کو پھر باہمی مشاورت ہوئی اور محمد علی اس میں کچھ "نرم" پڑ گئے یعنی محمد علی نے یہ تجویز پیش کی اور منظور کرائی کہ "فاؤنڈیشن کمیٹی کے ہاتھ سے یونیورسٹی لینے یا نہ لینے کا فیصلہ نکال لیا جائے اور ایک ایسے محدود ڈیپوٹیشن کو اس کا اختیار دیدیا جائے جس کے ممبروں سے انھیں کامل امید تھی کہ وہ جمہور مسلمانوں کی نیابت اچھی طرح کر سکیں گے اور وہی فیصلہ کثرت رائے سے کریں گے جو ان حالات میں خود فاؤنڈیشن کمیٹی کرتی"۔

اسباب محمد علی کی اس روش پر ان کے بعض رفقا نے بہت سخت اعتراضات کئے اور انھیں بہت شدید مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا۔

درحقیقت یہ تعجب خیز بات بھی ہے کہ محمد علی جیسا جمہوریت پسند آدمی ایک جمہوری مسئلہ کو ایک محدود جماعت کے سپرد کر دینے کا حق حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

لیکن اگر حالات پر سنجیدگی سے غور کیا جائے تو اس "سرگزشت شب" "احدیث الغاشیہ" کی حقیقت کچھ اور معلوم ہوتی ہے۔

محمد علی یہ جانتے تھے کہ علیگڑھ کی تحریک پر کن لوگوں نے قبضہ کر لیا ہے، یہ بھی جانتے تھے کہ یہ جماعت تھوڑا بہت ملک و قوم پر اور بہت زیادہ گورنمنٹ کے حلقوں میں اثر و رسوخ رکھتی ہے، اس وقت تک یہ ساری تحریک اسی جماعت کے ہاتھ میں ہاتھ میں تھی، اس لئے انھوں نے محسوس کیا کہ اگر اس جگہ اختلاف کیا گیا تو ضد اور ہٹ سے معاملہ اور خراب ہو جائیگا

لہٰذا انھوں نے ایک ایسا "وسطی" راستہ اختیار کیا جس پر دونوں فریق مطمئن ہو سکتے تھے اور کام نکلنے کی امید ہو سکتی تھی اس لئے اپنے ضمیر کے خلاف جیسا کہ انھوں نے بارہا اپنے مضامین و مقالات میں اور اپنے مکتوب بنام مہاراجہ محمود آباد میں ظاہر کیا ہے، یہ کیا، گو ان کی امیدیں پوری نہیں ہوئیں اور وہ آخر وقت تک اپنی اس روش پر نادم رہے اور نہایت وسعت قلب اور شرافت کے ساتھ اس کا اعتراف بھی کرتے رہے۔

نتیجہ | بالآخر ۲۶-۲۷ رجولائی ۱۹۱۳ء کو علیگڑھ میں فاؤنڈیشن کمیٹی کا جو جلسہ ہوا اس میں اگرچہ ارباب علیگڑھ کو پورے مواقع حاصل تھے اور انھوں نے اس سے ہر جائز اور ناجائز فائدہ بھی اٹھایا، یعنی علی گڑھ کے اضلاع سے بہت کافی تعداد لوگوں کی "منگائی گئی" کہ ان کے خیال کے مطابق فیصلہ ہو سکے لیکن پھر بھی "فیصلہ وہی ہوا جس کی جمہور مسلمانوں سے توقع تھی، اگرچہ حقیقتہً اس فیصلہ کے بعد بھی اس تحریک کو اس اسلوب پر نہیں چلایا گیا جس کی یہ مستحق تھی۔

جنگ عظیم | جنگ عظیم کے آغاز ہی پر محمد علی نظر بند کر دئے گئے، ان کی اس نظر بندی سے دوسرے فریق نے قدرۃً پورا فائدہ اٹھایا، ان کی اس وقتی تائید کے بعد ان لوگوں کو پھر محمد علی کی مخالفت سے دوچار ہونا پڑا تھا، اس لئے ان کی نظر بندی کی خبر، دوسرے الفاظ میں یونیورسٹی کے "چارٹر" کا مژدۂ جانفزا تھا۔

دوبارہ تحریک | اگرچہ جنگ عظیم کے سلسلہ میں گورنمنٹ بھی پریشان تھی، اور اس وقت اس مسئلہ کا اٹھانا کسی طرح بھی مناسب نہیں تھا مگر اس مسئلہ کو پھر گورنمنٹ تک پہنچایا گیا۔

گورنمنٹ کی آمادگی | گورنمنٹ اس شرط پر یونیورسٹی دینے پر آمادہ ہو گئی کہ مسلمان اسی قسم کی یونیورسٹی قبول کر لیں جس طرح ہندوؤں نے اپنے مصالح اور ضروریات کا لحاظ رکھ کر قبول کی تھی

جمہور عام نے اس کی مخالفت کی، گروہ احرار نے اس کے خلاف زبردست تقریریں کیں۔ اور مضامین لکھے، مگر جو لوگ اس ادارہ اور اس تحریک پر قابض ہو چکے تھے، ان پر کوئی اثر نہیں ہوا، اور انھوں نے پورے طور سے اس پر آمادگی ظاہر کی کہ ہم اس طرح کی یونیورسٹی قوم کے لئے مفید اور مناسب سمجھتے ہیں اس لئے ضرور لیں گے اور جو لوگ مخالفت کر رہے ہیں انھوں نے تعلیم بھی کسی یونیورسٹی میں پائی ہے؟

محمد علی کی مخالفت محمد علی اگرچہ اس زمانہ میں نظربند کر دئے گئے تھے لیکن پھر بھی اس مسئلہ سے ہر امکانی دلچسپی لیتے تھے، ان کی خواہش تھی کہ یونیورسٹی کا مسئلہ جنگ عظیم کے اختتام تک نہ اٹھایا جائے، اس کے بعد پوری شدت کے ساتھ اٹھایا جائے، اُس صورت میں کامیابی کی زیادہ امید ہے، بہ نسبت اس صورت کے کہ جلد بازی کر کے خواہ مخواہ کام بگاڑ دیا جائے۔

مکتوب بنام محمود آباد چنانچہ چھندواڑہ سے انھوں نے ایک نہایت اہم خط مہاراجہ صاحب محمود آباد کے نام لکھا جس میں اپنی بے بال و پری کے باوجود اپنا نقطہ نظر نہایت تفصیل اور پورے دلائل کے ساتھ پیش کیا، جس کا اہم اقتباس انھیں کے الفاظ میں یہ ہے۔

"میں بہ وثوق تمام کہہ سکتا ہوں کہ میری مختصر پبلک زندگی میں اس واقعہ سے زیادہ اہم کوئی واقعہ پیش نہیں آیا کہ میں نے بظاہر اپنے کھلے ہوئے اور دیرینہ اصولوں کے سراسر خلاف ایک جمہوری حق کو ایک محدود جماعت کے سپرد کرنے کی تجویز جمہور کے سامنے پیش کی، مگر آخرکار چند واقعات ایسے پیش آئے کہ خود ان حضرات کو جن کی مخالفت کو مٹانے کی غرض سے مجھے ان کے ساتھ متذکرہ بالا سمجھوتہ کرنا پڑا تھا۔ مارچ ۱۳ء میں لکھنؤ میں یہ تسلیم کرنا پڑا کہ جب تک فاؤنڈیشن کمیٹی کو پھر مدعو نہ کیا جائے اور کل معاملات کو

اس کے سامنے پیش نہ کیا جائے، کوئی کارروائی جائز طریقے پر نہیں ہو سکے گی۔

اگست ۱۹۱۵ء میں آنجناب نے چند اصحاب کو شملہ پر مدعو فرمایا اور اس امر کی کوشش کی کہ مسلمان ایک ایسی یونیورسٹی کو جو ہندو یونیورسٹی کے اصول پر مبنی ہو قبول کر لیں۔

۱۰ اپریل ۱۹۱۶ء کے لئے فاؤنڈیشن کمیٹی کا ایک جلسہ پھر تجویز کیا گیا اور میں مشکور ہوں کہ آنجناب نے مجھے فراموش نہیں فرمایا، مگر کیا بیجا ہوگا اگر میں عرض کروں کہ اصل مدعا شوری نہ تھا، بلکہ مجھے اپنی رائے سے متاثر کرنا مقصود تھا، میرے دیرینہ دوست سید سجاد حیدر صاحب یہاں آئے اور ان سے یونیورسٹی کے مسئلہ پر دیر تک بحث رہی۔

یہ ظاہر ہے کہ ۱۰ اپریل ۱۹۱۶ء کو مسلمان اگر طوعاً نہیں تو کرہاً ضرور ان امور پر راضی ہو گئے جن کے خلاف وہ اور میں اس وقت تک دونوں تھے۔

غالباً آپ سے یہ امر پوشیدہ نہیں ہے کہ ۱۰ اپریل ۱۹۱۶ء کے فیصلوں پر میں ہرگز مطمئن نہیں ہوا۔

آج پھر فاؤنڈیشن کمیٹی کو مدعو کیا جا رہا ہے اور قوم کے دیرینہ خواب کی اس طرح تعبیر کی جائے گی کہ جس طرح کی یونیورسٹی ایک دوسری قوم نے بظاہر اپنی قومی خصوصیات و ضروریات کو ملحوظ خاطر رکھ کر لینا قبول کی ہے، اسی طرح کی یونیورسٹی ہم بھی علانیہ اپنی قومی خصوصیات و ضروریات کے خلاف قبول کر لیں، کہاں ۱۱-۱۲ و ۱۳ اگست ۱۹۱۲ء کے مطالبے اور دعوے تھے اور کہاں آج کی ہمتیں اور ارادے ہیں۔

اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ کونسا عظیم الشان تعلیمی فائدہ اسی سال اس کی بنیاد رکھے جانے سے حاصل ہو جائے گا، جو ایک دو سال کے توقف و تامل سے فوت ہو جائے گا۔

پھر کیا وجہ ہے کہ اس عجلت سے کام لیا جارہا ہے اور ایک متنازعہ فیہ مسئلہ کو جس کا دوران جنگ میں چھیڑنا خود سرکار عالیہ کے پیش کردہ اصول کے خلاف ہے، چھیڑا جارہا ہے۔

جہاں تک تعلیم کا تعلق ہے میں بہ وثوق تمام کہہ سکتا ہوں کہ کوئی وجہ اس عجلت کی موجود نہیں اور متعدد وجوہ اس عجلت کے خلاف موجود ہیں۔

ایک عرصہ تک میں نے انتظار کیا کہ ان حضرات کا رجحان معلوم ہو جو کم از کم ۱۰ اپریل ۱۹۱۶ء سے پیشتر میرے ہم خیال تھے، لیکن جب وقت تنگ رہ گیا تو میں نے مجبور ہو کر ایک تحریک ۲۵ مارچ کے جلسہ کے لئے سکرٹری صاحب کی خدمت میں معہ ایک مفصل عریضہ کے داخل ایجنڈا کرنے کے لئے ارسال کر دی۔

مگر اب معلوم ہوا کہ جلسہ ۸ اپریل کو ہوگا اور لوگوں کا خیال ہے کہ آنجناب نہایت سرگرمی سے مسلمانوں سے نہ صرف ۱۱-۱۲ اگست ۱۹۱۲ء و ۲۶ و ۲۷ جولائی ۱۹۱۳ء کے فیصلوں کے خلاف فیصلہ کرانا چاہتے ہیں بلکہ ۱۰ اپریل ۱۹۱۶ء کے فیصلہ کے بھی خلاف فیصلہ حاصل کرنا چاہتے ہیں اور مجھے یہاں تک اطلاع ملی ہے کہ آپ علانیہ فرماتے ہیں کہ اگر ضرورت ہوگی تو میں لکھنؤ سے دس ہزار آدمی اپنی رائے کے موافق رائے دینے کے لئے لے آؤں گا، یہ وہ خیالات ہیں جو آپ کے متعلق میں اپنے دل میں ہرگز جاگزیں نہیں ہونے دینا چاہتا!

اگر آنجناب سید سجاد حیدر صاحب یا کسی دوسرے صاحب کو جو آنجناب کی رائے سے پوری طرح واقف ہوں یہاں روانہ فرمائیں تو امید ہے کہ وہ مندرجہ تحت سوالوں کا جواب آنجناب کی طرف سے دے سکیں :

(۱) یونیورسٹی کے مسئلہ کو تا اختتام جنگ کیوں نہ ملتوی رکھا جائے اور اس عرصہ میں وہ تمام کارروائی کالج کی ترقی و اصلاح کے متعلق کیوں نہ کرلی جائے جو بلا توسط سرکار عالیہ ہم آج بھی کرنے کے مجاز ہیں ۔

(۲) وہ کونسا تعلیمی فائدہ ہے جو یونیورسٹی کے متعلق اس وقت آخری فیصلہ کرنے میں متصور ہے مگر ایک دو سال بعد فوت ہوجائے گا ؟

(۳) کیا جنگ کے باعث قیام یونیورسٹی میں باوجود ہمارے فیصلہ کردینے کے کہ جیسی بھی ملے قبول کرلی جائے رکاوٹیں پیش نہ آئیں گی ؟

(۴) کیا ہم عنقریب کافی اور عمدہ اسٹاف جو یونیورسٹی کے شایان شان ہو مہیا کرسکیں گے ؟

(۵) کیا علی گڑھ کالج کے ارباب حل وعقد پر آپ کو اعتماد ہے کہ وہ یونیورسٹی کو مناسب طریقہ پر چلا سکیں گے ۔

(۶) اگر آپ کو ان حضرات پر اعتماد ہے تو آپ اب تک کیوں ان سے اس قدر کشیدہ رہے ہیں اور کیوں علیگڑھ کالج کے معاملات میں آپ نے اس سرگرمی کا جس کی آپ کے ہر جاننے والے کو آپ سے توقع تھی، اب تک اظہار نہیں فرمایا اور کیوں انتخاب صدر کانفرنس کے معاملہ میں آپ کی جانب سے ارباب حل وعقد علی گڑھ کی اس قدر مخالفت یا ان کی جانب سے

آپ کی اور آپ کے ہم خیال اصحاب کی مخالفت ہوئی۔

. . . . آپ کیا قوم کا جاہل سے جاہل شخص بھی اب سمجھ گیا ہے کہ یونیورسٹی کا مسئلہ بحالت موجودہ قوم کی موت اور زیست کا مسئلہ ہے ہماری نظربندی نے ہمیں مجبور کر دیا ہے کہ بہت سے قومی معاملات میں کوئی حصہ نہ لیں، مگر چونکہ تعلیمی معاملات میں ہم ایک حد تک آزاد ہیں اور خط و کتابت کر سکتے ہیں اس لئے کم از کم مکاتبت اور مراسلت میں معذور نہیں، اپنا تو اس پر عمل ہے۔

فریاد و فغاں بلبل ناشاد کئے جا | مہان قفس خاطر صیاد کئے جا
فریاد ہو یا نالہ ہو یا آہ جگر سوز | جو ہو سکے تجھ سے دل ناشاد کئے جا

مشکل یہ ہے کہ ہم کو آج انھیں سے شکایت پیدا ہوتی ہے جن کی تعریف میں ہماری زبانیں کل تک سوکھتی تھیں، استبدادیوں کا جامۂ استبداد کہیں ہی احرار کو دستیاب ہو گیا ہے اور اسے ہمارے سب سے بڑے حریت پسند زیب بدن کئے ہوئے ہیں، بھلا کہہ نہیں سکتے، برا کہنے کو جی نہیں چاہتا۔

دل بردو حق آنست کہ دلبر نتواں گفت | بیداد تواں دید و ستمگر نتواں گفت

موجودہ زمانہ ہمیشہ نہ رہے گا مگر جو فیصلہ ہم اور آپ آج کریں گے اس کا اثر ہمارے بچوں اور آنے والی نسلوں کی تعلیم پر صدیوں تک پڑتا رہے گا، کیا آپ کو یہ گوارا ہے کہ ان کے لئے ہم اپنی کم ہمتی بطور ورثہ کے چھوڑ جائیں؟"

اس خط کو آپ نے ملاحظہ فرمایا! اس میں جو سوالات ہیں وہ درحقیقت سوالات نہیں ہیں بلکہ دلائل ہیں اور خود اپنی اہمیت کو ظاہر کر رہے ہیں۔

دوسری کوششیں | محمد علی کی کوششیں یہیں ختم نہیں ہوگئیں بلکہ اپنی بے بال و پری کے باوجود انھوں نے اس معاملہ کو حسب دلخواہ طے کرنے کی اور کوششیں بھی کیں۔

انھوں نے حالت نظر بندی میں ممبر صاحب تعلیمات کو ایک درخواست بھیجی، جس میں یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ انھیں اس جلسہ میں شریک ہونے کی اجازت مرحمت فرمائی جائے جس میں یونیورسٹی کے لینے یا نہ لینے کا فیصلہ ہونے والا تھا تاکہ وہ وہاں اپنی رائے پیش کرسکیں اس لئے کہ انھیں علی گڑھ کی تحریک سے جو دلچسپی رہی ہے اس کا اقتضا یہ ہے کہ وہ اس میں شریک ہوں، مگر ممبر صاحب تعلیمات نے اس درخواست کا جواب دیا کہ وہ ایسی اجازت دینے سے "معذور" ہیں۔

"صلہ کارگذاری" | محمد علی نے ہمدرد میں ایک بار ضمناً علیگڑھ پر اظہار خیال کرتے ہوئے ایک عجیب و غریب انکشاف کیا تھا، بے موقع نہ ہوگا اگر اس جگہ اس کا خلاصہ انھیں کے الفاظ میں یہاں پیش کردیا جائے۔ وہ فرماتے ہیں :-

> "۱۹۱۵ء میں علی برادران نظر بند کردئے گئے اور وہ قانون اساسی جسے میں نے اور میرے رفقا نے بڑی محنت سے اور ارباب بست و کشاد کی سخت مخالفت کے باوجود کالج کے قانون کو اصلاح دے کر تیار کیا تھا، ہماری نظر بندی کی ابتدا سے لے کر انتہا تک ایک بار نہیں بلکہ بار بار حکومت کے حکم سے خراب کیا گیا، سر شفیع نے فوراً یونیورسٹی ایکٹ کا نفاذ کرالیا اور مہاراجہ صاحب محمود آباد نے بہ حیثیت وائس چانسلر کے نوبت بجاکر یونیورسٹی کا افتتاح کردیا، یہ وہی سر شفیع تھے جو ۱۹۱۲ء میں ہارکورٹ بٹلر صاحب کی وزیر ہند کی طرف سے پیش کردہ شرائط کو قبول کرنے کے لئے ہرگز آمادہ نہ تھے مگر

جو بحیثیت وزیر تعلیمات ہونے کے ڈاکٹر ضیاء الدین کے ایما سے علی برادران کو قید خانہ مبتول سے چھوٹنے پر بھی علیگڑھ نہ آنے دینے کی کوشش پر آمادہ ہو گئے اور جنھوں نے سنہ ۲۰ء کی ابتدا ہی میں سر ہارکورٹ بٹلر سے ہز ہائنس نواب صاحب رامپور کو پیغام بھجوایا کہ یا تو علی برادران کو علیگڑھ جانے سے روک دیا جائے، یا انھیں رامپور سے جلا وطن کر دیا جائے، چنانچہ ہم نے علیگڑھ کو نہ چھوڑا، البتہ رامپور اس دن سے آج تک نہ جا سکے۔"

باب ۴

مسلم لیگ

غدر کے بعد سے مسلمانوں نے سیاسیات سے بالکل کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ ادر ان اوطن کی ایک سرگرم جماعت نے البتہ کانگرس میں جان پیدا کرنے کی کوشش کی اور اس زمانہ کے لحاظ سے جو قوت اسے پہنچائی جاسکتی تھی وہ پہنچائی اور گورنمنٹ پر اثرات ڈالے گئے۔

اس وقت تک مسلمان گورنمنٹ کے ظل عاطفت کو سایۂ الٰہی سمجھ رہے تھے اور کسی ایسی "باغیانہ" تحریک میں شریک ہونے کے لئے نہیں تیار تھے جس سے سرکار دولتمدار کی جبین پیشانی ان نیاز مندوں کے جذبۂ وفا کو ذرا بھی محل نظر سمجھے اور یہ بھی "گستاخوں" کی صف میں نظر آسکیں۔

حالات میں تغیر لیکن ظاہر ہے یہ حالات ہمیشہ تو قائم نہیں رہ سکتے تھے، گورنمنٹ کے گوشۂ چشم التفات میں تبدیلی ہوئی "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی پالیسی علی الاعلان ظاہر ہوئی تو الحمد للہ کہ مسلمانوں میں بھی احساس پیدا ہوا اور سب سے زیادہ مسرت بخش بات یہ ہے کہ یہ احساس اس جماعت کی طرف سے پیدا کرایا گیا جو سید عالی مقام کی جانشین تھی اور سیاسیات کو شجر ممنوعہ سمجھ کر اس سے ہر وقت اپنی بے تعلقی اور بے زاری کا اعلان کرنا اپنی بہترین ملکی و قومی خدمت سمجھتی تھی۔

مسلم لیگ کی تاسیس اسی جماعت نے نواب وقار الملک بہادر اور نواب محسن الملک مغفور کی کوششوں سے دسمبر ۱۹۰۶ء میں جب بمقام ڈھاکہ ایجوکیشنل کانفرنس منعقد ہوئی، وہیں

ایک گوشہ میں مسلمانوں کی آئندہ سیاسی زندگی کی تشکیل کے لئے ایک سیاسی جماعت کی تعمیر و تاسیس کی تھی، جس نے مسلم لیگ نام پایا۔

محمد علی کا حصہ محمد علی نے اگرچہ اس وقت تک سیاسی دنیا میں قدم نہیں رکھا تھا اور نہ بحیثیت ایک سیاسی قائد کے اس وقت تک ان سے توقعات وابستہ تھیں لیکن پھر بھی محمد علی نے اس کی تاسیس اور اس کے استحکام میں نمایاں حصہ لیا اور اس طرح اس کے بانیوں میں اپنے لئے ایک نمایاں جگہ حاصل کر لی۔

میر محفوظ علی کا بیان میر محفوظ علی صاحب ارشاد فرماتے ہیں۔

"اس موقعہ پر باوجودیکہ اسلامی ہند کی دماغی قابلیت کا عطر موجود تھا مگر مسلم لیگ کے نظام کی درستی اور قواعد وضوابط کی تیاری کا سارا کام محمد علی نے کیا"

سر یعقوب کی رائے اسی طرح سر محمد یعقوب فرماتے ہیں۔

"علی گڑھ کا پرانا کھلنڈرا ولایت سے ایک زبردست مضمون نگار، ایک پرجوش مقرر اور ایک ہونہار مدبر بن کر آیا تھا، مسلم لیگ کی ساخت اور اس کے قواعد کی ترتیب میں محمد علی کا بڑا حصہ تھا، اور اس وقت سے محمد علی کی زندگی سراپا سیاست بن گئی۔"

لیگ کا نصب العین لیکن گو اس وقت ایک حد تک مسلمانوں میں بیداری پیدا ہو گئی تھی اور مسلمان سیاسیات میں جھجھک جھجھک کر حصہ لینے پر آمادہ ہو رہے تھے، شاید اسی لئے لیگ کا نصب العین بہت پست رکھا گیا۔ اس وقت تک اس کے دائرہ عمل میں صرف یہ بات تھی کہ سال بھر میں کسی ایک مقام پر ایک سالانہ جلسہ منعقد کرائے اس میں کچھ گورنمنٹ کی بھلائیاں اور کچھ ہندوؤں کی برائیاں بیان کر کے تان اس پر توڑی جائے کہ مسلمانوں کے ساتھ برادرانہ

وطن ناانصافی کرتے ہیں، گورنمنٹ بھی کبھی کبھی اپنا ابر کرم دوسری طرف برسا دیتی ہے۔ اعلیٰ ملازمتیں مسلمانوں کو نہیں ملتیں اور ادنیٰ ملازمتوں میں بھی "نشستیں محفوظ" نہیں ہیں لہذا امید ہے کہ سرکار ابد قرار کی توجہ گرامی ہم وفا کیشوں اور جو ر پرستوں پر بھی مبذول ہوگی، گو اس زمانہ میں کانگرس بھی اپنی "وفاشعاری" اپنے لئے باعث فخر سمجھ رہی تھی، اور اس کا کام بھی یہی تھا کہ "تعزیت" اور "مؤدبانہ گذارش" کی تجویزیں پاس کرے اور اس کے بعد پھر خاموش ہو جائے۔

محمد علی کی عملی شرکت لیکن جب محمد علی کو عملی شرکت کا موقعہ حاصل ہوا تو انھوں نے لیگ کے قالب بے جان میں ایک روح تازہ پیدا کرنا چاہی، ایسی روح جو دوسروں کو ہشیار کر سکے اور بیداری پیدا کر سکے۔

سلف گورنمنٹ لیگ کے نصب العین کی پستی کا انھیں احساس تھا اور اس کے لئے انھوں نے انتھک کوششیں کیں، بالآخر خداوندان لیگ نے بھی اس حقیقت کا احساس کیا اور انتہائی شجاعت و مردانگی کے ساتھ اس کا اعلان فرما دیا کہ اب لیگ کا "نصب العین" ہندوستان کے مناسب حال (سوٹ ایبل) سلف گورنمنٹ ہے۔

لیکن محمد علی کی کوششیں ابھی نہیں ختم ہوئیں انھوں نے برابر اس میں ایک نئی زندگی پیدا کرنی چاہی اور وہ اس سے کبھی الگ نہیں ہوئے، نہ تحریک خلافت کے ہنگامہ زا زمانہ میں اور نہ تحریک کی افسردگی کے مضمحل کن عہد میں، وہ ہمیشہ اس میں شریک ہوئے اور اس کی بلندسے بلند تر سطح نظر تک رہنمائی فرماتے رہے۔

باب ۵

طبی وفد

محمد علی کے کارناموں میں بہت اہم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ہندوستان سے ایک طبی وفد بلقان بھیجنے میں بڑی سرگرمی ظاہر کی تاکہ ہندوستان کے مسلمانوں کی عملی ہمدردی کا ثبوت مل سکے۔

جس وقت محمد علی نے یہ عزم کیا ہے کہ ہندوستان سے ایک طبی وفد بھیجا جائے، اس وقت حالات نہایت ناسازگار تھے، اور کامیابی کی کوئی صورت نہیں نظر آتی تھی، لیکن محمد علی نے اپنی غیر معمولی اور بالکل منفرد قوت فیصلہ اور قوت عمل سے کام لے کر اس کا بیڑا اٹھایا، اور دنیا نے حیرت کے ساتھ دیکھا کہ اسے اتمام تک پہنچا دیا، واقعات کی ضروری تفصیل یہ ہے۔

جنگ بلقان

۱۹۱۲ء میں جب جنگ بلقان شروع ہوئی، اس وقت ہندوستان کے مسلمانوں میں سخت ہیجان، جوش اور حرکت کا ظہور عمل میں آیا۔

ملک کا وہ طبقہ جو گورنمنٹ سے تعاون کرتا تھا اس نے بھی اپنی وفاداری بالائے طاق رکھ دی اور اپنی ہمدردی کا اظہار ترکان آل عثمان کے ساتھ کرنا شروع کیا۔

کم از کم اسلامی ہند میں وہ سب سے پہلا دور تھا جس میں مسلمانوں نے اس طرح اپنے جوش و خروش کا مظاہرہ کیا ہو اور علی الاعلان اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ اپنی ہمدردی ظاہر کی ہو اور غریب سے غریب آدمی نے بھی ایثار و سیر چشمی کا نہایت نادر نمونہ پیش کیا ہو۔

مسٹر ممتاز حسن کا واقعہ

لکھنؤ کے مشہور بیرسٹر مسٹر ممتاز حسن نے امین آباد میں ایک

کارکن طبی وفد جنگ بلقان
(سنہ ۱۹۱۲ء)

نہایت پرجوش دردانگیز اور فصیح و بلیغ تقریر کی، صاحب ڈپٹی کمشنر بھی اس جلسہ میں موجود تھے وہ مسٹر ممتاز حسن کی اس شعلہ نوائی سے بہت متحیر ہوئے اور اپنی حیرت کا اظہار کئے بغیر نہ رہ سکے لیکن مسٹر موصوف نے نہایت جرأت اور ہمت سے کہدیا کہ یہ ایسا نہیں معاملہ ہے جس میں ہم مسلمانوں سے کسی قسم کی کمزوری کی مطلق امید نہ رکھی جائے، صاحب ڈپٹی کمشنر نے انھیں اطمینان دلایا کہ وہ مسلمانوں کے اس احساس سے ہمدردی رکھتے ہیں۔

مولنا شبلی کی نظم | مولنا شبلی سا عافیت پسند اور علمی سرگرمیوں سے الگ رہنے والا بزرگ بھی اپنے جوش کو قابو میں نہ رکھ سکا اور ایک معرکۃ الآرا نظم لکھی جو قیصر باغ کی بارہ دری میں پڑھی گئی اور بہت سے لوگوں کے کان میں آج بھی اس کی گونج باقی ہے۔

پھر جب طبی وفد بخیر و عافیت واپس آیا ہے تو پھر ان کے تاثرات اشعار آبدار کی صورت میں ظاہر ہوئے۔

ان دونوں نظموں میں مولنا شبلی نے نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کی صحیح ترجمانی کی، بلکہ انگریزوں کی پالیسی اور مدبرین برطانیہ کی مسلم آزار روش پر بھی نہایت آزادی سے نکتہ چینی اور تنقید کی۔

ڈاکٹر انصاری کا ارادہ | ان حالات میں ڈاکٹر انصاری کی یہ خواہش ہوئی کہ وہ ہندوستان سے ایک طبی وفد لیجائیں اور مجروحین و مقتولین کی جو خدمت ان سے بن آئے کریں۔

محمد علی کی حمایت | محمد علی سے جب انھوں نے اپنے اس قابل صد ستائش عزم کا تذکرہ کیا تو محمد علی نے بہت زبردست تائید کی اور انھیں پورے طور سے آمادہ کیا کہ وہ اس کار خیر کو ضرور انجام دیں۔

مشکلات راہ | لیکن سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ سرمایہ ناپید تھا اور بغیر کافی سرمایہ کے یہ مہم اتمام تک پہنچ نہیں سکتی تھی۔

ہلال احمر دہلی کا وعدہ

اس زمانہ میں ترکان آل عثمان کی امداد و اعانت کے لئے ہندوستان کے ہر بڑے شہر میں "ہلال احمر" کے نام سے انجمنیں قائم ہو گئی تھیں، جن کا مقصد سرمایہ جمع کرنا اور ترکوں کو پہنچانا تھا کیونکہ گورنمنٹ نے بھی مسلمانوں کے جوش و خروش کو دیکھ کر اس کی اجازت دیدی تھی کہ یہاں سے انھیں مالی امداد بھیجی جا سکے اور آسانیاں بھی پیدا کر دی تھیں کہ اس راہ میں مشکلات جو آئیں ان میں کسی نہ کسی حد تک سہولت ہو چنانچہ محمد علی نے یہ معاملہ دہلی کی انجمن ہلال احمر کے سامنے پیش کیا، مسئلہ کی اہمیت اور نزاکت سمجھائی، وفد کی ضرورت اور اہمیت کی طرف اس کے ممبروں کی توجہ مبذول کرائی، نتیجہ یہ ہوا کہ انجمن نے پندرہ ہزار کی رقم منظور کی اور اس کے انتظامات کرنے کا وعدہ کیا کہ وہ رقم اس وفد پر صرف کی جائے گی۔ اور وفد بھیجا جائیگا۔

وعدہ خلافی

لیکن یہ وعدہ ابھی شرمندۂ تکمیل نہ ہوا تھا کہ انجمن نے اپنی رائے بدل دی اور وہ رقم جو دینے کا وعدہ کیا تھا اسے براہ راست ترکوں کو بھیجنے کے انتظامات کرنے لگی، محمد علی نے ہر چند سمجھایا کوششیں کیں، منت سماجت کی، عواقب و نتائج ان کے سامنے پیش کئے، مگر سب بے سود، انجمن کی اکثریت نے پھر اپنی رائے نہیں بدلی"۔

حیرت انگیز عزم

میر محفوظ علی صاحب اپنا مشاہدہ بیان فرماتے ہیں کہ:

"محمد علی نے جلسہ ہی میں مجھ سے (محفوظ علی سے) پوچھا، ہمارے پاس کتنی رقم ہے؟ میں نے کہا "اتنے ہزار اتنے سو روپیہ" کہنے لگے "الحمدللہ ہمارے پاس کافی رقم ہے، انصاری! میں نے طے کر لیا ہے کہ انشاءاللہ مشن جائیگا اور ضرور جائے گا، میرے پاس دس روپیہ بھی ہوتے جب بھی ہمت نہ ہارتا تم اللہ کا نام لے کر انتظام کرو، رقم کی فراہمی میرے ذمے۔

اپیل

اسی رات کو اپنے خدمتگار محمد حسین سے کہا، جا کر میرے کمرے میں لیمپ تو

جلائے، کمرے میں جاکر کامریڈ کے لئے مضمون لکھا جس میں مسلمانوں سے بھی مشن کے چندہ کے لئے وہ دل ہلا دینے والی اپیل کی جس نے کامریڈ کے دفتر میں روپیوں کی بارش شروع کر دی، کامریڈ کے فائل گواہ ہیں کہ ایک ایک دن میں دس دس پندرہ پندرہ ہزار روپئے وصول ہوئے ہیں اور میں گواہ ہوں کہ منی آرڈر اور پارسلوں پر دستخط کرتے کرتے میرا ہاتھ شل ہو ہو گیا ہے۔"

آخر کار اس طرح محمد علی نے مایوسیوں اور ناامیدیوں کے عالم میں اس مہم کا آغاز کیا اور اسے اتمام تک پہنچا کر دم لیا۔

باب ۶

ٹرنر ماریسن کمپنی

اور

دوسرے واقعات

ترکوں کو قرضہ ۱۹۱۳ء میں جب دول یورپ نے ٹرکی کو مالی دقتوں اور پریشانیوں میں مبتلا کرکے اس کی کوشش کی تھی کہ وہ ایک ذلت آمیز صلح پر مجبور ہو جائے تو محمد علی نے اپنی پوری کوشش اس امر پر صرف کر دی کہ گورنمنٹ اس کی اجازت دیدے کہ ترکوں کی مالی امداد کی جاسکے، اور جب اس میں کامیابی ہوگئی تو محمد علی نے ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں کا دورہ کیا، اور لوگوں کو اس پر آمادہ کیا کہ وہ ترکی تمسکات کے حصص خریدیں اور اس مقصد عظیم میں انھیں بڑی حد تک کامیابی بھی ہوئی، محمد علی کے ایک سابق عقیدتمند کا بیان ہے کہ:

> "یہ پہلا موقعہ تھا کہ ہندوستان کی اسلامی آبادی نے ایک کثیر رقم ترکی سلطنت کو بطور قرض کے دی۔"

مقدونیہ آؤ حکومت ہائے بلقان کے انسانیت سوز اور شرمناک مظالم سے متاثر ہو کر ترکوں کی ایک جماعت نے ایک اپیل شائع کی جس کا عنوان تھا "مقدونیہ آؤ اور ہماری مدد کرو"، وہ اپیل اپنے درد و تاثر اور واقعیت وحقیقت کے اعتبار سے نہایت زبردست اثر اپنے اندر رکھتی تھی۔

محمد علی نے اسے کامریڈ میں بالاقساط شائع کیا جس پر دہلی کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے ہمدرد و کامریڈ کے وہ تمام پرچے ضبط کر لئے جس میں یہ اپیل شائع ہوئی تھی۔

ضمانت کی طلبی | اور دو ہزار کی ضمانت طلب کی جن سابق "عقیدتمند" صاحب کا بیان اوپر گذر چکا ہے وہ فرماتے ہیں:

"اس حکم کے خلاف آپ نے سب سے زیادہ آزاد خیال عدالت کلکتہ ہائی کورٹ میں اپیل کی، آپ کی جانب سے مشہور مقنن مسٹر مارٹن نے تمام عمر کا قانونی تجربہ اور اپنی بہترین قانونی قابلیت اس حکم کو ناجائز قرار دینے میں صرف کی، مگر مسٹر مارٹن اور محمد علی اور تمام ہندوستان ششدر رہ گیا، جب فاضل ججوں نے یہ ظاہر کیا کہ پریس ایکٹ ایک ایسا ہمہ گیر قانون ہے جس میں صحائف آسمانی بھی آسکتے ہیں"

ٹرنر مارسین کمپنی | آگے چل کر وہی صاحب فرماتے ہیں:

"۱۹۱۴ء میں ٹرنر مارسین کمپنی نے حجاز کی جہازرانی کے اجارہ کی درخواست مع واپسی ٹکٹ حکومت بمبئی کی خدمت میں پیش کی اس نے مع اپنی سفارش کے حکومت ہند کی منظوری کی اجازت بذریعہ تار مانگی، اس خفیہ کارروائی کی خبر آپ کو بھی بذریعہ تار ہوگئی، آپ نے فوراً کامریڈ کا ایک ضمیمہ شائع کیا، جس میں اس درخواست کی منظوری کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور پرائیویٹ طور پر لارڈ ہارڈنگ کو اس مسئلہ کی جانب متوجہ کیا، آپ کی اس جدوجہد کا یہ اثر ہوا کہ وائسرائے نے اس درخواست کو بالکل مسترد کر دیا، اب وہی مذموم طریقہ آپ کی نظربندی کے بعد مستحسن قرار دیا گیا اور ٹھیکہ بھی اسے دیدیا گیا"

ہمدرد

کلکتہ سے دہلی | محمد علی نے کامریڈ کا اجرا کلکتہ سے کیا تھا، اس لئے کہ وہ یہ چاہتے تھے کہ اپنا اخبار حکومت ہند کے دارالسلطنت اور مرکز سے نکالیں لیکن جب حکومت نے اپنا مرکز تبدیل کر لیا اور کلکتہ سے دہلی آگئی تو محمد علی نے بھی حکومت کا تعاقب کیا، اور دہلی پہنچ گئے، اور یہاں آکر انھوں نے ہمدرد کے اجرا کے انتظامات بھی کامریڈ کے ساتھ شروع کر دیئے۔

تعویق | اصل میں ان کا یہ خیال پرانا تھا، مگر حالات سازگار نہ ہو سکے اس لئے ان کا ارادہ قوت سے فعل میں نہ آسکا، سب سے بڑی وقت یہ تھی کہ بیروت سے انھوں نے جو ٹائپ ہمدرد کے لئے منگایا تھا وہ پورا نہیں تھا اور جب تک وہ مکمل نہ ہو جاتا اس وقت تک ہمدرد کا نکلنا مشکل تھا۔

حکیم اجمل خاں کی رائے | میر محفوظ علی صاحب فرماتے ہیں کہ:

"ایک روز حکیم اجمل خاں تشریف لائے اور دریافت کیا کہ ہمدرد کے اجرا میں کیا دیر ہے، محمد علی نے کہا ابھی تک پورے اخبار کے لئے ٹائپ نہیں آسکا ہے فرمانے لگے آج کل خبروں کی بہم رسانی کی سخت ضرورت ہے اگر پورا اخبار نہ نکل سکے تو صفحہ دو صفحہ ہی کا نکال دیجئے، آمدنی بھی ہوگی اور پبلک کی خدمت بھی۔

نقیب ہمدرد | محمد علی نے اس رائے کو پسند کیا اور ہمدرد کا وہ سلسلہ خاص ۲۳ فروری ۱۹۱۳ء سے جاری ہوا جسے عام طور پر نقیب ہمدرد کہتے ہیں یہ پرچہ روزانہ

ایک ورق پر چھپتا رہا اور ہاتھوں ہاتھ بک جاتا تھا"

ہمدرد کا اسٹاف | محمد علی کو معلوم ہوتا ہے شخصیت شناسی میں بھی ملکۂ تام حاصل تھا، ہمدرد کے اسٹاف میں چن چن کر انھوں نے ایسے آدمی رکھے تھے جو محمد علی کی تربیت کی بدولت مختلف حیثیات سے روشناس خلق ہوئے! بہت سے ذروں کو محمد علی نے اپنی نگاہ کیمیا اثر سے آفتاب بنا دیا، ہندوستان کا کوئی اخبار آج تک اتنا قابل قدر ادارتی عملہ نہیں فراہم کر سکا، ہمدرد کے عملہ کا ایک ایک فرد اپنے وقت کا ایک بہت بڑا ادیب و صحافی ثابت ہوا،

میر محفوظ علی صاحب سا ادیب بےمثیل جو تقریباً مضمون نگاری فرماتے تھے (دراصل نیجر تھے) سید ہاشمی فریدآبادی، قاضی عبد الغفار، سید جالب، مولوی عبد الحلیم شرر، فاروق صاحب دیوانہ سبھی ہمدرد کے دفتر میں موجود تھے۔

اور پھر دور ثانی میں عارف ہسوی اور ڈاکٹر سعید احمد جیسے افراد کا کھنچ کھنچ کر ایک ہی حلقہ میں جمع ہو جانا محمد علی کی سحر آفریں شخصیت کا نتیجہ تھا، پھر جس اخبار کو ایسا بے نظیر عملۂ ادارت اور محمد علی سا قابل ایڈیٹر ملے وہ کیوں نہ آسمان صحافت پر مہر و ماہ بن کر چمکتا؟ وہ چمکا اور اس نے اپنی ضوفشانی سے دوسرے سیارگان و ثوابت کی روشنی اور چمک دمک میں کمی پیدا کر دی۔

محمد علی کی ادارتی رہنمائیاں | قاضی عبد الغفار صاحب جو اس زمانہ میں ہمدرد کے رکن ادارت تھے، تحریر فرماتے ہیں؛

"میری زندگی میں وہ یادگار صبح تھی یعنی وہ پہلا دن جب بحیثیت استاد شاگرد میرے اور محمد علی کے مستقل تعلقات شروع ہوئے، میں اس زمانہ کو بھول نہیں سکتا، کیا زمانہ تھا جب ہمدرد و کامریڈ کے دفتر میں صبح اور شام تمام ممبران اسٹاف اخبار کے متعلق مشورے میں شریک ہوتے تھے، شوکت علی، محمد علی، سید محفوظ علی

راجہ غلام حسین، میں اور دو چار، ہم سب زیر بحث مسائل پر بحث کرتے تھے اور محمد علی صاحب ایک ایک کو اس کے کام کے متعلق ہدایات دیتے تھے، ان کے دماغ کی ہمہ گیری کا یہ عالم تھا کہ جب ایک چھوٹا سا نوٹ لکھنے کے لئے بحث کے خاص خاص پہلو بتانا شروع کرتے تھے جو اگر سب حیطۂ تحریر میں لائی جاتی تو ہمدرد کے آٹھ دس کالم پر ہو جاتے۔

دفتر ہمدرد کی فضا آگے چل کر قاضی صاحب موصوف تحریر فرماتے ہیں۔

"ہمدرد کے دفتر کی آب و ہوا بھی کچھ عجیب تھی، وہ صحبتیں اور دل کی امنگوں کی خواہشیں، اقبال کی نظمیں اور شوکت علی بھائی کا ترنم، غلام حسین مرحوم کے دھیمے مذاق، محفوظ علی بھائی کی شیریں گفتاری کہ ہر لفظ جو دہان موزوں سے نکلتا تھا گویا ایک برکت فلک سیر سے کم نہ ہوتا تھا۔"

محمد علی کا نظریہ صحافت ہمدرد کے ذکر کے سلسلہ میں نامناسب نہ ہوگا، اگر محمد علی کا وہ نظریہ صحافت پیش کر دیا جائے جس پر عمل پیرا ہو کر ہمدرد نے ہندوستانی صحافت میں اپنے غیر فانی نقوش قائم کئے ہیں۔

یہ وہ زمانہ ہے کہ محمد علی ابھی بڑودہ میں برسر ملازمت ہیں۔ انشا پردازی اور مضمون نگاری کا جب جوش اٹھتا ہے تو ٹائمز آف انڈیا بمبئی میں اپنے قلم کی روانی دکھاتے ہیں اور اس کے ایڈیٹر سے خراج تحسین حاصل کرتے ہیں خود ان کے دل میں بھی اس میدان میں آنے کی تمنا پرورش پا رہی ہے اور اس جنجال سے جلد از جلد رہائی چاہتے ہیں مگر بقول شخصے

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد پر طبیعت ادھر نہیں آتی

اسی زمانہ میں گجرات سے ان کے ایک شناسا نظام الدین صاحب نے ایک اخبار نکالنا

چاہا اور محمد علی سے مشورہ طلب کیا، محمد علی نے مشورہ کی صورت میں صحافت کے یہ زرین اصول ان کی خدمت میں پیش کر دئے۔

"اخبار کی کامیابی کے لئے اتنی باتوں کا ہونا لازمی ہے:-

(۱) ذاتیات سے بالکل مبرا ہو نہ کسی دشمن کے خلاف کچھ لکھا جائے نہ خواہ مخواہ دوستوں کی تعریف کے قصیدے گائے جائیں۔

(۲) کسی شخص یا اخبار کی رائے کے خلاف کچھ لکھنا ہو تو وہ مخالفت محض رائے تک رہے ذات کا حصہ شامل نہ ہو۔

(۳) جو کچھ لکھا جائے عبارت آرائی کے خیال سے نہیں نہ لوگوں کے چٹکیاں لینے کی غرض سے بلکہ متانت سے اور نہایت سنجیدگی سے۔

(۴) جہاں تک ممکن ہو وہی خبریں چھاپی جائیں جو انگریزی ڈیلی چھاپتے ہیں اگر اس سے زیادہ کوئی لوکل یا باہر کی خبر چھاپنی ہو تو اس کے راوی کا ثقہ ہونا سب سے ضروری ہے۔

(۵) اخبار کا مقصد اپنی قوم کو نفع پہنچانا ہونا چاہئے نہ کہ دوسری قوم کو نقصان پہنچانا اس لئے دوسروں کے رنج پر اپنے کو خوش نہ ہونا چاہئے، خصوصاً ہنود پر بیجا حملہ نہ کرنا چاہئے، ان کے حملہ کا دفعیہ ضرور رہے۔"

(۶) اخبار خبروں کا مجموعہ ہوتا ہے لہذا زیادہ تر خبروں کا حصہ ہونا چاہئے۔

(۷) مضامین میں ایک ایڈیٹوریل ہو، کسی ایسے مضمون پر جو اس زمانہ میں زیر بحث ہو اور یہ مضمون اخبار بھرنے کی غرض سے نہ لکھا گیا ہو بلکہ ایسا ہو کہ جس کا لکھا جانا نہایت ضروری تھا مضمون پولٹیکل ہو خواہ سوشل خواہ تعلیمی خواہ

تجارتی۔

(۸) ایڈیٹوریل نوٹ حال کے واقعات اور خبروں پر اپنی رائے زنی کیلئے ہیں اس لئے اسی کالم میں آنا چاہئے۔

(۹) ایک مضمون کسی اور کا بھی ہونا چاہئے خواہ وہ کسی خبر کے متعلق ہو یا کسی مستقل مضمون پر۔

(۱۰) مختلف مقامات پر چند مضمون نگار دوستوں یا تنخواہ داروں کا بندوبست کرنا چاہئے جو مہینہ میں ایک مرتبہ آدھے کالم میں آسکے۔

(۱۱) خطوط وہی چھاپے جائیں جو واقعی کسی ضرورت سے لکھے گئے ہوں ، نہ کہ نامہ نگاروں کی جودت طبع کے اظہار کے لئے۔

(۱۲) اخبار مذہبی بحث سے بالکل معرا ومبرا ہو۔

(۱۳) ایڈیٹر کو خود تمام مسئلوں پر غور کرنا اور دوسرے اخباروں اور کتابوں سے واقفیت حاصل کرنا لازم ہے ، آپ کو یہ نہیں معلوم ہے کہ روزانہ اخبار کا ایڈیٹر کس قدر سخت محنت کرتا ہے ، خود مجھے مصر کے متعلق کچھ لکھنا ہے روزانہ اخبارات سے بہت سے واقعات معلوم ہوتے رہتے ہیں مگر تین چار کتابیں شروع سے آخر تک پڑھی ہیں تب جاکر ایک دو کالم کا مضمون لکھ سکوں گا ، اگر قلم برداشتہ لکھنا چاہوں تو بہت آسان ہے مگر پڑھنے والے کو مشکل ہے"۔

نظریہ کیسا تھا؟ یہ تھے محمد علی کے وہ زرین اصول صحافت جن پر ان کا اخبار ہمدرد چلا اور جس نے ہمیشہ غیروں سے خراج تحسین حاصل کیا۔

محمد علی کو اپنی زندگی میں بار ہا بڑی بڑی شخصیتوں کے خلاف قلم اٹھانا پڑا اور سخت

سے سخت مخالفت کرنی پڑی، لیکن غور کیجئے، آپ کو معلوم ہوگا کہ انھوں نے اپنے اصول سے تجاوز کبھی نہیں کیا جس مسئلہ میں انھوں نے اختلاف کیا، اس کے بعد کسی دوسرے مسئلہ میں انھوں نے اس سے زیادہ اتفاق کیا، اور اتفاق وحمایت کا حق ادا کردیا۔

ڈاکٹر کچلو، ڈاکٹر عالم وغیرہ کے سلسلہ میں آپ اس کی تفصیل پڑھ چکے ہیں۔

یہی وجہ ہے جوان کا زبردست سے زبردست مخالف ان کی قدر کرتا تھا۔

حکیم برہم کا خط | چنانچہ جب ہمدرد کی نشاۃ ثانیہ ہوئی ہے، تو حکیم برہم مالک وایڈیٹر اخبار مشرق گورکھپور نے انھیں ذیل کا خط اپنی ساری مخالفتوں کے باوجود لکھا۔

"بہت خوشی ہوئی کہ آپ نے ہمدرد و کامریڈ کے اجرا کا قصد فرمایا، یقین ہے کہ قوم اور ملک کی متزلزل حالت ٹھیک ہوجائے گی اور رائے عامہ کی پریشانی دور ہوجائے، جس روز پہلے پرچے جاری ہوں، میرے نام ایک سال کے لئے دونوں پرچے ویلو روانہ کردیں۔"

اعلیٰ انتظامات | محمد علی نے ہمدرد اس شان اور اس آن بان کے ساتھ چلایا کہ اس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔

ہندوستان کا وہ پہلا اردو روزنامہ تھا جس نے براہ راست ایسوشی ایٹیڈ پریس اور روائٹر کی خدمات حاصل کی تھیں۔

اشاعت | یہی چند در چند اور گوناگوں خصائص تھے جن کی بنا پر ہمدرد ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تھا اور جنگ کے زمانہ میں تو اس کی اشاعت بہت زیادہ بلکہ ہزاروں تک پہنچ گئی تھی، یہی وہ پہلی معراج تھی جو ہمدرد کو حاصل ہوئی اور اس کے بعد سے آجتک کوئی اخبار ہندوستان کی اردو صحافت میں اپنی کثرت اشاعت کا ایسا نمونہ نہیں پیش کرسکا۔

گورنمنٹ کا خراجِ تحسین | اپنے اس قابلِ رشک کارنامے کی داد تعجب ہے کہ ہمدرد نے گورنمنٹ سے بھی حاصل کر لی، چنانچہ ان کی نظربندی کے بعد چیف کمشنر صوبہ نے اُردو پریس کے اور اس کی غیر ذمہ دارانہ روش پر سرکاری سالانہ رپورٹ میں جو نہایت زبردست اعتراضات کئے تھے ان سے ہمدرد کو مستثنیٰ کر دیا تھا اور اس کے مضامین و مقالات کی تعریف و توصیف کی تھی۔

"الفضل ما شہدت بہ الاعداء" کی یہ کتنی صحیح تصویر ہے؟

سنسر | ہمدرد پر جب جنگ کے بعد سنسر بٹھالا گیا اور بغیر اس کی منظوری کے کوئی مضمون یا خبر شائع کرنا جرم کر دیا گیا تھا تو ایک دلچسپ لطیفہ پیش آیا، جسے خود محمد علی نے اس طرح بیان کیا ہے

"ہمدرد کے سنسر نے تو ایک بار چڑیا چڑونٹے کی کہانی کو بھی خارج کر دیا تھا اور اعتراض کیا گیا تو کہا کہ بھائی ہے تو چڑیا چرونٹے ہی کی کہانی اور مطلب بھی صاف معلوم ہوتا ہے مگر ہمدرد والوں سے ڈر ہی معلوم ہوتا ہے اور روٹی کا معاملہ ہے نہ معلوم اس میں بھی کچھ زہر بھر دیا ہو۔ اور جواب دہی ہمارے سر آپڑے۔"

التوا | آخر محمد علی کی نظربندی کے بعد ہمدرد کی اشاعت بھی ملتوی کرنی پڑی اور گو سید جالب صاحب "آف ہمدرد" نے بہت کوششیں کیں مگر افسوس ہے کہ وہ کامیاب نہ ہو سکے اور اخبار کا چلانا ان کے لئے ناممکن ہو گیا۔

درمیانی وقفہ | ہمدرد کی نشاۃ اولیٰ اور نشاۃ ثانیہ کے درمیانی وقفہ میں ہندوستان پر جو آفتیں آئیں مسلمانوں پر جو مصائب ٹوٹے، عالم اسلامی پر برطانوی ہوس استعمار کے دندان آز جس جس طرح تیز ہوئے، خود ہندوستانی سیاسیات میں جو عظیم الشان مدوجزر آیا، اور محمد علی کی ذات جن حالات کی آماجگاہ رہی، یہ عنوان اس تفصیل کی نذر نہیں کیا جا سکتا، سردست ان

تمام انقلابات و حوادث سے قطع نظر کرکے آپ ایک بار ہمدرد کے دفتر میں اپنی نظر جمائیے۔

نشأۃ ثانیہ | بیجاپور جیل سے رہائی کے بعد محمد علی نے کامریڈ کے ساتھ ہمدرد کی زمام ادارت پھر اپنے ہاتھ میں لی۔

عہد ثانی کو عہد اول سے عمدہ ہونا چاہیے تھا مگر افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا، محمد علی کے ذہن اور دماغ پر جو حملے ہوئے انھوں نے ان کی متاع اطمینان و سکون کو درہم برہم کر دیا اور وہ فروغ خاطر کے ساتھ کامریڈ کی طرح ہمدرد کو بھی نہ چلا سکے، علاوہ ازیں ان کی غیر معمولی مصروفیت جس میں کانگرس کی صدارت کے سبب اور اضافہ ہو گیا تھا، نیز عہد اول کے بے مخلص رفقا اب ناپید تھے۔

لیکن پھر بھی ہمدرد نے اپنا معیار قائم رکھا اور وہ کبھی بھی ان جرائد و اخبارات کی صف میں نظر نہیں آیا، جن کا مقصد صرف دریوزہ گری ہے اور جن کا دلچسپ مشغلہ خواہ مخواہ دوسروں کو چھیڑ چھیڑ کر "گرمیٔ بازار" کا ہنگامہ پیدا کرنا۔

وہ اپنی سنجیدہ، متین اور جاذب توجہ روش پر چلتا رہا اور اب چونکہ پبلک اور زیادہ بدمذاق بنائی جا چکی تھی اس لئے وہ "چاشنی" ڈھونڈھتی تھی اور "چاشنی" یہاں کہاں؟

ہمدرد کی دوسری ناکامی کا سبب یہ ہوا کہ اب اس کے نظریہ میں بھی فرق آ گیا تھا، یعنی پہلے وہ اصول صحافت پر عامل تھا اور پورے طور پر ایک "اسٹوڈیٹ" بلند روزنامہ تھا۔

لیکن اب محمد علی نے اسے صرف قوم کے مریض غم کا نسخہ بنا دیا جس میں پرہیز کی غیر دلچسپ ہدایتیں تھیں، تلخ و ترش دواؤں کی فہرستیں تھیں اور ایک ہی طور پر مسلسل علاج کرنے کی کوشش تھی۔

اس بنیادی تغیر کے باوجود اس نے اپنی آن بان میں کوئی فرق نہیں کیا، نہ بے موقع

طور پر اس نے کسی کی خوشامد کرکے کسب زر کی کوشش کی، اور نہ گالیاں دے کر، ڈرا دھمکا کے بعض اخبارات کی اصطلاح میں کچھ "اینٹھا"۔

خواجہ حسن نظامی کی رائے چنانچہ خواجہ حسن نظامی صاحب نے ۲۴ نومبر ۱۹۲۶ء کے روزنامچہ میں ہمدرد کی بلند پائگی کا اعتراف ان الفاظ میں کیا تھا۔

"مسلمانوں کے اور ہندوستان کے شہرہ آفاق لیڈر مولنا محمد علی صاحب کی ایڈیٹری میں "ہمدرد" روزانہ شائع ہوتا ہے، اس اخبار کی طرز عامیانہ نہیں ہے بلکہ انگریزی کے اعلیٰ اخباروں کی شان کے موافق نہایت باوقار اور مدلل رائے زنی اس اخبار میں ہوتی ہے، اسلامی ممالک اور اسلامی حقوق اور ہندوستانی حقوق کی یکساں حمایت کرتا ہے"

مہاراجہ اندور کا واقعہ ہندوستانی اخبارات بالخصوص اُردو اخبارات کا بالعموم شیوہ امتیاز رہا ہے کہ جہاں کسی بڑے آدمی پر کوئی آفت آئی اور انھوں نے اس کے آستانہ کے دورے لگانا شروع کیے کہ اگر اس ذریعہ کچھ مل گیا تو "خدمات" حاضر ہیں اور نہ ملا تو پھر ایڈیٹوریل کی شمشیر برہنہ موجود ہے۔

مہاراجہ نابھ، مہاراجہ اندور، حضور نظام کی بارگاہوں کے واقعات، لکھنؤ میں ایک مشہور تاجر کا مقدمہ، علی گڑھ سے ڈاکٹر ضیاء الدین کی علٰحدگی، کہانتک شمار کرایئے، ان سب واقعات میں مقامی اور غیر مقامی اخباری "نمائندوں" نے ماشاء اللہ بہت کافی مالی حالت مضبوط کرلی۔

مہاراجہ صاحب اندور کا جب ممتاز بیگم والا مشہور واقعہ عالم وجود میں آیا، اس وقت اگر ہمدرد چاہتا تو اپنا سارا قرضہ اس آمدنی سے ادا کر سکتا تھا اس لئے کہ اسے کسی سفارش کی ضرورت نہیں تھی، اس کی رائے کا گورنمنٹ کے حلقہ اور قوم کے طبقہ میں جو اثر تھا وہ ظاہر تھا،

چنانچہ ہمدرد کے بعض " ہمدردوں " نے مہاراجہ صاحب تک اس قسم کی تحریک کرنا چاہی کہ ان پر جو آفت آرہی تھی اس کا مقابلہ بھی ہو سکے گا اور ہمدرد کو بھی فائدہ پہنچ جائیگا۔

محمد علی کو اس کی خبر ہوئی تو کہتے ہیں:

" جوں ہی میں نے اس کا ذکر سنا، میں نے ان آدمیوں کو ڈھونڈھ نکالا اور ان سے حلف لیا کہ وہ اس قسم کا کوئی ذکر نہ اوروں کی طرف سے نہ اپنی طرف سے کریں گے "

الور کی جوبلی

دوسرا نہایت اہم واقعہ ہمدرد کی اصابت و استقامت کا یہ ہے:

مہاراجہ صاحب الور نے اپنی طرف سے ایک معقول رقم دے کر محمد علی کو انگلستان بھیجا تھا کہ وہ اپنی صحت کی طرف اسی بہانہ سے متوجہ ہوں، کچھ آرام ملے اور کچھ علاج کریں تو کسی نہ کسی حد تک تو صحت درست ہو ہی جائے گی، محمد علی روانہ ہو گئے۔

ہمدرد کی مالی حالت اس وقت بہت خراب ہو رہی تھی اس لئے وہ اسے بند کر دینا چاہتے تھے، لیکن ان کے وفا شعار اور مخلص دوست آگے بڑھے اور انھوں نے ہمدرد کو بند نہیں ہونے دیا۔

مولٰنا عبد الماجد صاحب دریابادی مدظلہ نے ہمدرد کی ادارتی رہنمائیاں اپنے متعلق کر لیں۔ اور مولٰنا ظفر الملک صاحب علوی مدیر الناظر نے انتظامی نقائص کو دور کرنے کی ذمہ داری اپنے سر لے لی۔

محمد جعفری صاحب مدیر ملت جو اس سے پہلے سب ایڈیٹر کے فرائض انجام دے رہے تھے ایڈیٹر کر دئے گئے۔

ولایت سے واپسی پر بھی کچھ دنوں یہی انتظام رہا، محمد علی رنگون کی پیہم طلبیوں سے

مجبور ہو کر رنگون گئے ہوئے تھے۔

عین اسی زمانہ میں مولنا عبدالماجد صاحب مدظلہ کی روایت کے مطابق محمد علی کی عدم موجودگی میں اس کی تحریک کی گئی کہ الور کی جوبلی پر ہمدرد اپنا ایک "اسپشل نمبر" نکالے اور جملہ مصارف مع شئے زائد، ریاست کے ذمہ۔

جعفری صاحب نے اتنے اہم معاملہ میں تنہا اپنی ذمہ داری پر کوئی کارروائی مناسب نہ سمجھی محمد علی تو رنگون میں تھے لہذا انھوں نے دریاباد کا رُخ کیا اور مولنا عبدالماجد صاحب سے استفسار و استصواب کیا، مولنا نے بھی ذاتی طور پر کوئی فیصلہ کرنا مناسب نہ سمجھا، انھوں نے اسی وقت رنگون ایک تار دیا جو خاصہ مفصل تھا، اس لئے کہ وقت کم رہ گیا تھا، محمد علی نے مہاراجہ صاحب الور کی تمام عنایتوں اور زر پاشیوں کے باوجود صاف انکار کر دیا اور لکھدیا کہ "کہدیا جائے کہ ہمدرد کا اس طرح کا اسپشل نمبر آج تک نہیں نکلا، اس لئے معذوری ہے، ہاں ہمدرد پریس میں اگر ضرورت ہو تو ایک پمفلٹ چھپ سکتا ہے۔

اشتہارات ان ذرائع کے علاوہ اگر صرف کسب زر مقصود ہوتا تو ہمدرد میں ایسے اشتہارات شائع ہو سکتے تھے، جن کی اشاعت سے پڑھنے والوں کا نہیں تو چھاپنے والوں کا "بھلا" ہو سکتا تھا، لیکن ہمدرد نے اس مذاق عام کی بھی کبھی پیروی نہیں کی، وہ اصول پر مر گیا لیکن اپنی خاطر اس نے اصول کا "قتل" گوارا نہیں کیا۔

باب ۸

ہنگامۂ کانپور

کانپور کی مسجد اتنی مشہور ہو چکی ہے کہ کم از کم اس کے نام سے ہر شخص واقف ہے خواہ اصل واقعہ کا صحیح طور پر کسی کو علم ہو یا نہ ہو، یہی وہ واقعہ ہے جب مسلمانوں نے ظلم و جبر کے مقابلہ میں نہایت استقامت، استقلال اور بہادری کا ثبوت دیا تھا اور ہنسی خوشی اپنی جانیں محض اللہ اور اس کے گھر کی حرمت کی خاطر نثار کر دی تھیں۔

اصل واقعہ اصل واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۱۳ء میں کانپور کی میونسپلٹی کی طرف سے ایک سڑک تعمیر ہو رہی تھی ایک مسجد "سنگ راہ" بنی ہوئی تھی، اور اس کی وجہ سے اس مجوزہ "صراط مستقیم" میں کجی پیدا ہو رہی تھی۔

مسجد کے متولیوں نے غایت درجہ دریا دلی اور رواداری کے ساتھ میونسپلٹی کو اس کی اجازت دیدی کہ راستہ میں مسجد کے غسلخانہ اور پاخانہ کے جو سنگ گراں حائل ہیں انھیں ہٹا دیا جائے۔

میونسپلٹی کو موقعہ مل گیا اور اس نے اسے منہدم کرانیکے انتظامات شروع کر دئیے۔

عامۃ المسلمین، جمہور علماء، اور ہندوستان کے تقریباً تمام بزرگوں نے اس کے خلاف اظہار رائے کیا اور متولیوں کی اس غلط فہمی کو رفع کرانا چاہا کہ وہ اپنی کسی جائداد کے متعلق تو اتنا فیاضانہ اعلان کر سکتے تھے لیکن مسجد کے معاملہ میں نہیں۔

یہ تمام ہنگامہ اور شور و غل بیکار ثابت ہوا اور مسجد کا وہ حصہ آخر کار منہدم کر دیا گیا، اس

کے انہدام نے مسلمانوں کے قلوب پاش پاش کر دئے، کانپور میں بالخصوص اور سارے ہندوستان میں بالعموم ایک آگ لگ گئی، ہندوستان بھر میں جلسے ہوئے، تجویزیں پاس ہوئیں، گورنمنٹ کے اس فعل پر اظہار نفرت کیا گیا لیکن کانپور جہاں یہ ہنگامۂ ہائلہ ہوا تھا وہاں کے مسلمانوں نے سر سے کفن لپیٹ کر مسجد کا رُخ کیا اور منہدم شدہ حصۂ مسجد کو پھر درست کرنے لگے، پولیس آئی اس نے ان لوگوں کو واپس کرنا چاہا مگر ناکام ہوئی، فوج آئی اس نے ان مجاہدین راہ حق و صداقت کو مرعوب کرنا چاہا مگر بے سود، ہوائی فیر ہوئے مگر لا حاصل اور اس کے بعد پھر فوج کی گولیاں چلیں، کارتوس ختم ہوئے اور لوگ دھڑا دھڑ گرنا شروع ہوئے، گولیاں سینوں پر پڑ رہی تھیں اور لوگ شہید ہو ہو کر، زخمی ہو ہو کر، نیم جان ہو ہو کر گر رہے تھے اور یہ سب کچھ دن کی روشنی میں، عدل پرور، و نصفت شعار حکومت کے ایما سے ہو رہا تھا، بلکہ حکم سے ہو رہا تھا۔

اس واقعہ فاجعہ نے مسلمانوں کے غم و غصہ میں اور اضافہ کر دیا اور احتجاج نے بہت نازک صورت اختیار کر لی، مگر حکومت صوبجات متحدہ ٹس سے مس نہ ہوئی، سر جمیس مسٹن نے اسے اپنے وقار کے خلاف سمجھا کہ وہ اس "ایجی ٹیشن" سے متاثر ہو جائیں۔

محمد علی کی کوششیں اس سلسلہ میں مولنا آزاد سبحانی، مولنا ابوالکلام آزاد اور مرحوم مولنا مظہر الحق، مہاراجہ محمود آباد نے بھی جو گرانقدر خدمتیں انجام دیں وہ فراموش نہیں ہو سکتیں۔

ان مقامی اور محدود کوششوں کے علاوہ محمد علی نے اس معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ پہلے تو انھوں نے سر جمیس مسٹن صاحب گورنر صوبہ متحدہ سے نجی طور پر خط و کتابت کی، اس لئے کہ انھیں امید تھی کہ ان کے ذاتی تعلقات جو سر جمیس مسٹن سے چلے آ رہے تھے وہ کام آئیں گے اور مسئلہ کی نزاکت اور اہمیت کو سمجھ سکیں گے مگر ان کے سر میں وہ نشہ نہیں تھا جو اس "ترشی" سے اتر سکتا۔

مسٹر میکڈانلڈ کو تار نتیجہ یہ ہوا کہ جب محمد علی مایوس ہو گئے تو انھوں نے غالباً ستمبر ۱۹۱۳ء میں ممبئی جا کر مسٹر میکڈانلڈ کو ایک تار دیا اور ان سے درخواست کی کہ وہ اس معاملہ کو سمجھیں اور پارلیمنٹ میں اس کے متعلق سوال کریں مگر مسٹر میکڈانلڈ نے بھی اس تار کا کوئی جواب نہیں دیا اور جب ملاقات ہوئی تو "عذر گناہ بدتر از گناہ"، کیا، جب یہ صورت بھی بے اثر رہی تو محمد علی نے ایک اور

انگلستان بہ ہمراہی وزیر حسن تجویز پر عمل کیا یعنی مسٹر (اب سر اور چیف جسٹس) وزیر حسن سکریٹری آل انڈیا مسلم لیگ کو اکتوبر ۱۹۱۳ء میں اپنے ہمراہ لیا اور انگلستان پہنچ گئے یہ روانگی بہت دلچسپ رہی، جب تک جہاز میں سوار نہ ہو لئے کسی کو پتہ بھی نہ چلا کہ مبادا اسٹن صاحب کی حکومت اس منصوبہ کو درہم برہم کر دے، بہر حال وہاں اس مسئلہ کے متعلق انھوں نے بہت کافی پروپیگنڈا کیا، مضامین لکھے تقریریں کیں، ارباب حکومت، ممبران پارلیمنٹ اور ارکان کابینہ سے ملاقات کی اور ہر طرح سے انھیں اس مسئلہ کی نزاکت جتلائی اور عواقب و نتائج سے باخبر کیا۔

کامیابی آخر ان کی کوششیں کامیاب ہوئیں اور سر جیمز لاٹوش سابق گورنر صوبہ متحدہ رکن مجلس وزیر ہند، محمد علی کے دلائل سے کافی متاثر ہوئے اور اس طرح لندن سے لارڈ ہارڈنگ وائسرائے ہند کو ہدایت بھجوائی گئی اور انھوں نے بطور خود اس معاملہ کا تصفیہ اس طرح کیا کہ کانپور پہنچے، ہسپتال میں زخمیوں کا معائنہ کیا، جیل میں قیدیوں کو محبت اور پیار کی نظر سے دیکھا، انھیں اپنا "بیٹا" سمجھا اور سب کو رہا کر دیا اور مسجد کی تعمیر کی اجازت مرحمت فرمائی۔

محمد علی کی واپسی اس نمایاں کامیابی کے بعد آخر دسمبر ۱۹۱۳ء میں محمد علی ہندوستان واپس آئے اور ان کا نہایت پر خلوص اور شاندار استقبال کیا گیا اور ان کی جاں فشانی اور کارکردگی کا نہایت خلوص قلب سے اعتراف کیا گیا، ان کی رہنمائی کا ایک اہم زینہ یہ بھی تھا۔

باب ۹

"چوائس آف دی ٹرکس"

۱۹۱۱ء میں جب جنگ عظیم شروع ہوئی ہے، اس وقت لندن ٹائمز نے ایک اشتعال انگیز مضمون اپنے اخبار میں شائع کیا تھا اور ترکوں کو مشورہ دیا تھا کہ وہ صرف دور سے تماشا دیکھیں اس جنگ میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہونا چاہیے، یہانتک کہ یونان پر بھی ان کی پیش قدمی نہ ہو۔
مضمون حد درجہ اشتعال انگیز اور دلشکن پیرایہ میں لکھا گیا تھا جس سے ترکوں کی سخت توہین اور حقارت مقصود تھی۔

اگرچہ اس زمانہ میں بیگم محمد علی سخت علیل تھیں اور اسی فکر و پریشانی میں محمد علی کو رات رات بھر جاگتے گزرتی تھی مگر وہ اپنے اس جوش کو قابو میں نہ رکھ سکے جو اس مضمون کے دیکھنے سے ان میں پیدا ہوا تھا۔

محمد علی کا بیان | چنانچہ اس مضمون کے متعلق خود محمد علی کا بیان ہے کہ:

"میں نے یہ مضمون چالیس گھنٹہ کی لگاتار محنت شاقہ برداشت کر کے لکھا اور اس تمام عرصہ میں ایک منٹ بھی نہ سویا اور جب خود لکھتے لکھتے تھک جاتا تھا تو اخبار کے اسسٹنٹ ایڈیٹر کو خود بولتا جاتا تھا اور ان سے لکھواتا تھا اور اس چالیس گھنٹہ میں نہ صرف سونے سے محروم رہا بلکہ خوراک بھی قہوہ کی چند پیالیوں سے بمشکل ہی آگے بڑھی۔"

ضمانت کی ضبطی | یہ مضمون گورنمنٹ کے حلقوں میں اس قدر ناپسندیدگی سے دیکھا گیا کہ

چند ہی روز میں اس کا نتیجہ بھی نکل آیا یعنی ہمدرد و کامریڈ کی ضمانت ضبط کر لی گئی۔

پیروی | لیکن محمد علی خاموش بیٹھنے والے نہیں تھے، انھوں نے اس حکم کی آسانی کے ساتھ تعمیل نہیں کی، بلکہ اس فیصلہ کے خلاف اپیل کی اور لطف یہ کہ اس مقدمہ کی خود پیروی کی خود جرح کی اور خود اس حکم کے پرخچے بارگاہ عدالت میں اڑائے۔

تفصیل | میر محفوظ علی صاحب کے الفاظ میں اس اجمال کی تفصیل یہ ہے:

"کامریڈ کی ضبطی ضمانت کے سلسلہ میں محمد علی نے عدالت میں خود بحث کی اور دوران بحث میں وکیلوں اور بیرسٹروں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوئے تھے اور ہر شخص دم بخود تقریر سن رہا تھا، باہر نکلے تو ہر ہندو مسلمان وکیل بیرسٹر کے منہ سے بیک زبان یہی جملہ نکلا "مسٹر محمد علی کاش آپ بیرسٹر ہوتے"۔

محمد علی نے جواب دیا آپ بھی جو کچھ ہوں اس کی کونسی قدر ہو رہی ہے جو بیرسٹری میں ہوتی"۔

اس طرح بالآخر ضمانت ضبط کر لی گئی اور کامریڈ موت کے آغوش میں چلا گیا۔

باب ۱۰

نظربندی

جنگ عظیم اپنے ساتھ عالم اسلامی اور اسلامی ہند بلکہ سارے ہندوستان کے لئے بڑی بڑی برکتیں لائی تھی۔

ڈاکٹر انصاری اور اجمل خاں کا مشورہ ضبطی ضمانت کے بعد محمد علی نے پھر ذیابیطس کی شکایت محسوس کی اور ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری اور حکیم اجمل خاں نے آپ کو یہ مشورہ دیا کہ آپ نے فوراً سارے دماغی کام نہ چھوڑ دئے تو آپ کی زندگی کو خطرہ ہے، اس مشورہ کے بعد محمد علی رامپور گئے کہ وہاں تبادلہ آب وہوا کا خیال بھی تھا اور وطن کی کشش بھی۔

دہلی کے ایک رفیق کار کا بیان ہے کہ

"رامپور پہنچے ہی تھے کہ ڈائرکٹر جنرل پولیس صوبہ متحدہ نواب صاحب رامپور کے پاس آئے اور نواب صاحب کی معرفت آپ طلب کئے گئے وہاں آپ سے کانپور کے قضیہ کے متعلق سوالات کئے گئے اور اس دوران میں سخت گفتگو ہو گئی۔

رام پور میں نظربندی ڈائرکٹر جنرل کے جانے کے بعد آپ کو یہ بتایا گیا کہ آپ نواب صاحب کی بغیر اجازت رامپور سے نہیں جا سکتے، گویا دوسرے معنوں میں آپ نظربند کئے گئے غالباً ۱۴ گھنٹہ کی پرلطف نظربندی کے بعد آپ رہا ہوئے اس کے بعد آپ نینی تال کی گھاٹیوں میں شکار کھیلنے گئے تو واپسی

پر سخت بخار میں مبتلا ہوئے، اس عرصہ میں ڈاکٹر انصاری نے نینی تال میں موسم گرما بسر کرنے کے لئے مکان وغیرہ کا بندوبست کیا، آپ کی علالت کی خبر سن کر مولانا شوکت علی دہلی سے رامپور گئے اور دونوں بھائیوں کا ارادہ حسب دستور حضرت معین الدین چشتی کے سالانہ عرس پر اجمیر شریف جانے اور وہاں سے نینی تال جا کر موسم گرما گزانے کا تھا، اجمیر شریف جاتے ہوئے ایک ہفتہ کے لئے دہلی ٹھہرے، دہلی تشریف لائے ہوئے آپ کو دو ہی روز

حکم

گزرے تھے کہ دہلی کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کا ایک جابرانہ حکم، ارمئی کو قانون تحفظ ہند کی رو سے آپ کو دیا گیا کہ آپ مع اپنے برادر محترم کے اپنے تئیں نظر بند سمجھیں، اس حکم کی رو سے آپ پر وہ تمام پابندیاں عائد کی گئیں جو جرائم پیشہ پر بھی عائد نہیں کیجاتیں، آپ نے اس حکم کو پڑھتے ہی خدا کا شکر ادا کیا اور کہا کہ یہ ایک پیغمبرانہ سنت ہے جس کی ادائگی کے لئے خدائے حکیم نے محض اپنے فضل و کرم سے مجھے منتخب کیا"

قاضی عبدالغفار کا بیان

اس حکم کو سن کر محمد علی پر کیا تاثرات غالب ہوئے اور ان کے چہرہ بشرہ سے کیا ظاہر ہوتا تھا، اسے قاضی عبدالغفار صاحب کی سطور ذیل سے معلوم کیجئے۔ وہ لکھتے ہیں:

"خوش وقتی کا یہ عالم تھا کہ جس وقت نظر بندی کا حکم آیا ہے، میں دفتر میں نہ تھا، لیکن بلایا گیا اور جب محمد علی صاحب کے کمرہ کے پاس پہنچا تو میں نے ایک شور مبارکباد سنا اور یہ خیال ہوا کہ شاید کوئی بہت اچھی خبر کہیں سے آئی ہے لیکن دیکھتا ہوں تو کمرہ کے وسط میں میز پر احکام نظر بندی کھلے رکھے ہیں

اور ایک غلغلۂ تہنیت برپا ہے جس میں دونوں بھائیوں کی آواز جو ایک دوسرے کو ہنس ہنس کر مبارکبادیں دے رہے تھے، سب سے زیادہ بلند ہے۔"

مہرولی کو روانگی بہرحال ان احکام نادری کے بعد محمد علی نے حسب الحکم مہرولی جانیکا ارادہ کیا ۵ رمئی کو جمعہ کے روز علی برادران جامع مسجد میں نماز جمعہ ادا کرنے گئے تھے، اہالیان دہلی کو اس خبر کی اطلاع مل گئی تھی اس لئے ایک خلقت کی خلقت ان دونوں بھائیوں کی زیارت کو

عبدالغفار صاحب کا شاہدہ آئی تھی، قاضی عبدالغفار صاحب اس روز کا اپنا مشاہدہ یوں بیان فرماتے ہیں:

"وہ آخری جمعہ مجھے یاد ہے جب جامع مسجد کی سیڑھیوں پر یہ دونوں اہل دہلی سے رخصت ہو رہے تھے اور دل کی کیفیات سے بے قابو ہو کر رونے والوں کو تلقین صبر و استقامت کر رہے تھے، مسجد شاہجہانی کی سیڑھیوں پر یہ دو انسان پتھر کے دو مینار تھے جن پر زمانہ کی طوفان انگیزیاں بے اثر تھیں۔"

مہرولی کی پابندیاں مہرولی کے ایام نظر بندی میں محمد علی کو کچھ آسانیاں بھی حاصل تھیں یعنی وہ مشغلۂ تحریر جاری رکھ سکتے تھے، اور اس صورت میں انھیں بہت زیادہ دقت بھی نہیں تھی، راجہ غلام حسین کریڈ کے لئے اور قاضی عبدالغفار و سید جالب ہمدرد کے لئے کافی تھے، یہاں پہنچ کر محمد علی نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے اپنا "گناہ" دریافت کیا جس کا یہ مختصر "سرکاری" جواب دیا گیا کہ "صاحب ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ایسے سوالات کا جواب دینا پسند نہیں کرتے۔"

زائرین کا ہجوم محمد علی مہرولی میں نظر بند تھے لیکن شکر ہے کہ اہالیان دہلی کو دہلی میں نظر بند نہیں کر دیا گیا تھا اس لئے دہلی والوں کو یہ آسانی حاصل تھی کہ وہ مہرولی آکر محمد علی سے مل سکیں، اگرچہ وہ خود مہرولی سے باہر نہیں جا سکتے تھے!

گورنمنٹ کو شاید ان کی یہ حرکت بری معلوم ہوئی اس لئے اس نے ان خطرناک لوگوں کو مہرولی سے ہٹا دیا، اور لینڈون بھیج دیا۔

مہرولی سے لینڈون لینڈون پہنچ کر مہرولی کی سی "نیم آزادی" بھی سلب کرلی گئی اور ان کے قلم پر سنسر شپ قائم کردی گئی، پہلے اگر ہمدرد میں مضامین لکھ سکتے تو اب اس سے بھی محروم ہوگئے، ہمدرد بھلا اس نعمت عظمیٰ سے کیوں محروم رہتا، اسے بھی سنسر کے فیض گراں مایہ سے مفتخر ہونے کا موقعہ عطا فرمایا گیا۔

اس سلسلہ میں چڑیا چڑونٹے کی کہانی کے حالات ہمدرد کے سلسلہ میں بیان ہوچکے ہیں لینڈون پہنچ کر محمد علی نے اپنے پرانے دوست اور جدید دشمن سر جیمس مسٹن گورنر صوبہ متحدہ سے اپنی نظر بندی کے اسباب دریافت کئے، مگر یہاں سے بھی وہی جواب ملا کہ گورنر صاحب (شاید اپنی کثیر مصروفیتوں کے سبب) اپنے احکام پر مزید گفت و شنید نہیں کرسکتے۔

جرم کیا تھا؟ علی برادران کی نظر بندی کے بعد ایک نہایت اہم سوال پیدا ہوا کہ آخر ان لوگوں کا جرم کیا ہے جس کی بنا پر قید بے میعاد بھگتنے پر انہیں مجبور کیا جارہا تھا۔

عجیب سوء اتفاق کہ یہ سوال ہمیشہ ایسے وقت گورنمنٹ سے کیا گیا، جب وہ بالکل خالی الذہن ہوتی تھی، اور جواب دینے پر اپنے تئیں کسی طرح آمادہ نہیں پاتی تھی، اور اگر کونسل کے "آنریبل ممبر" اس پر بھی اپنے سوال کے جواب پر مصر ہوتے تھے تو کبھی کچھ کہہ کر ٹال دیا جاتا تھا اور کبھی کوئی دوسری بات بتائی جاتی تھی۔

آنریبل رضا علی کا سوال آنریبل رضا علی نے جب سوال کیا تو جواب یہ دیا گیا کہ نظر بندی کا حکم دفعہ ۳ قانون تحفظ ہند کے ماتحت دیا گیا ہے اور پھر ۱۹۱۶ء میں جب دہلی کی انتظامی رپورٹ شائع ہوئی تو علی برادران کے متعلق یہ لکھا گیا:

"اس ماہ میں محمد علی شوکت علی کو نظر بند کرنا ضروری معلوم ہوا اس لئے کہ گورنمنٹ کے خلاف ان کی سخت و تلخ کارروائیاں مسلمانوں کی ایک جماعت پر بُرا اثر ڈال رہی تھیں۔"

مسٹر مظہر الحق اور مسٹر جناح کے سوالات پھر امپیریل کونسل میں جب مسٹر مظہر الحق اور مسٹر جناح نے ضمناً علی برادران کے متعلق سوال کیا تو بتلایا گیا کہ چونکہ کھلم کھلا انھوں نے گورنمنٹ کے خلاف حصہ لیا اس لئے وہ نظر بند کر دیے گئے اور اگر وہ آئندہ محتاط رہنے کا وعدہ کریں تو گورنمنٹ ان کی رہائی کے مسئلہ پر غور کر سکتی ہے اور بعد کو جب ۱۹۱۷ء کے ایجی ٹیشن میں مسز بسنٹ وغیرہ رہا کی گئیں تو پھر علی برادران کی رہائی کا مسئلہ پیدا ہوا، مگر اب ان کے جرم کی نوعیت بدل چکی تھی، خیر اس کا ذکر آگے آئے گا۔

لینڈون سے چھندواڑہ ان حضرات کو جب مہرولی سے لینڈون بھیجا گیا تھا تو خیال تھا کہ اب یہاں کچھ روز نظر بندی ہی کی حالت میں سہی مگر انھیں موقع ملے گا کہ نسبتہً آرام و سکون کی زندگی بسر کر سکیں گے، مگر گورنمنٹ تو ان سے کھیل کر رہی تھی، یہ زندگی بھی اسے نہیں پسند آئی اور اس نے انھیں چھندواڑہ جیسے دور دراز مقام پر منتقل کر دیا، چھندواڑہ پہنچنے کے حالات ہم محمد علی

مکتوب بنام عبدالغفار کے اس مکتوب سے لیتے ہیں جو انھوں نے اپنے اسسٹنٹ قاضی عبدالغفار صاحب کو لکھا تھا۔

"راستے کی مختصر سی سرگزشت سناتا ہوں شرائط یہاں بھی بجنسہٖ وہی ہیں جو لینڈون جاتے وقت موصول ہوئے تھے، راستے کی کیفیت سنو، پہلے اطلاع شروع نومبر میں ملی تھی کہ تیار رہو لیکن یکایک ۱۳ر نومبر کو اطلاع ملی کہ ۲۰ر نومبر کو چھندواڑہ جانا ہوگا، اس اطلاع کے ملنے پر ہم نے چند کارڈ دوستوں کو ڈال دئے کہ فلاں

راہ سے فلاں وقت گزریں گے، ہنسر نے بلا استثنا سب کو بھیجدیا، اس لئے کہ
اس میں بظاہر کوئی مضائقہ نہیں تھا، الہ آباد میں گاڑی سات گھنٹے بعد ملتی
تھی اس لئے بھائی ظہور احمد (مسٹر ظہور احمد بیرسٹر) کو لکھدیا کہ کھانا تمہارے ساتھ
کھائیں گے، والدہ، بیوی اور بچوں کے لئے ایک گاڑی کا انتظام کردینا کہ
الہ آباد دیکھ لیں، چنتامنی کو لکھدیا کہ تم سے، سپرو سے اور پنڈت (موتی لال)
جی سے بھی ملاقات ہوجائے گی، چلنے سے ایک دن پہلے اطلاع ملی کہ جو
سب انسپکٹر ہمراہ جائے گا اسے ہدایت ملی ہے کہ ہماری پارٹی کا کوئی متنفس
کسی اسٹیشن کے باہر نہ جائے گا، گو ہمارے نام جو حکم آیا تھا اس میں یہ شرط نہ تھی
ہم نے صاف کہدیا کہ گورنمنٹ نے ہم کو نظر بند کیا ہے مگر ہمارے متعلقین آزاد
ہیں، ہم نے ارادہ کرلیا کہ خود الہ آباد اسٹیشن پر رہیں گے، باہر نہ جائیں گے۔

ہم ۲۰ کو ۱۰ بجے صبح کو روانہ ہوکر سہ پہر کو کوٹ دوار پہنچے، ۹ بجے شام کو ریل
چلی، ۷ بجے نجیب آباد پہنچے، ۲ بجے صبح مراد آباد ۶ بجے روانہ ہوئے ۸ کے
قریب پہنچے، وہاں آنریبل سید رضا علی یعقوب (سر یعقوب)، مسعود، عبدالسلام
وغیرہ تمام احباب ملنے آئے، رامپور سے میری اہلیہ مع حمیدہ اور گلنار اور
زاہد کے آگئے تھے وہ شریک سفر ہوئے، ان کے علاوہ رامپور سے بہت

احباب سے ملاقات

عزیز اور دوست آگئے تھے، من وسلویٰ کوٹ دوار ہی
پر آنا شروع ہوگیا تھا، مراد آباد پر اور نازل ہوا بریلی پر علی گڑھ کے احباب سے
رخصت ہوئے، انصاری (ڈاکٹر انصاری) رامپور سے مراد آباد آگئے
تھے، ڈاکٹر عبدالرحمن دہلی، آگئے تھے، بریلی میں بھائی داؤد وغیرہ چائے

لکھنؤ لے کر آئے تھے، لکھنؤ پہنچے تو گاڑی خلاف معمول پل کے اس طرف پلیٹ فارم پر رکی، مگر اس کے رک جانے کے بعد بہت سے احباب مع تقدس مآب مولنا عبدالباری صاحب قبلہ و مولنا محمد ابراہیم صاحب، سیالکوٹی تشریف لائے قدم بوسی کا شرف حاصل ہوا، کانپور سے، علی گڑھ سے، بارہ بنکی سے احباب آئے تھے، راستے کے لئے کھانا، میوہ اور مٹھائیاں اس کثرت سے آئیں کہ دونوں درجے لبالب بھر گئے اور بیٹھنے کو جگہ نہ رہی بلا مبالغہ تین چار سو آدمیوں کے لئے کھانے کا سامان کافی تھا مولنا عبدالباری صاحب قبلہ مع متعدد احباب کے رائے بریلی تک تشریف لائے، ان بزرگوں کی تحسین ہر لحہ ہم کو شرمسار کرتی تھی ناظر (اب ناظر یار جنگ) وسیم (مسٹر وسیم بیرسٹر) ولایت (ولایت علی بمبوق) کو ہم الہ آباد تک لے گئے کہ، گھنٹے وہاں بھی خوب گزریں گے۔

سر سپرو سے ملاقات اتفاقاً راستہ میں ڈاکٹر سپرو سے ملاقات ہوگئی کیونکہ وہ ہم سفر تھے، اس طرح الہ آباد کی "قدم بندی" کا بھی صدمہ نہ ہوا، ظہور اور لکھنؤ کے سید ظہور احمد صاحب بھی ملے۔

الہ آباد کے اسٹیشن پر قدغن آگے چل کر معلوم ہوا کہ الہ آباد کے اسٹیشن پر جاتے ہوئے پرندوں کے پر جلتے ہیں، پلیٹ فارم ٹکٹ بند اور اسٹیشن خالی ہے اور غالباً ہم کو، گھنٹے قبل ہی وہاں سے کہیں اور لے جائیں، یہ بھی سنا کہ پولیس کے سو سوا سو آدمی پہرہ دے رہے ہیں، یہ بھی معلوم ہوا کہ الہ آباد کے لوگوں نے اسٹیشن پر ہمیں گارڈن پارٹی دینے کی اجازت چاہی تھی مگر اجازت نہ ملی مجبور ہو کر ظہور کچھ میوہ اور کھانا اسٹیشن ماسٹر اور پولیس کو دے آئے کہ اسے دیکھ بھال کر

اگر کوئی چیز خلاف قانون دستیاب نہ ہو تو ان نظر بندوں کو دے دینا، الہ آباد کے اسٹیشن کو سوائے پولیس کے خالی پایا، دو افسر طبقۂ یورپین سے موجود تھے، دونوں شوکت کے شناسائی اور ایک تو دوست نکلے۔

پولیس افسر کی ناروا حرکت | تھوڑی دیر کے بعد ایک ذات شریف نہایت کر و فر کے ساتھ تشریف لائے اور پہلے اسٹیشن ماسٹر سے کہا کہ ان لوگوں کو اسٹیشن سے نکال دو یہ لوگ ڈاکٹر ناظر الدین حسن، مسٹر محمد وسیم، مسٹر ظہور احمد بیرسٹران، و سید ظہور احمد صاحب بی اے وکیل تھے، میں ان کی سلامت روی اور متانت کی تعریف کروں گا کہ باوجود سخت غصے اور مایوسی کے وہ خاموشی کے ساتھ چلے گئے، چلنے سے پیشتر والدہ نے انھیں گلے لگایا اور کہا کہ بیٹا ان باتوں سے آزردہ خاطر نہ ہونا، اس کے بعد وہ ذات شریف ہماری طرف تشریف لائے اور کہا کہ آپ اپنی گاڑی میں بیٹھ جائیں شوکت نے کہا کہ اس کی آخر کوئی وجہ؟ کہا میں آپ سے کہتا ہوں کہ آپ ایسا ہی کریں، ہم نے جواب دیا کہ ہم وہیں تک پابند ہیں جہاں تک گورنمنٹ کے احکام موصول ہو چکے ہیں، ورنہ ہم بالکل آزاد ہیں، ہمیں یہاں سات گھنٹے قیام کرنا ہے، اس پر صاحب موصوف بولے کہ نہیں آپ کو ساڑھے پانچ بجے کی ایک گاڑی سے سٹنہ جانا پڑے گا اور وہاں چند گھنٹے تک شب کی گاڑی کا انتظار کرنا پڑے گا جو یہاں سے جبلپور تہر و جاتی ہے، ہم نے

کشمکش | کہا کہ ہمارے احکام میں یہ داخل نہیں ہے، ہمیں احکام ملے ہیں کہ تین بجے کی گاڑی میں الہ آباد پہنچیں اور شب کو دس کے تہر و میں جبلپور جائیں، اس پر وہ بولے کہ نہیں گورنمنٹ نے احکام بدل دئے ہیں آپ کو ابھی جانا ہوگا۔

ہم نے کہا کہ ہمارے پاس کوئی احکام اس قسم کے موصول نہیں ہوئے ہیں جو حکم ہم کو ملا ہے اگر ہم اس کی خلاف ورزی کریں گے تو ہم تین برس کی قید بامشقت اور ایک ایک ہزار روپیہ کے جرمانہ کے مرتکب ہوں گے، اس پر فرمایا کہ میں آپ سے کہتا ہوں کہ یہی احکام گورنمنٹ کے ہیں میں نے عرض کیا کہ حضور والا کی شناسائی کا بھی ہم کو شرف حاصل نہیں ہے، پھر ہم تحریری اور مہر حکومت سے مزین احکام کی عوض محض آنجناب کی زبانی ہدایت کو کیوں قبول کرلیں، فرمایا اس اسٹیشن کا چارج میرے پاس ہے میں نے جواب دیا کہ میں آپ سے مل کر محظوظ ہوا مگر اس شرف نیاز مندی کے حصول کے بعد بھی ہم سرکاری احکام پر آپ کے ارشادات کو ترجیح نہیں دے سکتے۔

جھڑپ | اس پر تیکھے پن سے فرمایا کہ کیوں بدمزگی پیدا کرتے ہو میں نے تم سے نہایت نرمی سے کہدیا کہ گاڑی میں بیٹھ جاؤ، میں نے جواب دیا کہ اس میں بدمزگی کا سوال کچھ بھی نہیں ہے اور میں نے اس قدر نرمی سے کہدیا کہ ہم گورنمنٹ کے احکام کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے، اس پر نہایت تند و ترش ہو کر فرمایا کہ کیوں اسی راگ کو الاپے جاتے ہو؟ اس پر شوکت نے آنکھیں دکھا کر کہدیا کہ بس اس لہجے میں گفتگو نہ کیجئے، اس پر ذرا ہوش میں آئے اور پھر کہا کہ بدمزگی کیوں پیدا کرتے ہو میں تو نہایت نرمی سے کہتا ہوں کہ گاڑی میں بیٹھ جاؤ، شوکت نے کہا کہ آپ کی درخواست معقول نہیں ہے میں بھی آپ سے نرمی سے کہتا ہوں کہ ہم سے تعرض نہ کیجئے اور یہاں سے چلے جائیے، اس پر حاکمانہ انداز سے فرمایا کہ تم مجھے مجبور کرتے ہو کہ میں اپنے احکام کی تعمیل بجبر کراؤں

شوکت نے کہا شوق سے آپ ضرور کوشش کریں مگر ساڑھے تین من کی لاش
اور سوا چھ فٹ کے قد اور ڈیڑھ گز کے سینہ والے سے جبریہ تعمیل احکام کرانا آسان
نہیں، بولے کہ میں سمجھتا تھا کہ آپ جنٹلمین ہیں، اس پر میں نے عرض کی کہ ہم سمجھتے
تھے کہ آپ بھی "جنٹلمین" ہیں مگر .. .. اس "مگر" کے اضافہ
نے ان بزرگوار کو چکرا دیا، پھر کہنے لگے کہ اب میں جبریہ تعمیل کراؤں گا، شوکت
نے کہا کہ ہم تو کہہ ہی رہے ہیں کہ شوق سے کوشش فرمائیے، اس قدر
گفتگو کے بعد دوسرا پولیس انسپکٹر آیا۔

دوسرے افسر پولیس کا دخل | اور اس نے کہا کہ اس مسئلہ کو آپ ہمیں پر چھوڑ دیجئے
اس موقع کو غنیمت سمجھ کر (وہ حضرت) جدھر سے تشریف لائے تھے واپس
تشریف لے گئے، ہم سے پولیس انسپکٹر نے کہا کہ کچھ مضائقہ ہے اگر آپ انھیں
کا کہا مانیں، یہ بھی شوکت کا شناسائی تھا، شوکت نے جو جواب پہلے دیا
تھا، وہی اس کو بھی دیا کہ یہ معاملہ نجی تعلقات کا نہیں، سرکاری احکام
کا ہے اس کے بعد ہم ویٹنگ روم گئے اور وضو کر کے ظہر اور بعد از اں
عصر پڑھی، نماز سے فارغ ہوئے تو اطلاع ملی کہ شوکت کے پرانے دوست
اور میرے بھی گہرے شناسا مسٹر فرینٹل کلکٹر الہ آباد ملنا چاہتے ہیں، ہم گئے
تو ہم سے کہا یہ کیا جھگڑا ہے، شوکت نے تمام کیفیت سنائی اس پر کہا کہ مجھے
دو تین دن سے معلوم تھا کہ تمھارے سفر کا پروگرام بدلا جائے گا میں چلتے
وقت برن، چیف سکرٹری سے پوچھ آیا ہوں وہ کہتے ہیں کہ آپ لوگوں
کو ساڑھے پانچ ہی بجے چلنا ہوگا، شوکت نے کہا قاعدہ کی رو سے چیف

سکرٹری کا حکم ملنا چاہئے لیکن چونکہ میں تم سے واقف ہوں تاہم اسے تحریر کر دو تاکہ "سند ہو اور وقت ضرورت کام آئے"، حکم پانے پر ہم نے والدہ اور بچوں کو اطلاع کرا دی کہ گاڑی ابھی جائے گی۔

روانگی | (روانہ ہو کر) رات کو بارہ بجے ہم سٹنہ پہنچے گاڑی وہیں تک جاتی تھی دس بجے والی گاڑی الہ آباد سے آئی تو ہم پھر روانہ ہوئے اور صبح کو جبلپور پہنچے اور شب کو یہاں (چھنڈواڑہ) پہنچے۔

باب ۱۱

چھندواڑہ کے ایام اسیری

چھندواڑہ کی نظربندی کے بعد علی برادران صبر و شکر کے ساتھ چھندواڑہ ہی میں رہتے تھے اور وہاں رہ کر ملک و قوم کی جو خدمت کر سکتے تھے، اس میں منہمک رہے۔

تعمیر مسجد اپنی اسیری ہی کے ایام میں علی برادران نے اپنا ایک اور کارنامہ ظاہر کیا، یعنی تعمیر مسجد وہاں اگرچہ مسلمانوں کی تعداد بھی خاصی تھی، لیکن مذہبی عبادتگاہوں کی طرف عام لوگوں کو زیادہ خیال نہیں تھا، ان بھائیوں نے ان میں مذہبی روح پیدا کی اور ایک مسجد کی بنا ڈلوائی کہ وہاں مسلمان سربسجود ہو کر آستانہ الٰہی پر اپنی عبودیت و فدا دگی کا اظہار کریں، اس زمانہ میں اس مسجد میں ایک خاصی چہل پہل تھی۔

رہائی کی کوششیں مسلمانان ہند اپنے ان محبوب رہنماؤں کی اسیری پر حد درجہ مضطرب تھے اور جو امکانی کوششیں وہ کر سکتے تھے انھوں نے کیں مسٹر مظہر الحق اور مسٹر جناح نے امپیریل کونسل میں جو سوالات کئے اور ان کے جو جوابات دئے گئے وہ آپ کی نظر سے گزر چکے ہیں۔

مہاراجہ محمود آباد کی کوششیں اس سلسلہ میں راجہ (پھر مہاراجہ) صاحب محمود آباد کی کوششیں بھی فراموش نہیں کیجا سکتیں انھوں نے اپنے رسوخ و اثر سے فائدہ اٹھا کر ان مجاہدین راہ حق کی رہائی کی بہت کوششیں کیں، وہ بنفس نفیس چھندواڑہ گئے اور ان مسائل کا حل کرنا چاہا، مگر بعد کو معلوم ہوا کہ خلاف توقع ان کی کوششیں بھی بے سود ہیں۔

مسلم لیگ کی صدارت ستمبر ۱۹۱۸ء میں (نظربندی کے تقریباً ڈھائی سال کے بعد) محمد علی

کو مسلمانانِ ہند نے اپنی غیر معمولی محبت اور قدر دانی کے ثبوت میں آل انڈیا مسلم لیگ کی صدارت کا اعزاز بخشا تھا جو اس زمانہ میں مسلمانوں کی واحد سیاسی انجمن تھی لیکن نہ آپ کو شریک جلسہ ہونے کی اجازت ملی، اور نہ اس کی کارروائی میں اشارۃً و کنایۃً کسی طرح حصہ لینے کی، اسی مسلم لیگ کی صدارت کے متعلق فرمایا تھا۔

یہ صدر نشینی ہو مبارک تمہیں جو ہر   لیکن صلۂ روزِ جزا اور ہی کچھ ہے

جب گورنمنٹ کے استبداد نے آپ کو اس کا موقعہ نہیں دیا کہ آپ اس میں شریک ہو سکیں تو آپ کے بجائے بی اماں مرحومہ اجلاس میں شریک ہوئیں اور کرسی صدارت پر محمد علی کی تصویر آویزاں کردی گئی، کیا روح پرور منظر ہو گا!

بی اماں نے لیگ کے اجلاس میں اپنا "پیغام عمل" پڑھا، دہلی کے ایک صاحب کے بیان کے مطابق:

"جس کا ایک ایک لفظ تیر و نشتر کا کام دے رہا تھا اور جس نے اجلاس لیگ کو مجلس ماتم بنا دیا"

مسٹر تلک کا رزولیوشن اس سال کانگرس کے سالانہ اجلاس میں ہندوستان کے مشہور قائد سیاسی مسٹر تلک نے ایک رزولیوشن کانگرس میں پیش کیا جس میں علی برادران کی فوری رہائی پر گورنمنٹ ہند کی عنان توجہ مبذول کرانے کی سعی ناکام کی گئی اور بے اثر رہی۔

مسٹر مانٹیگو ہندوستان میں اسی زمانہ میں وزیر ہند مسٹر مانٹیگو تشریف لائے، ملک کی تمام سیاسی جماعتوں کے نمائندوں نے ان سے ملاقاتیں کیں، گاندھی جی، مسز بسنٹ، مسٹر جناح، پنڈت مالویہ مسٹر چنتامنی، امام صاحب جامع مسجد، بیگم صاحبہ بھوپال، راجہ صاحب محمود آباد، سبھی ان سے ملے، اصلاحات ہند پر مسٹر مانٹیگو نے سب سے نہایت تفصیل سے تبادلہ خیالات کیا، ہر شخص کے خیالات

معلوم کئے اور ہر شخص کو اپنا نقطۂ نظر سمجھایا۔

حقیقت یہ ہے کہ مسٹر مانٹیگو فطرۃً معقول آدمی تھے، وہ ہر شخص کا دکھ درد سننا چاہتے تھے آزاد خیال اتنے تھے کہ اگر ان کا بس چلتا تو وہ کانگرس کے اجلاس میں بھی شریک ہوتے، مگر حکومت ہند کی مصلحت پروریوں نے اس کی "اجازت" نہ دی۔

محمد علی نے بھی خواہش کی کہ وہ مسٹر مانٹیگو سے ملنا چاہتے ہیں اور ہندوستان و مسلمانان ہند کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کرنا چاہتے ہیں، حکومت ہند نے اس درخواست کا کوئی معقول جواب نہیں دیا اور ملاقات کی اجازت بھی نہیں دی۔

مسلمانوں کا وفد ہندوستان میں یہ کچھ رسم سی پڑ گئی ہے کہ حکومت کا جب کوئی ذمہ دار افسر آتا ہے تو اسے ایک پارٹی ضرور دی جاتی ہے، اس کی خدمت میں ایک سپاس نامہ ضرور پیش کیا جاتا ہے اور ایک وفد بھی کسی نہ کسی طرح حاضر بارگاہ ہمایونی ہونے کا شرف ضرور حاصل کرتا ہے۔

چنانچہ مسلمانوں کا ایک متفقہ وفد قرار پایا کہ نواب محمد اسحاق خاں کی سرکردگی میں مسٹر مانٹیگو سے ملاقات کرے۔

وفد نے اپنے ایڈریس میں مسلمانوں کے جذبات کی صحیح ترجمانی کرتے ہوئے علی برادران کی رہائی کا مسئلہ بھی پیش کیا، وفد جب مسٹر مانٹیگو سے ملنے دہلی آیا تو اسے اطلاع دی گئی کہ ملنا صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ علی برادران کا ذکر وفد کے ایڈریس سے خارج کر دیا جائے۔

وفد کی طرف سے جواب دیا گیا کہ چونکہ یہ وفد ذاتی طور پر شرف باریابی نہیں حاصل کر رہا ہے بلکہ مسلمانوں کے نمائندہ کی حیثیت سے اس اعزاز کے حاصل کرنے کا متمنی ہے، اس

لئے اپنی طرف سے نہ وہ کچھ اضافہ کر سکتا ہے، اور نہ کچھ کم کر سکتا ہے۔

یہ جواب حکومت کے لئے تشفی بخش نہیں ثابت ہوا اس لئے وفد کو "بیش گاہ معلی" میں شرف حاضری سے محروم رکھا گیا۔

عہدنامہ کی کوشش | ۲ ستمبر ۱۹۱۶ء کو مسٹر عبدالمجید مشہور خفیہ کے سپرنٹنڈنٹ کو ملک کے ایجی ٹیشن سے متاثر ہو کر چھندواڑہ بھیجا گیا اور وہ سر چارلس کلولینڈ کی طرف سے ایک عہدنامہ لائے کہ جس پر دستخط کرنے سے ان زندانیوں کو رہائی مل سکتی تھی۔

عہدنامہ کا مفاد یہ تھا کہ دوران جنگ میں علی برادران کوئی ایسی حرکت نہیں کریں گے جس سے بالواسطہ یا بلاواسطہ گورنمنٹ کے دشمنوں کو کسی قسم کی اخلاقی یا علمی مدد پہنچ سکے، اور ہر طرح پر امن رہیں گے، نہ کوئی ایسی بات کریں گے جس سے ملک معظم کے دشمنوں کی حوصلہ افزائی ہو، ان کی طرف سے جواب دیا گیا کہ ہم یہ سب کچھ اس وقت کرنے کے لئے تیار ہیں جب کہ ہمارے مذہبی مفاد سے آپ کا مفاد متصادم نہ ہو رہا ہو، اور اگر ایسی صورت ہوئی تو پھر ہم نہ کوئی وعدہ کر سکتے ہیں اور نہ کسی قسم کی پابندی قبول کر سکتے ہیں۔

سر چارلس سے محمد علی کے تعلقات | اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رہائی کا مسئلہ پھر تعویق میں آگیا اور ملک میں جو ایک خوشی کی لہر دوڑ رہی تھی وہ پھر افسردگی میں تبدیل ہو گئی۔

اس تعویق کی سب سے بڑی وجہ سر چارلس کا وجود باجود تھا، سر چارلس محمد علی سے کیوں خار کھائے بیٹھے تھے، اس پر مسٹر گھاٹے (علی برادران کے مشیر قانونی) کے اس خط کے اس جملہ سے روشنی پڑتی ہے جو انھوں نے مسز بسنٹ کو لکھا تھا۔

مسٹر گھاٹے کا خط مسز بسنٹ کے نام | "مجھے معلوم ہوا ہے کہ جب مسٹر محمد علی مع سید وزیر حسن کے انگلستان میں تھے تو وہاں ان سے کہا گیا تھا کہ وہ اس جماعت میں شریک ہوں

جس کا نام اب "انڈو برٹش ایسوسی ایشن" ہے اور حکومت ہند کے اینگلو انڈین عمال کے ساتھ لارڈ ہارڈنگ اور سر علی امام کے مقابلہ میں کارروائی کریں تاکہ ۱۹۱۱ء کے دربار میں جو انتظامی تبدیلیاں کی گئی تھیں وہ پھر لوٹ دی جائیں، یہ افسر اعلیٰ سر چارلس کلولینڈ ڈائرکٹر جنرل سی آئی ڈی تھے اور یہ واقعہ قابل غور ہے کہ اس سازش میں شریک ہونے سے انکار کر دینے کے بعد مسٹر محمد علی نے محسوس کیا کہ ان کے ساتھ سر چارلس کا طرز عمل بالکل بدل گیا۔"

سرکاری کمیشن | پھر ستمبر ۱۹۱۸ء میں ایک سرکاری ٹریبونل مقرر کیا گیا جس کے حلقۂ تحقیقات میں یہ بات داخل تھی کہ وہ علی برادران کی نظربندی کے صواب و عدم صواب پر غور کر کے ایک رپورٹ پیش کرے۔

کمیشن کے ایک رکن سر عبد الرؤف پنجاب ہائی کورٹ کے جج بھی تھے، ان بزرگ سے علی گڑھ کے سلسلہ میں ایک مدت سے چشمک چلی آرہی تھی، ۱۵ ردسمبر کو یہ تحقیقاتی کمیٹی چھنڈوارہ پہنچی اور اس نے علی برادران کی فرداً فرداً شہادت لی۔

علی برادران کے بیانات | علی برادران نے اپنے بیانات میں گورنمنٹ کے ظلم و جبر کو دلائل و براہین کے ساتھ ثابت کیا، اپنے مذہبی فرائض بتائے اور کمیشن کو یہ بات سمجھانے کی کوشش کی کہ مذہبی معاملات میں گورنمنٹ سے ان کی وفاداری بالکل مشروط ہے اگر اس نے مذہبی معاملات و مقامات پر دست اندازی کی پالیسی ترک کر دی تو ہم اس کے وفادار ہیں اور اگر وہ اپنی روش پر ثابت قدم رہی تو ہم سے بڑھ کر اس کا دشمن کوئی نہیں اور اپنی اس مشروط وفاداری کو ملکۂ وکٹوریہ کے تاریخی اعلان سے مدلل کیا اور اپنے

تنیں پورے طور سے حق بجانب ثابت کیا اور گورنمنٹ کے ناروا فعل پر دلائل کی روشنی میں اظہار تعجب کیا۔

اور چونکہ اپنے نقطہ نظر سے وہ اپنی بے گناہی اور گورنمنٹ کی درازدستی کو ثابت کر چکے تھے اس لئے انھوں نے گورنمنٹ سے اپنے اس نقصان کی تلافی بھی طلب کی جو اس ناواجب اور ناجائز نظربندی کے سلسلہ میں ان کی تجارت اور ان کے اخبار پر پڑا تھا

کمیشن کی سفارشات | کمیشن نے اپنی "تحقیق انیق" کی بنا پر نظربندی تو بالکل جائز ٹھہرائی اور نقصانات کا جو معاوضہ طلب کیا گیا تھا اسے بھی باطل ٹھہرایا لیکن ازراہ معدلت گستری و مراحم خسروانہ ان بلبلان اسیر کی رہائی کی بہ یک جنبش قلم "سفارش" کر دی۔

گورنمنٹ بھلا اتنی "مدلل سفارش" کو کیونکر منظور کر سکتی تھی، کہ اس کا فعل حق بجانب قرار دیا گیا ہو، ملزمین مجرمین کی صورت میں تسلیم کر لئے گئے ہوں اور ان کا مطالبہ و تاوان باطل ٹھہرایا گیا ہو پھر اسے کیا پڑی تھی کہ اس سفارش کو وہ قبول کرتی۔ چنانچہ یہ سفارشیں شرف قبولیت نہ حاصل کر سکیں اور علی برادران بدستور چھندواڑہ میں نظربند و قدم بند رہے۔

مسز بسنٹ کی رہائی | نومبر ۱۹۱۷ء میں مسز اینی بسنٹ ہندوستان کے سخت احتجاج کے بعد رہا کی گئیں، ان کی رہائی سے امید بندھی تھی کہ شاید علی برادران بھی رہا کر دیئے جائیں، مگر یہ امید غلط ثابت ہوئی اور علی برادران رہا نہیں کئے گئے۔

مسز بسنٹ کی کوششیں | مسز بسنٹ کی کوششوں کی داد نہ دینا سخت بے انصافی ہو گی، انھوں نے رہا ہوتے ہی علی برادران کی رہائی کی سخت کوششیں کیں اور ہر طریقہ سے گورنمنٹ کو متاثر کرنا چاہا اور اسے سمجھانا چاہا کہ علی برادران کی نظربندی نہیں بلکہ رہائی عین مصلحت ہے مگر گورنمنٹ کے کان پر جوں بھی نہیں رینگی۔

مسز بسنٹ کی وائسرائے سے ملاقات | چنانچہ اپنی کوششوں کو اتمام تک پہنچانے کیلئے مسز بسنٹ نے وائسرائے کا دروازہ کھٹکھٹایا اور وائسرائے سے مل کر اس مسئلہ پر مفصل تبادلۂ خیالات کیا اور علی برادران کی نظربندی کے مقاصد اور رہائی کے سیاسی فوائد گورنمنٹ کے گوش گزار کرا دیے مگر نتیجہ اس کا بھی ناکامی تھا، چنانچہ وائسرائے ہاؤس سے واپس آکر انھوں نے جو بیان دیا اس کا ایک حصہ یہ ہے:

مسز بسنٹ کا بیان | ”میں دہلی میں ہز ایکسلنسی وائسرائے سے ملاقات کرکے ابھی آئی ہوں، ہز ایکسلنسی وائسرائے نے میرے تمام پیش کردہ دلائل کو بغور سنا اور بہت صاف باتیں کرتے رہے، وائسرائے اور ان کی کونسل شوکت علی محمد علی صاحبان کی نظربندی کے معاملہ پر غور اور مزید غور کر چکے ہیں اور مجھے ایک ایسے شخص نے جو گورنمنٹ کا معتمد علیہ ہے یہ اطلاع دی ہے کہ گورنمنٹ نے بالاتفاق یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ مذکورہ بالا نظربندوں کو رہا نہ کیا جائے۔“

اسباب | لیکن وہ کون اسباب تھے کہ مسز بسنٹ تو صرف تین مہینہ کی دلچسپ نظربندی کے بعد رہا ہو گئیں، اور علی برادران تین ساڑھے تین سال کی نظربندی کے بعد بھی رہا نہ کئے گئے، آخر اس کے اسباب کیا ہیں، یہ سوال جتنا دلچسپ ہے اس کا جواب اس سے کہیں زیادہ عجیب و غریب ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ گورنمنٹ علی برادران سے خائف تھی اس لئے انھیں نظربند کرنا تو عین مقتضائے وقت و مصلحت سمجھا گیا، لیکن اسباب نظربندی خود اس کے ذہن میں بھی پوری طور سے نہیں تھے اس لئے جب کبھی بھی اس سے ان کی نظربندی کے متعلق استفسار کیا گیا تو وہ ہمیشہ بے سروپا جوابات دیتی رہی، کبھی انھیں ایک سازش کا مجرم سمجھا گیا جس میں امیر افغانستان

کو حملہ کی دعوت دی گئی تھی۔

اور کبھی یہ کہا گیا کہ ایک فوجی افسر کو باغیانہ خط لکھا تھا اس لئے معتوب سرکار ہیں اور کبھی یہ الزام تراشا گیا کہ وہ ملک معظم کے دشمنوں کی حوصلہ افزائی کر رہے ہیں اس لئے ان کی نظربندی مصلحت وقت ہی، اور کبھی گھبرا کے یہ کہدیا کہ انھوں نے پیش کردہ عہدنامہ پر دستخط کیوں نہیں کئے غرض جس وقت جو بات زبان پر آگئی وہ کہدی گئی کسی غور و فکر کی نہ ضرورت تھی نہ پرواہ۔

پروفیسر الیاس برنی کا خط | ایام نظربندی میں محمد علی کے احباب پہ کیا گزرتی تھی، اس کا اندازہ ذیل کے دو خطوں سے ہوگا، پروفیسر الیاس برنی اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"پیارے بھائی۔

اس وقت صبح کے چار بجے ہیں کہ بیتابی کے عالم میں یہ خط لکھ رہا ہوں، کل حیات سے آپ کی تازہ ترین غزل ملی اور نہیں کہہ سکتا کہ اس کو پڑھ کر دل کی کیا حالت ہوئی جاتی ہے، رات اسی کو گنگناتے گنگناتے سویا اور ترکے سویرے جو آنکھ کھلی تو دل نے پھر وہی رنگ جمایا، جوں جوں پڑھتا ہوں، خوشی سے، یا رنج سے، نہ معلوم کیا کہوں گرم گرم آنسو ٹپکنے لگتے ہیں۔

تم سے بعید تھا کہ بھلا دو اگرچہ ہم ‏ ‏ ‏ اک عمر ہو گئی کہ ہوئے انجمن سے دور

یہ شعر دل پر نشتر کا کام کر گئی (؟) اور بیتاب ہو کر یہ خط لکھنا شروع کیا یہ کیسے ممکن (جوہر) ہے کہ قوم تم دونوں بھائیوں کو بھلا دے، دل دل میں تمھاری یاد ہے لب لب پر تمھارے واسطے دعا ہی، گھر گھر تمھارا چرچا ہے جس نے تمھارا نام بھی سنا ہے تم پر فریفتہ ہے، خاموشی ہے تو اس کے اسباب کچھ اور ہیں، فراموشی نہیں۔

نغمے بیتاب ہیں تاروں سے نکلنے کیلئے ‏ ‏ ‏ تو ذرا چھیڑ تو دے تشنۂ مضراب ہے ساز

خدا تم دونوں فدائیان ملت اور شیران وطن کو اپنی حفظ و امان میں رکھے ۔"

مکتوب عبدالحق | دوسرا خط مولوی عبدالحق صاحب پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی و سکرٹری انجمن ترقی اردو کا ہے، وہ تحریر فرماتے ہیں ۔

"میں تمھیں مبارکباد دیتا ہوں اور خدا کا شکر کرتا ہوں کہ تم اپنی بات اور روش پر ثابت قدم رہے، تم بلا شبہ اس مدرسۂ ہند میں بہت ہونہار طالب علم ہو ۔

اہل بینش کو ہے طوفان حوادث مکتب ‏ ‏ ‏ ‏ لطمۂ موج کم از سیلی استاد نہیں

ان خطوط سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ اس وقت مسلمانوں کی اور علی برادران کے تنا ساؤں کی کیا حالت ہورہی تھی مگر یہ دونوں کوہ وقار داعیان حریت و آزادی بدستور، اسی متانت، اسی استقامت اور اسی قابل رشک صبر و سکون کے ساتھ جو انھیں کا حصہ تھی ان تمام مصائب کو ہنسی خوشی، بے چہرہ پر شکن لائے بغیر برداشت کرتے رہے ۔

نہ ستم کا کبھی شکوہ نہ کرم کی خواہش ‏ ‏ ‏ ‏ دیکھ تو ہم بھی ہیں کیا صبر و قناعت والے

(ذوق)

چھندواڑہ سے "رہائی" | کئی سال تک چھندواڑہ کی آب و ہوا میں زندگی بسر کرنے کے بعد چھندواڑہ بھی چھٹا اور ایک دوسرا قفس ان کے لئے تیار کیا گیا ۔

واقعہ یوں ہے کہ چھندواڑہ کی مسجد انھیں دونوں بھائیوں کی کوششوں کا نتیجہ تھی وہاں تراویح اور نماز یہ لوگ پڑھا کرتے تھے ۔

تقریر | ایک روز جمعہ کو جمعہ کی نماز کے بعد محمد علی نے ایک نہایت زبردست تقریر کی اور مسلمانوں کو ان کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا، تقریر حسب معمول درد و اثر اور روح مذہب سے بھری تھی، حاضرین پر اس کا خاصہ اثر ہوا ۔ گورنمنٹ بھلا اس قسم کی جرأت کی ہمت افزائی کیسے

کرسکتی تھی، لہٰذا اس نے چھند واڑہ سے منتقل کر کے انہیں بیتول جیل پہنچا دیا، یہاں سے نظربندی کے بجائے جیل کی زندگی شروع ہوتی ہے اور جو تھوڑی بہت آزادی برائے نام باقی تھی وہ بھی "نذرِ خاطرِ صیاد" ہو گئی۔

باب ۱۲

چھندواڑہ سے بیتول

تقریر کے بعد علی برادران کی نظر بندی بھی خطرناک سمجھی گئی اور مناسب یہ سمجھا گیا کہ ان دونوں کو اب جیل خانہ بھیج دیا جائے، چنانچہ گرفتاری عمل میں آئی اور قوم و ملت کے یہ دونوں سردار اسیر زندان کردیے گئے۔

شوکت کی ڈائری بدقسمتی سے ہمیں بیتول جیل کی زندگی اور چھندواڑہ سے روانگی کے متعلق کچھ بھی معلومات حاصل نہیں ہیں، اس وقت تک علی برادران پر جو کچھ تحریری مواد موجود ہے اس میں بھی کچھ نہیں ملتا، صرف اتنا ملتا ہے کہ وہ چھندواڑہ سے بیتول میں قید کردیے گئے! لیکن یہ کارروائی کیونکر وقوع پذیر ہوئی، اس کے متعلق سب خاموش ہیں، اتفاقاً محمد علی کے کاغذات کے انبار میں ہمیں مولانا شوکت علی کی ڈائری مل گئی جس سے یہ مسئلہ بہت خوش اسلوبی کے ساتھ حل ہوگیا۔

شوکت صاحب کی یہ ڈائری بہت نامکمل ہے یعنی صرف چند ہی روز انھوں نے ڈائری لکھی اور اس کے بعد یہ مفید کارآمد اور آئندہ نسلوں کا سامان اشتیاق انھوں نے خود بند کردیا۔

لیکن بہرحال ہمیں اپنے عنوان کے متعلق اس سے بہت کافی معلومات حاصل ہوئیں اب ہم اس کے ضروری اقتباسات پیش کرتے ہیں جن کا نفس عنوان سے تعلق ہے۔

مولانا فرماتے ہیں:

گرفتاری (چھندواڑہ میں) حسب معمول ہم قریب گیارہ بجے سو گئے تھے اور

۲ یا ۲½ بجے سحری کو اٹھے اس دن اتفاق سے اندر والدہ اور محمد علی کے بچوں کے ساتھ سحری کھانے بھی نہیں گیا بلکہ پلنگ پر بیٹھ کر ایک دو منٹ میں دودھ کو ختم کر کے سو گیا، تقریباً ۴ بجے اپنے بنگلہ کے احاطہ کے چھوٹے دروازہ کی طرف سے بہت سے پانوؤں کی آہٹ سنی، چونکہ میں بہت چونکنا سونے والا ہوں، فوراً آنکھ کھل گئی اور میں نے بہت سے آدمیوں کو آتے ہوئے دیکھ کر انگریزی میں دریافت کیا کون ہیں؟ اس پر انگریز نے جو ڈپٹی کمشنر ہلو ڈون تھا جواب دیا "کیا آپ ہیں مسٹر شوکت علی؟" میں نے فوراً جواب دیا کیونکہ میں اول ہی جان گیا تھا کہ یہ جم غفیر ہماری عزت افزائی کے لئے آیا ہے "جی ہاں! آئیے!" اس پر ایک دوسرے انگریز نے جو مسٹر رائٹ ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس تھا کہا کہ "ہم آپ کو لینے آئے ہیں" میں نے جواب دیا آئیے میں چلنے کو تیار ہوں، اس عرصہ میں پانچ یا چھ انگریزوں نے اور بہت سے سپاہیوں نے میرے پلنگ کو گھیر لیا، میں صرف بنیان اور پاجامہ پہنے تھا، رائٹ میرے قریب آیا اور مجھ سے کہا کہ ہم آپ کے ساتھ بہت اخلاق سے پیش آئیں گے اگر آپ ہمیں کسی قسم کی تکلیف نہ دیجئے گا، میں نے کہا تکلیف دہی کیسی، چلئے، میں تیار ہوں، میں اس وقت پلنگ کے پاس کھڑا ہو گیا تھا چاروں طرف آدمی! اس قدر اہتمام مذاق انگیز تھا۔

تلاشی رائٹ نے ذرا لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے میرے جسم پر ہاتھ پھیرا کہ کوئی توپ یا مشین گن بنیان میں نہ ہو، اس کے بعد ہوڈن نے دریافت کیا مسٹر محمد علی کہاں ہیں، میں نے کہا اندر سوتے ہیں میں بلاتا ہوں، میں نے

زاہد کو آواز دی، جس پر وہ اور بندن خاں اور اختر علی آگئے، زاہد نے محمد علی کو
باہر سے آواز دی، کئی آوازوں کے بعد وہ نکلے تو ویسے ہی بنیان اور پاجامہ
پہنے کمرہ کا دروازہ کھول کر باہر آنے لگے تو ان کے ہاتھ میں کسی انگریز نے ہاتھ ڈال
دیا، ان کو یہ اطلاع نہ تھی کہ باہر یہ حضرات ہم کو لینے آئے ہیں غالباً وہ شخص چھندواڑہ
کا اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس بیک تھا محمد علی کو یہ حرکت بری معلوم ہوئی اور
انھوں نے چاہا کہ اندر جاکر کرتہ پہن آئیں مگر اس کی اجازت نہ ملی، غالباً یہ خطرہ تھا
کہ محمد علی کوئی نو ایجاد کردہ آلہ نہ لے آئیں ان سے پلوڈن نے کہا کہ ہم آپ کو
لینے آئے ہیں انھوں نے کہا کہ میں تیار ہوں، مگر میں غسل کرنا چاہتا ہوں
جس کی اجازت نہ ملی، اس عرصہ میں ہمارے نوکر وغیرہ بھی آگئے، مسٹر رائٹ
نے جو اس حملہ کرنے والی فوج کے کمانیر تھے اور بہت غرفش کر رہے تھے کہنے
لگے کہ ہم آپ کو پانچ منٹ دیتے ہیں کہ آپ تیار ہوجائیں میں نے سوٹ اور
قمیص منگواکر پہنا، میرے کپڑوں کو بھی میاں رائٹ نے ٹٹولا مگر ذرا شرماتے ہوئے
محمد کوٹ بھی نہ پہننے پائے تھے کہ ان کے ہاتھ میں ہاتھ مڑے کرے چلے۔

بہادری اس عرصہ میں برقع پہنکر والدہ صاحبہ تشریف لائیں، انھوں نے فرمایا
میں بھی ضرور چلوں گی، اس پر پلوڈن نے جواب دیا ہم کو فقط ان دو صاحبوں
کے لیجانے کا حکم ہے۔ محمد علی نے وارنٹ دیکھنے کی درخواست کی، اس عرصہ
میں چار پانچ موٹریں ہمارے بنگلہ کے سامنے آئیں ہم لوگ ان کی طرف چلے
والدہ صاحبہ ہمراہ تھیں اور چلنے پر مصر۔

پولیس افسر کی گستاخی رائٹ نے کسی سے کہا " ذرا ان بڑی بی کو کوئی روکے " ہم نے

پسند نہیں کیا کہ ان کے ساتھ کسی قسم کی گستاخی یا بدتمیزی کی جائے، وہ برابر ہمراہ چلنے پر اڑی ہوئی تھیں اور باوجود اندھیرے اور کبرسنی کے تیز تیز قدم رکھ کر سب کے ساتھ موٹر تک آئیں مگر ہم نے ان کو خدا اور رسول کا واسطہ دیا کہ آپ نہ آئیں بعد مشکل تمام وہ خاموش ہوئیں۔

استقامت کا ثبوت محمد حسین غریب مجھ سے گلے ملتے وقت رونے لگا، اس غریب کے رونے کو دیکھ کر مجھ سے ضبط نہیں ہوا، میں نے ایک زور کا چانٹا رسید کیا، اور چلا کر کہا، خبردار! کافر کے سامنے ایک آنسو نہ نکلے وہ بڑا بہادر اور وفادار ملازم ہے، فوراً سنبھل گیا، اقبال ہمارے ہی لے حکم دے چکا ہے۔

یہ رسم بزم فنا ہے اے دل گناہ ہے جنبش نظر بھی رہے گی کیا آبرو ہماری جو تو یہاں بے قرار ہوگا

روانگی کے وقت تاثرات خدا کا شکر ہے ہمارے اعزہ اور متعلقین میں سے کسی نے کمزوری کا اظہار نہیں کیا، سب کے چہروں پر غصہ اور حقارت کے آثار تھے ہم کو خوشی ہے اور فخر ہے کہ ہم نے نہ تو والدہ صاحبہ اور نہ زاہد اور صادق یا کسی اور عزیز سے اس وقت اظہار محبت کیا۔

روانگی ہم سب روانہ ہوئے، اس وقت کا سرور اور لطف یا تو خدا جانتا ہے یا ہمارا دل، ہم نے اپنی زندگی میں بہت کچھ دنیوی لطف اٹھائے، مگر خدا جانتا ہے اس "روحانی عیاشی" میں جو لطف ملا، اس کا عشر عشیر بھی پہلے نصیب نہ ہوا تھا"

اس ہنگامہ کے بعد یہ دونوں بہتول جیل میں نظر بند نہیں بلکہ بند کر دیے گئے۔

باب ۱۳

بیتول سے امرتسر

رہائی | بالآخر ۳۰ر مئی ۱۹۱۵ء کی گرفتاری اور نظربندی کے بعد دسمبر ۱۹۱۹ء میں کم وبیش پانچ سال کے بعد دفعتاً حیرت انگیز طریقہ پر ان بلبلان اسیر کو قید قفس سے آزاد کیا گیا اور پانچ سال کے طویل اور صبر آزما عہد نامسعود کے بعد پھر وہ مبارک زمانہ آیا کہ عندلیب خوش لحن پھر شاخ چمن پر زمزمہ آرا ہو۔

حوریاں رقص کناں ساغر مستانہ زدند

رہائی کیوں ہوئی؟ | اپریل ۱۹۱۹ء میں جب گاندھی جی نے رولٹ ایکٹ کے خلاف اپنی ستیہ گرہ کا آغاز کیا ہے تو تمام ملک برطانیہ کے دست تطاول کا شکار ہوا کوئی بڑا شہر ایسا شاید ہی ہو جس میں گولیاں نہ چلی ہوں، اور نہایت بے دردی کے ساتھ غریب ہندوستانیوں کو ظلم وجور کا تختۂ مشق نہ بنایا گیا ہو۔

حادثہ جلیان والہ باغ | اسی زمانہ میں جلیان والہ باغ کا افسوسناک اور ناقابل فراموش واقعۂ فاجعہ پیش آیا تھا جس نے سارے ہندوستان میں برطانیہ کے خلاف غم وغصہ کے جذبات برانگیختہ کردئے تھے، ہندوستان میں یہ کیفیت بڑھ رہی تھی کہ گورنمنٹ نے غالباً اس صورت حال کا

عفو عمومی | مقابلہ مناسب نہ سمجھ کر دسمبر ۱۹۱۹ء میں ایک مدبرانہ اعلان کیا اور تقریباً تمام سیاسی قیدیوں کو غیر مشروط طور پر رہا کر دیا گیا۔ ان رہائی یافتگان میں ہندوستان کے محبوب اور قابل افتخار رہنما علی برادران بھی تھے جن کا وطن ثانی جیل خانہ ہو چکا تھا۔

امرتسر | امرتسر میں جہاں جلیان والہ باغ کا حادثہ پیش آیا تھا، کانگرس کا سالانہ جلسہ اسی زمانہ میں ہو رہا تھا مسلم لیگ اور خلافت کانفرنس کے اجلاس بھی وہیں ہو رہے تھے۔

کانگرس کے صدر پنڈت موتی لال نہرو اور مسلم لیگ کے صدر حکیم اجمل خاں مرحوم تھے۔

لہذا علی برادران رہا ہوتے ہی سیدھے امرتسر پہنچے کہ کانگرس اور مسلم لیگ کے اجلاس میں شریک ہوں۔

عدیم النظیر استقبال | ایک صاحب نے "حالات علی برادران" نامی ایک مختصر سا رسالہ علی برادران کی نظر بندی کے بعد لکھا تھا، وہ امرتسر کے استقبال کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں۔

"آپ ۲۹ دسمبر کو امرتسر پہنچے، راستہ میں جس اسٹیشن پر دونوں بھائیوں کا گذر ہوا ہندو مسلمانوں نے پرجوش خیر مقدم کیا امرتسر کے اسٹیشن پر جس وقت دونوں بھائیوں کی گاڑی پہنچی تو قومی نعروں سے ہزار ہا ہندو مسلمانوں نے استقبال کیا، اسٹیشن سے جلوس مرتب ہو کر سیدھا آل انڈیا نیشنل کانگرس کے پنڈال کی جانب روانہ ہوا جس خلوص اور شوق سے اہل امرتسر نے ان دونوں بھائیوں کا خیر مقدم کیا وہ امرتسر کی حیات قومی میں آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔

کانگرس میں استقبال | کانگرس کے پنڈال کے دروازہ پر مہاتما گاندھی، پنڈت مدن موہن مالوی اور دیگر رہنمایان ہند نے استقبال کیا۔

اس وقت کا منظر | کانگرس کے پنڈال میں قدم رکھتے ہی تمام ہندو مسلمان تعظیم کے لئے کھڑے ہو گئے اور اس زور شور سے مسلسل چیرز بلند ہو رہے تھے کہ پندرہ منٹ تک کارروائی ملتوی رہی۔

پنڈت موتی لال کا حاضرین سے تعارف | پنڈت موتی لال نہرو پریسیڈنٹ کانگرس نے

حاضرین سے ان دونوں بھائیوں کا تعارف کراتے ہوئے ان کی قومی خدمات کا تذکرہ کیا۔

مالوی جی کا ڈیلی گیٹ بنانا | پنڈت مدن موہن مالوی نے ان دونوں بھائیوں کو (کانگرس کا) ڈیلی گیٹ بنایا۔"

یہاں شرکت کے بعد علی برادران مسلم لیگ کے اجلاس میں گئے، وہاں بھی اسی جوش وخروش اور اشتیاق وبیچینی کے ساتھ ان کا استقبال ہوا۔

کانگرس میں تقریر | کانگرس میں تقریر کرتے ہوئے محمد علی نے کہا:

"میں کہتا ہوں اس آزادی کے لئے مسٹر تلک کو پھر جیل چلا جانا چاہئے، مجھے دوبارہ اپنی عمر بھر کے لئے نظر بند ہونا چاہئے، مسز بسنٹ کو پھانسی پر چڑھ جانا چاہئے، مگر اس قسم کے مظالم کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو جانا چاہئے، جیسے کہ پنجاب میں ہوئے۔"

باب ۱۴

دہلی

دہلی کا استقبال | پنجاب کے سیاسی اجتماعات میں شریک ہونے کے بعد علی برادران نے دہلی کا قصد کیا، یہی ان لوگوں کا "دار السلطنت" تھا، اس لئے یہاں ان کا شاہانہ استقبال ہوا جس کی تفصیل "حالات علی برادران" کے حوالہ سے یہ ہے:

"دہلی سو برس کے بعد دلہن بنی ہوئی تھی، قریب قریب تمام چھوٹے بڑے بازاروں میں جھنڈیوں کا جال پھیلا ہوا تھا، استقبالیہ کمیٹی کے عالی شان دروازوں کے علاوہ تمام چھوٹے بڑے بازاروں اور تمام گلی کوچوں کے سروں پر صدہا خوشنما دروازے نصب تھے۔

آزادی کا جہاز | چاندنی چوک کے بازار میں گھنٹہ گھر کے نیچے، جہاں وائسرائے اور شہزادوں اور خود ہز امپیریل میجسٹی کو ایڈریس دیا گیا تھا، ایک خوشنما آہنی چادروں سے منڈھا ہوا جہاز بنایا گیا تھا اور جلی حرفوں میں "آزادی کا جہاز" لکھا ہوا تھا جس پر قومی جھنڈا لہرا رہا تھا، اس جہاز کی تعمیر صرف چوبیس گھنٹہ میں ہوئی تھی اور پانچ سو روپے سے زائد اس پر خرچ ہوئے تھے، اس پر ایک درجن آدمیوں کے بیٹھنے کی جگہ تھی، اس کے نیچے کرسیاں بچھی ہوئی تھیں جن کے لئے دو روپیہ اور چار روپیہ ٹکٹ تھا ٹھیک گیارہ بجے دونوں بھائی تشریف لائے، مجمع نے اللہ اکبر اور بندے ماترم کے نعروں سے خیر مقدم کیا اور پھولوں کی بارش شروع کر دی۔

اجمل خاں کی تحریر | ڈاکٹر مختار احمد انصاری نے حکیم اجمل خاں کی ایک تحریر سنائی جس میں علی برادران کی ملکی و قومی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ان کی رہائی پر اظہار مسرت کیا تھا اور اس موقعہ پر اپنی عدم موجودگی پر افسوس''۔

اڈریس | بعدہٗ رائے بہادر لالہ شیو پرشاد صاحب سی آئی ای، او، جی، ای رئیس دہلی نے ایڈریس پیش کیا جس کو خواجہ حسن نظامی صاحب نے باواز بلند پڑھ کر سنایا۔"

ایڈریس میں علی برادران کی قومی و ملکی خدمات پر نہایت عقیدتمندانہ الفاظ میں تبصرہ کیا گیا تھا، اور ان کے بے پناہ جذبۂ ایثار و سرفروشی کی تعریف و توصیف کی گئی تھی، اس کے بعد علی برادران نے باری باری اہل دہلی کی نوازش کا شکریہ ادا کیا اور اپنی نظربندی پر روشنی ڈالی۔

باب ۱۵

وائسرائے کے ہاں وفد

تجویز | خلافت کانفرنس نے بمقام دہلی و امرتسر یہ تجویز پاس کی تھی کہ مسلمان نمائندوں کا ایک وفد ممالک غیر مثل انگلستان، امریکہ، عراق وغیرہ جائے اور وہاں مسلمانوں کے مذہبی فرائض و واجبات نہایت معقولیت کے ساتھ گوش گزار کرائے۔

گورنمنٹ نے ممالک غیر میں وفد کو جانے کی اجازت نہیں دی، ہاں انگلستان جانے کی اجازت دیدی، اس وفد سے پیشتر ایک وفد اور ہندو مسلمانوں کا مشترکہ نمائندہ بن کر لارڈ چیمسفورڈ وائسرائے ہند کی خدمت میں محمد علی کی سرکردگی میں حاضر ہوا تھا اور گورنمنٹ کو اس کے مواعید یاد دلائے تھے جو اس نے اپنی "نہایت وفادار مسلم رعایا" سے کر کے توڑے تھے۔ وفد

ارکان وفد | میں ہندو مسلمانوں کے نہایت با اثر اور ممتاز اصحاب شامل تھے، نیز ہر طبقہ اور ہر جماعت کی نمائندگی کا کافی لحاظ رکھا گیا تھا۔

خاص خاص ممبروں کے نام یہ ہیں:

گاندھی جی۔ سیٹھ چھوٹانی۔ مولانا ثناء اللہ امرتسری۔ مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی ایم اے امیر جماعت احمدیہ لاہور۔ ممتاز حسین صاحب بیرسٹر لکھنؤ۔ مولانا کفایت اللہ، مولانا حسرت موہانی مسٹر سید حسین (ایڈیٹر انڈیپنڈنٹ)، مولانا شوکت علی، مولانا عبدالباری فرنگی محلی حکیم اجمل خاں صاحب ڈاکٹر کچلو۔ ڈاکٹر انصاری، مولانا محمد علی، مولانا عبدالماجد بدایونی۔ سید ظہور احمد صاحب سکرٹری آل انڈیا مسلم لیگ۔ مولانا فاخر۔ مولانا سید سلیمان ندوی۔ آغا محمد صفدر قزلباش۔ راجہ صاحب

محمود آباد۔ پنڈت موتی لال نہرو۔ راجہ صاحب جہانگیر آباد۔ مسٹر جناح، ان میں دو حضرات (مسٹر جناح و پنڈت نہرو) وقت پر دہلی نہیں پہنچ سکے تھے لیکن انھوں نے تار بھیج کر اپنے کامل اتفاق کا اظہار کیا تھا۔

ایڈریس | یہ ایڈریس محمد علی نے تیار کیا تھا جس کا ترجمہ ان کے برادر بزرگ مسٹر ذوالفقار علی نے کیا ہے، وفد نے وائسرائے کے سامنے کہا:

> "ہم عرض کرنا چاہتے ہیں کہ چاہے کتنا ہی بڑا اور زرخیز حصۂ زمین ہو یا کیسا ہی بڑا سیاسی نفع ہو، مگر وہ معاوضہ نہیں ہو سکتا اس اخلاقی عزت کے نقصان کا جو برطانیہ کو ہوگا، اگر وعدے حرف بہ حرف پورے نہ کئے گئے۔
>
> اخلاقی رعب کا خاتمہ اس لئے اور گراں معلوم ہوگا کہ اس اعلان شاہی کی قلعی کھل جائے گی جو حضور والا کے پیشرو وائسرائے نے ترکی کی لڑائی ہونے پر شائع کئے تھے۔"

باب ۱۶

وفد خلافت یورپ

قرارداد | یہی وہ وفد تھا جس کی دہلی اور امرتسر کی خلافت کانفرنسوں میں قرارداد پاس ہوئی تھی یہ وفد یورپ اس لیے بھیجا گیا تھا کہ وہاں کے ارباب حل وعقد سے مل کر وزراء اور امراء سے مل کر اور اگر ہو سکے تو ملک معظم اور وزیر اعظم سے مل کر مسلمانان ہند کے جذبات و احساسات معقولیت اور صحت کے ساتھ پیش کرے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ وفد نے نہایت گرانقدر خدمات انجام دیں۔

ارکان | وفد کے صدر محمد علی تھے، مسٹر حسن محمد حیات (موجودہ پبلسٹی افسر و سکرٹری لیجسلیٹو کونسل بھوپال) سکرٹری تھے، مسٹر سید حسین، مولنا سید سلیمان ندوی اور ابوالقاسم صاحب وفد کے ارکان تھے، مسٹر شعیب قریشی اور مسٹر عبدالرحمن صدیقی اس زمانہ میں آکسفورڈ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے ان دونوں حضرات نے اپنا تعلیمی سلسلہ عارضی طور سے منقطع کر دیا اور اس وفد کے ساتھ مصروف کار رہے۔

وفد کی کوششیں | سب سے پہلے جب وفد انگلستان پہنچا تو اس نے وہاں کے تمام ذمہ دار لوگوں سے ملاقات کی اور انھیں اصل مذہبی مسئلہ سمجھانے کی کوشش کی، پھر اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ محمد علی نے مختلف مقامات پر دورے کئے اور جہاں کہیں ایک ذرا سا بھی موقع مل سکا وہاں انھوں نے تقریر کی اور اپنی طرف سے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔

محمد علی کا بیان | محمد علی لکھتے ہیں:-

"۱۹۲۰ء میں جب میں وفد خلافت لے کر یورپ گیا تو اس وقت ریمزے میکڈانلڈ صاحب پارلیمنٹ کے ممبر تک نہ تھے، لائڈ جارج نے گزشتہ انتخابات میں سب

کو شکست فاش دی تھی اور آپ کی نشست تک چھین چکی تھی"

خبر وحشت اثر | جس دن ہمارا جہاز وینس میں مغرب کے وقت لنگر انداز ہوا اسی دن ہمیں لندن کے اخبارات پڑھنے کو ملے تھے اور ان سے معلوم ہوا تھا کہ صلح کانفرنس ترکی کا چند ہی دن میں فیصلہ کئے دیتی ہے، اسی شب کو تار گھر جا کر ہم نے نہایت اہم اور پر زور تار اتحادیوں کی ساری حکومتوں کو اور ان کے اخبارات کو اور

لائڈ جارج کو تار | بالخصوص لائڈ جارج اور مسٹر مانٹیگو کو صبح کے ساڑھے تین بجے تک تار دئے تھے اور باوجود فرانس میں ریل والوں کی اسٹرائک کے ہم اسی شب کو لندن پہنچے جب کہ قسطنطنیہ کی واپسی کے متعلق دار العوام میں مباحثہ ہو رہا تھا۔

مسٹر میکڈانلڈ سے دائمی اختلاف | وقت کی تنگی اور کام کی اہمیت کے باعث ہمیں اتنی فرصت کہاں تھی کہ ریمزے میکڈانلڈ صاحب کو ڈھونڈھ نکالتے۔

حزب العمال کے سالانہ جلسہ کا وقت آیا ہم وہاں پہنچے جہاں حزب العمال کا جلسہ تھا، جاتے ہی کرنل ویجوڈ مسٹر سنوڈن اور دیگر عمائد حزب العمال سے ملے اس سے پیشتر مسٹر لینسبری سے ملاقات ہو چکی تھی۔

کنگسوے ہال میں جلسہ | انھوں نے ہمارے لئے کنگسوے ہال میں ایک عظیم الشان جلسہ کرایا تھا جس کے وہ خود صدر تھے، ان سے خاصی بے تکلفی بھی ہو گئی تھی ان سے ہم ملے اور درخواست کی کہ ہمیں حزب عمال کے سالانہ کانفرنس میں ترکی کے ساتھ صلح کی شرائط کے متعلق اظہار خیال کا موقعہ دیا جائے، چونکہ اس عرصہ میں ہم زیادہ تر پیرس ہی میں رہے تھے اس لئے ہمیں اس سالانہ جلسہ کی اطلاع بہت دیر میں ملی تھی، ان لوگوں نے کہا اب تو پروگرام طے ہو چکا تاہم مسٹر ریمزے میکڈانلڈ

سکرٹری ہیں، ان کو اختیار ہے اگر چاہیں وقت نکال لیں وہ تو تمھارے پرانے دوست ہیں تھوڑا سا وقت تو نکال ہی دیں گے، ہیں خوش خوش آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔

مسٹر میکڈانلڈ کی خفگی میں نہیں کہہ سکتا کہ اس شخص نے کس تلخی کے ساتھ مجھے جواب دیا "ہرگز نہیں، ہرگز نہیں، ہمارا پروگرام یونہیں پُر ہے، اسی کے لئے وقت نکالنا مشکل ہے"

مجھے اس انکار سے سخت رنج ہوا مگر رنج کے علاوہ میرے تعجب کی انتہا نہ رہی جب مجھے اس انکار کا اصل سبب معلوم ہوا۔

خفگی کا اصل سبب اس لئے کہ آپ سے نہ رہا گیا اور آپ نے مجھ سے اسی وقت فرمایا کہ تم نے تو مجھے بالکل ہی بھلا دیا، تم مجھ سے آج ملتے ہو، اتنے دن سے کہاں تھے؟ میں نے کہا کہ میں لندن سے باہر تھا فرمایا "تم ان بنا کار (بعض ممبران پارلیمنٹ و دیگر عمائد لندن) کے پاس گئے اور مجھے بالکل ہی بھلائے رکھا آج مجھے یاد فرمایا، میں تمھارے لئے بالکل وقت نہیں نکال سکتا"، جو شخص ایک دن برطانیہ کا وزیر اعظم ہونے والا تھا وہ اور اس قدر کم ظرف و تنگدل؟ مجھے سخت حیرت ہوئی کہ حزب عمال کے لیڈروں سے ان کی اس قسم کی مخالفت تھی کہ میرا ان سے ملنا ان کو اتنا ناگوار ہوا، جو شخص رشک و حسد میں اس قدر ڈوبا ہوا ہو کہ ہندوستان اور ترکی اور خود برطانیہ کے مفاد کا خیال نہ رکھے اور خیال رکھے تو صرف اس کا کہ فلاں شخص حزب عمال کے اور لیڈروں سے کیوں ملا مجھ سے کیوں نہ ملا اس سے بھلا کسی بھلائی کی امید ہو سکتی ہے؟

لینسبری کی کوشش ان بزرگ کے انکار کے بعد مسٹر کلائنس اور لینسبری نے صدر

کانفرنس سے کہہ کر مجھے پانچ منٹ تو تقریر کے لئے دلا ہی دئے اور جس انداز سے

تقریر | میں نے تقریر کی اس نے سامعین کو اتنا محفوظ کیا کہ صدر کی گھنٹی تین بار بجی مگر ہر بار سامعین چلا چلا کر کہتے رہے کہ "ابھی اور تقریر کرنے دیجئے، ابھی انھیں نہ روکئے، "آپ بولے جائیں، آپ ابھی تقریر ختم نہ کریں" اور جب چوتھی بار صدر جلسہ نے گھنٹی بجائی تو یہ کہہ کر بجائی کہ "اب تقریر بیس منٹ لے چکی ہے اور ابھی کام بہت باقی ہے، میں خود معزز مقرر کو ابھی اور سننا چاہتا ہوں مگر کیا کروں مجبور ہوں"

اس دن سے مسٹر میکڈانلڈ تادم مرگ محمد علی سے خفا رہے، بہرحال اس کے علاوہ محمد علی کے وفد یورپ کی کوششوں کے متعلق اور بھی خاصے معلومات حاصل ہوتے ہیں اور اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح ان لوگوں نے یورپ بھر میں گھوم گھوم کر اپنے مقاصد کی تبلیغ کی ہے۔

فرانس میں تقریریں | فرانس میں بھی محمد علی اور مسٹر سید حسین نے نہایت معرکۃ الآرا تقریریں کیں اور فرانس کی کم از کم اخلاقی ہمدردی حاصل کرنے کی پوری کوشش کی اور اس میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے۔

پاپائے روم سے ملاقات | پھر محمد علی نے پاپائے روم سے ملاقات کی اور ان کے سامنے بھی اپنے مقاصد و داعیات کا ایک مختصر خاکہ پیش کیا، مسلمانوں کے وہ تاثرات بیان کئے جو انھیں ترکی حکومت کے ساتھ وابستہ کئے ہوئے ہیں خلیفۃ المسلمین کی جو حیثیت مسلمانوں میں ہے اسے بیان کیا۔

مسٹر لائڈ جارج سے ملاقات | پھر محمد علی مسٹر لائڈ جارج وزیر اعظم کے حضور میں باریاب ہوئے لائڈ جارج کا اس وقت طوطی بول رہا تھا، بڑے کروفر سے اس نے وزارت اور بڑے ٹھاٹھ باٹھ سے اس نے اپنے وقار و تمکنت کی نمائش کی، اس زمانہ کا لائڈ جارج وہ تھا جب سارے یورپ پر اس کے تدبر، اس کی قابلیت اور اس کی گراں مایہ خدمت ملی کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔

محمد علی مسٹر لائڈ جارج سے ملے اور آزادی و بیباکی اور معقولیت و متانت سے مسلمانوں کے مطالبات پیش کئے، گورنمنٹ کے وعدے یاد دلائے، وہ نتائج و عواقب پیش کئے جن سے برطانیہ کو دوچار ہونا پڑتا، خلیفہ اور خلافت کی حیثیت اسلامی نقطۂ نظر سے پیش کی، پھر مسلمانان ہند کی وفاداریوں کا تذکرہ کیا، یہ یاد دلایا کہ مسلمانوں نے کس طرح گورنمنٹ کے وعدوں پر اعتبار و اعتماد کر لیا اور پھر اب کس طرح خود گورنمنٹ اپنے تئیں وعدہ خلاف ثابت کر رہی ہے۔

ناکامی لیکن محمد علی کی تمام کوششیں، ساری تقریریں اور کل پروپیگنڈا بیکار ثابت ہوا، برطانوی قوم وفا پرست اور ایفاء عہد کرنے والی قوم نہیں ہے وہ ہمیشہ قوت کے دیوتا کو سجدہ کرتی ہے اور کمزوری کے مجسمہ کو حقارت سے ٹھکراتی ہے، وہ دور بیں اور مصلحت شناس نہیں ہے، ہاں "وقت شناس" ہے "وقت" پر وہ سب کچھ کر سکتی ہے۔

تشنگیٔ معلومات وفد خلافت یورپ کے متعلق اس وقت تک کوئی مفصل بیان نہیں دیا جا سکتا جب تک شرکاء وفد میں سے کوئی بزرگ اپنے قلم کو جنبش نہ دیں اس لئے کہ اس زمانہ کے اخبارات میں جو حالات شائع ہوئے اول تو وہ مفصل کارروائیوں کے اجمال کی صورت میں شائع ہوئے تھے، دوسرے وہ بھی اب "کبریت احمر" کا حکم رکھتے ہیں، بایں وجود تلاش بسیار وفد کے متعلق مستند ترین مفصل معلومات پیش کرنے سے معذوری ہے، ہاں اگر شعیب صاحب، حسن محمد حیات صاحب، عبد الرحمٰن صدیقی صاحب یا مولانا سید سلیمان صاحب ندوی اپنے قلم کو جنبش دیں تو یہ ممکن ہے، لیکن لوگوں کا بیان ہے کہ ایسا ہونا جوئے شیر کے "خود بخود" پیدا ہونے سے کم نہیں!

ہمیں جستہ جستہ حالات خود بخود محمد علی کے مختلف مضامین میں ضمناً حاصل ہوئے وہ اوپر گزر چکے ہیں، حسن اتفاق سے جمعیۃ مرکزیۂ خلافت کے شائع کردہ "حسابات وفد خلافت یورپ" کا ایک نسخہ بھی ہاتھ آگیا ہے۔

لوح سلیمان اس میں مولانا سید سلیمان ندوی کا ایک مقدمہ بھی ہے۔ مقدمہ میں موصوف نے
حسابات کی تفصیل وغیرہ بتائی ہے اور ضمناً وفد کی کارروائی پر بھی ایک سرسری نظر ڈالی ہے
اس وقت وہ سرسری نظر بھی بہت غنیمت ہے، اس مقدمہ کے اہم اجزا ہدیۂ ناظرین ہیں:۔

اعتراض و جواب "یہ عجیب بات ہے کہ مسلمانوں سے زیادہ ہمارے اینگلو انڈین دوستوں
کو وفد کے حسابات کا انتظار ہے۔ وفد خلافت نے کاغذات اور حسابات کو درست کر لیا تھا
اور اسی لئے اُس نے حسن محمد حیات صاحب بی اے علیگ سے خدمات وفد خلافت
کے سکرٹری کی حیثیت سے حاصل کر لئے تھے انھوں نے اس فرض کو جس تندہی جانفشانی
اور محنت کے ساتھ انجام دیا اس کی شہادت تو وہ دیکھیں گے جنھوں نے ان کو
ولایت کے دفتر میں دو دو بجے رات تک کام کرتے دیکھا ہے یا اس کا اندازہ کچھ وہ
لوگ کر سکیں گے جن کو وفد کے اُن کاغذات ووچر اور رسیدات کے چھوٹے چھوٹے
ٹکڑوں اور پرزوں کے دیکھنے کا جو دفتر خلافت کے کئی صندوقچوں میں اب تک محفوظ
ہیں دیکھنے کا موقع ملا ہے متعدد راتیں ان کی مہینے میں ایسی گزرتی تھیں کہ وہ کاغذات
کی ترتیب و تلاش میں وہ شب زندہ دار رہتے تھے اور شاید ہی تمام مدت قیام یورپ
دو بجے شب سے پہلے ان کو دن بھر کے کاغذات سمیٹنے کے بعد بستر پر جانے کا اتفاق ہوا ہو
واپسی میں برنڈزی سے لیکر بمبئی تک خود ان کے قول کے مطابق ان کو یہ بھی
بمشکل احساس رہتا تھا کہ وہ سمندر میں چل رہے ہیں یا خشکی پر، یہ پورا زمانہ اس کوشش
میں صرف ہوا کہ ادھر ہمارا جہاز بمبئی میں لنگر انداز ہو اور اُدھر اس دفتر بے پایان
کی ترتیب و درستگی سے نجات مل جائے۔

وفد خلافت کے دفتر کا کام رفتہ رفتہ اس قدر وسیع ہو گیا تھا کہ تنہا ایک سکرٹری

کے بس سے باہر ہوگیا، اس موقع پر ہم اپنے دوست عبدالرحمن صاحب صدیقی کا نام لئے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتے جنھوں نے محض خلوص خاطر اور جوش دینی کی بنا پر اپنی تعلیم کو خیرباد کہا اور دفتر کا کام اپنے ہاتھ میں لیا اور آکسفورڈ چھوڑ کر پورے چھ سات مہینے یعنی جب تک وفد خلافت ولایت میں رہا وہ ہر روز صبح سے شام تک میز سے سر نہیں اٹھاتے تھے اور حقیقت یہ ہے کہ ایک تو طبعًا ان کو اس بدمزہ کام سے دلچسپی ہے اور دوسرے جنگ بلقان کے زمانے میں طبی وفد ترکی کے منیجر کی حیثیت سے چونکہ وہ اس سے پہلے کامیاب فرائض انجام دیکھے تھے اس لئے ان کے تجربے سے فائدہ اٹھانے کا موقع ہاتھ آیا، اس سلسلہ میں مسٹر شعیب قریشی کا نام لینا بھی ضروری ہے جنھوں نے دفتر خلافت کی علمی و تحریری امداد میں پورے چھ مہینے صرف کئے اور اس کام کے لئے حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے بڑی قربانی گوارا کی اور اپنے فرائض کو نہایت خوبی سے انجام دیا۔

ہمارے رئیس وفد کو حسابات کی ترتیب اور درستگی میں اس قدر اہتمام بلکہ غلو تھا کہ کبھی کبھی اُن کے ساتھ کے (ملا) کو غصہ آجاتا تھا، ان کے ہاتھ سے جو اخراجات ہوتے تھے وہ روزانہ ان کو اپنے نوٹ بک میں عمومًا درج کرلیتے تھے، اسی کے ساتھ ان کا یہ بھی فرض تھا کہ اپنے بے پروا رفقائے سفر کے اخراجات کو یاد رکھیں اور رات کو سوتے وقت جب بنیوں کی طرح وہ دن کا حساب بند کرنے بیٹھتے تھے تو حقیقت یہ ہے کہ ان کی یادداشت پر تعجب ہوتا تھا۔

ترتیب حساب کے مشکلات | محمد علی صاحب کی کوشش تھی کہ روز کا روز حساب ہوجایا کرے، لیکن جب تک لندن میں قیام رہتا یہ کام آسان تھا، لیکن مشکل یہ آن

پڑتی تھی کہ ہر دوسرے تیسرے ہفتہ میں مختلف دورے اور سفر درپیش آجاتے تھے اس رواروی میں حسابات کا مرتب رکھنا اور ریل اور جہاز میں بیٹھ کر روز روز کی میزان لگانا عملاً کس قدر مشکل تھا، ایک معمولی سفر میں تو انسان بدحواس ہو جاتا ہے، پھر ایسے دور دراز سفر میں جہاں ۲۴ گھنٹے کے اندر متعدد ملک، متعدد قوموں اور متعدد زبانوں سے واسطہ پڑتا تھا، ریل کے ہچکولے، جہاز کی طوفان خیز موجیں قوائے دماغی وجسمانی کو درہم کر دیتی تھیں، دفتر حساب کھولکر بیٹھنا اور ان کو صاف کر لینا کس قدر مشکل بلکہ عملاً محال تھا، اس دوڑ بھاگ اور چل پھر میں چھوٹے چھوٹے کاغذات، ہوٹل کے بلوں، ڈاک تار اور ادائے زر کی رسیدوں اور ووچروں کو سنبھال کر رکھنا اور گاڑی، ٹیکسی، قلی، ریل جہاز ریفرشمینٹ روم، خرید اخبارات وغیرہ کی اداکاریوں کو ہوٹل پہنچ کر اطمینان کے ساتھ بیٹھنے تک یاد رکھنا اور ان کو نوٹ بک پر ٹانکتے جانا معمولی کام نہ تھا۔

اس سے زیادہ دقت یہ تھی کہ یورپ کے مختلف ملکوں میں سفر کرنا پڑتا تھا، آج انگلستان میں، کل فرانس، پرسوں سوئیٹزرلینڈ، چوتھے دن اٹلی، یورپ کے مسافروں کو معلوم ہے کہ یورپ کے سفروں میں سکوں کے مبادلہ کی کس قدر غیر معمولی دقتیں پیش آتی ہیں، ہر جگہ نئے سکہ کی ضرورت پیش آتی ہے اور دوسرے ملک کا سکہ وہاں بیکار ہو جاتا ہے، اس سے کسی ایک سکہ میں حساب کی یکسانی کو قائم رکھنا محال تھا جب ایک ملک سے دوسرے ملک کو جانا ہوتا تھا تو اس ملک کے تمام سکوں کو دوسرے ملک کے سکوں میں تبدیل کرانا پڑتا تھا، اسی طرح مختلف سفروں سے لوٹ کر جب ہم اپنے مستقر پر پہنچتے تھے تو سکرٹریوں کو کئی کئی دن ان سکوں کو انگریزی سکوں میں تبدیل کر کے حساب کے درست

کرنے میں لگ جاتے تھے اور پھر بھی مشکوک رہ جاتے تھے۔

مشکلات کا اب بھی خاتمہ نہیں ہوا ہے، یورپ میں ہر روز ہر شخص کا پہلا کام یہ ہے کہ اخبارات کے کالموں میں سکّوں کی قیمت پڑھ لے جس زمانہ میں ہمارا وہاں قیام تھا، یہ حال تھا کہ ہندوستانی فرانسیسی، سویس اور اٹالین سکّوں کی قیمت ہر روز بلکہ کبھی کبھی دن میں کئی کئی دفعہ اُترتی چڑھتی رہتی تھی، ہمارے پاس ہندوستان سے روپیوں کی صورت میں رقم بھیجی جاتی تھی، وہاں ہم کو انگریزی پونڈ کی شکل میں ملتی تھی۔

روپیوں کا بھاؤ کسی ایک نظام پر نہ تھا، اب اس پونڈ کو لے کر جو ہم فرانس پہنچے تو اس کو فرانک بنانا پڑا، ہر روز فرانک کا نرخ گھٹتا بڑھتا رہتا تھا، وہاں سے اٹلی جانا ہوا تو فرانک کو لیرہ کی شکل میں بدلوانا پڑا۔ ایک پونڈ کے مقابلہ میں ۵۰ فرانک سے ۵۵ بلکہ ۶۰ فرانک تک ہر روز الٹ پھیر ہوا کرتا تھا، اٹلی کا سکہ ایک پونڈ کے مقابلہ میں ۷۰ سے ۸۰ تک بدلتا رہتا تھا، ایسی حالت میں ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ وفد خلافت کے حسابات کی ترتیب اُس قدر آسان نہ تھی جس قدر بظاہر نظر آتی ہے، اس وقت وفد خلافت کے کاغذات یورپ کے سفر کردہ ملکوں کے اقتصادیات اور اکانمیکل عجائبات کا مجموعہ ہے اب ہندوستان پہنچ کر ان تمام مختلف سکّوں کو جن کا ہر روز نیا نرخ تھا روپیوں کی شکل میں لا کر حسابات کو درست کرنا ایک دو ماہ کا کام نہ تھا۔

اس پر بھی ہمارے رئیس وفد کا عزم یہ تھا کہ واپسی میں ۱۵ - ۲۰ دن جہاز میں بیٹھ کر ان تمام دقتوں کے بحر بیکراں کو بھی طے کر لیا جائے گا، مگر جہاز میں بیٹھ کر اُن کاغذات کے صندوق کو کھول کر ترتیب دیا جانے لگا تو معلوم ہوا کہ اس آبی سمندر کا طے کرنا تو آسان ہے مگر یہ "حسابی سمندر" صرف ایک دو آدمیوں کی محنت سے قطع نہ ہو سکے گا

تاہم یہ پورا سفر وفد کے سکرٹری نے ان کاغذات کی ترتیب اور حسابات کی درستگی میں صرف کیا، خیال تھا کہ ساحل بمبئی پر پہنچ کر چند ہفتوں میں یہ کام ختم کر دیا جائے گا، مگر یہ کس کو نہیں معلوم کہ اس دن سے جس دن کی صبح کو وفد خلافت بمبئی کے ساحل پر لنگر انداز ہوا، رئیس وفد کو تحریک کی اشاعت، تقریر، تحریر، دورہ اور سفر میں ایک دن کی مہلت اپنے ذاتی کاموں تک کی بھی نہ مل سکی، یہاں تک کہ لوگوں کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ اسی زمانہ میں جبکہ اُن کی دو لڑکیوں کی شادیاں ہوئیں تو ان کو اس تقریب میں بھی ایک دو دن سے زیادہ شرکت کا موقع نہ ملا اور سمدھی کو بیگانوں کی طرح نقط اس فرض کا تماشہ دیکھنا پڑا، اور ان سب پر مزید یہ کہ جامعہ ملیہ نیشنل مسلم یونیورسٹی کے معلموں اور پروفیسروں کی تلاش نصاب کی تیاری، جامعہ کی تنظیم کا عظیم الشان کام ان کے سر آپڑا اور اُن کو پورے تین مہینے تک پرنسپلی کے فرائض انجام دینے پڑے جس کے درمیان میں ان کو کسی اور کام کے لئے چند لمحے بھی بمشکل میسر آسکتے تھے، اور وہ بھی علی گڑھ کالج اور علیگڑھ ضلع کے حکام کے ساتھ ناگوار قصوں کی تحریری و تقریری جواب دہی میں صرف ہوئے۔

الغرض ۱۴ر اکتوبر ۱۹۲۰ء سے لیکر ۱۴ر ستمبر ۱۹۲۱ء تک یعنی ولایت کی واپسی سے یوم گرفتاری تک ان کو چند دن بھی ایسے نہ ملے جو اطمینان سے بیٹھ کر باقی کاغذات کو دیکھ سکتے، اس ایک سال کا ایک ایک دن مختلف شہروں کے دورے مختلف صوبوں کے سفر، ہزارہا مجلسوں، کانفرنسوں اور انجمنوں کی شرکت و تقریر اور لوگوں کے ہجوم ملاقات کے نذر ہوا۔

لیکن ترتیب حسابات کا جو بوجھ اُن پر تھا وہ ان تمام مشغول و مصروف اور اہم د

نازک حالات میں بھی ان کو فراموش نہ ہوتا تھا، بہار آسام بمبئی، ممالک متوسط اور مدراس کے تمام سفروں میں حسابات کے صندوق اور سکرٹری اُن کے ساتھ ساتھ رہے اور ریلوں، اسٹیمروں میں یا جائے قیام پر جہاں بھی کچھ تھوڑا سا وقفہ ان کو مل سکا سکون و آرام کو چھوڑ کر وہ اُن کاغذوں کو لے کر بیٹھ جاتے تھے، ہر شخص جانتا ہے کہ دورہ اور سفروں میں ان کے ارد گرد خلقت کا کس قدر ہجوم ہوتا تھا، ملاقاتیوں کی کس قدر کثرت ہوتی تھی، دن بھر میں ان کو کتنی تقریریں کرنی پڑتی تھیں، کتنے مضامین اور بیانات لکھوانے پڑتے تھے کہ اٹھنا بیٹھنا، کھانا، پینا مشکل تھا مگر قوم کو اپنے رئیس وفد کے دل و دماغ پر ناز کرنا چاہئے کہ ان مشکلات و عوائق و موانع انبار کے باوجود انھیں پراگندہ اور منتشر ایام میں حسابات کی ترتیب کا آدھے سے زیادہ کام وہ انجام دے چکے تھے کہ دفعتہً ۱۴ ستمبر ۱۹۲۱ء کو ان کی گرفتاری پر ان کی اس سخت مصروفیت و مشغولیت کا مجبورانہ خاتمہ ہوگیا، ناچار ان کے لائق سکرٹری حسن محمد حیات صاحب نے اس ادھورے کام کو پورا کرنا شروع کیا اور بالآخر آج یہ اس قابل ہوا کہ آپ کے سامنے پیش کیا جا سکے۔

وفد خلافت کی عظمت و اہمیت وفد خلافت کا انگریزی نام "انڈین خلافت ڈیلیگیشن" تھا وہ ہندوستان سے نہ صرف، کروڑ مسلمانوں کی زبان بن کر گیا تھا بلکہ جیسا کہ لوکمانیہ تلک آنجہانی نے وفد خلافت کو رخصت کرتے ہوئے کہا تھا وہ متحدہ ہندوستان کی طرف سے پیام لے کر فرنگستان گیا تھا اور حقیقت میں وہ یورپ کی سرزمین میں متحیر خاموش، ساکن لیکن مضطرب القلب دنیائے اسلام کے جذبات و احساسات کا ترجمان تھا اس طرح یہ وفد خلافت دنیائے تاریخ کا ایک انقلابی واقعہ، مشرق کی طرف سے مغرب کے مظالم کے خلاف پہلی تنبیہی صدا توحید کی جانب سے تثلیث کو ندائے رجز، بلکہ

جیسا کہ پوپ آنجہانی نے وفد خلافت کے جواب میں کہا کہ وہ مذہب کی طرف سے الحاد کو اور روحانیت کی طرف سے مادہ پرستی کو اعلان جنگ تھا۔

ایک ایسے اہم، شاندار اور عظیم المطالب وفد کو جس عظمت، وقار، متانت، بلندی نظر اور رکھ رکھاؤ کی ضرورت تھی وہ محتاج بیان نہیں اور پھر ایسے ملکوں میں جہاں ظاہر بینی اور ظاہر پرستی ہی زندگی کا مذہب جہاں بد حیثیت اور بدحال کو سوسائٹی میں داخل ہونے کا حق نہیں، جہاں انسان کی ظاہری حالت اس کی اندرونی عظمت کا معیار سمجھی جاتی ہے، جہاں اس کے قول وگفتار کی اہمیت کا اس کے ظاہری پوزیشن سے اندازہ لگایا جاتا ہے، جہاں غربا کو امراء کے طبقہ سے ملنے اور رعرض حال کرنے کی اجازت نہیں جہاں چھوٹے درجہ اور کم حیثیت طریق سے رہنے والوں سے ملنا جلنا ان کے پتہ سے مراسلت کرنا ان کو اپنے ہاں مدعو کرنا یا ان کے ہاں مدعو ہونا معیار شرافت کے خلاف ہے

ان حالات کو پیش نظر رکھ کر وفد خلافت کو یہ ثابت کرنے کے لئے کہ وہ ۳۳ کروڑ ہندوستانیوں اور ۴۰ کروڑ مسلمانوں کا نمائندہ ہے وہ مشرق کا پیام امن لیکر مغرب کے پاس آیا ہے، وہ توحید کے شرائط صلح کو تثلیث کے کانوں تک پہنچانا چاہتا ہے وہ دنیائے اسلام کا پیغام فیصلہ عالم عیسوی کے گوش گزار کرنے آیا ہے، وہ مذہب وحق پرستی کی جانب سے الحاد و مادہ پرستی کے سامنے پہلی صدائے تنبیہ ہے، وہ ممالک اتحادیہ کے چھوٹے طبقہ سے لے کر بڑے طبقہ تک سب سے کچھ کہنا اور ان سے کچھ سننا چاہتا ہے، چاہیے تو یہ تھا کہ کم از کم اس سے کمتر حیثیت میں نہ رہتا، جس حیثیت میں اس اہمیت کے وفود سرزمین یورپ میں رہتے ہیں یا اس وقت رہ رہے تھے۔

جس وقت ہم یورپ پہنچے ہیں حسب ذیل مشرقی وفود وہاں موجود تھے :۔

مصری قومی وفد، حجازی وفد، البانی وفد، جاجین وفد، آذربیجانی وفد، اسلامی قازانی وفد، یہ وفود جس حیثیت اور پوزیشن سے رہتے تھے ان میں سے اکثر وفود سے ہمارے رہنے سہنے کی پوزیشن کم درجہ تھی، ہم متوسط ہوٹلوں میں قیام کرتے تھے، انگلستان میں پہلے کرزن ہوٹل میں جاکر ٹھہرے جہاں پر بمشکل جگہ ملتی تھی، اس کے بعد رائل کورٹ ہوٹل میں جاکر ٹھہرے جو لندن کا نہایت معمولی ہوٹل ہے، پھر ہوٹلوں کا قیام گراں دیکھ کر ایک پرائیویٹ مکان میں منتقل ہوگئے وہ بھی گراں نظر آیا تو البرٹ ہال مینشین میں ایک مستقل مکان (فلیٹ) کرایہ پر لے کر رہے، فرانس میں دیگرام ہوٹل، ریجنیا ہوٹل اور اٹلی میں گرینڈ ہوٹل اور ہوٹل کوئریل میں قیام رہا، ہر سیاح یورپ جانتا ہے کہ ان ملکوں کے متوسط ہوٹل ہیں حالانکہ اسی زمانہ میں دوسرے اسلامی وفود اپنے مقاصد کی اہمیت کے لئے بڑے بڑے ہوٹلوں میں مقیم تھے، مصری قومی وفد جو سعد پاشا زاغلول کے زیر سیادت تھا ان ہوٹلوں میں قیام کرتا تھا جو کروڑپتی مہاجنوں اور شہزادوں کا قیام گاہ تھا، انگلستان میں کارلٹن، سیوائے۔ اور ٹرنین اور پیرس میں کلیرج اور رٹنز میں ٹھہرتا تھا، غریب حجازی عربوں کا ڈیلیگیشن انگلستان میں کارلٹن میں اور پیرس میں کلیرج میں مستقل فلیٹ لے کر رہتا تھا۔

یونانی ڈیلیگیشن جن کے مقابلہ کے لئے ہم بھیجے گئے تھے وہ ریٹز میں مقیم تھا جو یورپ بھر میں سب سے بڑا اور گراں ہوٹل ہے، یہ تمام ہوٹل دولتمندوں شہزادوں، مہاجنوں اور بڑے بڑے سلطنتوں کے نمائندوں کی جائے قیام ہے، آپ اس سے اندازہ کرسکتے ہیں کہ ہم نے افراط و تفریط کے بیچ میں اعتدال کا راستہ اختیار کیا اور اتنا بھی صرف

اس لئے ہوا تاکہ ڈیلیگیشن کے اعتبار میں فرق نہ آئے اسلام اور ہندوستان کی سبکی نہ ہو اور اعلیٰ پوزیشن کے لوگوں کو ان ہوٹلوں کے پتے سے مراسلت کرنے اور وہاں آنے جانے اور دعوت قبول کرنے میں جھجک نہ ہو۔

وفد کے ارکان کارکن اور عملہ ہندوستان سے ہم چار آدمی جہاز پر روانہ ہوئے مولانا محمد علی مسٹر سید حسین حیات صاحب اور خاکسار کچھ دنوں کے بعد مولوی ابوالقاسم صاحب کا اضافہ ہوا اور اس کے بعد شیخ مشیر حسین صاحب قدوائی آئے خلافت وفد اور مسلم اوٹ لک کے دفتروں کی نگرانی ترتیب و اہتمام کے لئے سعید الرحمٰن صاحب صدیقی (آکسفورڈ) ہمارے ساتھ قیام کرنے پر رضامند ہوئے، مسلم آؤٹ لک کی ترتیب اور اڈیٹری اور محمد علی صاحب کی تحریری اعانت کے لئے شعیب قریشی صاحب (حال اڈیٹر نیو انڈیا) وانڈیپنڈنٹ کو محمد علی صاحب نے مجبور کر کے اپنے ساتھ رکھا حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں صاحبوں کی ذات سے ڈیلیگیشن کے کاموں میں ایسی علمی امدادیں ملیں جن کا شکریہ ادا کرنا ہمارا فرض ہے، حالانکہ ان کو اس کے سبب سے اپنا ایک پورا ٹرم (دورہ تعلیم) قربان کرنا پڑا اور مزید قیام کے لئے ان کو زاد روپے کی فکر کرنی پڑی اور وطن کامیاب لوٹ کر آنے کی آرزو میں چھ سات مہینہ کا وقفہ ان کو گوارا کرنا پڑا۔

معزز کارکنوں میں کبھی کبھی مسٹر پکتھال (حال اڈیٹر بمبئی کرانیکل) اور مسٹر سروجنی نائڈو اور ڈاکٹر مسٹر ہارنیمن (سابق اڈیٹر بمبئی کرانیکل) اور عبدالقیوم ملک صاحب اڈیٹر مسلم اوٹ لک اور محمد حبیب صاحب بی اے (آکسفورڈ) کی معیت کا شرف بھی ڈیلیگیشن کو حاصل رہا۔ اس کے علاوہ ہندوستانی احباب اور طلبہ بھی اپنی مہربانی اور محبت سے کبھی کبھی ہم کو سرفراز کیا کرتے تھے، ان سے دفتر کے اور دوڑ دھوپ

کے مختلف کام لئے جاتے تھے، فرانس میں موسیو لوکو کو نیر۔ موسیو والدام۔ میدموزل پورودہ۔ اور ڈاکٹر رشاد ہمارے دست و بازو تھے۔ اٹلی میں غالب کمال بے (سفیر ترکی)، ڈاکٹر عبدالحمید سعید (مصر) نوری عزیز (ترک تاجر) شیخ خالد (طرابلسی) وغیرہ ہمارے اعوان و مددگار تھے۔

تنخواہ دار کام کرنے والوں اور نوکروں میں ایک ٹائپسٹ اور جب زیادہ کام ہو تو دو ٹائپسٹ اور ایک دفتر ڈاک کا ملازم ایک باورچن ایک مددگار باورچن اور جھاڑو اور صفائی کے لئے ایک ملازمہ اتنے آدمی شامل تھے، اکثر نامہ نگاروں مختلف اخبار کے نمائندوں سیاسی پارٹیوں کے ارکان، پارلیمنٹ کے ممبروں اہم اور با اثر اشخاص کو بھی مدعو کرنا ضروری ہوتا تھا اور جب پیرس اور روما میں جانے کا اتفاق ہوتا تو اکثر اپنے ترک، عرب اور دیگر مسلمان بھائیوں کی میزبانی کی عزت بھی حاصل ہوتی تھی۔

یورپ کی گرانی یورپ کی گرانی جنگ سے پہلے ہی کیا کم تھی اور جنگ کے بعد تو قیاس و شمار سے باہر ہوگئی تھی جس کا اندازہ لگانا ان لوگوں کے لئے بہت مشکل ہے جن کو ممالک یورپ کے سفر کا اتفاق نہیں ہوا ہے، ہندوستانیوں میں سے جنھوں نے بمبئی دیکھی ہے اور وہاں کے مصارف کا ان کو تجربہ ہے وہ ایک ہلکا سا خاکہ یورپ کے مصارف و گرانی کا کر سکتے ہیں، وہاں مکانات کا کرایہ ہوٹلوں کا بل نوکروں کی تنخواہ ماہوار نہیں بلکہ ہفتہ وار کے حساب سے ادا کرنا پڑتی ہے۔ متوسط ہوٹلوں (مثلاً کرزن ہوٹل) کے چار کمروں اور ایک دفتر اور ملاقات کے کمرہ کے لئے ایک ہفتہ میں ۵۵ پونڈ صرف قیام کے ادا کرنے پڑے اور ۲۰ پونڈ کھانے کے، یہ خرچ اس قدر گراں نظر آیا کہ جلد از جلد کسی پرائیوٹ مکان میں رہنے کا انتظام مناسب معلوم ہوا چنانچہ ایک پرائیوٹ مکان کے خاندان

میں مل کر یہ یا ہاؤس میں اٹھ گئے وہاں ۵۲ پونڈ فی ہفتہ صرف رہنے کے دینے پڑے اس کو بھی چھوڑ کر ایک مستقل اپنا مکان (فلیٹ) البرٹ ہال مینشن میں لیا جس کا کرایہ قیام ۴ پونڈ فی ہفتہ تھا چنانچہ یکم اپریل ۱۹۲۰ء سے یکم ستمبر ۱۹۲۰ء تک اسی مکان میں ہمارا قیام رہا اور کھانے کا انتظام بھی گھر ہی پر کیا گیا، روزانہ ۸۔ آدمی سے لیکر ۱۲ آدمی تک کی اوسط ہمارے مطبخ کے مستقل شرکا رکی رہتی تھی اور جب کبھی مہمانوں کی کثرت ہوتی تھی تو یہ تعداد ۱۵۔ ۱۶ تک بڑھ جاتی تھی تاہم اس انتظام سے ہوٹل کی بہ نسبت کھانے کے مصارف بھی کم ہو گئے۔

ایک ٹائپسٹ کی تنخواہ ہندوستان میں چالیس پچاس روپئے ماہوار ہی لیکن انگلستان میں ۴ پونڈ یعنی ۶۰ روپیہ فی ہفتہ یعنی ۲۴۰ روپئے ماہوار تھا ہندوستان میں ۱۰۔ ۱۲ روپئے میں اچھے ملازم ملتے ہیں وہاں کم وبیش ایک پونڈ فی ہفتہ یا ساٹھ روپئے ماہوار تنخواہ ہوتی ہی، کھانے کی مدمیں صرف ایک حساب سن لیجئے کہ ایک انڈے کی قیمت ۵؍ ہے، پیرس میں تو اور غضب ہی پانی جو ہر جگہ مفت ہی مگر وہاں عموماً کھانے کے ساتھ ہوٹلوں میں شراب پیتے ہیں اور متقی لوگ سوڈالمینڈ وغیرہ اس سے بھی زیادہ ہم جیسے دینداروں کو اپنی دینداری کی قیمت میں سادہ معدنی پانی پینے کی قیمت ۴؍ روبل ادا کرنا پڑتی تھی کیونکہ اہل پیرس نے مشہور کر رکھا ہی کہ وہاں معمولی سادہ پانی مضر صحت ہی اور اس کا پینا قابل احتراز ہی۔

آپ کسی ہوٹل میں کھانا کھانے گئے دربان نے جھک کر شیشہ کے بند دروازے کو کھولا اور جھک کر تعظیم دی آگے بڑھ کر کلوک روم جہاں آپ اپنا لبادہ اتاریں گے اور چھڑی چھتری رکھیں گے، وہاں کے ملازموں نے آپ کو اس کام میں مدد دی، یہاں

سے نکل کر آپ میز پر جا کے بیٹھے خانساماؤں نے آپ کو کھانا کھلایا، فراغت کے بعد جب آپ نے کھانے کا حساب چکایا تو جس قدر ہوٹل کا چارج ہوگا اُس کا دسواں حصہ آپ پر فرض ہے کہ خانساماؤں کو "جبری انعام" ٹپ عطا کریں اور اس کے جواب میں شکریہ احباب کی سند خوشنودی حاصل کریں، یہاں سے نکل کر محاسب کے پاس گئے ان کے پاس کچھ دام اخلاقاً چھوڑے، کلوک روم میں اپنے کوٹ اور چھڑی چھتری کی واپسی کے لئے گئے اس قلیل مدت میں اپنی چیزوں کو غیروں کے دست برد سے حفاظت اور "پروٹیکشن کا خرچ ادا کرنا لازم ہوا، پھر دربان کی خوش اخلاقی کا معاوضہ ضروری ہے، غرض اس طرح کھانے کے علاوہ بالائی مصارف بھی کچھ کم نہیں ہیں، آپ جب کسی گاڑی۔ موٹر ٹیکسی پر بیٹھیں گے تو کرایہ کے علاوہ ڈرائیور کو ۲ پنس دینا بھی کرایہ کا ایک جزو ہے۔

مغربی سیاحوں کو جس قدر مشرقی ممالک کے ملازموں کی "بخشیش" پر غصہ و تعجب آتا ہے مشرقی سیاحوں کو مغربی ممالک کے ملازموں کی "ٹپ" پر اس سے کم غصہ و تعجب نہیں آتا۔

سفر کا حال یہ ہے کہ براعظم یورپ کی تیز ریل گاڑیوں کو (کنٹنٹل ایکسپریس ٹرینوں) میں فرسٹ اور سکنڈ دو ہی درجے ہوتے ہیں لیکن سکنڈ کلاس میں سونے کی جگہ نہیں ہوتی، اس لئے بڑے سفروں میں سونے کے فرسٹ کلاس میں جانے سے چارہ نہ تھا، قلیوں کو آپ دو چار آنے دیتے ہیں وہاں دو چار روپیوں سے کم نہیں لیتے، ہم لوگوں کے سامان کے اتارنے چڑھانے کی مزدوری صد کے قریب لیتے تھے، ٹیکسی کا کرایہ پہلے کچھ تھا لیکن ہمارے جانے کے بعد ۵ فیصدی کا اضافہ ہوگیا، ادھر آپ نے ٹیکسی پر قدم رکھا اور وہاں ۱۰ پنس پر میٹر کی سوئی

آگئی، غرض وہاں کھانا پینا چلنا پھرنا اترنا چڑھنا بولنا چالنا ہر چیز "قیمت طلب" ہے۔

دوسرے تبلیغی مصارف ڈاک کا خرچ آپ دو پیسے اور اب ایک آنہ لفافہ دیتے ہیں۔

وہاں ۳ رہے، تار کا خرچ یہاں ایک آنہ لفظ ہے وہاں سے ہندوستان ضروری تار کے لئے شاید ڈیڑھ شلنگ عہ فی لفظ دینا ہوتا تھا جب کبھی جلسہ کرنا ہوتا تھا تو کوئی ہال چند گھنٹوں کے لئے کرایہ پر لینا پڑتا تھا جس کے لئے ۲۵-۳۳ پونڈ ادا کرنے ہوتے تھے جو لوگ اس کا انتظام کرتے تھے ان کو اشتہارات کی چھپائی، تقسیم، اخبارات میں اطلاع، روشنی اور کرسیوں کا کرایہ لوگوں کو بلانے کا خرچ دینا پڑتا تھا، چنانچہ کنگس وے ہال کے جلسوں میں ۳۲ پونڈ ہال کا کرایہ تھا اور ڈھائی سو تین سو پونڈ ان مصارف بالا کے لئے ادا کرنے پڑتے تھے، چنانچہ کنگس وے اور کیکسٹن ہال کے ایک ایک جلسہ کا خرچ تین سو سوا تین سو پونڈ ہوتا تھا، مانچسٹر میں ایک جلسہ ہوا اور دو سو پونڈ خرچ ہوے۔

مسلم اوٹ لک جو پہلے سے جاری تھا جب ہم وہاں پہنچے ہیں تو کمی آمدنی کے باعث نزع کی حالت میں تھا، ہم کو اپنی تبلیغ اور ضروری مضامین اور اطلاعات اور جلسوں کی کارروائیوں اور خبروں کی اشاعت کے لئے اخبارات کی ضرورت تھی، انگلستان کے مشہور و ممتاز اخبارات نے اور خصوصاً ٹائمز نے جو مخالفت کا رویہ اختیار کیا، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ مضامین تو مضامین ہمارے اشتہارات وہ قیمتی معاوضہ پر بھی شائع نہیں کرتے تھے ہے دے کے مزدور طبقہ کے اخبارات ڈیلی ہیرلڈ فارن اور فرس وغیرہ سے معاملہ کرنا پڑا کانگرس کے اخبار انڈیا کو مدد دے کر اپنے ساتھ لیا، مسلم اوٹ لک کے مصارف طبع و اشاعت کا سارا بار اٹھایا

مسلم اوٹ لک پر کم و بیش ۲۰ پونڈ فی ہفتہ کا خرچ تھا اور کبھی حجم بڑھ جاتا تو ۲۵، ۳۰، ۴۰ ۔۔۔۵۰ پونڈ تک خرچ ہو جاتے تھے اور تقریباً چھ سات مہینے اس خرچ کے ساتھ ہم لوگوں نے اس کو نکالا۔

ڈیلی ہیرلڈ یا فارن افیئرس میں ہمارے مضامین اور اعتراضات کے جوابات چھپتے تھے، اشتہارات نکلتے تھے، ڈیلی ہیرلڈ کے نصف کالم سے بھی کم کے اشتہار کے لئے ۸۰ پونڈ دینے پڑتے تھے، فارن افیئرس کا ایک خاص خلافت نمبر نکلوایا تھا اس کو ۵۰۰ پونڈ دئے، شاید ہندوستان میں ہمارے احباب اس کو بہت زیادہ رقم خیال کریں گے لیکن اسی کے مقابل میں جب ارمنی اور یونانی اشاعات (پبلیکیشن)، اشتہارات اور پروپگنڈے کے مصارف کو آپ دیکھتے تو آپ کو معلوم ہوتا کہ ان کے لاکھوں کا ہم ہزاروں سے اور ان کے ہزاروں کا ہم سیکڑوں سے مقابلہ کر رہے تھے۔

یورپ میں پروپگنڈے کی ایک عام صورت مضمون نگاروں نامہ نگاروں اور خبر نویسوں کی خاطر مدارات اور مہربانی ہے، کسی بڑی اہم آمد پر اسٹیشن پر اترنے کے ساتھ نامہ نگاروں، انٹرویو کرنے والے اور فوٹو گرافروں کا اژدہام ہو جاتا ہے پھر آپ اپنی خواہش اور انتخاب کے مطابق مختلف بڑے بڑے اخبارات کے اڈیٹروں نامہ نگاروں، خبر نویسوں کو دعوت دیں گے اور اپنے معاملہ کے متعلق گفتگو کریں گے یا ان کو انٹرویو میں اپنا بیان لکھائیں گے اور اس خالص علمی و سیاسی خدمت کے لے کچھ نہ کچھ اعزازی خراج، آپ پر واجب ہوگا، دو چار اخبارات کے وقائع نویسوں کو اپنے ساتھ لگائے رکھنا پڑے گا جو وقت بوقت آپ کے کاموں کے متعلق اخبارات میں خبریں چھپوا دیا کریں، ایک دو اخبارات کے شیئر خرید کر کے ان کا حصہ دار

بننا پڑے گا کہ یہ اعزازی معاوضہ کی صورت ہو۔

غرض یورپ کی اقتصادی تجارت کے علاوہ یہ سیاسی تجارت بھی کچھ کم آمدنی کا ذریعہ نہیں اور غریب مشرقی وفدوں کو ان کی اعانت طلبی سے چارہ نہیں۔

ہمارے جانے سے پہلے سر آغا خاں، مسٹر ایچ ایم، اصفہانی اور شیخ مشیر حسین صاحب قدوائی نے لندن اور پیرس میں اسلامک انفارمیشن بیورو قائم کرلئے تھے اور ان کے لئے کچھ رقم بھی جمع کی تھی مگر جب ہمارا وفد پہنچا تو یہ دونوں بیورو تقریباً دیوالیہ ہو چکے تھے، فرانس کے مسلم بیورو کے صدر شریف پاشا تھے جو مالدار آدمی تھے مگر وہ کنارہ کش ہو گئے تھے، چونکہ ان دونوں بیوروں نے حقیقت میں بہت کام انجام دئے تھے، اور دے رہے تھے اور دے سکتے تھے، اس لئے اُن کی امداد لازم تھی، لندن بیورو کے ہفتہ وار اخبار، مسلم اوٹ لک کی چھپائی اور اشاعت کا تمام بار ہمارے سر رہا۔ پیرس اسلامک بیورو اور اس کے پانزدہ روزہ اخبار" ایکو دی اسلام (صدائے اسلام) کے بیشتر مصارف وفد خلافت کے سرمایہ سے ہوتے رہے۔ یہانتک کہ چلتے ہوئے بھی ڈاکٹر رشاد (اڈیٹر ایکو دی اسلام) کو اس کے لئے کچھ دے کر آنا ضروری تھا۔

اس کے علاوہ انگریزی اور فرنچ زبانوں میں رسائل اور مضامین کے طبع واشاعت کا سلسلہ تھا اہم مضامین خلافت، اسلامی ممالک کی کیفیت، سمرنا اور تھریس کے مظالم کی روداديں اور مردم شماری جلسوں کی تقریریں اور ہندوستانی جلسوں کی رودادیں پمفلٹ اور رسالوں کی صورت میں چھپوا کر اخبارات میں ارباب سیاست کے پاس پارلیمنٹ کے ممبروں کی خدمت میں بھیجے جاتے تھے اور لوگوں

میں تقسیم کیے جاتے تھے۔

ڈنر یورپ کے کاروبار زندگی میں فرصت کے اوقات بہت کم ہیں، رات کے کھانے کے بعد جو وقت ہو وہ کھیل تماشوں کے لئے مخصوص ہے، وہاں اہم معاملات پر گفتگو اور مطمئن ملاقات کا وقت صرف رات کے کھانے (ڈنر) کا وقت ہے۔ اس وقت کا کھانا وہ لوگ بہت دیر میں وقفہ کے ساتھ اور بہت ٹھہر ٹھہر کر کھاتے ہیں۔ یہ کھانا عموماً احباب اور اعزہ کے لطف صحبت اور پر مذاق گفتگوؤں کے درمیان میں ڈیڑھ دو گھنٹے میں ختم ہوتا ہے، تمام یورپ میں باہمی گفتگو ملاقات اور مبادلۂ خیالات کا یہی بہترین وقت ہے، جو لوگ کسی سے مطمئن ملاقات کرنا چاہتے ہیں وہ عموماً اس کو اسی موقع پر آنے کی تکلیف دیتے ہیں۔

اسی بنا پر تبلیغ و اشاعت کی عام صورت یہ ہے کہ اہم اشخاص اور جماعتوں کو شام کے کھانے (ڈنر) پر بلایا جائے اور میز پر بیٹھ کر اپنے معاملہ پر ان سے مشورہ گفتگو اور مبادلۂ خیال کیا جائے، ہم لوگوں کو بھی اس سے کام لینا پڑا، بہت کم ہفتے ایسے گذرتے تھے کہ جس میں ایک یا چند اشخاص کو ڈنر دینا نہ پڑتا تھا، کہ اس کے سوا ان سے گفتگو اور مبادلۂ خیال کی کوئی صورت نہ تھی اور اس پر بھی ان کا احسان ہوتا تھا کہ وہ اس کو قبول کرتے تھے، کبھی پارلیمنٹ کے ممبروں کو کبھی لیبر پارٹی کے ممبروں کو کبھی کسی اخبار کے نامہ نگار کو، کبھی یونیورسٹی کے پروفیسروں کو، کبھی ارباب سیاست کو ڈنر پر مدعو کرنا ہوتا تھا اور باتوں باتوں میں ان کو اپنا مقدمہ سمجھایا جاتا تھا، ان کے شکوک کو دور کیا جاتا تھا اور اپنی حمایت و اعانت کے لئے ان کو آمادہ کیا جاتا تھا۔

اس قسم کے اخراجات پیرس میں زیادہ پیش آئے۔ وہاں ایک دفعہ ۳۰ یا ۴۰ آدمیوں

کو یعنی پیرس میں جس قدر ترکوں کے حامی یا مشرقی معاملات سے دلچسپی رکھنے والے تھے،
سب کو مدعو کیا اور کھانے کے بعد حمایت اسلام کی ایک نئی مجلس کی بنیاد ڈالی گئی اس
کے بعد روزانہ ایک ایک شعبہ کے اکابر کو بلا بلا کر دعوت دی گئی اور ان کو کھانے کی
میز پر بٹھا کر اپنا مقدمہ سمجھایا گیا اور ان کو اپنا ہمدرد بنایا گیا۔

ان لوگوں کے علاوہ پیرس اور اٹلی میں ترکوں، عربوں، مصریوں، ایرانیوں،
روسی مسلمانوں، ٹیونسیوں، البانیوں وغیرہ کی بڑی جماعت ہے، ان کے تعارف حاصل
کرنے کے لئے اور ان کو ہم آہنگ بنانے کے لئے اور ان ممالک کے مسلمانوں سے
ہندوستان کا رشتہ اتحاد جوڑنے کے لئے ان کو وقتاً فوقتاً میز پر یکجا کرنا پڑتا تھا اور ان
میں اپنے کام کی تبلیغ کیجاتی تھی۔ اس ذریعہ سے ممالک اسلامیہ میں مسئلہ خلافت اور
ہندوستان کے کارناموں کی اہمیت سمجھانے میں بڑی مدد ملی اور اس اتحاد اسلامی
کے سنگ بنیاد قائم کرنے کا بہترین موقع میسر آیا جس سے بڑی بڑی امیدیں اور توقعات
قائم ہیں۔ سعد پاشا زاغلول کے مصری وفد اور حجازی عربوں کے ڈیلیگیشن اور تونسی
وفد کو اپنے ہاں کئی دفعہ بلایا۔ اٹلی میں ترکوں، مصریوں اور طرابلسیوں کو ڈنر دیے۔

الغرض اس تمام تفصیل سے یہ معلوم ہوگا کہ وہاں کام کا بڑا ذریعہ لیکن گراں
ذریعہ ڈنر اور دعوت ہے، اسی لئے آپ کو وفد کے حسابات کی تمام مدوں میں سے
اس مد میں سب سے زیادہ رقم نظر آئے گی⁽¹⁾ اور دفتر خلافت میں ہوٹلوں کے حسابات کے
بل اور رسیدیں ملیں گی جن میں سے کھانے کے ہر حساب پر جہاں زیادہ صرف ہوا ہے
محمد علی صاحب نے خود اپنے قلم سے وجوہ زیادتی اور تعداد و اسمائے مہمانان کی تفصیل لکھی

---

(۱) بشمول کرایہ مکان و ہوٹل اور متفرقات (دھلائی، حجامت، نوکروں کی تنخواہ، ہوٹلوں کی ٹپ، ضروریات اتفاقی ارکان وفد وغیرہ

ملے گی۔

مقامات سفر جہاز، ریل اور سواری کی گاڑیوں کی گرانی کرایہ کے واقعات ہم اوپر لکھ چکے ہیں، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ ہمارا سفر صرف بمبئی سے لندن اور لندن سے بمبئی تک محدود نہیں ہے، ہم کو اغراض خلافت، وزرا اور مدبرین کی ملاقات جلسوں میں تقریریں کرنے اور اہم ترک و عرب اشخاص سے ملنے کے لئے انگلستان فرانس سوئیزرلینڈ اور اٹلی کا پورا دورہ کرنا پڑتا ہے۔ انگلستان سے فرانس اور فرانس سے انگلستان، ہم کو پانچ دفعہ (آمد و رفت کے دس پھیرے) آنا جانا پڑا۔ انگلستان میں دوکنگ کیمبرج، آکسفورڈ، اڈنبرا، سوانک، مانچسٹر، اسکاربرو، گلاسگو، کارڈف میں جا جا کر جلسوں کو خطاب کیا، اٹلی میں روم پوپ، نیپلز، غالب کمال بے اور میلان امیر فیصل سے ملنے کے لئے گئے۔ سوئیزرلینڈ میں جنیوا کی تیسری سوشیالسٹ کانفرنس میں شرکت کی اور طریلطے جا کر جلا وطن ترک و عرب و مصری احرار اسلام سے جا کر ملاقات کی۔

مصارف کی کل میزان حسابات میں مصارف کی تمام مدیں دی ہوئی ہیں اور ہر ایک مد کی علٰحدہ علٰحدہ میزان بھی ہے۔ مرکزی دفتر خلافت سے وفد خلافت کو شروع سے آخر تک کل ایک لاکھ پچپیس ہزار آٹھ سو چالیس روپیہ تین پائی مختلف تاریخوں میں دئے گئے اور علاوہ ازیں دوسرے اتفاقی ذرائع امداد سے چار ہزار چار سو اکیس روپے سات آنے ۹ پائی ولایت میں ملے، کل ایک لاکھ ساٹھ ہزار کے قریب یہ رقم پہنچتی ہے اس میں سے بیس ہزار تین سو پچانوے سمرنا فنڈ کے تھے جو غالب کمال بے (سفیر ٹرکی متعین اٹلی)، کے حوالے کئے گئے اور پندرہ ہزار دو سو چھیانوے ڈیلی ہیرلڈ

اخبار کے حصہ کی خریداری میں خرچ ہوئے۔ باقی تقریباً ۱۰۰،۴۳ دفتر کو واپس کئے گئے ۲۹۲ روپیہ ابوالقاسم صاحب اور رشید حسین صاحب کے ذمہ باقی ہیں وفد کے سفر، قیام، طعام، اور کاموں پر صرف ہوئے یہ سوالاکھ کے قریب روپئے جو آٹھ مہینے کے انگلستان، فرانس سوئیزرلینڈ، اٹلی کے کرایہ جہاز وریل، سفر، قیام، طعام، تبلیغ و اشاعت وطباعت وانعقاد مجالس، معاوضہ مضامین و مہمانداری و میزبانی وغیرہ میں صرف ہوئے، ان کی یکجائی رقم شاید بعض حضرات جن کو یورپ کے وفود کے کاموں کا تخیل، (آئیڈیا) نہیں شاید اندازہ سے زیادہ سمجھیں، لیکن ہندوستان سے جن سیاسی وفود نے چند گذشتہ سالوں میں اسی قسم کے کاموں کی خاطر صرف انگلستان تک کا سفر کیا، کر ان کے اخراجات کی مجموعی رقم بھی اسی کے لگ بھگ ہے، اسی زمانے میں جو حصری قومی وفد یورپ میں کام کر رہا تھا وہ کم از کم ۱۴ ہزار پونڈ (دولاکھ دس ہزار روپئے) لے کر یورپ گیا تھا"

مصارف کا موازنہ

تفصیل آمد و خرچ

مولنا سید سلیمان صاحب نے آخر میں آمد و خرچ کی تفصیل بھی ایزاد کردی ہے اپنی اہمیت کے لحاظ سے وہ بھی اس قابل ہے کہ پیش نظر رہے۔

"مجلس مرکزیہ خلافت ہند کے اجلاس مورخہ ۱۷ر اکتوبر ۲۱ء منعقدہ دہلی میں مولنا محمد علی صاحب کے وفد انگلستان کے حسابات مع اڈیٹر کے سرٹفکیٹ کے پیش ہوئے مجلس مرکزیہ نے ان حسابات کو بالاتفاق منظور کر کے شائع کرنے کی اجازت دی۔

اخراجات وفد پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ مولنا ممدوح نے جملہ مصارف میں کفایت شعاری کو مدنظر رکھا وفد کا کل خرچ سینسٹھ ہزار روپیہ کے قریب ہے وفد میں چھ اصحاب تھے جو نو مہینے یورپ کے مختلف ممالک میں مسلمانان ہند کے جذبات

کی ترجمانی کرتے رہے اگران کے اخراجات کا مقابلہ اس وفد کے اخراجات سے کیا جائے جو گورنمنٹ کی دعوت پر عالیجناب سیٹھ چھوٹانی صاحب کی سرکردگی میں گیا تھا تو آسانی سے اس امر کا احساس ہو جائے گا کہ مولٰنا کے وفد پر کم سے کم خرچ ہوا ہے سیٹھ صاحب کے وفد میں بھی چھ اصحاب تھے۔ ان میں سے ہز ہائنس آغا خاں اور سیٹھ صاحب نے گورنمنٹ سے اپنا خرچ لینے سے انکار کر دیا تھا مسٹر حسن امام صاحب، عالیجناب ڈاکٹر انصاری صاحب اور قاضی عبدالغفار صاحب نے اپنے اخراجات بل پیش کئے۔ ان حضرات کے قیام انگلستان کے زمانے کا بیس پونڈ روزانہ الاؤنس بل میں رکھا تھا لیکن حکومت ہند نے صرف دس پونڈ روزانہ منظور کیا، اس پر مسٹر حسن امام نے روپیہ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب و قاضی عبدالغفار نے منظور کر لیا اور اس حساب سے ان کو دس دس ہزار روپیہ وصول ہوا۔

ان اعداد سے ظاہر ہے کہ مولٰنا محمد علی صاحب کے وفد پر فی کس گیارہ ہزار روپیہ خرچ ہوا اور مسٹر حسن امام کے وفد پر فی کس دس ہزار روپیہ لیکن مولٰنا ممدوح کا وفد نو مہینے یورپ میں رہا اور مسٹر حسن امام کا وفد صرف ڈھائی ماہ انگلستان میں رہا۔ اس حساب سے مولٰنا کے وفد کے مقابلہ میں گورنمنٹ کے بھیجے ہوئے وفد کے اخراجات تین گنے ہوئے ان اعداد کو مدنظر رکھتے ہوئے ان لوگوں کے خیالات پر حیرت ہوتی ہے جو مولٰنا محمد علی صاحب پر فضول خرچی کا الزام عائد کرتے ہیں۔"

تبصرہ مولٰنا سلیمان ندوی کے بیان کے اہم اور قابل ذکر حصص آپ کے سامنے پیش کئے جا چکے ہیں، ان پر کسی مزید تبصرہ کی ضرورت نہیں

وفد خلافت یورپ کی "فضول خرچیوں" کے متعلق طرح طرح کی "افواہیں" مشہور ہیں اور بہت

ادعا کے ساتھ بعض حلقوں سے یہ آواز بلند ہوئی اور حسب ضرورت اب بھی کبھی کبھی بلند ہو جاتی ہے کہ یورپ میں "گلچھرے" اڑائے گئے، مسلمانوں کا روپیہ بے دریغ صرف کیا گیا اور اس کا ذرا لحاظ نہ کیا گیا کہ یہ روپیہ ایک غریب و نادار قوم کی جیبوں سے نکل کر آیا ہے، لیکن اس مفصل جواب سے یقیناً مخالفین و معاندین کے علاوہ ان تمام حضرات کو تشفی ہو جائے گی جو واقعی اپنے دل میں کسی قسم کا شبہ رکھتے ہیں۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سے زیادہ حزم و احتیاط اور دیانت و امانت کا کیا ثبوت دیا جا سکتا ہے جس کی تفصیل صفحات بالا میں گزر چکی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جہاں ہماری قوم میں بہت زیادہ محامد و محاسن ہیں وہاں سب سے بڑی خصوصیت خاصہ اس کا ملکۂ تنقید ہے، مسلمانوں نے اپنے زعما پر، مخلص قائدین پر، ایثار پیشہ رہنماؤں پر جس بے دردی، سنگدلی اور شقاوت کے ساتھ نکتہ چینی کی ہے، تنقید و تبصرہ کیا ہے اور اور بالآخر ان کے قوائے عمل کو مفلوج کر دیا ہے اور پھر آنسو بہائے ہیں، اس کی مثال شاید ہی کوئی اور قوم پیش کر سکے

اسی وفد کے معاملہ میں ارکان وفد کے ایثار، جذبۂ خدمت، استقامت علی الحق، ثبات قدم، محنت و مستعدی اور "ترک فرزند و زن" کی داد کسی نے بھی نہ دی، لیکن حساب پوچھنے کے لئے ہر شخص آمادہ تھا اور عدم اطمینان کی صورت میں قلم اس کے ہاتھ میں تھا، اخبارات کے کالم کھلے ہوئے تھے اور دیکھتے دیکھتے بڑے بڑے "سنسنی خیز انکشاف" ہونے لگتے تھے، بہر حال اس موضوع پر مزید تفصیل سے گفتگو کرنے کا یہ محل نہیں ہے، اس لئے صرف اسی بیان پر اکتفا کی جاتی ہے۔

بہر حال محمد علی نے یقیناً برطانوی سیاست سے متعلق غیر ضروری حسن ظن سے کام لیا، لیکن شاید ان کا مقصد یہ تھا کہ وہ "دروغ گو را تا بہ خانہ باید رسید" پر عمل کریں اور اس پر عمل کر کے

بالآخر وہ سب کچھ انھوں نے کیا جس کی ان جیسے جری اور پختہ دماغ قائد اسلام سے توقع تھی۔

واپسی بالآخر پورے آٹھ ماہ تک یورپ کا دورہ کر کے محمد علی ہندوستان واپس آئے۔

استقبال بمبئی میں ارکان وفد خلافت کا نہایت شاندار اور قابل رشک طریقہ پر استقبال ہوا اس عرصہ میں ہندوستان کی فضا اور زیادہ بدل چکی تھی اور گورنمنٹ برطانیہ کے خلاف حقارت و نفرت کے جذبات پوری شدت کے ساتھ برانگیختہ ہو چکے تھے اور مسلمانوں میں ایک عام احساس پیدا ہو گیا تھا، ایسا فقید المثال کہ پھر کبھی ہندوستان کی تاریخ میں وہ نمونہ دیکھنے میں نہیں آیا گو جوش و خروش کے بہت سے مظاہرے آنکھوں نے دیکھے۔

ناکامی کا اثر وفد کی ناکام مراجعت نے مسلمانوں میں اور زیادہ اشتعال پیدا کر دیا اور اب ان کے لئے اس کی کوئی صورت باقی نہ رہی کہ وہ ایسی گورنمنٹ سے تعاون کر سکیں جس نے پیہم وعدہ خلافیاں کیں، خلاف ورزیاں کیں، مسلمانوں کو مغالطہ میں ڈالا، ان کو فریب دیا، اور جب ایفاء عہد کا وقت آیا تو ایک ادائے دلنوازی کے ساتھ معاملہ ہی کو سرے سے ٹالنے کی کوشش کی گئی۔

مقاطعہ اب مقاطعہ کی تحریک پوری شدت کے ساتھ جاری ہو چکی تھی، اسکول خالی ہو رہے تھے، کالج کے طلبہ اسٹرائک کر رہے تھے، یونیورسٹی کے "اسکالر" یونیورسٹی پر لعنت بھیج رہے تھے۔

سرکاری ملازمین دھڑا دھڑا استعفے دے رہے تھے، بڑی بڑی آسامیاں اس خندہ پیشانی سے چھوڑتے تھے گویا بہت بڑی نعمت عظمیٰ پا گئے۔ خان بہادروں نے اپنے خطابات واپس کئے خانصاحبوں نے اپنے خطابات واپس کئے، حاذق الملک اور دوسرے "سروں" نے اپنے خطابات واپس کئے اور بڑے بڑے حامی تعاون بزرگوں نے گورنمنٹ سے تعاون کا ہاتھ کھینچ لیا۔

لیکن اسی زمانہ میں چشم حیرت نے یہ تماشا بھی دیکھا کہ کوئی خطاب واپس کر کے مسلمانوں کا سرتاج بنا اور کوئی آستانۂ حکومت پر "سر" ہو گیا! اللہ رے سرکار کے اقبال،

باب ۱۷

جامعہ ملیہ

محمد علی کے کارنامہ ہائے حیات کا ایک روشن ترین پہلو جامعہ ملیہ سلامیہ کی تاسیس ہے۔

وفد خلافت جب یورپ سے ناکام و نامراد واپس آیا تو ہندوستان میں ترک تعاون اور ترک موالات کے الفاظ ہر ہندوستانی کی زبان پر چڑھے ہوئے تھے۔

علمائے کرام بھی ایک عرصہ کے جمود و تعطل کے بعد میدان عمل میں اتر آئے تھے اور نہایت جانبازی اور اخلاص کے ساتھ گورنمنٹ کے خلاف صف آرا ہو گئے تھے۔

علی گڑھ کو دعوت خیر

سب سے پہلے محمد علی نے اپنے علیگڑھ کالج کو جس سے انھیں محبت تھی اور جس کی تعمیر و استحکام میں وہ نہایت نمایاں حصہ لے چکے تھے، دعوت الی الخیر دی اور بتایا کہ گورنمنٹ کا مسلمانوں کے ساتھ کیا طرز عمل ہے۔ مسلمانوں نے اب ہندوستان میں رہنے کے لئے کیا وسائل اختیار کئے ہیں، اسلامی ہند کس اضطراب و اضطرار کے عالم میں ہے اور اسلامیان ہند نے اس نازک وقت میں اپنی شاہراہ عمل کیا تجویز کی ہے، علیگڑھ جو مسلمانوں کی آرزوؤں کا مظہر اور ان کی دیرینہ تمناؤں کی تعبیر ہے، اسے اس وقت مذہب کی پکار پر سر بکف میدان عمل میں اتر آنا چاہئے اس کی نظر مستقبل کی مصلحت شناسیوں کی طرف نہ ہونی چاہئے، بلکہ حال کی روح فرسا، ہمت شکن اور دل و دماغ کو بیچین کر دینے والی کیفیت پر ہونی چاہئے، علیگڑھ کے طلبہ اسلام کے سپاہی ہیں، بگل بج چکا ہے جنگ بھی شروع ہو چکی ہے پھر وہ کیوں مست خواب خرگوش ہیں؟

اس پیام حق و صداقت کا علیگڑھ کے طلبہ پر تو ایک حد تک ضرور اثر ہوا، مگر حکام علیگڑھ

خداوندان علیگڑھ اور ارباب علیگڑھ اس ضرورت کے منکر تھے، مسلمان اپنا ہاتھ تعاون سے کھینچ رہے تھے اور علیگڑھ کے ارباب حل وعقد اپنا دست طلب گورنمنٹ ہی کی طرف دراز کر رہے تھے او وہ ہنگامہ ختم ہوگیا اور بعد کو یہ حقیقت بے نقاب ہوگئی کہ اپنے قرطبہ اور غرناطہ کے نقش ثانی سے علمی زندگی میں کس قسم کی توقعات قائم کیجا سکتی ہیں اور اسلام کا درد ان کے دل میں کہاں تک موجود ہے؟

کورٹ میں تقریر | سب سے پہلے محمد علی اپنے رفقاء کار ڈاکٹر انصاری اور حکیم اجمل خاں وغیرہ کے ساتھ کورٹ کے اجلاس میں شریک ہوئے اور اس کے ممبروں کو دعوت الی الخیر دی اور اپنی امید ظاہر کی کہ اسلام کے اس نازک وقت میں آپ لوگ جو مسلمانوں کے بھی ناخدا ہیں، اپنی جرأت وہمت سے مسلمانوں کی پیشوائی فرمائیں گے اور گورنمنٹ سے جو سرکاری تعلق علی گڑھ کو ہے اسے منقطع فرمائیں گے۔

کورٹ میں اس وقت مخالف اثرات پورے طور سے کام کر رہے تھے، چانسلر، وائس چانسلر پرو وائس چانسلر، سبھی مخالف تھے اور کسی طرح اس تجویز پر غور کرنے پر بھی آمادہ نہیں تھے اور اسے بالکل نامنظور کر دینے پر تلے ہوئے تھے۔

نتیجہ | چنانچہ وہی ہوا جس کی توقع تھی، یعنی ان رہنمایان اسلام کے پیغام عمل کو ٹھکرا دیا گیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، ڈاکٹر انصاری اور حکیم اجمل خاں جیسے عظیم المرتبت

ملامت کا ووٹ | رہنماؤں پر ملامت کی تجویز بھی پاس کر دی گئی کہ ان ”غداران اسلام“ نے علیگڑھ جیسے سدا بہار گلشن تعلیم پر دور خزاں کو دعوت دی! سبحان اللہ کتنی معقول تجویز ہوئی؟

اس طرف سے مایوس ہو کر اب سوا اس کے کوئی اور چارہ کار باقی نہ رہ گیا تھا کہ طلبہ کو باقاعدہ اور براہ راست دعوت الی الخیر دی جائے، کامیابی کی ایک ہلکی سی امید یہ بھی تھی!

یونین میں تقریر | چنانچہ ہر طرح سے طلبہ کو ان کا بھولا ہوا سبق یاد کرا کے پرائیویٹ صحبتوں میں

نصیحت کرکے اور جامع مسجد کے جلسوں میں وعظ کہہ کے، انھیں آمادہ کیا کہ اسلام کا سب سے زیادہ نازک وقت یہی ہے، اٹھو اور میدان عمل میں آؤ کہ اس وقت اسلام کو سرفروش سپاہیوں کی ضرورت ہے، تمھاری تعلیم، تربیت اور نشوونما اس لئے اور صرف اس لئے ہوئی تھی کہ تم جب اسلام پر کوئی وقت پڑے تو مردانہ وار میدان عمل میں اتر آؤ، نہ اس لئے کہ اپنی ہمت ہار دو اور اغیار کو طعن و تشنیع اور تمسخر و استہزار کا موقعہ دو مسلمانوں کی شان اس سے ارفع ہے!

یہ تقریر محمد علی نے اپنی پوری سحرکاریوں کے ساتھ علیگڑھ کالج کی یونین میں کی، پھر دوسرے زعما اور مولنا شوکت علی صاحب نے بھی ایک درد انگیز تقریر کی۔ اس تقریر کا اثر یہ ہوا کہ یونین کے وائس پریسیڈنٹ (ڈاکٹر ذاکر حسین خاں شیخ الجامعہ) جو اس خیال سے آئے تھے کہ اس تعلیمی مقاطعہ کی مخالفت کریں گے، پورے طور سے مسحور ہو گئے اور انھوں نے بھی ایک ولولہ انگیز تقریر کی اور پورے طور سے آمادگی کا اظہار کیا۔

عمل کا وقت لیکن جب عمل کا وقت آیا اور یہ سوال سامنے آیا کہ اب علیگڑھ کو چھوڑ دو تو پھر اس مورد ملخ میں بہت کمی ہو چکی تھی لیکن الحمد للہ کہ ایک جماعت اپنے عزم و عقیدہ پر استقلال سے جمی رہی اور نہایت استقامت سے جامعہ ملیہ کی تعمیر اور استحکام میں رکن رکین ثابت ہوئی۔

اولڈ بوائز لاج میں قیام علیگڑھ کی اس مخلص جماعت کو لے کر محمد علی اولڈ بوائز لاج میں مقیم ہو گئے، اس لئے کہ اولڈ بوائز لاج پر کالج کا قبضہ نہیں تھا اور وہ محض اولڈ بوائز کی تھی اور محمد علی اور ان کے برادر بزرگ مولنا شوکت علی صاحب کی انتھک کوششوں اور پیہم اور لگاتار جدوجہد کا نتیجہ!

نکل جاؤ لیکن یہاں بھی امن و سکون کے ساتھ ان علمبرداران صداقت کو بیٹھنا نصیب نہ ہوا کالج کے حکام نے ان سرکش باغیوں کو حکم دیا کہ اولڈ بوائز لاج خالی کر دو اور یہاں سے نکل جاؤ

جواب میں عرض کیا گیا کہ اولڈ بوائز لاج پر تو سرکار علیگڑھ کا کوئی تصرف ہی نہیں، وہ اولڈ بوائز کی ملکیت ہے، انھیں کو اس پر تصرف کا حق حاصل ہے اور وہی اس پر قبضہ رکھ سکتے ہیں، انھیں نکالنے کا حکم آپ کے قبضہ قدرت سے باہر ہے۔

حاکمانہ انداز میں ارشاد کیا گیا کہ اولڈ بوائز لاج کالج کے حدود میں واقع ہے اور چونکہ یہ ثابت ہو گیا ہے کہ تم علی گڑھ کے باغی اور سرکش ہو، نیز اپنے ساتھ بغاوت اور سرکشی کے بہت سے جراثیم بھی لائے ہو، اور انتہائی بیباکی سے تم نے انھیں کالج کی فضا میں چھوڑ بھی دیا ہے اور ان کی اس "رہائی" کے برے آثار بھی ظاہر ہو رہے ہیں اس لئے "تحفظ امن عامہ" کے قانون کے مطابق تمھیں حکم دیا جاتا ہے کہ فوراً اولڈ بوائز لاج کو خالی کر دو۔"

انکار لیکن یہ نشہ کہیں ان ترشیوں سے اتر سکتا تھا، ادب والتجا کے ساتھ عرض کر دیا گیا کہ فرمان جہاں پناہی سر آنکھوں پر مگر تعمیل سے معذوری ہے۔

اس انکار اور اس تمرد کا ارباب علیگڑھ نے جواب یہ دیا کہ بھشتی کو حکم ہوا کہ پانی کا ایک قطرہ اولڈ بوائز لاج میں نہ جانے پائے، لائٹ کیپر کو حکم ہوا کہ ایک بلب اولڈ بوائز میں نہ جلنے پائے دھوبی کو تہدید کی گئی کہ خبردار جو ادھر کے لوگوں کا ایک کپڑا بھی گھاٹ پر لے گیا، خاکروب کو بلا کر یہ ہدایت کی گئی کہ اولڈ بوائز لاج کو ملبہ بنا رہنے دے اور کسی چیز میں ہاتھ نہ لگائے۔

لیکن یہ لوگ اتنے سخت جان تھے کہ اندھیرے میں رہے، "ڈائننگ ہال" سے خارج ہوئے، دھوبی اور بھشتی کے امتناعی احکام سنے، مگر ٹس سے مس نہ ہوئے اور نہ اپنے چشم و ابرو سے ظاہر ہونے دیا کہ وہ ان شدائد سے کچھ بھی متاثر ہیں! کتنی عجیب بات تھی؟

پولیس کا داخلہ دو ایک روز تک حکام کالج ہوا کا رخ دیکھتے رہے اور اس کے متوقع رہے کہ شاید یہ لوگ خود ان شدائد کی تاب نہ لا کر راہ فرار اختیار کریں اس لئے کہ اس کے تمام ضروری

انتظامات مکمل کر دئے گئے تھے۔

لیکن جب اس کا بھی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا تو پھر پولیس سے استمداد کی گئی کہ وہی باغیوں کے اس قلعہ کا محاصرہ کرے اور انھیں شکست فاش دے۔

پولیس اپنی پوری شان جبروت وجلال کے ساتھ آئی، ڈنڈوں اور سنگینوں کے ساتھ آئی، بندوقوں اور پستولوں کو لے کر آگے بڑھی!

حکم ہوا کہ اولڈ بوائز للاج خالی کر دو، نیازمندوں نے اس فرمان خسروی پر سر تسلیم خم کر دیا۔

باغیوں کا سردار محمد علی آگے آگے تھا اور عقیدتمندوں اور جاں نثاروں کی فوج پیچھے پیچھے اور پولیس کے ڈنڈے باز اور مسلح دستے ارد گرد اپنے جلو میں انھیں لئے ہوئے تھے

کتنا عجیب وغریب منظر چشم فلک نے دیکھا ہوگا کہ کل تک جہاں عزت وعظمت پیشوائی کے لئے موجود، نعرہ ہائے تحسین اور غلغلہ مسرت استقبال کے لئے حاضر، چشم عقیدت، محبت والفت سے لبریز۔

آج وہیں سے کشاں کشاں، پولیس کے جلو میں وہیں نکالا دیا جا رہا ہے اور اتنی مجال نہیں کہ اپنے گلشن میں ایک سانس بھی لے سکیں، آہ!

قیام بلبل مجبور رحم باغباں تک ہے!

اصغر صاحب کا بیان | جسٹس سر وزیر حسن کے برادر اصغر جن کا کسی موقعہ پر ذکر ہو چکا ہے وہ اس وقت وہیں موجود تھے، اور قاصد صلح بن کر محمد علی کے پاس گئے تھے کہ محمد علی کو "صراط مستقیم" پر لا سکیں، ذیل میں ان کے بیان کا ایک حصہ درج ہے، اس سے نفس معاملہ پر کچھ روشنی پڑتی ہے، نیز محمد علی کے بلند کردار اور بلند تر عزم اور اس سے بھی زیادہ دوستوں اور رفیقوں سے برتاؤ کا ایک ہلکا سا خاکہ بھی نظر کے سامنے آجاتا ہے، اصغر صاحب فرماتے ہیں:

"آخری موقعہ جو ملاقات کا ہوا تھا اس کا دل پر ناقابل محو نقش ہے، نومبر ۱۹۲۰ء میں جب علیگڑھ کالج کو قومی ادارہ کرنے کا ہنگامہ علی گڑھ میں ہوا تھا جو محمد علی کا مطمح نظر تھا اس وقت ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب نے مجھکو اور سید سجاد حیدر صاحب کو مرحوم سے گفتگو کرنے کے لئے بھیجا تھا، باوجود اس کے کہ مرحوم نہایت پرجوش جذبات کے شخص تھے ہم لوگوں کے ساتھ اس قدر لطف اور محبت کے ساتھ گفتگو کی کہ باوجود اختلاف رائے کے پرانی صحبتوں کا لطف تازہ ہوگیا، رات زیادہ ہوگئی تھی جب ہم لوگ اولڈ بوائز لاج سے جہاں مرحوم مقیم تھے اپنی جائے قیام پر جانے لگے تو مرحوم نے کہا اصغر! تمھاری ملاقات سے سیری نہیں ہوئی ہے، صبح آکر میرے ساتھ چائے پیو تو ملاقات اور گفتگو ہوگی۔

اس کی صبح والا وہ دن تھا جبکہ ان کے اوپر پولیس کا پہرہ ہوگیا تھا اور اس کے ذریعہ سے وہ وہاں سے ہٹائے جا رہے تھے، مجھکو آتا دیکھ کر دور سے کہا، اصغر تم میرے پاس نہ آؤ، تمھاری بہبودی بوجہ تمھارے ملازم گورنمنٹ ہونے کے اسی میں ہے، یہ الفاظ آبدیدہ ہوکر کہے گئے تھے۔"

خیام میں قیام اولڈ بوائز لاج سے اس شاندار انداز میں پسپائی اٹھا کر محمد علی آگے بڑھے اور یونیورسٹی کے حدود سے تھوڑی ہی دور آگے چند خیمے نصب کر لئے اور وہیں جم کر بیٹھ گئے درختوں کے نیچے تعلیم ہوتی تھی، چٹائیوں پر نشست ہوتی تھی۔

نہ کلاس روم تھے نہ لیبوریٹری نہ ہال تھا نہ گراؤنڈ، نہ روپیہ تھا نہ پیسہ مگر استقامت تھی اس لئے اس بے سروسامانی میں بھی بڑے بڑے مزے تھے، اس فقر و فاقہ کے عالم میں بھی عجیب کیف تھا اور اس بوریہ نشینی میں مسند زرکار و زرنگار کا لطف تھا۔

کیا زمانہ تھا، شیخ الہند بانی، محمد علی پرنسپل، تصدق احمد خاں شروانی رجسٹرار، اور جامعہ کا قیام!

بعد کے انتظامات کچھ عرصہ کے بعد بیرون علی گڑھ سے بھی طلبہ اسٹرائک کر کر کے، اپنے کالج چھوڑ چھوڑ کے جامعہ میں آنے لگے تو خیمے ناکافی ہوئے اور پاس ہی چند کوٹھیاں کرائے پر لی گئیں اور اس طرح طلبہ کے قیام میں نسبتہً سہولت پیدا ہو گئی۔

محمد علی کی "پرنسپل شپ" جن خوش قسمت لوگوں نے اس زمانہ میں تعلیم حاصل کی ہے وہ کبھی کبھی اگر اپنے زمانہ کے بالخصوص محمد علی کے زمانہ پرنسپلی کے حالات بیان کرتے ہیں تو عجیب کیفیت ہوتی ہے۔

علمی حیثیت سے محمد علی کا جو پایہ تھا اسے ایک دنیا جانتی ہے، اس تحریک کے زمانہ میں ان پر مذہب کا رنگ بہت غالب تھا، اس لئے مذہب کے اوپر زیادہ تر ان کی تقریریں ہوا کرتی تھیں۔

راویوں کا بیان ہے کہ اس زمانہ میں محمد علی صبح آٹھ بجے تشریف لاتے تھے اور تقریر کرنا، (بڑی کلاسز کے سامنے) شروع کرتے تھے، تقریر کیا ہوتی تھی اسلام کے متعلق بیش بہا معلومات کا ایک خزانہ ہوتی تھی، اور بعض بعض دن ایسے بھی آئے ہیں کہ ۱۲ بجے تک مسلسل انھوں نے اسلامیات پر اپنا لیکچر دیا ہے، پھر کھانا وغیرہ کھا کے، نماز پڑھ کے اپنا لیکچر شروع کیا، عصر کا وقت ہو گیا عصر کے بعد پھر تقریر شروع ہوئی اور مغرب کے وقت کہیں جا کر اُٹھے!

جامعہ ملیہ کی اسکیم محمد علی نے باوجود اپنے گوناگوں کثیر مشاغل کے اور پھر ۱۹۲۰ء کی مشغولیت کا کیا عالم ہوگا، جامعہ ملیہ پر ایک مختصر سی اسکیم شائع کی تھی، اس میں مقاصد اور طریقہ تعلیم کے متعلق یوں سمجھئے کہ اشارات ہیں، اس لئے کہ نہ تفصیل کا وقت تھا اور نہ انھیں اس کی فرصت ہی تھی، اس اسکیم میں وہ لکھتے ہیں۔

"ہمارا مطمح نظر ہمیشہ یہ رہا ہے کہ ہم اپنی درس گاہوں سے ایسے نوجوان پیدا کریں جو

نہ صرف حسب معیار زمانہ حال تعلیم و تربیت یافتہ شمار کئے جانیکے مستحق ہوں، بلکہ سچے معنوں میں مسلمان بھی ہوں جن میں اسلام کی روح ہو اور جو اپنے مذہب کی تعلیمات سے اس قدر بہرہ اندوز ہو چکے ہوں کہ مبلغین اسلام کی فوج میں دوسروں کی امداد سے مستغنی و بے نیاز ہو کر خود اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکیں۔ اس مقصد کے لئے قرآن مجید سے پوری واقفیت حاصل کرنے کو ہم نے اپنی تعلیم کا سنگ بنیاد قرار دیا ہے، چنانچہ ہر منزل میں ہم نے اس امر کا انتظام کیا ہے کہ قرآن مجید کی تعلیم سمجھا کر دی جائے تاکہ مسلمانوں کی وہ جماعت جو اقتصادی یا دیگر وجوہ کی بنا پر منزل ابتدائی سے آگے بڑھنے کی استطاعت نہ رکھتی ہو، قرآن مقدس صرف ناظرہ ہی پڑھ لے۔"

آگے چل کر ارشاد ہوتا ہے۔

"بچوں کے دل میں یہ بخوبی راسخ کر دیا جائے کہ مسلمانوں کی ابتدائی فتوحات عقائد اسلامی کی صداقت، احکام اسلام کی عملی سودمندی اور ان پر سختی کے ساتھ عمل کرنے پر مبنی تھے۔ اور ہم اگر پھر اپنی گم شدہ عظمت کا اعادہ کرنا چاہتے ہیں تو اس کا صرف یہی طریقہ ہے کہ عقائد اور احکام اسلامی پر کاربند ہو جائیں اور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین کے نقش قدم پر چلیں"

یہ تھا مسلمانوں کی تعلیم کے متعلق محمد علی کا صحیح اسلامی تخیل۔

اور اپنے اس عقیدہ میں کہ جامعہ کے اندر ہر طالب علم مذہبی احساس سے لبریز ہو اور مذہبی روح اس میں پورے طور سے سرایت کر جائے وہ بہت زیادہ سختی سے عامل تھے۔

فلسفہ کی پروفیسر شپ | چنانچہ مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی مدظلہ کا بیان ہے کہ جب جامعہ

قائم ہوئی تو محمد علی نے جناب ممدوح کو جامعہ تشریف لانے کی دعوت دی، اور فلسفہ کی پروفیسری پیش کی۔

لیکن چونکہ اس وقت تک جناب ممدوح کے "مسلمان" ہونے کا محمد علی کو علم نہ تھا۔ اس لئے محمد علی نے یہ بھی لکھ دیا کہ آپ تشریف لائیے، لیکن اتنا لحاظ رہے کہ مجھے تعلیم سے زیادہ مذہب عزیز ہے تعلیم کو میں چھوڑ سکتا ہوں لیکن مذہب پس پشت نہیں ڈال سکتا۔

بعض اسباب کی بنا پر جناب ممدوح جامعہ تشریف نہ لا سکے۔

جامعہ سے بے تعلقی اور تعلق | تھوڑے عرصہ کے بعد محمد علی سیاسی مشغولیتوں میں ایسے مصروف ہوئے کہ پھر باوجود کوشش کے اس گرداب سے کبھی نہیں نکل سکے اور گو ان کی یہ خواہش ہمیشہ رہی کہ کبھی انھیں فراغ خاطر حاصل ہو تو وہ جامعہ میں اپنے اوقات عزیز صرف کریں، اور وہاں کے طلبہ میں پھر وہی روح پیدا کریں جو ان کے لئے وہ ضروری سمجھتے تھے لیکن ان کی یہ آرزوئے دیرینہ نہ پوری ہو سکی اور عملاً وہ کوئی خدمت نہیں کر سکے۔

لیکن اس بے تعلقی کے بعد بھی ان کا قلبی تعلق ہمیشہ جامعہ کے ساتھ رہا حکیم اجمل خاں کا جب انتقال ہوا تو محمد علی نے مسلسل ہمدرد میں مضامین لکھے اور لوگوں کو اس کی اعانت کی طرف مائل کیا

اسی طرح جامعہ جب دہلی میں آئی، تو انھوں نے مسلسل پروپگنڈا کیا، جامع مسجد میں تقریریں کیں اور لوگوں کو آمادہ کیا کہ وہ اپنے بچوں کو جامعہ ہی میں داخل کرائیں!

باب ۱۸

ناگپور کانگرس

اکتوبر سنہ ۲۰ء میں جامعہ کی تاسیس اور اس کے اندر نظم و انتظام قائم کر کے محمد علی نے ملک کا دورہ کیا اور ترک موالات کی حمایت کی فضا پیدا کی۔

ناگپور کانگرس پھر دسمبر سنہ ۲۰ء میں ناگپور میں کانگرس کا مشہور اور تاریخی اجلاس ہوا جس میں ترک تعاون کا پروگرام منظور کر لیا گیا اور گاندھی جی کے ہاتھ میں زمام قیادت سونپ دی گئی۔

خلافت کانفرنس خلافت کانفرنس کا اجلاس بھی اسی زمانہ میں ناگپور میں منعقد ہوا تھا مسلمانوں کے قلوب گورنمنٹ کے طرز عمل سے پاش پاش ہو رہے تھے، گورنمنٹ کی عالم اسلام پر دراز دستیوں اور وعدہ خلافیوں نے مسلمانوں کو آتش زیر پا کر رکھا تھا، اس سے پیشتر امرتسر، بمبئی اور دہلی کی خلافت کانفرنسوں میں ترک موالات کئی بار معرض بحث میں آچکا تھا اور رجحان عام اس کے قبول کر لینے پر آمادہ معلوم ہوتا تھا، چنانچہ ناگپور میں اس کی توثیق کر دی گئی اور طے کر لیا گیا کہ اب مسلمان بھی ترک موالات کی تحریک میں پورا حصہ لیں گے، مسلمانوں نے بھی اپنی قیادت کے لئے گاندھی جی کو منتخب کیا کیونکہ اس سے پیشتر گاندھی جی نے مسلمانوں کے مطالبات اور گورنمنٹ کی روش پر اپنی کارگزاریوں کا نہایت گراں بہا ثبوت دیا تھا اور مسلمانوں کی امداد و اعانت کے لئے ہر طرح آمادگی ظاہر کی تھی، پھر جنوبی افریقہ میں انھیں قیادت کا تجربہ بھی ہو چکا تھا، اس لئے مسلمانوں نے بلا پس و پیش گاندھی جی کی رہنمائی قبول کر لی اور اس طرح عدم تشدد کے وہ بھی پابند ہو گئے۔

اختلاف اس وقت تک کانگرس سے لبرل حضرات علٰحدہ نہیں ہوئے تھے اور وہ بھی اس

میں شریک ہوتے تھے، انھیں چونکہ یہ "غیر آئینی" روش پسند نہیں تھی، اس لئے وہ بھی پوری طاقت کے ساتھ کانگریس میں شریک ہوئے اور تجویز ترک موالات و ترک تعاون کو نامنظور کرانا چاہا۔

ہندوؤں میں پنڈت مالویہ اور مسلمانوں میں مسٹر جناح پیش پیش تھے۔

سی آر داس | مسٹر سی آر داس بھی اس وقت تک پریکٹس کر رہے تھے اور مقاطعہ اور ترک موالات کے وہ بھی شدید مخالفین میں تھے، اس لئے بظاہر بڑی پریشانی تھی کہ دیکھئے انجام کیا ہوتا ہے؟

محمد علی کی کوششیں | محمد علی نے اپنے آپ کو اس تجویز کے منظور کرانے کے لئے وقف کر دیا تھا کبھی گاندھی جی سے گفتگو کر رہے ہیں، کبھی مالوی جی سے مل رہے ہیں، کبھی مسٹر جناح کو سمجھا رہے ہیں اور کبھی سی آر داس کو مجبور کر رہے ہیں کبھی اور دوسرے لوگوں سے تبادلہ خیالات کر رہے ہیں اور انھیں تجویز کی اہمیت سمجھا رہے ہیں، غرض اس زمانہ میں محمد علی کا کھانا پینا بند ہو گیا تھا اور رات کی نیند حرام ہو گئی تھی۔

سی آر داس کی رضامندی | محمد علی کو سب سے زیادہ فکر سی آر داس کی تھی، ان کی نگاہ دور رس نے بھانپ لیا تھا کہ یہ جوہر قابل ہے، اگر ہاتھ آگیا تو تحریک کو چار چاند لگ جائیں گے، اس لئے محمد علی کا سارا زور سی آر داس پر صرف ہو رہا تھا، وہ انھیں دلائل سے، براہین سے، محبت سے، پیار سے، خفگی سے، دلا سے، غصہ سے، خوشامد سے ہر طریقہ سے ہموار کر رہے تھے کہ وہ اپنی لاکھوں روپیہ سالانہ کی پریکٹس پر لات مار دیں، ایک رات کو وہ اسی فکر میں غلطاں پیچاں گاندھی جی کے پاس سے واپس آ رہے تھے کہ داس نے محمد علی کا ہاتھ پکڑا اور الگ لیجا کر کہا، محمد علی! تمھاری رائے صحیح ہے میں نے طے کر لیا ہے کہ تحریک کی حمایت کروں اور اپنی پریکٹس چھوڑ دوں، محمد علی یہ سنتے ہی وفور مسرت سے داس کے گلے لپٹ گئے اور ان کے خوب ہی خوب بوسے لئے

محمد علی کو آخر عمر تک ہمیشہ اپنی اس خدمت پر فخر رہا کہ داس جیسی شخصیت کو میدان عمل میں

لانے والے وہی تھے۔

رہ گئے مسٹر جناح اور پنڈت مالویہ ان سے انھیں کوئی خاص امید نہیں تھی، اس لئے

تجویز پاس ہوگئی | اب وہ بے فکر ہوگئے، بڑے ہنگاموں اور بڑے اندیشہ اختلاف کے بعد یہ تجویز کانگرس نے منظور کی۔

نتیجہ | اس سے ایک نتیجہ تو یہ نکلا کہ سارے ہندوستان میں ایک روح عمل تازہ ہوگئی اور ہر شخص کے دل میں آزادی کی تڑپ اور سر میں آزادی کا سودا پیدا ہوگیا، بچہ بچہ آزادی کا علمبردار تھا۔

دوسرا اہم نتیجہ یہ نکلا، کہ کانگرس معتدلین اور عافیت پسند ممبران سے خالی ہوگئی، وہی تاریخی کانگرس ہے جس کے بعد سے پھر مسٹر جناح اور دوسرے معتدلین کبھی کانگرس میں شریک نہ ہوئے، گو ملک پر بڑے بڑے نازک دور آئے اور گزر گئے۔

تحریک کا آغاز | اب تجویز کے منظور ہوجانے کے بعد گاندھی جی نے محمد علی اور شوکت علی کے ساتھ سارے ملک کا دورہ کرنا شروع کیا۔

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ گاندھی جی اور علی برادران کی غیر معمولی کوششوں اور سرگرمیوں کا یہ مفید نتیجہ نکلا کہ انگریزوں کا ڈر عوام کے دل سے کافور ہوگیا، قیدخانہ ایک مذاق رہ گیا اور گرفتاری ایک کھیل۔ یاد ہوگا وہی وہ تحریک تھی جس میں انگریزوں کے اقتدار کا خاتمہ ہوا، اور ہندوستانیوں میں مرنے کی تڑپ پیدا ہوگئی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہندو بھی اپنے اندر مرمٹنے کی آرزو پانے لگے۔

ولنٹائل شرل کا خیال | مشہور ماہر سیاست و فلسفہ ولنٹائل شرل اپنی کتاب Unrest in India کے آخری ایڈیشن میں کتنی سچی بات لکھتے ہیں کہ

> "مسلمانان ہند کو انگریزوں کے خلاف بھڑکانے کی سب سے زیادہ ذمہ داری علی برادران کی گردن پر ہے جنھوں نے کانگرس میں دخیل ہوکر امن پسند ہندوؤں میں جرأت کے عناصر پیدا کئے اور ادھر مسلمان فوج کو بغاوت پر آمادہ کیا۔"

باب ۱۹

تحریک خلافت

ناگپور کانگرس کے بعد محمد علی کی زندگی کا وہ رخ شروع ہوتا ہے جس میں محمد علی نے اپنی قوت قیادت، قوت فیصلہ اور قوت عمل کا دوست دشمن، موافق، مخالف، سب سے اعتراف کرا لیا اور جس بے نظیر اور عدیم المثال قوت ایمان و عمل کا تذکرہ ہندوستان کے آئندہ مورخ کے لئے ناگزیر ہے۔

دورہ | محمد علی نے اس زمانہ میں تقریباً سارے ہندوستان کا دورہ کیا، اور جہاں بھی وہ گئے ان کے یمن قدم سے ہر جگہ ایک نئی فضا اور ایک تازہ حرکت پیدا ہو گئی جس نے ملوکیت کے قصر فلک بوس میں تزلزل پیدا کر دیا۔

انھوں نے لکھنؤ، اجمیر، علی گڑھ، دہلی، بمبئی، الہ آباد، مدراس، بنگال، آسام، پنجاب، تمام مقامات کا دورہ کیا اور جہاں بھی وہ گئے کامیابی ان کے قدم لینے کو بڑھی اور اقبال نے ان کے آگے سر جھکایا۔

جوش و خروش | جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ وہ دیہاتی جنھیں "لال پگڑی" کو دیکھ کر تپ و لرزہ کی شکایت پیدا ہو جاتی تھی، وہ مردانہ وار استقبال کرتے تھے، جلسوں میں شریک ہوتے، جلوسوں میں حصہ لیتے تھے، پولیس اور فوج کے سامنے اللہ اکبر اور ہندو مسلم اتحاد کی جے کے رفع پرور نعرے لگاتے تھے، ڈنڈے کھاتے تھے اور گولیاں اپنے سینہ پر روکتے تھے، نہ انھیں موت سے ہراس تھا نہ جیل کا ڈر نہ بال بچوں کی پروا۔

وہ جب جیل جاتے تھے تو ان کے گھر والے انھیں مبارکباد دیتے تھے، ان کے دوست احباب

خوش ہوتے تھے، اور ان کے اہل و عیال اس کارنامہ پر فخر سے اپنا سر اٹھاتے تھے۔

بچوں کا یہ حال تھا کہ خلافت اور خلیفہ کے معنی سے ناآشنا تھے، اسلام اور اسلامیت کے مفہوم سے ناواقف تھے، تحریک اور تحریک کے محرکین سے بے خبر تھے، وہ تو بس گاندھی جی کو جانتے تھے اور "مولی شوکلی" (محمد علی شوکت علی) سے واقف تھے۔

صبح ہوئی اور ان کا قافلہ چلا، شام ہوئی اور انھوں نے بازار کا رُخ کیا، کوئی گاندھی جی کی جے کے نعرے لگا رہا ہے، کوئی علی برادران کے جیکارے بھر رہا ہے کوئی سودیشی کا پرچار کر رہا ہے، کوئی گورنمنٹ کے متعلق سر راہ پیشین گوئیاں کر رہا ہے اور جب گرفتاری کا وقت آتا ہے تو نہسی خوشی مسرت سے سربلند ہو کر سپاہیوں کو مجبور کر رہا ہے کہ ہمیں بھی گرفتار کر و اور اگر سپاہی بچہ سمجھ کر چھوڑ گیا ہے تو وہ وہیں مچل جاتا ہے اور رونے لگتا ہے، اس کا رونا جب ہی بند ہو سکتا تھا جب وہ گرفتار کر لیا جائے، اسیر زنداں کر دیا جائے۔

شوق گرفتاری بڑے بڑے ثقہ لوگوں کا بیان ہے کہ بعض مشہور شہروں میں جب فوج یا پولیس کی جماعت لاریاں لے کر گرفتار کرنے آتی تھی تو بیتابی اور اشتیاق کا یہ عالم ہوتا تھا کہ لاری میں بیٹھنے کی جگہ نہیں رہتی تھی اور گرفتار ہونے والے وفور شوق میں لاری کے پائدان پر کھڑے ہو ہو کر اپنے تئیں گرفتاری کے لئے پیش کرتے تھے اور جب تک عروس تمنا سے ہمکنار نہیں ہو جاتے تھے ان کی حالت دیوانوں کی سی رہتی تھی۔

چندہ اسی زمانہ میں کانگرس فنڈ اور خلافت فنڈ کے لئے چندہ کی تحریک شروع ہوئی اور شاید ایک کرور کا مطالبہ ایک نہایت ہی مختصر اور محدود زمانہ میں کیا گیا کہ اتنے عرصہ تک یہ چندہ ضرور جمع ہو جائے۔

والنٹیروں کے دستے گھومنے لگے اور غریب فاقہ مست مزدوروں اور کام کرنے والوں سے

چندہ مانگنے لگے، اس زمانہ میں کسی خاص تحریک کی ضرورت نہیں تھی، صرف ذرا سا اشارہ کر دیجئے۔ اور اتنا چندہ جمع کر لیجئے کہ چندہ دینے والوں کو ابھی چندہ دینے سے سیری نہ ہو اور آپ کو "تنگیٔ داماں" کی شکایت ہو جائے۔

جو غریب تھے انھوں نے اپنی مزدوری کاٹ کاٹ کر پیسے جمع کئے اور چندہ دیا، جو محتاج تھے انھوں نے اپنے گھر کی چارپائیاں، لوٹے اور برتن رہن رکھے اور چندہ دیا، جو اس وقت خالی ہاتھ تھے انھوں نے اپنی بیویوں سے انکا زیور مانگا انھوں نے ہنسی خوشی زیور اتار، پوٹلی باندھ شوہر کے سامنے لا کر رکھ دی، شوہر صاحب گئے اور چندہ دیا "سرخرو" ہوئے۔

یہ تو تھا غریب طبقہ کا حال، اگرچہ اس زمانہ میں سرمایہ داروں نے کوئی خاص مدد نہیں پہنچائی لیکن طبقہ متوسط نے ایثار و قربانی، فدائیت اور جاں نثاری کی انتہا کر دی۔

ترک ملازمت اسی طبقہ کے افراد تھے جنھوں نے ملازمتیں چھوڑیں، فاقے کئے، میلے کچیلے کپڑے پہنے اور لاکھ لاکھ اصرار کے بعد بھی ان کا انکار برابر قائم رہا اور وہ اپنے ارادہ سے نہ ہٹے، طالب علم

ترک تعلیم جو تھے انھوں نے اسکول بند کرائے، کالج خالی کرا دئے، یونیورسٹیوں میں قفل لگوا دئے اور جوق در جوق اللہ کے راستے میں شدائد و مصائب برداشت کرنے کے لئے چل کھڑے ہوئے، نہ راہ کے مصائب کا خوف نہ فقر و فاقہ کا ڈر، ایک عزم تھا جو سب کچھ کرائے جا رہا تھا! کیا زمانہ تھا۔

اور اس سارے نظام کی محور، ایک ذات تھی، محمد علی! جس کی طرف اشارہ کر دیا اس نے وکالت چھوڑ دی، جس کی طرف دیکھ لیا، اس نے نوکری چھوڑ دی اور جس سے کہدیا وہ جیل خانہ ہو آیا۔

اتفاق و اتحاد ایک یہ زمانہ ہے کہ ہندو مسلمان سے متنفر، اور مسلمان ہندو سے بیزار، اور

ایک وہ مبارک و مسعود زمانہ تھا کہ ہندو مسلمان دونوں بھائی بھائی معلوم ہوتے تھے، عید ہوئی اور ہندوؤں نے سبیل لگا دی، شربت پلا رہے ہیں اور راہ گیر مسلمانوں کی ہر طرح سے خاطر تواضع کر رہے ہیں، کبھی پان کھلاتے ہیں، کہیں پوریاں پیش کی جاتی ہیں، کبھی الائچی۔

ہولی آئی اور مسلمانوں نے اظہار مسرت شروع کر دیا، اپنے ہندو بھائیوں کی دعوتیں کیں، ان کی خوشی پر خوش ہوئے اور ہر طرح سے ان کی دلچسپی میں اضافہ کرنے کی کوشش کی! وہ زمانہ ہوا کی طرح آیا اور بادل کی طرح نکل گیا۔

باب ۲۰

معافی کا افسانہ!

اسی زمانہ میں کہ محمد علی کا طوطی بول رہا تھا، ہر شخص ان کے نام کا کلمہ پڑھ رہا تھا اور وہ یلغار کرتے ہوئے سارے ہندوستان کو "فتح" کر رہے تھے کہ ہندوستان بھر میں یہ افواہ مصدقہ طور سے اڑی اور بڑی شہرت کے ساتھ اڑی کہ

علی برادران کی "معافی" علی برادران نے گورنمنٹ سے معافی مانگ لی! ہر شخص انگشت بدنداں رہ گیا کہ علی برادران اور معافی!

مگر بڑے زور شور سے یقین دلایا گیا کہ ہاں علی برادران نے معافی مانگ لی! گورنمنٹ کے سامنے توبہ کر لی!

مقصد اس افواہ کا مقصد یہ تھا کہ علی برادران کا بڑھتا ہوا اثر زائل ہو جائے اور رائے عامہ ان سے برگشتہ ہو جائے، تاکہ علی برادران اپنے مقاصد "مشئومہ" میں کامیاب نہ ہو سکیں اور جس "پبلک" کے بل پر وہ اتنا ہنگامہ برپا کر رہے ہیں وہی ان کے خلاف ہو کر ان کی زندگی دوبھر کر دے۔

اثر لیکن اس خبر کو جس عیارانہ سرعت کے ساتھ پھیلایا گیا، اسی قدر اس میں ناکامی ہوئی۔ سننے کو تو ہر شخص نے سن لیا، مگر یقین کسی کو بھی نہ آیا۔ ہر شخص نے خندۂ استحقار سے "مخبر کاذب" کی اس خبر کی تکذیب کی اور علی برادران کے اثر و رسوخ میں کوئی فرق نہ آیا وہ سارے ہندوستان کے اسی طرح سرتاج رہے اور سارے ہندوستان نے اسی عقیدت و محبت کا ان سے برتاؤ کیا جس کے وہ مستحق تھے۔

محمد علی کا بیان خوش قسمتی سے اس مسئلہ کے متعلق خود محمد علی نے ضمناً نہایت تفصیل سے اظہار

خیال کیا ہے جس سے ساری حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے، اہم اقتباس یہ ہے۔

گاندھی جی کی لارڈ ریڈنگ سے ملاقات | "مہاتما گاندھی لارڈ ریڈنگ سے جو اس وقت نووارد وائسرائے تھے شملہ میں ملے، ان پر اس ملاقات سے یہ اثر ہوا کہ لارڈ ریڈنگ ہندوستان کو آزادی دلانے اور خلافت ترکیہ کے اقتدار و قوت کو بحال کرانے میں مدد دیں گے مگر وہ فقط اس کے خواہاں ہیں کہ ترک تعاون کی تحریک تشدد سے بری رہے۔

سازش کا الزام | ہمارے خلاف یہ خبر مشہور تھی کہ ہمارے پاس اعلیٰحضرت شاہ افغانستان کا بھیجا ہوا ایک آدمی آیا تھا اور ہم ہندوستان پر افغانستان کا قبضہ کرا دینا چاہتے ہیں، افغانی ہوے سے بعض ڈرنے والے ہنود نے مہاتما جی کو پریشان کر رکھا تھا کہ آپ ان دونوں بھائیوں پر اس قدر اعتماد کیوں کرتے ہیں۔

انڈیپنڈنٹ کے نمائندہ کے سوالات | ان کو مطمئن کرنے کی غرض سے مہاتما جی نے مجھ سے چند سوالات کرائے اور میرے جوابات افغانی حملہ اور قبضۂ ہندوستان کے متعلق حاصل کئے اور انڈیپنڈنٹ اخبار میں شائع کرا دئے۔

شبہ مالوی اور سپرو کو تھا | پھر مالوی جی اور ڈاکٹر سپرو نے انہیں ہماری تقریروں کے چند چھوٹے سچے سیاق و سباق سے بے تعلق اقتباسات اس غرض سے دکھائے کہ انہیں ہم سے بدظن کر دیں۔

لارڈ ریڈنگ کا مواد | یہی اقتباسات لارڈ ریڈنگ نے انہیں دکھائے تھے اور مہاتما جی کو یہی مناسب معلوم ہوا کہ ان کے متعلق ہمارا ایک بیان شائع کر دیا جائے کہ مہاتما گاندھی کی ترک تعاون کی تحریک میں رہ کر ہمارا ارادہ نہیں ہے کہ ہم تشدد سے سوراج حاصل کریں، لیکن بعض احباب پر ہماری تقریروں کا یہ غلط اثر پڑا ہے اس لئے ہم

اظہار افسوس کرتے ہیں کہ ہم نے کیوں ایسے الفاظ استعمال کئے جن سے یہ غلط مطلب بھی نکل سکتا ہے، ہمارا خیال کبھی بھی نہ تھا کہ لارڈ ریڈنگ اسلام کا بھلا چاہتے ہیں لیکن ہم نہیں چاہتے تھے کہ ہم ایک ایسا بیان شائع کرنے سے انکار کریں اور ہمارے ہندو دشمن مہاتما جی کو ہم سے یہ کہہ کر بدگمان کردیں کہ یہ مسلمان سوراج چاہتے ہی کب ہیں؟ ان کو تو مسلمان راج مطلوب ہے اور یہ تشدد اور افغانی مدد سے ہندوستان کو غلام بنانا چاہتے ہیں، اسی لئے ایسا بیان دینے سے انکار کرتے ہیں اور یہ تو بہت ممکن تھا کہ مہاتما جی بعد کو کہتے کہ لارڈ ریڈنگ ہندوستان کو سوراج دلاتے دلاتے صرف اسی وجہ سے رک گئے کہ ہم نے بیان مطلوبہ نہ دیا، اس خیال سے ہم بیان دینے پر اسی وقت راضی ہو گئے، مگر میں نے کہا کہ پہلے وہ اقتباسات تو دیکھوں جن کی اس طرح تاویل کی گئی ہے مہاتما جی اس کی معقولیت کے قائل ہو گئے اور وائسرائے کو تار دیا کہ وہ اقتباسات بمبئی ارسال کر دئے جائیں، احتیاطاً مالوی جی کو بھی اسی مطلب کا تار دیا گیا۔

وائسرائے کا انکار وائسرائے مالوی جی سے بھی زیادہ کائیاں تھے، انھوں نے ہماری تقریروں کے اقتباسات بھیجنے سے قطعاً انکار کر دیا مگر مالوی جی نے ارسال فرما دئے میں نے جب یہ اقتباسات پڑھے تو دیکھتے ہی کہہ دیا کہ بعض تو غلط فہمی یا غلط سننے یا غلط نویسی کا نتیجہ ہیں اور بعض کو صریحاً غلط معنی پہنائے جا رہے ہیں، ایک بھی اقتباس ایسا نہیں ہے جس سے تشدد کی ترغیب یا نیت ثابت ہوتی ہو۔

بیان دینے سے انکار اس لئے ہم نے انکار کر دیا کہ ہم ایسا بیان ہرگز نہ دیں گے، البتہ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ گو نہ ہمارا یہ مقصد تھا نہ ان تقریروں ہی سے یہ

مطلب سمجھ میں آسکتا ہے، تاہم چونکہ بعض سربرآوردہ حضرات نے اس کے یہ معنی نکالے ہیں، افسوس ہے کہ ایسا ہوا، اور ہم ہر شخص کو اس کا یقین دلاتے ہیں کہ ہماری نیت نہیں ہے کہ ترک تعاون کی تحریک میں ہم کسی کو تشدد کی ترغیب دیں چنانچہ ہم نے یہی

بیان کی اشاعت

بیان شائع کردیا اور اس کے شائع کئے جانے کے بعد مہاتما جی نے وائسرائے کو بھی اس کی اطلاع دیدی، اشاعت سے پہلے اس ترمیم کی جس پر ہمیں اصرار تھا وائسرائے کو اطلاع نہ دی گئی تھی، اس لئے کہ مہاتما جی نے فرمایا تھا کہ یہ بیان تمہارا ہے جو جی چاہے لکھو، وائسرائے کے حکم سے کچھ نہیں لکھا جارہا ہے کہ ان کی منظوری ترمیم کے متعلق پہلے حاصل کرلی جائے۔ اور نہ یہ بیان تم وائسرائے کو

وائسرائے کے لئے نہیں

اطمینان دلانے کے لئے دے رہے ہو بلکہ اپنے ہندوستانی بھائیوں کی غلط فہمی رفع کرنا مقصود ہے تو ان کے اطمینان کے ساتھ وائسرائے کو بھی اطمینان ہوجائے گا، نہ مہاتما جی نے مجھ سے فرمایا نہ مجھے اس کا وہم وگمان تھا کہ ہمارا بیان اس لئے شائع کیا جانے والا تھا کہ ہم سزا سے بچائے جائیں، وائسرائے نے جس وقت مہاتما جی کو وہ اقتباسات دکھائے تھے جو مالوی جی اور ڈاکٹر سپرو پہلے ہی نہیں دکھاچکے تھے تو مہاتما جی نے ارشاد فرمایا تھا کہ میرا ارادہ ہے کہ میں اس قسم کا بیان ان دونوں بھائیوں سے کہہ کر شائع کرادوں تاکہ ان کے بعد پھر کسی کو بے اطمینانی کے لئے

وائسرائے کی گاندھی جی سے گفتگو

کوئی عذر بھی باقی نہ رہے اس پر وائسرائے نے کہا تھا کہ یہ بہت ہی اچھا ہوگا حکومت ہند نے فیصلہ کیا تھا کہ علی برادران پر مقدمہ چلایا جائے لیکن اگر یہ بیان شائع ہوجائے گا تو پھر مقدمہ چلانیکی کوئی ضرورت نہ رہے گی یہ سن کے

گاندھی جی کا جواب

مہاتما گاندھی نے فرمایا کہ مقدمہ چلانا یا نہ چلانا آپ کا کام ہے، اس

سے ہمیں کوئی غرض نہیں، ہمیں تو ایک ضروری بیان شائع کرانا ہے اور وہ ہمارا ہر حالت
میں فرض ہے، خواہ آپ مقدمہ چلائیں یا نہ چلائیں، یہ سب سے آخری وائسرائے سے
ملاقات تھی۔

مقدمہ چلانے کا ذکر | اور مقدمہ چلانے کا اس سے پہلے کبھی بھی ذکر نہیں آیا تھا، ورنہ شبہ ہوتا
کہ وائسرائے کی اس دھمکی پر مہاتماجی نے ہمارے بچانے کی یہ صورت نکالی تھی تاہم
جب ہمارا بیان شائع ہوا تو وائسرائے کا تار مہاتماجی کے نام کچھ اس انداز کا آیا کہ گویا
ہمارا یہ بیان وائسرائے کے حکم سے شائع کیا گیا تھا اور ہماری ترمیم انھوں نے کرم فرما کر
منظور فرمائی تھی ہم اس وقت بمبئی جا رہے تھے، مہاتماجی نے خاموشی کا دن
شروع کر دیا تھا، وہ تو نہ بول سکتے تھے مگر تار دیکھ کر ہمیں کھٹکا کہ اس کے غلط معنی تو
نہیں پہنائے جا رہے ہیں اور مہاتماجی سے عرض کیا کہ یہ تو کچھ اور ہی فرما رہے ہیں
انھوں نے مسکرا کر سر ہلا دیا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ بھی ایسا ہی خیال کرنے لگے
بہرحال ہم رو ج میں میرے ایک دوست رات کے دس گیارہ بجے بمبئی سے خاص
اسی غرض سے آئے کہ مجھے بمبئی کرانیکل کا وہ پرچہ دکھائیں۔

لارڈ ریڈنگ کی تقریر | جس میں لارڈ ریڈنگ کی چیمسفورڈ کلب والی تقریر تھی جو مہاتماجی کی
ملاقاتوں اور ہمارے اس بیان کے متعلق دی گئی تھی اور جس کی غرض سے سر محمد شفیع
نے لاٹ صاحب بہادر کو دعوت دی تھی تاکہ اپنے دو مسلمان بھائیوں کو ذلیل و
خوار کر سکیں اس تقریر میں مہاتماجی کی بہت تحقیر کی گئی تھی اور بتایا گیا تھا کہ وہ ملاقات
کے سائل بن کر آئے تھے، حالانکہ ہر شخص جانتا ہے کہ در اصل

مالوی جی کا بلانا | لاٹ صاحب بہادر کی طرف سے مالوی جی نے اپنی علالت کا عذر

کرکے اور یہ کہہ کر کہ اگر آپ مجھ سے ملنے نہ آسکیں تو اسی حالت میں ہیں آپ سے ملنے الہ آباد آؤں، مہاتما جی کو بلایا تھا،

لارڈ ریڈنگ کی عیاری

لارڈ ریڈنگ سے زیادہ کوئی چالاک وائسرائے اس صدی میں تو ہندوستان آیا نہ تھا، انھوں نے یہ چالاکی کی کہ اپنی تقریر میں ملاقاتوں کا ذکر کچھ اس طرح کیا کہ پہلے اپنی ساری گفتگو سنا دی، پھر مہاتما جی کا جواب، حالانکہ گفتگو چھ ملاقاتوں میں ہوئی تھی اور اس کا مجموعی دوران پندرہ گھنٹے تھا اور ظاہر ہے کہ نہ سات آٹھ گھنٹے لاٹ صاحب تقریر فرماتے رہے تھے نہ اتنی ہی دیر اس کے بعد مہاتما جی، بلکہ چند منٹ ایک بولتا ہوگا چند منٹ دوسرا، اس طریقہ پر گفتگو کا خلاصہ کرنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ لوگ سمجھے کہ وائسرائے نے مہاتما جی سے کہا کہ ہم علی برادران پر مقدمہ چلانے والے ہیں اور مہاتما جی نے جواب دیا کہ میں ان سے کہہ کر اظہار افسوس کرائے دیتا ہوں اور اس طرح ہم دو غریبوں کی جان بخشی ہوئی اور ہم نے سزا کے ڈر سے لاٹ صاحب سے معافی مانگ لی۔

حسرت کا خط

چنانچہ میرے جلد باز بھائی مولانا حسرت موہانی نے اس تقریر کو پڑھتے ہی مجھ کو ایک کارڈ لکھا جس میں درج تھا کہ اگر مہاتما جی نے تمھیں اس بیان کو شائع کرنے سے پہلے اطلاع دیدی تھی کہ وائسرائے نے اس شرط پر تمھیں معاف کیا ہے تو تم سے بڑھ کر بزدل کوئی نہیں اور اگر انھوں نے اس کی اطلاع تمھیں نہ دی تھی تو ان سے بڑھ کر کوئی بے ایمان نہیں۔

لیکن میرے ان جوشیلے بھائی کو یہ نہ سوجھا کہ ایک صورت یہ بھی ہوسکتی تھی کہ لارڈ ریڈنگ نے ملاقات کا خلاصہ غلط دیا ہو بہرحال جب میں نے چیمسفورڈ کلب والی

تقریر سنی۔

تقریر سے تاثر | تو سارا بدن پھنک گیا اور میں نے تہیا تا جی سے اسی قدر کہا کہ اجازت ہو تو اس کا جواب دیدوں، جلسہ خلافت کا تھا میں صدر تھا، تقریر صدارت کچھ اور ہونے

تقریر | والی تھی، مگر اس کے بعد میں نے صرف لارڈ ریڈنگ کی تلبیس کا پردہ چاک کیا اور شکل ہی سے میں نے ساری عمر میں اس سے زیادہ سخت کوئی اور تقریر کی ہو گی غالباً جون ۱۹۲۱ء کے ممبئی کرانیکل میں اس کی مفصل رپورٹ شائع ہوئی تھی جس کے بعد لاٹ صاحب بہادر کو بھی جواب دینا پڑا کہ باوجود اس دعوے کے جو لاٹ صاحب کی تقریر ہی میں موجود تھا کہ اگر تشدد کی ترغیب نہ دی گئی اور محض حکومت سے لوگوں کو بددل کیا گیا تو دفعہ ۱۲۴ الف کے جرم میں کسی تارک تعاون کو ماخوذ کر کے مقدمہ نہ چلایا جائے گا۔

لارڈ ریڈنگ کی تحریک | انھوں نے (وائسرائے نے) حکومت بمبئی کو مجبور کیا کہ مجھ پر کراچی خلافت کانفرنس کے ایک ریزولیوشن کی بنا پر مقدمہ چلائے، اور احتیاطاً کراچی کی ایک اور تقریر پر بھی دفعہ ۱۲۴ الف کے ماتحت مقدمہ چلایا جائے اور وعدہ خلافی سے بچنے کے لئے یہ عذر بھی تلاش کر لیا گیا کہ گو تشدد کی ترغیب نہ تھی لیکن کراچی کانفرنس کی تجویز مسلمان سپاہیوں کو ہتھیار ڈالنے کی طرف مائل کرتی تھی اور یہ تشدد سے بھی بدتر ہے۔

سر سپرو کی "مساعی حسنہ" | سب لوگ جانتے ہیں کہ کس طرح ڈاکٹر سپرو بمبئی گئے اور اڈوکیٹ جنرل کو پیروی کرنے پر آمادہ کرنا چاہا اور بالآخر الہ آباد ہی کے ایک انگریز بیرسٹر مسٹر اسٹن کو اٹھارہ ہزار نے کر بہائے حبس دوام کی سزا کا سامان کیا گیا، مگر

کس طرح جیوری کے عیسائی اور انگریز اراکین نے بھی حق کی حمایت کی اور ہم کو بری کر دیا، مگر جوڈیشیل کمشنر نے ایک اور الزام پر ہم کو دو دو برس کی سزا دیدی۔

اس مقدمہ سے پیشتر مہاتما جی نے وائسرائے کو زچ کر دیا تھا، اور باوجود مالوی جی کی اس عنایت کے کہ انھوں نے لاٹ صاحب کی طرف سے حق وکالت پوری طرح ادا کیا، مہاتما جی نے وائسرائے کو صاف لکھ دیا کہ | گاندھی جی کی وائسرائے کے نام تحریر

علی برادران کا روئے سخن تمھاری طرف نہ تھا بلکہ اپنے اہل وطن (مثلاً مالوی جی اور ڈاکٹر سپرو) کی طرف تھا اور ان کے اظہار افسوس کے ہرگز یہ معنی نہ تھے کہ وہ تم سے معافی مانگ رہے تھے اور اپنا ایک علٰحدہ بیان شائع کرنے کی دھمکی دے کر وائسرائے کو مجبور کر دیا کہ وہ ایک متفقہ بیان شائع کریں جس میں صاف اقبال ہو کہ ہمارا بیان کسی سمجھوتے کی بنا پر اور مول تول کرنے کی غرض سے ہرگز نہ دیا گیا تھا اور مقدمہ چلانے کا ذکر وائسرائے نے اسی وقت کیا تھا جب مہاتما جی خود پہلے ہی کہہ چکے تھے کہ وہ ہم سے ایک بیان شائع کرنے کے لئے کہنے والے ہیں "

یہ ہے اس معافی کی حقیقت جسے اس زمانہ میں ہر ہر دیہات اور قصبہ کے لور پرائمری اسکولوں تک میں پہنچایا گیا تھا اور مشتہر کیا گیا تھا کہ دیکھو تمھارے سب سے بڑے سورما اور بہادر گورنمنٹ بہادر سے اس طرح لرزتے ہیں کہ ذرا سی گرفتاری کی دھمکی پر معافی مانگنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔

دنیا کو یہ حقیقت خوب معلوم ہے کہ اس فریب کارانہ جدوجہد کا کیا نتیجہ ہوا؟ اور علی برادران کی رفعت و عزت میں فرق آیا یا اضافہ ہوا؟

اس پرلطف "معافی" کے بعد اب انکی گرفتاری اور سزایابی کا زمانہ آتا ہے یعنی مشہور مقدمہ کراچی کے حالات اس کی ضروری تفصیل و اسباب و علل پر بحث آئندہ سطور میں ہو گی۔

کی گرج کرۂ عدالت میں گونجی اور گو مجسٹریٹ اور جج سب ہی زچ ہوئے، مگر متاثر ہوکے آخر سب ہی خاموش ہو رہے۔

اس جگہ عدالت سے ان کی آئینی جنگ کو طوالت کے خیال سے نظر انداز کیا جاتا ہے لیکن جن لوگوں نے مقدمہ کراچی پڑھا ہے وہ محمد علی کی شجاعت و بسالت کا صحیح اندازہ کر سکتے ہیں اور معلوم کر سکتے ہیں کہ اس وقت جب وہ ایسے الزام میں ماخوذ تھے جس میں پھانسی اور کم از کم حبس دوام کی سزا بآسانی دی جا سکتی تھی، اس وقت بھی ان کی زبان کلمۂ حق سے خاموش نہیں ہوئی۔

سزا کا اثر | محمد علی اور ان کے رفقا کی سزایابی نے ہندوستان کے جواں ہمت فرزندوں میں ایک اور ولولہ پیدا کر دیا اور تحریک کی رفتار میں بہت زیادہ خلاف توقع اضافہ ہو گیا۔

وہی زمانہ تھا جب ہر گھر خلافت کمیٹی کا دفتر اور ہر فرد خلافت کمیٹی کا ممبر تھا۔ بیگم محمد علی اور بی اماں محیر العقول طریقہ پر سارے ہندوستان کا دورہ کر رہی تھیں اور خلافت فنڈ کے لئے چندہ جمع کر رہی تھیں، مسلمان خواتین میں اتنے جوش عمل کا اندازہ بعد کو ہوا۔

احباب پر اثر | یہ معلوم ہو چکا ہے کہ محمد علی کو اور ان کے رفقا کو سزائے بامشقت ہوئی تھی۔

محمد علی کے احباب محمد علی کے طرز ماندو بود سے پورے طور سے واقف تھے، اس لئے جب ان کے کانوں میں یہ خبر پڑی کہ سزا بامشقت ہوئی ہے اور بعد کو پھر قید تنہائی کا بھی اضافہ ہوا ہے تو ان کے قلق و اضطراب کی انتہا نہ رہی۔

ایک یادگار واقعہ | چنانچہ اسی حکم سزا کو جب محمد علی کے ایک عزیز، مخلص اور "سچے" دوست نے سنا تو اسی دن سے انھوں نے چارپائی پر استراحت کرنا ترک کر دیا۔

چونکہ ایک مباح چیز کو وہ حرام نہیں کر سکتے اس لئے کبھی کبھی تو چارپائی ضرور استعمال

کر لیتے ہیں، لیکن اکثر و بیشتر فرش خاک ہی ان کا فرش خواب ہوتا ہے! خلوص و محبت کی ایسی روح پرور مثالیں آج کل کس قدر کمیاب ہیں؟

تاثرات ماجد | اسی زمانہ میں، یعنی اسیری کے بعد سچ کے فاضل ایڈیٹر نے محمد علی پر ایک دوسری تقریب کے سلسلہ میں خیالات و تاثرات ذیل کا اظہار فرمایا تھا۔

"کارساز عالم کی کارسازیوں میں شاید یہ سب سے عجیب تر حقیقت یہ ہو کہ کائنات کے اہم ترین حوادث و نتائج کے وجود کا ذمہ دار ایسے ذرائع واسباب کو بنایا جاتا ہے جو بہ ظاہر اس کے قطعی منافی اور عقل بشری کے اعتبار سے بالکل بعید از قیاس ہوتے ہیں۔

بجلی کا خزانہ پانی کے دھارے میں مخفی نکلتا ہے، آتش سوزاں کے شرارے ہری ہری شاخوں کی رگڑ سے پیدا ہوتے ہیں، خلیل بت شکن کی صدائے توحید بت پرستی کے مرکز سے بلند ہوتی ہے، آزادی کی شعاعیں استبداد کی گہری تاریکیوں سے پھوٹ کر نکلتی ہیں

یہ اسی لطیف و خبیر صناع کی صنعت گری تھی جس نے بیسویں صدی عیسوی کی روشن خیال، علم پرور اور شائستگی نواز دنیا کو ایک بار پھر صحابۂ کرام کے صدق عمل خلوص قلب و پختگی ایمان کا زندہ نمونہ دکھا دیا اور اس غرض کے لئے انتخاب ایسے شخص کا کیا جس کی ایک عمر اس طرح گزری کہ ہر ہر سانس فرنگیت کی فضا میں آتی اور جاتی تھی ورنہ چند سال پیشتر کس انسانی دماغ کو یہ اندازہ ہو سکتا تھا کہ علیگڑھ کی روشن خیالی فرنگی محل کی مولویت کے ہاتھ پر بالآخر بیعت کرے گی؟ انگریزی زبان کا سحر نگار انشا پرداز اپنے بہترین اوقات کو حفظ قرآن کے لئے وقف کرے گا

مارگولیس کا شاگرد شہنشاہ کونین کے عشق میں بلال واویس کے جوش جنوں کی یاد تازہ کرے گا، مل و مارلی گلیڈاسٹن و بریڈلا کے مدرسۂ تحقیق کے فاضل کو قصباتی قوالوں کی غیر مہذب صدائیں رقص و وجد میں لائیں گی، آکسفورڈ کا آنرز مین گریجویٹ سلسلہ عالیہ قادریہ کی غلامی پر فخر کرے گا، نفیس اور بیش بہا سوٹ پہننے والا جیلخانے کی پھٹی پرانی، میلی کچیلی کملی شوق سے اوڑھے گا، مخمل کے کوچ اور پر تکلف مسہری پر لیٹنے والا کھرّی زمین کے مرطوب فرش پر جاڑے کے جاڑے ہنسی خوشی کاٹ دیگا اور صوبہ کے گورنروں، پارلیمنٹ کے ممبروں اور امرا ہند و انگلستان کا وہ عزیز دوست جس کا ایک دن بھی بغیر سرکاری ضیافتوں اور پارٹیوں کے بمشکل گزرتا تھا، وہ ایک دو وقت نہیں مدتوں وہ غذا کھا کر رزاق مطلق کا شکر ادا کرے گا جس کی جانب انسان تو الگ رہے ان حکام والا مقام اور امراء نامدار کے کتے بھی شاید رخ نہ کرتے "

مولانا عبد الماجد صاحب مدظلہ کے اس پر اثر تاثر نے محمد علی کی زندگی کے ہر رخ کو "ظاہر و باہر" کر دیا ہے، وہ بھی جب وہ "مسٹر" تھے اور وہ بھی جب وہ "مولانا" ہو گئے اس مرقع میں ان کی عیش و عشرت اور پھر بعد کو شدائد و مصائب کا پورا اندازہ کر لیا جا سکتا ہے۔

باب ۲۳

سزا کے بعد!

ملک کی عام حالت یہ بتایا جاچکا ہے کہ محمد علی اور ان کے رفقا کی گرفتاری کے بعد تحریک میں کسی قسم کا اضمحلال نہیں پیدا ہوا تھا بلکہ اس کی رفتار میں اور اضافہ ہوگیا تھا۔

جس ریزولیوشن پر محمد علی کی گرفتاری اور سزایابی کا "حادثہ" وقوع میں آیا تھا، اس کو ملک کے ہر طبقہ نے عام جلسوں میں ایک بار نہیں متعدد بار دہرایا۔

گاندھی جی کا اعادہ گاندھی جی نے اور کانگرس کے دوسرے زعما نے، مولانا ابوالکلام آزاد نے اور خلافت کے دیگر کارکنان نے بکرات و مرات بالاعلان اسی ریزولیوشن کا اعادہ کیا اور گورنمنٹ کو دعوت دی کہ اس نے صرف علی برادران کو کیوں گرفتار کیا، ہمیں کیوں نہیں گرفتار کرتی، سارا ہندوستان اسی ریزولیوشن کا اعادہ کر رہا ہے، وہ کیوں آزاد ہے؟

علی برادران کی گرفتاری کے وقت تک صرف دو تین لاکھ روپیہ چندہ جمع ہوا تھا لیکن ان کی گرفتاری اور سزایابی کے بعد ایسا جوش و خروش پیدا ہوا اور ایسا بے پناہ جذبۂ عمل ظاہر ہوا کہ نہایت تھوڑے عرصہ میں پچیس تیس لاکھ چندہ کا ڈھیر لگ گیا جس میں بیگم محمد علی اور بی اماں کی انتھک کوششوں کو بہت دخل تھا۔

سول نافرمانی کا ارادہ علی برادران کی گرفتاری کے وقت تک گاندھی جی صرف مقاطعہ اور تحریک ترک موالات کے اجزا پر زور دے رہے تھے، لیکن پھر وہ اس کے لئے پورے طور سے آمادہ ہوگئے کہ سول نافرمانی کی مہم کا بردولی سے آغاز کر دیں اور ملک کے اس جذبۂ عمل کو کسی ایک مخصوص

و متعین راستہ پر لگا دیں۔

ملک نے بھی اس تحریک کے شروع کرنے پر اپنی پوری آمادگی کا اظہار کر دیا تھا۔

واقعۂ چوری چورا کہ اسی زمانہ میں چوری چورا کا منحوس واقعہ پیش آگیا جس میں چند ہندوستانیوں نے پولیس کے ظلم و جبر سے تنگ آکر پولیس کے پورے تھانہ کو مع سپاہیوں کے نذر آتش کر دیا تھا۔ جس سے گورنمنٹ بھی بہت پریشان ہوئی۔

مالوی جی کی کوششیں مالوی جی شروع ہی سے اس تحریک کے، علی برادران کے اثر ورسوخ کے اور مسلمانوں کی اس شرکت عمل کے سخت مخالف تھے انھیں کی شخصیت تھی جس نے افغانستان کا ہوا اپنی تصور آفرینی کی قوت سے لاکھڑا کیا تھا، اور وہی تھے جو یہ سمجھ رہے تھے کہ علی برادران تو ہندوستان پر مسلمانوں کی حکومت چاہتے ہیں اور وہی تھے جن کا محور عمل "فرام الہ آباد ٹو شملہ اور فرام وائسرائز ہاؤس ٹو بنارس" رہ گیا تھا۔

اس واقعہ نے انھیں موقعہ دیا کہ وہ گاندھی جی کو نشیب و فراز سمجھائیں اور جس چیز کو گاندھی جی شروع میں ماننے سے انکار کر رہے تھے اسے ان کی آنکھوں کے سامنے لاکھڑا کر دیں۔

پروگرام کا التوا نتیجہ یہ ہوا کہ گاندھی جی پورے طور سے متاثر ہو گئے اور انھیں یقین آگیا کہ تحریک اگر جاری رہی تو تشدد سے محفوظ نہیں رہ سکے گی، اس لئے وہ باردولی پہنچے اور وہاں پروگرام کے التوا کا اعلان فرما دیا کہ کسی مناسب موقع کا انتظار کیا جائے، مولٰنا حسرت موہانی شروع سے گاندھی جی کی قیادت کی مخالفت کر رہے تھے مگر اس وقت اس نقار خانہ میں طوطی کی آواز کون سنتا تھا؟

التوا کا اثر اس اعلان التوا کے بعد بھی جوش و خروش میں کوئی کمی نہیں آئی، لیکن صوبوں اور ضلعوں کی کانگرس کمیٹیوں نے گاندھی جی اور آل انڈیا کانگرس کمیٹی کو تنبیہ کرنا شروع کیا کہ التوا کا

اثر بُرا پڑے گا، جوش عمل سرد ہو جائے گا۔ چوری چورا کا حادثہ ایک اتفاقی اور مقامی حادثہ ہے تمام ملک عدم تشدد کے اصول پر عامل ہے اور اسی عقیدہ کا قائل ہے، مگر گاندھی اس واقعہ سے اتنے گھبرا چکے تھے کہ وہ کسی طرح بھی نظر ثانی کرنے پر راضی نہ ہوئے، انھیں یہی یقین رہا کہ تشدد کی بلا سے اب اس تحریک کا محفوظ رہنا مشکل ہے۔

تحقیقاتی کمیٹی بہرحال حامیان خلافت، رضاکاران کانگرس اور صوبہ اور ضلع خلافت کمیٹیوں اور کانگرس کمیٹیوں کے پیہم اصرار اور احتجاج سے گاندھی جی نے ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کرائی جس کا مقصد یہ تھا کہ وہ ملک بھر کا دورہ کرے اور یہ معلوم کرے کہ آیا ملک سول نافرمانی کرنے کے لئے تیار ہے یا نہیں اور اس میں اس کی صلاحیت و استعداد ہے یا نہیں اور آیا تشدد کا مرض "متعدی" تو نہیں ہو رہا ہے۔

اس تحقیقاتی کمیٹی کو سارے ہندوستان میں دورے کے لئے حکم دینا، بیان لینا، شہادت لینا اور دوسرے حوادث و واقعات کو اس کے احاطۂ تحقیق میں کرنا جس مقصد کے ماتحت تھا، وہ پورا ہو گیا، یعنی دیکھتے دیکھتے تحریک میں انحطاط شروع ہوا اور چند ہی مہینہ کے بعد تحریک فنا ہو گئی۔

گاندھی جی کی گرفتاری اس اضمحلال کے باوجود گاندھی جی کچھ نہ کچھ کام کئے ہی جا رہے تھے ان کے دورہ اور تقریر کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا تھا کہ ایک بار اجمیر میں ایک تقریر کرنے کے بعد گاندھی جی بھی گرفتار کر لئے گئے اور اس طرح رہی سہی جان کا بھی خاتمہ ہو گیا اور جو تسمہ لگا رہ گیا تھا وہ بھی ختم ہو گیا۔

سوامی شردھانند کی رہائی سوامی شردھانند جو اس تحریک میں سزایاب تھے اور جنھیں مسلمانان دہلی نے جامع مسجد کے ممبر پر دعوت تقریر دی تھی، اور گوش ہوش سے ان کی تقریر سنی تھی، دفعتہً و بغتۃً میعاد اسیری ختم ہونے سے پیشتر غیر مشروط طور سے رہا کر دیے گئے، اس رہائی کی وجہ بعد

میں معلوم ہوئی!

فسادات ملابار بدقسمتی سے اسی زمانہ میں ملابار کے پرجوش اور مجاہد مسلمانوں میں طرح طرح سے اشتعال پیدا کرنے کی کوشش کی گئی، انھیں گورنمنٹ کے خلاف بھی اکسایا گیا اور ہندوؤں کے خلاف بھی۔

وہ ایک ایسی جماعت تھی جس کے اندر تعلیم کم اور جوش زیادہ تھا، چونکہ تعلیم سے ناآشنا تھی اس لئے اس کے اندر مصلحت بینی، دوراندیشی اور نکتہ سنجی کا مادہ بہت کم تھا اور چونکہ مسلمان تھی اور جنت کو تلواروں کے سایہ میں سمجھتی تھی اس لئے جوش جہاد، موت سے بے خوفی، شہادت کی تمنا اور اسلام پر مرمٹنے کی ہوس موجود تھی۔

نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے انگریزوں کو بھی پیٹا اور ہندوؤں کی خبر بھی لی اور اس کی پاداش انھیں یہ ملی کہ وہ جلاوطن کر دئے گئے، مفلس اور فقیر کردئے گئے، تباہ اور نادار کر دئے گئے، ذلیل اور بے عزت کردئے گئے۔

وہ دن ہے اور آج کا دن، گورنمنٹ کا عتاب ان پر بدستور ہے، وہ اسی طرح جلاوطن ہیں اسی طرح فقر و فاقہ میں اپنی زندگی بسر کر رہے ہیں، اسی طرح اپنی املاک و جاگیر سے محروم ہیں۔

ملکانہ راجپوتوں کی شدھی سوامی شردھانند کی غیر مشروط اور قبل از وقت رہائی کا حال آپ کو معلوم ہوچکا ہے، انھوں نے آتے ہی اپنی کارگزاریوں کا ایک ثبوت جو آئندہ کے عزائم کا آئینہ دار تھا، یہ دیا کہ ملکانہ راجپوتوں پر چھاپہ مارا۔

وہ بیچارے نام کے مسلمان تھے نہ کسی مولوی نے انھیں کلمہ پڑھایا، نہ کسی صوفی نے انھیں مرید کیا۔ نہایت آسانی سے قابو میں کر لئے گئے اور شدھ ہو گئے۔

اثر اس خبر سے کہ ملکانہ راجپوت ہزاروں کی تعداد میں شدھ کر لئے گئے اور ابھی بہت

سے شدھ کئے جائیں گے، مسلمانوں میں اک آگ لگ گئی اور ان میں ایک تازہ حرکت پیدا ہو گئی،
لیکن اس حرکت کا رخ دوسری طرف تھا اور یہ جذبۂ عمل کوئی دوسرا نتیجہ ظاہر کر رہا تھا۔

تبلیغ | فوراً مسلمانوں نے دفاعی طور سے تبلیغی مہم جاری کر دی اور بڑے زور شور سے تبلیغ کے
"قد آدم پوسٹر" میدان میں نظر آنے لگے۔

اب مسلمانوں کے دل سے بھی آزادی کا سودا نکل چکا تھا اور وہ پوری طور پر مستعد تھے کہ پہلے
ہندوستان میں اپنے قیام و بقا کا کوئی انتظام کریں اور شدھی اور سنگٹھن کا جو یہ طوفان اٹھا ہے اس
کا مقابلہ کر لیں، پھر آزادی کا دیکھا جائے گا! مسلمانوں کو یہ احساس بھی تھا کہ اسلام ایک تبلیغی مذہب ہو
اس کی تبلیغ تو نہ ہو اور جس مذہب کے لوگ سمندر پار جانے سے کافر ہو جاتے ہوں اور جہاں تبلیغ
ایک جرم ہو وہاں تبلیغ ہو رہی ہو، یہ بات ان کے سمند غیرت پر ایک تازیانہ ثابت ہوئی۔

انقلاب | ان تحریکوں کے شروع ہو جانے سے ملک میں ایک عجیب انقلاب پیدا ہو گیا، پہلے
ہندو مسلمان اس لئے ایک مقام پر مجتمع ہوتے تھے کہ پیمان محبت مستحکم کریں لیکن اب دونوں کی
ملاقات اس لئے ہوتی تھی کہ قوت آزمائی کریں، پہلے ہندو مسلمان گورنمنٹ کے خلاف صف آرا
تھے لیکن اب وہی ایک دوسرے کے مقابلہ میں کھڑے ہوئے للکار للکار کر دعوت مبارزت دے
رہے تھے اور ایک دوسرے کا خون بہا کر خوش ہوتے تھے اور اسی کو سب سے بڑی معراج اور سب
سے بڑی کامیابی سمجھتے تھے، پہلے اگر جلسہ اور جلوس غیر معمولی سے ہو گئے تھے تو اب فسادات کی
خبر میں کوئی ندرت، کوئی اہمیت اور کوئی حیرت نہیں تھی۔

جو کانگرسی تھے اور آزادی وطن کے لئے ہر قسم کے مصائب برداشت کرنے کو تیار تھے
انھوں نے اب اپنی قامت پر لباس مہاسبھائیت چست کر لیا۔

جو خلافتی تھے وہ بھی تبلیغی بن کر میدان عمل نظر آ رہے تھے۔

لیکن اس حیرت انگیز واقعہ کو ہندوستان کی تاریخ ہمیشہ یاد رکھے گی کہ آزادی کی جنگ میں سب سے پہلے اختلال انھوں نے پیدا کیا، جو اکثریت میں تھے۔ سب سے پہلے ہندو مسلمانوں میں تفریق انھوں نے پیدا کی جو اکثریت میں تھے، شدھی و سنگٹھن کی ضرورت سب سے پہلے انھوں نے محسوس کی جو اکثریت کے بل پر زور والے، طاقت والے اور اقتدار والے تھے، سب سے پہلے اور سب سے زیادہ نمایاں حصہ شدھی و سنگٹھن میں انھوں نے لیا، جو! یاد رکھئے! جو کانگرسی تھے۔

کانگرس کے عقیدہ پر، اصول پر اور پالیسی پر، انتہائی استقامت اور استقلال سے جو جماعت قائم رہی وہ خلافت کی تھی! نہ وہ شدھی سے متاثر ہوئی نہ سنگٹھن سے، نہ تبلیغ نے اسے اپنی طرف مائل کیا، نہ تنظیم نے، وہ جماعت ۱۹۲۸ء میں نہرو رپورٹ کے بعد برگشتہ ہوئی! صبر کی کوئی انتہا ہے؟

سرمایہ خلافت کیا ہوا؟ اوپر جو اسباب و واقعات عرض کئے ہیں اصل میں وہی تحریک کے زوال و انحطاط کے موجب ہیں، جب یہ تحریک بالکل ختم ہوگئی اور آثار حیات مفقود ہوگئے تو اب مسلمانوں کو یاد آیا کہ خلافت کا سرمایہ کیا ہوا؟ بیکاری کا ایک دلچسپ مشغلہ یہ بھی رہی، چھوٹانی سیٹھ پر غبن کا الزام ثابت کر دیا گیا!

محمد علی کی گرفتاری کے بعد فضا اس درجہ مسموم و ناموافق ہوگئی تھی!

باب ۲۴

رہائی اور کانگرس کی صدارت!

اپنے ایام اسیری پورے کر کے کم و بیش دو سال کے بعد محمد علی کو پھر رہائی نصیب ہوئی، مرغ اسیر کو شاخ چمن پر پھر نغمہ سرائی کا موقعہ حاصل ہوا۔

آمنہ بیگم کی علالت | محمد علی کو جیل ہی میں اپنی منجھلی صاحبزادی آمنہ بیگم کی علالت کی تشویش انگیز اطلاع مل چکی تھی اور وہیں سے انھوں نے اپنی بیمار لڑکی کو "پیام زندان" بھیجا تھا۔

تیری صحت ہمیں منظور ہے لیکن اس کو   نہیں منظور تو پھر ہم کو بھی منظور نہیں

جب وہ جیل سے رہا ہوئے تو دہلی میں اسپیشل کانگرس کی شرکت کے بعد سیدھے کوہ بھوالی تشریف لے گئے جہاں سنی ٹوریم میں وہ بستر علالت پر دراز تھیں۔

رہائی کے بعد بیان | محمد علی نے رہائی کے بعد پریس کے نمائندہ کو ایک بیان دیا جس میں کہا۔

"میں ایک چھوٹے جیل سے نکل کر بڑے جیلخانہ میں آگیا ہوں، مجھے یرودا جیل کی کنجی کی تلاش ہے تاکہ میں گاندھی جی کو رہا کر سکوں اور اس کے حصول کا انحصار آزادی پر ہے۔"

صدارت کے لئے نامزدگی | اسی سال محمد علی کو تمام صوبہ کانگرس کمیٹیوں نے بالاتفاق انڈین نیشنل کانگرس کے سالانہ جلسہ کے لئے صدر منتخب کیا اور اگرچہ وقت کم رہ گیا تھا لیکن پھر بھی محمد علی نے نہایت دلنشیں اور کامیاب خطبہ صدارت پڑھا جو اپنے مغز و تعلیم کے اعتبار سے، اپنی زبان و انشاء کے لحاظ سے ہمیشہ یادگار رہے گا۔

عہد صدارت | محمد علی کا عہد صدارت بہت پر آشوب تھا، اسی زمانہ میں شدھی و سنگٹھن اور

تبلیغ وتنظیم نے کانگرس کی گرمی بازار سرد کر رکھی تھی، ہندوؤں نے مہاسبھا قائم کرلی تھی اور مسلمانوں نے تبلیغ کانفرنس، آزادی کی منزل مقصود بعید تر ہوتی چلی جارہی تھی اور کامیابی کی امید روز بروز موہوم ۔

ایک طرف تو یہ حالت تھی، دوسری طرف خود کانگرس کے اندر تفریق پیدا ہو چکی تھی، ایک مختصر سا گروہ تھا جو "نو چینجر" تھا یعنی کانگرس کے اصولوں سے بغاوت کرنا نہیں چاہتا تھا اور انھیں اسلوب پر اپنی مستعدی اور جذبہ کار کو صرف کرنا چاہتا تھا جنھیں کانگرس نے متعین کر دیا تھا یعنی گورنمنٹ سے قطع تعلق کر کے بے نیاز ہو کے ۔

دوسری جماعت تھی جو کانگرس کی کبھی زمانہ میں سرگرم کارکن رہ چکی تھی، وہ اب جوابی تعاون کی پالیسی اختیار کرنے پر تلی ہوئی تھی، کونسل اور اسمبلی کے خوش نما اور خوش مزہ لیکن "خواب آور" مناظر سے لطف اندوز ہونا چاہتی تھی، اس جماعت میں کانگرس کے وہ تمام لیڈر تھے جن پر غیر معمولی اعتماد کیا جاسکتا تھا یعنی پنڈت موتی لال نہرو، لالہ لاجپت رائے، مسٹر سی آر داس ۔

موتی لال تو اسمبلی میں جانے کے لئے اس قدر مصر تھے کہ وہ فرماتے تھے، اگر کانگرس نے یہ تجویز منظور نہیں کی تو میں کانگرس میں جھانکنے تک کا نہیں۔ اس طرح دھمکا کر وہ اپنا مقصد بڑی حد تک گیا کانگرس میں حاصل کر چکے تھے اور اب کوکناڈا میں پھر حاصل کرنا چاہتے تھے ۔

ایسے نازک دور میں صدارت کرنا اور کامیابی سے اسے اتمام تک پہنچا دینا کچھ محمد علی ہی کا کام تھا اس نے ان سب کی تالیف قلب کی، سب کو سمجھایا اور جو لوگ اس کے نقطۂ نظر پر نہیں آسکے انھیں بھی اس نے کانگرس سے جدا نہیں ہونے دیا ۔

گاندھی جی کی رہائی | کچھ عرصہ کے بعد گاندھی جی جو چھ سال کے لئے اسیر زندان کئے گئے تھے اپنی شدید علالت کی وجہ سے رہا کر دئے گئے ۔

گاندھی جی جب رہا ہوئے تو حسب توقع اپنے عقائد میں بہت سخت تھے اور اس پالیسی سے سخت متنفر جس کا مقصد یہ تھا کہ کونسلوں میں جا کر گورنمنٹ کو شکست دیجائے، عہدے نہ قبول کیے جائیں لیکن صدارت قبول کی جائے اور کسی سرکاری کمیٹی کی ممبری نہ قبول کی جائے، ہاں کبھی کبھی اگر "اسکیمن کمیٹی" کی ممبری قبول کرلیجائے تو زیادہ مضائقہ نہیں۔

محمد علی کی روش | محمد علی خود تو عقیدۃً سخت کانگرسی تھے اور وہ کسی طرح اس پر رضامند نہیں تھے کہ کونسل یا اسمبلی میں جائیں، لیکن انکے جو غلط کار دوست اس میں جا رہے تھے ان کی راہ میں وہ حائل بھی نہیں ہوئے اور انھیں اپنی جماعت سے خارج بھی نہیں کرنا چاہا، گاندھی جی کی ہمخیال و عقیدتمند جماعت نے "سوراج پارٹی" کے خلاف کانگرس کے ایک جلسہ میں سخت جدوجہد کی اور محمد علی نے حسب معمول نرم گرم خود برداشت کر کے معاملہ ختم کر دیا اور سوراج پارٹی کے خلاف کوئی

گاندھی آشرم میں بوچھار | آئینی اقدام نہیں کیا، اس پر جب وہ گاندھی جی کے آشرم میں پہنچے تو ان پر بہت سخت تنقید ہوئی کہ انھوں نے کیوں ایسا نرم رویہ اختیار کیا اور کیوں نہیں انھوں نے سوراج پارٹی کے خلاف جدوجہد میں کوئی عملی حصہ لیا، محمد علی نے اسے برداشت کیا اور اپنی صلح کل پالیسی میں فرق نہیں آنے دیا اور دونوں پارٹیوں سے اپنی ہمدردی کا اظہار اور ہر جماعت سے انصاف کا برتاؤ کرتے رہے۔

کارنامہ | اس زمانہ میں سب سے بڑا کارنامہ جو محمد علی سے ظہور پذیر ہوا وہ یہ کہ جب کانگرس اور سوراج پارٹی میں سمجھوتہ ہوگیا اور لوگ کانگرس کے ٹکٹ پر اسمبلی اور کونسل میں جانے لگے تو پنجاب خلافت کمیٹی، اور احرار پنجاب نے مجلس مرکزیہ خلافت کو بہت مجبور کیا کہ وہ بھی خلافت کے ٹکٹ پر لوگوں کو اسمبلی اور کونسل میں جانے کی اجازت دے دیں تاکہ ان جگہوں پر بھی ہمارا اثر واقتدار رہے اور ان مقامات پر وہی لوگ جاسکیں جو ہمارے یعنی جمہور کے معتمد علیہ ہوں۔

پنجاب خلافت کمیٹی نے اس تجویز کے منظور کرانے میں اپنی پوری طاقت صرف کردی، لیکن محمد علی نے اس سے سخت اختلاف کیا۔ اور کہا کہ جس چیز کو خوب سمجھ کر اور غور و فکر کے بعد ہم چھوڑ چکے ہیں، اس کے نقائص و معائب معلوم کر چکے اور اس کے محامد و محاسن کے ہم قائل نہیں ہوئے تو پھر کانگرس کی تقلید میں ایسا کرنا کہاں کی دانائی ہے ؟

اور بالآخر یہی فیصلہ ہوا کہ ذاتی اور شخصی طور سے جس کا جو جی چاہے کرے، مگر خلافت کے ٹکٹ پر، خلافت کے نام پر اور خلافت کی حمایت میں کوئی شخص بھی کونسل یا اسمبلی کی امیدواری کے لئے نہیں کھڑا ہو سکتا۔

محمد علی کا یہ نہایت قابل فخر کارنامہ ہے کہ انھوں نے محض کانگرس کی پیروی اور اتباع کے جوش میں خلافت کمیٹی کو ان مفاسد سے بچایا جو اس صورت میں پیدا ہونے والے تھے۔ حالانکہ اگر چاہتے تو وہ بہت آسانی کے ساتھ اسمبلی کے ممبر ہو سکتے تھے اس لئے | ممبر ہو سکتے تھے
کہ زیادہ سزا یافتہ شخص کی ممبری کے لئے شرط یہ تھی کہ وہ اجازت لے لے اور اجازت کی نوعیت ایسی تھی جیسے اخبار کے ڈکلریشن کی جس کا ملنا یقینی ہے چنانچہ لالہ لاجپت رائے وغیرہ کو بغیر کسی دقت کے اجازت مل ہی گئی اور جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ انھیں "کانسٹی ٹیوشنل" معاملات سے بڑی دلچسپی تھی، پھر تو وہ اور زیادہ جانے کے حامی ہو سکتے تھے مگر اپنی اس "دلچسپی" کے باوجود انھوں نے اپنے اصول میں فرق نہیں آنے دیا۔

باب ۲۵

عہد تعطل یا ردعمل

عام حالت | محمد علی کی رہائی کے بعد ملک کی جو حالت ہو گئی تھی اور انھوں نے ملک کو جس حالت میں پایا تھا اس کا سرسری اندازہ آپ کو سطور بالا سے ہو گیا ہو گا۔

اس سارے جمود و خمود اور اس سارے تعطل اور فراموشی کی

اصل علت | اصل علت یہ ہے کہ ملک کے سامنے اس وقت کوئی پروگرام نہیں تھا جس پر وہ گامزن ہو کر اپنے عمل کو سنوارتا اور کوئی صحیح اقدام کر سکتا۔

یہی وجہ تھی جو ہندوؤں اور مسلمانوں میں تفریق پیدا ہوئی، اور کانگرس و خلافت کے بجائے تبلیغ و سنگٹھن نے ان کی جگہ لے لی۔

استقامت | محمد علی نے اپنی غیر معمولی استقامت کا ثبوت دیا اور اس ردعمل کا نہایت استقلال کے ساتھ مقابلہ کیا، حالانکہ اگر وہ چاہتے تو انھیں تبلیغ میں شریک ہونے کے بعد، یا کانگرس کا مخالف ہو جانے کے بعد پھر سر آنکھوں پر بٹھایا جا سکتا تھا لیکن انھوں نے رائے عامہ اور میلان عام کی بالکل پروا نہیں کی اور جو علاج قوم کے لئے مفید سمجھتے تھے، اسی کا تجربہ قوم پر کرتے رہے۔

رفقا کی علیحدگی | محمد علی کے لئے وہ بہت ہمت شکن اور حوصلہ فرسا زمانہ تھا جب ایک ایک رفیق الگ ہو رہا تھا، جن دوستوں اور ساتھیوں پر سب سے زیادہ اعتماد تھا وہی اپنی کارگاہ عمل سے نکل کر حریف کے کیمپ کو زینت دے رہے تھے۔

موتی لال جی بیرسٹری پریکٹس شروع کر چکے تھے، داس سوراج پارٹی کے ناخدا بن چکے تھے دوسرے

شرکا بھی الہ آباد اور لکھنؤ میں اپنی اپنی وکالت و بیرسٹری کو فروغ دینے کے سامان کر رہے تھے۔

دوسری طرف علما کا گروہ پورے طور سے علٰحدہ ہو چکا تھا، تبلیغ و تنظیم اس کے دائرہ عمل کا اہم جزو قرار پا گئی تھی۔

تیسری طرف ڈاکٹر کچلو نے تنظیم کا ایک متوازی ادارہ قائم کر دیا تھا، اور اکثر معتمد علیہ رفقار کھنچ کھنچ کر اس طرف جا رہے تھے، مولٰنا عبدالماجد بدایونی، مولٰنا نثار احمد کانپوری اور دوسرے بزرگ علی الاعلان خلافت سے الگ بلکہ بیزار اور تنظیم کے شریک کار ہو چکے تھے۔

محمد علی بھی اگر چاہتے تو مسٹر تامبے، سر سریندر ناتھ بنرجی، بپن چندر پال اور سنکرن نائر کے طرز عمل کی پیروی کر کے گورنمنٹ کے حلقہ میں خاصا رسوخ پیدا کر سکتے تھے، ہندوؤں کو گالیاں دیکر مسلمانوں میں اپنا اقتدار بحال کرا سکتے تھے، لیکن یہ واقعہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ اس وقت وہ نہایت استقلال سے کانگرس کے "واماندگان" کی صف میں نظر آتے رہے جب اس کا بازار سرد ہو چکا تھا اور گرمی محفل کے اسباب دوسری جگہوں پہ پائے جاتے تھے۔

محمد علی کے تاثرات | محمد علی نے اس حالت پر خود بھی ایک بار ضمناً اظہار خیال کیا تھا، وہ کہتے ہیں:

"دو سال تک ہندوستان نے جس سامان بتیابی کا معائنہ کیا، وہ فرانس کے انقلاب کی یاد کو تازہ کرتا تھا، مگر جب حکومت نے ہندوستان کے بڑے اور چھوٹے تیس چالیس ہزار "لیڈروں" کو جن میں ہندو مسلمان سکھ، انگریزی تعلیم یافتہ، مولوی اور پنڈت سبھی شامل تھے، جیل خانوں میں بھر دیا اور عوام ایک بے سری فوج کی طرح رہ گئے تو حکومت کے گرگے اور وہ لوگ جن کی "لیڈریاں" اس عجیب و غریب ہنگامے میں ماند پڑ گئی تھیں نکلے اور عوام کو انکے صحیح رہنماؤں سے جو قید و بند میں گرفتار

تھے، بدظن کرنا اور انھیں گمراہ کرنا شروع کیا، ایک طرف شدھی اور سنگٹھن کی تحریکوں نے زور پکڑا دوسری طرف تبلیغ و تنظیم کی صدائیں بلند ہونا شروع ہوئیں اور زیادہ تر وہ لوگ سربرآوردہ نظر آنے لگے جو آزمائش کے وقت گوشۂ عافیت سے کبھی باہر نہ نکلتے تھے، اب یہی سب سے بڑے قائد تھے اور انھیں کے لئے جیکارے لگائے جاتے تھے اور انھیں کے گلوں میں پھولوں کے ہار ڈالے جاتے تھے۔

جب ترک تعاون کی آزمائش والے زمانہ کے قیدخانوں سے نکلے تو انھوں نے اصلاح کی بہت کچھ کوشش کی، مگر اب طوائف الملوکی کا زمانہ تھا، ہر شخص "لیڈر" تھا، مقتداؤں کی اتنی کثرت تھی کہ مقتدی مشکل ہی سے کسی کو میسر آتے تھے، عوام پریشان تھے کہ کس کو رہنما سمجھیں، ایک، ایک راستہ پر لیجانا چاہتا تھا تو دوسرا دوسرے راستہ پر اور ایک رہنما دوسرے رہنما کو رہزن بتا رہا ہے، سب الگ الگ سر الاپ رہے تھے "ذوق نغمہ" کی شدت اور کثرت اب کہاں میسر آتی بہت سی طوطیوں نے اس نقار خانہ میں اپنی صدا کو بند کر دیا جن کی غرض نمائش تھی انھوں نے اس غرض کو پورا ہوتا ہوا نہ دیکھ کر خاموشی اختیار کی، بعض نے اس چیخ پکار میں اپنی صدا بلند کرنے کو ازراہ فرزانگی بیہودہ سمجھا اور اقبالؔ کی طرح کہنا شروع کیا کہ

مزاج اہل عالم میں تغیر آ گیا ایسا
کہ رخصت ہو گئی دنیا سے کیفیت وہ سیمابی

فغان نیم شب شاعر کی بار گوش ہوتی ہے
نہ ہو جب چشم محفل آشنائے لطف بے خوابی

کسی کا شعلۂ فریاد ہو ظلمت ربا کیونکر
گراں ہے شب پرستوں پر سحر کی آسماں تابی

مہاتما گاندھی خاموش ہو گئے اور ہمارے بعض ساتھیوں نے تو سکوت ہی اختیار

فرمایا بلکہ ایک نقارہ لے کر اسی نقارخانے کے نقارچی وہ بھی بن بیٹھے۔
لیکن ہم دعوے سے کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے نہ سکوت اختیار کیا، نہ کوئی نیا ساز لا بنایا شروع کیا اور سامعین کی قلت اور بے پروائی کا مطلق پاس نہ کر کے ہم نے حافظ ہی کے شعر پر اپنا عمل جاری رکھا،

حافظ وظیفہ تو دعا گفتن است و بس ۔۔۔ در بند ایں مباش کہ نشنید یا شنید

ہم نے اور ہمارے چند ساتھیوں نے ذوق نغمہ میں کمی محسوس کر کے جس قدر تلخ نوائی کی اور محل کو گراں پا کر جس قدر حدی کو تیز تر کیا اسے یا ہم جانتے ہیں یا ہمارا خدا سب سے حیرت انگیز جو چیز ہے وہ یہ کہ ہم مسلمانان عالم کی موجودہ ذہنیت کو بدل کر انھیں از سر نو تاسیس خلافت راشدہ کی طرف مائل کرنا چاہتے ہیں تاکہ ایک بار پھر تمام مسلمانان عالم ایک ہی رشتہ میں منسلک ہو جائیں اور خلافت کمیٹیوں کا سلسلہ ہر ضلع کے ہر گاؤں اور ہر شہر کے محلے سے لے کر ہر صوبہ، ہر ملک، ہر براعظم میں پھیلتا ہوا مرکز خلافت راشدہ تک پہنچ جائے اور ہم یورپ کی شہنشاہیت یا امپیریلزم کی جڑ بنیاد کو ادھیڑ کر پھینکنا چاہتے ہیں اور نہ صرف ہندوستان کو بلکہ تمام مشرقی ممالک اور بالخصوص اسلامی ممالک کو اس کے پنجہ سے نکال کر آزاد کرانا چاہتے ہیں اور تمام عالم اسلام میں پھیلانا چاہتے ہیں۔"

رائے | یہ ہے محمد علی کا وہ سچا خاکہ جو انھوں نے خود پیش کیا ہے اور بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اپنی زندگی بھر انھوں نے اپنے اس بیان کردہ اصول کو نبھایا، تغیر محمد علی میں نہیں ہوا، بلکہ گرد و پیش کے ان حالات میں ہوا جنھوں نے محمد علی کو مجبور کر دیا کہ وہ اب مدافعت کریں اور صلح جوئی کا دروازہ بند کریں۔

اس عنوان کے بعد محمد علی کے اس کارنامہ کا ذکر آئے گا جو ہندوستان کے لیڈروں میں بہت نادرالوجود ہے اور جس نے محمد علی کی قدر و قیمت میں بہت زیادہ اضافہ کر دیا۔

یعنی کانگرس سے وفاداری! محمد علی کی وفاداری "بشرطِ استواری" تھی، جب تک یہ شرط پائی گئی ان کی وفاداری غیر متزلزل رہی، لیکن جب یہی چیز مفقود ہو گئی تو بیشک ان کی وفاداری بھی ختم ہو گئی ورنہ ان کے معتقدات سیاسی وہی تھے جو ۲۱-۱۹۲۰ء میں اور اس کا بہترین ثبوت ان کی گول میز کانفرنس کی تقریر ہے۔

باب ۲۶

کانگرس سے وفاداری

کانگرس کی تاریخ اور محمد علی کی زندگی کا یہ نہایت روشن صفحہ ہے۔

کانگرس میں اب پختگی آگئی ہے اور اس کے حامیوں میں سنجیدگی کے ساتھ جذبۂ آزادی پیدا ہوگیا ہے، لیکن تحریک شدھی و سنگٹھن کے زمانہ کا رنگ بالکل جداگانہ تھا، اس وقت سرداری و سرفرازی کا تاج اس کے سر ہوتا تھا جو ہندو مسلمانوں میں لڑائی پیدا کرائے اور حقارت و ذلت کا برتاؤ اس کے ساتھ جو اتفاق و اتحاد کی تلقین کرے، اس زمانہ میں محمد علی پہاڑ کی طرح اپنے مقاصد و داعیات کے علمبردار رہے، اور کسی طرح بھی جادۂ حق سے ان کے قدموں کو جنبش نہ ہوئی۔

تبلیغی جماعتوں کی دعوت | ہندوستان کی تبلیغی جماعتوں نے محمد علی کو دعوت دی، ان کے عقیدتمندوں اور پیرؤوں نے انھیں مجبور کرنا چاہا کہ وہ بھی تبلیغ کے میدان میں قدم رکھیں لیکن محمد علی نے ایسا نہیں کیا۔

اپنی مشہور اور مسلمہ مذہبیت کے باوجود محمد علی نے کیوں تبلیغ کے میدان میں قدم نہیں رکھا؟ یہ ایک حل طلب سوال ہے

جواب بالکل صاف ہے، اس وقت تبلیغی ادارے اور تبلیغی پوسٹر جس انداز سے چل رہے تھے وہ ایک سنجیدہ مسلمان کے شایان شان نہیں تھے، نیز تبلیغ کا جو اصل مقصد ہے وہ بعید تر ہوتا جا رہا تھا، نظر صرف اس پر تھی کہ غلغلہ کس کا بلند ہو رہا ہے؟ شور کس کا ہو رہا ہے، شہرت کے میدان میں جیت کس کی ہوئی؟

ان شطحیات سے محمد علی الگ رہے۔

پھر تبلیغ کا وہ انداز بھی محمد علی کو پسند نہیں تھا جس انداز پر کام شروع کیا گیا تھا وہ اس تبلیغ کے مخالف تھے کہ صرف خارجی موثرات سے اسلام کی دعوت دیجائے وہ اس کے حامی تھے کر اسلام ایسے رنگ روپ میں پیش کیا جائے کہ ہر شخص میں خود طلب وجستجو پیدا ہو، اس کے بعد جو اسلام لائے گا وہ سچا مسلمان ہوگا اور وہی اپنے اسلام پر مستقیم ہوگا۔

جمعیۃ تبلیغ انبالہ | ہندوستان میں صرف ایک تبلیغی ادارہ ایسا پیدا ہوا جو صحیح معنوں میں تبلیغ کا اہل تھا، یعنی میر نیرنگ کی جمعیۃ تبلیغ ، اس انجمن کے ساتھ محمد علی کی ہمدردیاں ہمیشہ رہیں اور ہمیشہ انھوں نے اس کو فائدہ پہنچانے کی کوشش کی۔

بلگام خلافت کانفرنس | بلگام خلافت کانفرنس کے صدر صاحب محمد علی کے "دیکے از اسیران کراچی"، رفیق تھے جو اس وقت ہندوؤں سے سخت بیزار تھے اور تنظیم کا علم جہاد لے کر کھڑے ہوئے تھے۔

اس زمانہ میں یہ دستور ہو گیا تھا کہ قومی مجالس کے خطبہ ہائے صدارت بہت زیادہ آتشیں ہوتے تھے، ہندو سبھا، آریہ لیگ، جمعیۃ تنظیم، مسلم لیگ ان تمام جماعتوں کے خطبہ صدارت اٹھا کر ملاخطہ فرمائے تو معلوم ہوگا کہ وہ ایک مستقل دعوت جنگ ہی جو ایک فرقہ دوسرے فرقہ کو نہایت رستمانہ انداز سے دے رہا ہے۔

خلافت کانفرنس بلگام کے صدر منتخب بھی ان جذبات سے متاثر تھے، ان کا خطبہ صدارت نرم کیسے ہو سکتا تھا، انھوں نے بھی ایک نہایت آتشیں خطبہ صدارت تیار کیا تھا اور ہندوؤں کے طرز عمل پر نہایت تلخ انداز میں نکتہ چینی کی تھی اور مسلمانوں کو مشورہ دیا تھا کہ وہ ان کے "دو مقابلہ" کے لئے صف آرا ہو جائیں، اسی مفہوم کو اگر نرم و ملائم الفاظ میں ادا کیا جاتا تو زیادہ مضائقہ

نہیں تھا لیکن غضب یہ ہوا کہ اسے نہایت ہی سخت لہجہ میں ادا کیا گیا تھا۔

محمد علی کی اصلاح | وقت بہت کم رہ گیا تھا، صبح خطبہ صدارت پبلک میں آنے والا تھا، محمد علی خلافت کانفرنس کو میدانِ جنگ بنانے پر راضی نہیں تھے اس لئے رات بھر جاگ کر محمد علی نے خلافت کانفرنس کے صدر کے خطبہ صدارت میں قطع و برید کی اور اس کے ناقابلِ برداشت اور سخت جملوں کو خارج کر دیا، پھر بھی وہ ایک حد تک سخت رہا، لیکن اب پہلے سے بہت کم ہو گیا تھا۔

بلگام کانگرس | ۱۹۲۴ء میں بلگام کانگرس کے گاندھی جی صدر تھے اس میں ایک دلچسپ سوال یہ پیدا ہوا کہ آیا کانگرس کی ممبری کے لئے کھدر کاتنے کی شرط رکھی جائے یا نہ رکھی جائے؟

"نوچینجر" اس کے حامی بلکہ زبردست محرک تھے اور سوراج پارٹی کے محترم ارکان کو سخت اختلاف تھا۔

مولانا حسرت موہانی تو کھدر ہی کی شرط کے نہیں قائل تھے مگر دوسرے لوگ یعنی وٹھل بھائی پٹیل، پنڈت موتی لال نہرو، مسٹر سی آر داس، لالہ لاجپت رائے وغیرہ کھدر کے تو حامی تھے لیکن ہر ممبر کے لئے اس کے کاتنے کی شرط کو "مضحکہ خیز" تصور کرتے تھے، محمد علی کا تعلق پہلی جماعت سے تھا اور وہ اس شرط کے سخت حامی تھے، چنانچہ انھوں نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا۔

"چرخہ کو شرط ممبری ہونا چاہئے، جو انتہائی مقدار کی کم از کم قربانی ہو اگر کوئی جرمن پروفیسر اپنے طول طویل نام کے ساتھ کہدے کہ چرخہ آزادی حاصل کرنے کا تنہا ذریعہ ہے تو چرخہ کاتنے میں کافی جوش پیدا ہو جائے اور اس وقت ہندوستان بلا پس و پیش چرخہ کو قبول کرلے مگر چونکہ یہ بات ایک ہندوستانی نے کہی ہے، اس لئے لوگ شک کرتے ہیں۔"

سنا ہے کہ اس تقریر نے بعض لوگوں کے چہروں پر نہایت نمایاں تغیر پیدا کر دیا!

فسادات کوہاٹ کوہاٹ کا فساد وہ پہلا واقعہ ہے جب گاندھی جی اور ان کے جنرل مولٹنا شوکت علی میں اختلاف رائے پیدا ہوا اور یہی وہ پہلا دن ہے جب سے ہندوؤں نے بالخصوص ہندو پریس نے علی برادران کی مخالفت کرنے کی ٹھان لی۔

مختصراً واقعہ یوں سمجھئے کہ کوہاٹ میں فساد ہوا، ہندوؤں کو شکایت تھی کہ مسلمانوں نے زیادتی کی، مسلمانوں کا بیان تھا کہ "چھیڑ" کا آغاز ہندوؤں کی طرف سے ہوا۔

کانگرس کا وفد کانگرس کا ایک وفد جو گاندھی جی اور مولٹنا شوکت علی پر مشتمل تھا کوہاٹ کے قصد سے روانہ ہوا، مگر گورنمنٹ نے وفد کو کوہاٹ جانے کی اجازت نہیں دی اس لئے وفد نے اپنی کارروائی غالباً راولپنڈی میں جاری رکھی، مسلمان بیان دینے نہ آسکے، صرف دو ایک آدمی آئے اور ہندوؤں کی کافی جماعت آئی اور اس نے شہادت دی جب رپورٹ شائع ہوئی تو گاندھی جی نے مسلمانوں کو قصوروار ثابت کیا مولانا شوکت علی نے اس الزام کو قبول کرنے سے اس لئے انکار کیا کہ جانبین کے بیانات مساوی اور قابل قبول طور پر نہیں حاصل ہو سکے۔

تنہا پیش قاضی روی راضی آئی

کوئی انصاف کا اصول نہیں ہے۔

گاندھی جی نے اس اختلاف کو شرافت کے ساتھ برداشت کیا اور شوکت صاحب نے وفاداری کے ساتھ اختلاف کیا، مگر ہندو پریس میں اک آگ لگ گئی اور آفت برپا ہوگئی

محمد علی کا نظریہ لیکن محمد علی کا نظریہ ان دونوں سے مختلف تھا، وہ یہ کہتے تھے کہ فضا ایسی پیدا کر دی گئی ہے کہ فسادات کا ہونا لازمی ہے قوم کے لیڈروں نے اگر اس وقت یہ روش اختیار کی کہ اپنی قوم کو بے قصور بتلایا اور دوسری قوم کو قصوروار تو اس سے اختلاف کے بڑھنے کا اور زیادہ امکان ہے اور ہمیں اس وقت ضرورت اس کی ہے کہ ہم اپنے اختلافات

کم کریں اور آزادی کی منزل مقصود کی طرف کوچ کریں، لہذا بہترین صورت انھوں نے یہ پیش کی کہ ہر لیڈر اپنی قوم کی غلطیوں پر اسے سرزنش کرے اس لئے کہ یہ تو مسلم ہے تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے، چنانچہ اس فساد کے بعد پنجاب پروانشل خلافت کانفرنس میں محمد علی نے تقریر کرتے ہوئے کہا۔

"یہ وقت نہیں ہے کہ ہر قوم دوسری قوم کے سر الزام تھوپے بلکہ موزوں یہی ہے کہ ہر شخص اپنے ہم مذہبوں کو متنبہ کرے اس لئے فسادات کوہاٹ کی جتنی ذمہ داری مسلمانوں کے سر ہے، میں انھیں ملامت کرتا ہوں"

صرف اسی موقعہ پر نہیں بلکہ ہمیشہ محمد علی نے یہی کیا اور مسلمانوں میں غیر ہر دلعزیز ہوتے رہے۔ اور صرف اسی موقعہ پر نہیں بلکہ ہمیشہ ہندو زعماء نے یا تو "سکوت مصلحت شناس" پر عمل کیا اور یا پھر "سچی سچی باتیں" بالکل "مجبور" ہو کر ان کو مسلمانوں کے متعلق بیان کرنا پڑیں۔

دھرم شالہ چھیدی لال کا جلسہ ۱۴ر اپریل ۱۹۲۵ء کی رات کو قومی ہفتہ کے سلسلہ میں دھرم شالہ چھیدی لال میں کانگریس کی طرف سے ایک جلسہ منعقد ہوا، حاضرین کی تعداد بہت کم تھی لیکن محمد علی اس مدوجزر سے واقف تھے، ان پر اس کا بالکل اثر نہیں ہوا، انھوں نے اپنی تقریر شروع کی۔

تقریر "آج کے جلسہ میں بہت کم حاضری ہے مگر اس افسردگی کا اثر ان لوگوں پر کچھ نہیں پڑ سکتا جو اپنے عقیدہ اور رائے پر پہاڑ کی طرح قائم ہیں اگر آج یہاں صرف دو آدمی ہوتے تب بھی جلسہ کیا جاتا، اس وقت تک ہم لوگ برابر اپنی کوششوں میں مصروف و مشغول رہیں گے جب تک ہم اپنی رائے اور عقیدہ کو صحیح سمجھتے ہیں۔

آج جو افسردگی و اضمحلال آزادی کی تحریک میں پیدا ہو گیا ہے، یہ کوئی نئی چیز

نہیں ہے، ہمیشہ ہر ملک میں تحریک آزادی کو نشیب و فراز سے گزرنا اور پستی و بلندی سے دوچار ہونا پڑا ہے۔"

موتی لال سے اختلاف کی وجہ اپنے اور پنڈت موتی لال نہرو کے اختلاف پر روشنی ڈالتے ہوئے محمد علی کہتے ہیں۔

"میرا ان کا سارا اختلاف اسی باعث ہے کہ اول تو انھوں نے مہاتما گاندھی کے قید و بند کے زمانہ میں ان کے خلاف بغاوت کی اور کانگرس کے دو ٹکڑے کروا دیے دوسرے انھوں نے ایک اور باغی لالہ لاجپت رائے کی امداد حاصل کرنے کی امید پر صوبہ سرحد اور سوراج پارٹی دونوں کے مسلمانوں کی حق تلفی کو گوارا کیا اور حق پر ثابت قدم نہ رہے۔"

محمد علی کی یہ تحریر اس وقت شائع ہوئی تھی جب ۱۹۲۵ء میں موتی لال نہرو صاحب نے اسمبلی کے اندر صوبہ سرحد کو مساوی حقوق دینے سے اختلاف کیا تھا۔

ایک غیر مسلم اخبار کا اعتراف ایک غیر مسلم اخبار جس نے ہمیشہ کسی نہ کسی نہج پر محمد علی سے اختلاف کیا، محمد علی کی اس خوبی کا وہ بھی مداح تھا کہ جب کانگرس سے لوگ کٹ رہے تھے محمد علی نے اپنے تعلقات اور زیادہ مستحکم کر لئے، وہ لکھتا ہے۔

"گو آج عدم تعاون کی تحریک کمزور ہو جانے کے باعث ہندوستان کے سیاسی آسمان پر مہاتما گاندھی اور ان کے رفیقوں کا علم بلند نہیں ہو رہا ہے اور ملک کے اندر شدھی و تبلیغ کی موجودہ افسوسناک گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں، مگر ملک کے محترم لیڈر مولانا محمد علی کی قابلیت، خلوص اور قومی خدمات کی یاد لوگوں کے ذہن میں اس وقت تک محفوظ رہے گی جب تک کہ ہندوستان کے رہنے والوں کے

دلوں میں حریت و آزادی کے خون کا ایک قطرہ بھی موجود ہے"

ایک اہم اختلاف | ۱۹۲۷ء میں پنجاب کے ایک لیڈر اور اسلامی ہند کے ایک شاعر نے پنجاب کونسل میں ایک تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ میں ہندو مسلم افسران کے بجائے انگریز افسران کا خیر مقدم کروں گا۔

محمد علی کو ان خیالات سے قدرتی طور پر سخت اختلاف ہونا چاہئے تھا، چنانچہ انھوں نے اس تخیل سے سخت اختلاف کیا اور اس موضوع پر اپنے گرانقدر خیالات پیش فرمائے جو ہمدرد کی کئی اشاعتوں میں کئی کئی کالم میں شائع ہوئے، ہم اس مضمون کے اہم حصص کا خلاصہ محمد علی ہی کے الفاظ میں درج ذیل کرتے ہیں۔

"وہ آج ہمارے مرض کا علاج اسے نہیں سمجھتے کہ ہندوؤں کو غیرت دلانے کی کوشش کیجائے کہ اقلیت کے ساتھ نا انصافی نہ کرو جب تک اس کو رام نہ کرگے سوراج نہ لے سکوگے اس کے استیصال کا خیال حماقت نہیں جنوں ہے۔

تاریخی تمثیل | جب محمد بن قاسم مٹھی بھر مسلمانوں کو لے کر سندھ میں داخل ہوا تھا تب اس کے استیصال کا اچھا موقع تھا تم نے اس موقعہ کو ہاتھ سے جانے دیا جب محمود غزنوی سترہ بار ہندوستان آیا اور سارے ملک میں گھوما گھوما پھر مگر وہی چند ہزار فوج کے ساتھ تب بھی موقعہ تھا کہ اس اقلیت کا استیصال کر دیا جائے اس وقت بھی تم نے اس کا استیصال نہ کیا، اس کے بعد شہاب الدین غوری آیا تم نے اس موقعہ کو بھی ہاتھ سے جانے دیا، غلاموں تک کے خاندان نے یہاں بادشاہی کی اور بہ ظاہر تم نے اسے بھی قبول کر لیا پھر ایک فرغنہ سے بھاگا ہوا مغل بابر یہاں آیا اور تم نے سارا گھر بار اسے دے ڈالا اس کے بیٹے کو یہاں سے

نکالا بھی تو اس کے بھائیوں نے یا مسلمان پٹھانوں نے، اور ان پٹھانوں کے ہاتھ سے بھی عنان حکومت نکلی تو پھر اسی کے ہاتھوں آگئی، اور اس کے بعد بھی بنئے بقال اس ملک کی حکومت کو ان مغلوں کے ہاتھ سے نہ چھین سکے جو رانا سانگھا جیسے راجپوت پر غالب آئے تھے، ایک اور مغل اکبر نامی پھر اس ملک پر حکمراں ہو کر رہا، تم نے سکھوں کو بھی جو اسلام سے بہت ہی قریب آگئے تھے مغلیہ حکومت سے بھڑوا دیا، تب بھی سوا اس کے کچھ نتیجہ نہ نکلا کہ بجائے دو بڑی مذہبی جماعتوں کے تین بن گئیں، جب اورنگزیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کے بعد چند ہی سال میں کئی بار بھائیوں، بھائیوں میں پھر تخت کے لئے جنگ چھڑی اور جو جیتا وہ بھی عیاشی میں پڑگیا اور وہ مرہٹوں کی قوت جس کو اپنا مطیع و منقاد بنانے کا عزم بالجزم کر کے اورنگ زیب دہلی کو چھوڑ کر دکن گئے تھے اور ۲۶ برس تک جب تک کہ وہ اور زندہ رہے اس میں مصروف رہے اور بالآخر اس قوت کو دبا کر ہی انھوں نے دم لیا اور دم دیا، وہ قوت پھر بڑھنے لگی اور ایک سیواجی کی جگہ چار چار مرہٹے راجہ برہمن پیشوا کے درباری بنے اور جب نادر شاہ نے مغلیہ سلطنت کو بالکل ضعیف چھوڑ دیا تو سب نے مل کر اتنی سمت کی کہ دہلی پر دھاوا بول دیا، اس وقت بھی ایک غریب الوطن پٹھان احمد شاہ ابدالی نے بھاؤ کو اس طرح شکست دی کہ پھر کبھی اس قوم نے شمال کا رخ نہیں کیا، بھاؤ جی سندھیا ایسا بھاگا پانی پت سے اس طرح بھاگا کہ ساری عمر وہ اس تعاقب کرنے والے پٹھان کو نہ بھولا جس کا چھوٹے قد کا گھوڑا اس کے پیچھے برابر چلا آرہا تھا اور اس کے نتھنوں سے نکلتی ہوئی بھاپ جسے وہ بار بار مڑ کر دیکھتا

تھا تو لرز جاتا تھا، ساری عمر اسے خواب میں ستاتی رہی، وہ آخری موقعہ تھا کہ تم
اس اقلیت کا استیصال کر سکتے تھے مگر تم نے اس کو بھی ہاتھ سے کھو دیا، احمد شاہ
ابدالی نے غضب کیا کہ تم کو تباہ بھی کیا اور خود قیام بھی نہ کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ
مسلمانوں کے ہاتھ سے بھی سلطنت نکل گئی اور تمھیں بھی نہ مل سکی، سات ہزار
میل کے فاصلہ سے سات سمندر پار کر کے کچھ سوداگر جہانگیر کے دربار میں تجارت
کرنے کی اجازت لینے آئے تھے انھوں نے جہانگیر کے وارث اندھے شاہ عالم
کو دو سو برس کے بعد اپنی "حفاظت" میں لے لیا اور اس کی اور تمہاری
دونوں کی رہی سہی طاقت کو مٹا کر اپنی سلطنت قائم کر لی۔

راہ عمل کیا ہو | اب اگر غلامی سے نکلنا ہے تو اس کا یہی طریقہ ہے کہ ہم تم ایک دوسرے
کے ساتھ انصاف اور رواداری کا برتاؤ کریں ایک دوسرے کی طرف سے
جو اذیت زبان سے یا ہاتھ سے پہنچتی ہے اس پر صبر کریں، مگر اس غلامی کو ہرگز
نہ برداشت کریں جس میں تم بھی سو ڈیڑھ سو برس سے مبتلا ہو اور ہم بھی، اور جو
یقیناً ہندو راج سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہے اور مسلم راج سے بھی۔

دشمن منتخب کر لو | نہ ڈاکٹر . . . . . صاحب اسے ہمارے مرض کا علاج سمجھتے ہیں
کہ مسلمانوں کو صبر کی تلقین کریں اور ان سے کہیں کہ گو یہ یقینی امر ہے کہ تمھیں خدا
کی خاطر ساری خدائی سے لڑنا پڑے گا لیکن تم ایک ہی وقت میں ساری دنیا
سے نہیں لڑ سکتے دشمنوں میں سے ایک کو چھانٹ لو جسے تم الد الخصام سمجھتے ہو
جو تمھارے دشمنوں میں سب سے زیادہ قوی ہے، اگر ہو سکے تو اس کے خلاف اوروں
کو اسی طرح اپنا حلیف بنا لو جس طرح رسول اکرم نے یثرب کے یہودیوں تک کو مشرکین

مکہ کے خلاف اپنا حلیف بنایا تھا، اگر کوئی جماعت بھی تمہارے سیاسی تدبر سے رام
ہوکر تمھاری حلیف نہ بن سکے تب بھی ہر محاذِ جنگ پر یکساں زور نہ لگاؤ اور
محاذوں پر صرف مدافعت کرتے رہو اور جس محاذ پر جہاں جنگ کا فیصلہ ہونے
والا ہو پورا زور صرف کردو، اور جگہ صبر وضبط سے کام لو جب سب سے بڑے محاذ
جنگ پر فتح حاصل ہو جائے تو دوسرے محاذوں پر آپ ہی فتح حاصل ہو جائے
گی اور اس وقت ایک ایک کرکے ہر دشمن سے دل کھولکر انتقام لے لینا، یہ نامردی
نہیں ہے بلکہ اسی کو "عزم" کہتے ہیں۔

الد الخصام کون ہے اگر چین و عرب بھی تمہارا ہے اور ہندوستان بھی تمہارا ہے اور تم
سب مسلمان ہو اور سارا جہان تمہارا وطن ہے تو اسی دشمن کو الد الخصام سمجھو جو
سارے جہان پر حاوی ہونا چاہتا ہے، یقیناً وہ دشمن ہندو نہیں ہے، اس غریب
کی تگ و دو تو سمندر کے کنارہ تک ہے، یہ تو گولر کا بھنگا ہے جس کی ساری دنیا
اسی گولر میں محدود ہے، ایمان سے کہو کیا تم اس سے خائف ہو؟، ریل پر
کسی ڈبہ میں چھ سات ہندو ہوں اور ان میں تم بھی جاکر بیٹھ جاؤ تو کیا تمھیں ان
سے ڈر لگے گا بعض اوقات تو انھیں کو تم سے ڈر لگتا ہے، البتہ اگر اس ڈبے
میں دو چار گورے ہوں تب تو تم کو اور ان کو دونوں کو ڈر لگتا ہے، کہ یہ مارینگے
یا سامان پھینک دیں گے یا گالی دیں گے یا پاؤں دبوائیں گے آج اگر ہندو
تم پر ظلم کرتے ہیں، تمہارے سیاسی و مذہبی حقوق پامال کرتے ہیں، تمھاری
عبادتوں میں خلل ڈالتے ہیں تو اس لئے کہ حکومت تمھاری اور تمھارے
حقوق کی حفاظت میں کوتاہی کرتی ہے، خیر اگر تمھیں ان سے لڑنا ہی ہے تو

کس ہتھیار سے لڑو گے ؟ لٹھ پونگے میں تم اب بھی دو رہتے ہو اگر آج انگریز بیچ میں
نہ کود پڑیں تو تم اب بھی ان سے بھگت نہیں سکتے ہو ایک جگہ بھی تو آج تک دن بھر
لڑائی نہ ہونے پائی، پولیس آجاتی ہے، فوج آجاتی ہے اور بالآخر اپنے اپنے
گھروں میں دبک کر بیٹھ جاتے ہو، پھر پکڑ دھکڑ شروع ہوتی ہے جن مسلمانوں
کے لئے تم گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخا کرتے تھے کہ سرکاری نوکریاں انھیں دی جائیں وہ
تو اس خوف کے مارے کہ کہیں سرکار انھیں متعصب اور طرفدار سمجھ کر برخاست
نہ کر دے، بعض اوقات خود ہی ناکردہ گناہ مسلمانوں تک کو پھنسوا دیتے ہیں۔
سہارنپور میں کیا ہوا ؟ علیگڑھ میں کیا ہوا ؟ وہ تو ہندو ہی ہیں جو خود تمھارے
قول کے مطابق اپنے مجرموں تک کو چھٹوا لیتے ہیں اور جو ہندو پولیس افسر
ہندو مہاسبھا کے صدر سے بقرعید کی صبح کو ٹیلیفون پر احکام لیا کرتے ہیں کہ کس
محلہ اور کس گلی اور کس بازار میں پولیس زیادہ لگوائی جائے ؟ اور کس میں کم ؟
جب مقدمات کچہری میں پہنچ جاتے ہیں تو تمھارے یہاں وکیلوں کا کال پڑ جاتا
ہے، خود تمھارا بیان ہے کہ عبدالرشید کے مقدمہ پر ایک بیرسٹر نے چارسو روپیہ
روز رکھوائے اور اگر شب ما قبل میں آٹھ بجے سے پہلے یہ رقم وصول نہ ہوگی تو
بوریا بدھنا باندھ اسی وقت اسٹیشن کا رخ کرنے کی دھمکی دی، نہ سشن میں، نہ
ہائیکورٹ کی اپیل میں کسی نامور مسلمان بیرسٹر نے پوری فیس نہ لے کر پیروی
کرنا قبول کیا ؟ اندور میں آج بھی مسٹر آصف علی جن کے لئے انتخاب میں بوڑھے
اور مفلوج مسلمان تک پالکیوں میں پڑ پڑ کر ووٹ دینے کے لئے آئے تھے غریب
مل کے مزدوروں سے دس ہزار اپنے لئے اور ایک ہزار اپنے منشی کے لئے

ٹھہرا چکے تھے اور بنگلہ کا کرایہ ستر ماہوار علیحدہ اور کھانے کا خرچ ڈیڑھ سو ماہوار مستزاد اور ڈیڑھ سو ماہوار موٹر کا خرچ سونے پر سہاگہ۔

جب حالت یہ ہو تو کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ فسادات سے جہاں تک ہو سکے بچا جائے!"

کانگرس کی حمایت میں، انگریزوں کی مخالفت میں، ہندو مسلم اتحاد کی موافقت میں اس سے بڑھ کر کچھ کہا جا سکتا ہے؟ یا کسی بڑے سے بڑے مدبّر نے ایسے نفسیاتی دلائل کبھی پیش کئے ہیں؟

بمبئی تحقیقاتی کمیٹی ۱۹۲۹ء کے فساد بمبئی میں محمد علی نے جو کچھ کیا وہ آپ پڑھ چکے ہیں، پھر اس کے بعد جب تحقیقاتی کمیٹی بیٹھی تو محمد علی نے اپنی علالت اور کانگرس کی مخالفت کے باوجود اس میں بیان دیا اور کانگرس کو ہندو مسلمانوں کا ادارہ بتایا، اپنے اختلافات کو فروعی اور خانگی ظاہر کیا، اور لاہور کے اجلاس کانگرس میں شرکت پر آمادگی کا اظہار کیا، گورنمنٹ، پولیس اور فوج پر پوری تنقید کی حالانکہ محض ایک "فرقہ وارانہ" لیڈر کا فرض یہ ہونا چاہئے تھا کہ وہ اس تحقیقاتی کمیٹی کے سامنے اپنی ملت کو مظلوم اور دوسری کو ظالم ثابت کر کے چلا آتا۔

مسٹر پٹیل کی ٹوپی سوراج پارٹی کے رکن کی حیثیت سے جب مسٹر وٹھل بھائی پٹیل نے پہلے اسمبلی کی ممبری اور پھر صدارت قبول کی اور صدارت قبول کرنے کے بعد جس طرح وہ پورے سرکاری لباس میں سر پر "وگ" ڈال کر تشریف لائے ہیں اس پر سبھی متحیر و متعجب ہوئے تھے اور اس طرزِ عمل کو "تعاون کا درمیانی قدم" بتایا تھا۔

مگر محمد علی نے نہ صرف یہ کہ اس روش کی مخالفت کی بلکہ مسٹر پٹیل کو ہر طرح سے آمادہ کیا کہ صدر ہو جانے سے آدمی کے عقائد میں فرق نہیں آنا چاہئے، آپ کو اپنا قومی لباس ہی زیب تن کرنا چاہئے اور "وگ" کے بجائے اپنی وہی ٹوپی جو اس سے قبل آپ کو محبوب تھی

چنانچہ مسٹر پٹیل نے اس نصیحت کو قبول کیا اور ان کی قبولیت کی خبر ان الفاظ میں شائع ہوئی۔

"معلوم ہوا ہے کہ مسٹر پٹیل پریسیڈنٹ لیجسلیٹو اسمبلی نے مولٰنا محمد علی کے مشورہ پر عمل کرتے ہوئے "وگ" کو اتار پھینکا اور اپنی اصلی کھدر کی ٹوپی پہن کر کرسی صدارت کو زینت دینے لگے۔"

الحمد للہ!

باب ۲۷

"یونٹی کانفرنس"

ملک کی عام حالت | تحریک ترک موالات کے التوا اور پھر گاندھی جی کی گرفتاری کے بعد ہندوستانی سیاسیات میں جو انقلاب عظیم پیدا ہوا وہ "ظاہر و باہر" ہے، ہندو مسلمانوں کے الگ الگ محاذ جنگ قائم تھے، اور ہر فریق کی پوری کوشش اس میں صرف ہوتی تھی کہ دوسرے فریق کو نیچا دکھایا جائے۔

سنگٹھن | پھر ایک نئے ولولہ کے ساتھ سنگٹھن کی تحریک شروع ہوئی جس کا مقصد یہ تھا کہ چند ہی دنوں کے اندر ہندوؤں میں اتنی توانائی آجائے کہ وہ مسلمانوں کو ہندوستان سے نکال کر بحر اوقیانوس تک میں "اوم" کا جھنڈا لہرائے۔

اس آرزو کو دیکھئے اور ہم کو دیکھئے!

اور اس مقصد کے حصول کے لئے کیا یہ گیا کہ اکھاڑے قائم کئے گئے جہاں کشتی کی تعلیم کے لئے پہلوان مقرر کئے گئے، ہندوؤں میں یہ احساس پیدا کرایا کہ "حفاظت خود اختیاری" کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ بانکا، بنوٹ، پھری، گتکہ ان تمام فنون میں مہارت حاصل کریں تاکہ یہ سب چیزیں بوقت ضرورت کام آویں۔"

دوسری طرف مالوی جی، لاجپت رائے اور سوامی شردھانند کی علی الاعلان تعلیم ہندو خواتین کو یہ تھی کہ وہ بھی اپنے پاس کم از کم ایک "قرولی" ضرور رکھیں، کیا معلوم کون وقت کیسا ہوتا ہے؟

مسلمانوں میں جوش ان باتوں سے مسلمانوں میں ایک جوش تو ضرور پیدا ہوگیا، لیکن الحمدللہ کہ انھوں نے اس قسم کی نمائشی حرکتیں نہیں کیں جن کا مقصد صرف تخویف و ترہیب تھا۔

نتیجہ ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ فسادات کا ایک موسم مقرر ہوگیا، جہاں کوئی مذہبی تقریب آئی اور فسادات کا موسم شروع ہوگیا۔ مسلمان اپنی لاٹھیاں لے کر نکلے اور ہندو اپنی! چلئے ایک بار خوب خونریز جنگ ہوگئی، کچھ مرے، کچھ زخمی ہوئے، کچھ جیل خانے گئے اور کچھ پھانسی کے تختہ پر لٹکے۔

اس تمام ہنگامہ دار و گیر میں سب سے زیادہ نقصان مسلمانوں کو ہوتا تھا اس لئے کہ ان بیچاروں کو پیروی کے لئے وکیل بھی نہیں ملتے، اور بڑی بڑی فیسیں دے کر اگر اپنے کو بچا سکتے تو جان ہتھیلی پر رکھ کر "میدان جہاد" میں کیوں اترتے۔

لکھنؤ کا فساد اسی زمانہ میں لکھنؤ میں ایک نہایت خونریز فساد بغیر کسی امید کے دفعتہً و بغتتہً ایک جماعت نے کر دیا، یہ فساد اتنا خوفناک تھا کہ بیان نہیں کیا جا سکتا، کئی روز تک مسلمانوں کے محلہ میں ہندوؤں کی اور ہندوؤں کے محلہ میں مسلمانوں کی جان کی خیر نہیں تھی، سیکڑوں راہ گیر مسافر غریب الوطن نذر تیغ بیدریغ کر دیئے گئے اور کشتوں کے پشتے لگ گئے۔

اسباب فساد لیکن اس خونریزی، اس کشت و خون اور اس قتل عام کے اسباب و محرکات کیا تھے؟ باجہ، گائے اور دسہرہ، ہولی!

مذہب کے نادان دوست مذہب کے نام پر کتنا بدنما دھبہ لگا رہے تھے؟

یونٹی کانفرنس ان حالات میں ایک یونٹی کانفرنس دہلی میں طلب کی گئی جس میں ہندو مسلمانوں کے "متفقہ" اور مسلمہ زعماء نے کوشش کی کہ راہ صلح و امن پیدا کی جا سکے، لیکن یہ مقصد صرف پر جوش اور دھواں دھار تقریروں سے حاصل کرنے کی کوشش کی گئی!

کئی روز تک اجلاس ہوتا رہا، تقریریں ہوتی رہیں، صلح و امن کی راہ تلاش کیجاتی رہی مگر وہ مل نہ سکی!

محمد علی کا حصہ محمد علی بھی اس "ملاپ کانفرنس" میں شریک ہوئے تھے، انھوں نے اپنی پوری قوت صرف کر دی کہ کوئی ایسا حل نکل آئے کہ جانبین کا فساد پسند عنصر راضی ہو جائے مگر ایسا نہیں ہوا، محمد علی نے اپنی تقریر میں یہاں تک کہدیا کہ "اگر کوئی ہندو میری بیوی کی بے عزتی کرے، جب بھی میں اس پر ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا۔ میری ماں کو قتل کرے جب بھی میں عدالت مقدمہ نہیں لیجاؤں گا، لیکن اب اس بدترین صورت حال کا علاج ہونا چاہئے، ذرا ذرا سی بات پر ہم کو چاہئے کہ تلواریں میان سے نہ نکال لیا کریں، ورنہ ہم آزادی کی منزل سے دور ہوتے چلے جائیں گے، اور اغیار برابر ہمارا مضحکہ اڑائیں گے، اور ہم پر زبان طعن دراز کریں گے،، لیکن وہ فضا ایسی تھی کہ ہندوؤں نے تو اس تقریر سے کوئی ہمدردانہ اثر نہیں لیا، مسلمان مخالفین نے محمد علی کی اسلام دشمنی کے ثبوت میں ان کی یہ تقریر البتہ اچھالنا شروع کر دی۔

ایک بات پر اگر شردھانند اپنی "نیم رضامندی" کا اعتراف کرنے پر آمادہ ہوتے تھے۔ تو مالوی جی کڑک کر ایک ڈانٹ بتا دیتے تھے، اگر مالوی جی کچھ صلح پسندی پر مائل ہوتے تھے تو "شیر پنجاب،، لالہ لاجپت رائے کی ایک دہاڑ ان کا پتہ پانی کر دیتی تھی۔

غرض کئی روز کی کوششوں کے بعد معلوم ہوا کہ

نشستند و گفتند و برخاستند

کا ہمہ گیر کلیہ یہاں بھی حاوی ہے۔

التوا کے بعد "ملاپ کانفرنس" کے التوا کے بعد اس لئے کہ وہ برخاست نہیں کی گئی تھی! ہندو مسلم زعماء پھر اپنی اپنی قوم کو "مستقبل" کے لئے تیار کرنے لگے، فساد کی گرم بازاری

میں کوئی کمی نہیں ہوئی، اور ہندو مسلم اختلافات میں اضافہ ہوتا رہا۔

محمد علی کا طرز عمل | اس التواء کے بعد محمد علی نے نہ گوشۂ عافیت اختیار کیا، نہ خاموشی اختیار کی اور نہ فساد پسند طبائع کو ابھارنا شروع کیا بلکہ انھوں نے مسلسل دورے کئے، تقریریں کیں، مضامین لکھے، پرائیویٹ ملاقاتیں کیں، جلسے طلب کئے، گاندھی جی کو سمجھایا، مالوی جی کی منت کی، مگر! نتیجہ؟ ناکامی!

شملہ یونٹی کانفرنس | آخر فسادات میں اضافہ ہوتا رہا اور ہندو مسلم تعلقات بد سے بد تر ہوتے رہے، گاندھی جی یہ کہہ کر "اب میری بات کوئی نہیں سنتا"، اپنے آشرم میں معتکف ہو گئے لیکن محمد علی کی کوششوں کا اب بھی خاتمہ نہیں ہوا۔

سنہ۱۹۲۷ء میں شملہ میں اسمبلی کا اجلاس ہو رہا تھا، وہیں مجلس مرکزیہ خلافت نے اپنا جلسہ طلب کیا، تقریباً تمام ممبران شریک ہوئے، مہاسبھا کی مجلس بھی اس زمانہ میں وہیں ہو رہی تھی، خلافت کے اکثر ممبران کا اصرار تھا کہ آخر ہم کبتک ہندو مسلم اتحاد کے نعرے لگائیں گے؟ ہم تو یہ نعرے لگا رہے ہیں اور دشمن ہماری غفلت سے فائدہ اٹھا کر ہمیں تباہ کرنے پر تلا ہوا ہے، "لہٰذا کم از کم ہمیں دفاعی پروگرام پر تو عمل کرنا چاہئے، مگر خلافت کمیٹی نے پھر اس پر جوش عنصر کو قابو میں رکھا۔

قاصد امن | مولانا شوکت علی نے مرکزیہ کی طرف سے مسٹر شعیب قریشی اور ڈاکٹر انصاری کو اپنا سفیر بنا کر ہندو مہا سبھا کے قائد ڈاکٹر مونجے کے پاس بھیجا کہ اب پانی سر سے گزر چکا ہے، حالات نازک سے نازک تر ہوتے جا رہے ہیں، ہم اپنے مقصد حریت کی خاطر دفاعی کارروائی کرنا بھی نہیں چاہتے۔ للہ اب ان اختلافات کو ختم کیجئے اور ایک جگہ سر جوڑ کر بیٹھئے اور دل جوڑ کر اٹھئے! پھر جب خدا وہ دن کرے کہ ہم عروس حریت سے ہمکنار رہوں تب پھر جتنا جی چاہے

لڑ لیجئے گا۔

کانفرنس شروع ہوگئی | آخر شملہ کی بلندیوں پر ایک بار پھر "ملاپ کانفرنس" کی کارروائی کا آغاز مسٹر جناح کی صدارت میں ہوا اور اس میں خلافت اور ہندو مہاسبھا کے اور بعض دوسری انجمنوں کے نمائندے اور بعض حضرات شخصی حیثیت سے شریک ہوئے۔

بیگم بھوپال کا تار | اسی زمانہ میں بیگم صاحبہ بھوپال نے ایک تار اس "ملاپ کانفرنس" کے نام بھیجا اور بڑی پرزور استدعا کی کہ اب فسادات و اختلافات کا خاتمہ ہونا چاہیئے، نیز ممدوحہ نے "آن" پیرانہ سالی اپنے خدمات پیش کئے! دوسرے لوگ بھی جو نہ آسکے انھوں نے ہمدردی کے تار دئے اور وقتاً فوقتاً شرکت پر آمادگی ظاہر کی، اس امید افزا فضا میں "ملاپ کانفرنس" کا آغاز ہوا۔

محمد علی کی کوششیں | محمد علی نے اس کانفرنس کو کامیاب بنانے کی جتنی کوشش کی کسی لیڈر نے کم کی ہوگی، تجویزوں کا مسودہ تیار کرنے میں، الفاظ گھٹانے بڑھانے میں، معاملات کو رد براہ کرنے میں، لوگوں کو ایک نقطۂ نظر پر لانے میں محمد علی نے اپنی ساری قابلیت اور ساری کوشش صرف کردی کہ کسی طرح اس افتراق و انشقاق کا خاتمہ ہو اور ایک بار پھر وہ مبارک زمانہ آجائے کہ ہندو مسلمانوں کی تعریف کر رہا ہو اور مسلمان ہندو کی منقبت۔

مجلس مرکزیہ خلافت کا جلسہ ختم ہوگیا، اس کے ممبران چلے گئے، مولنا شوکت علی واپس گئے، مگر "ملاپ کانفرنس" ختم نہیں ہوئی وہ ہفتوں ہوا کی

شاہد کی علالت | محمد علی شملہ میں ہندو مسلم اتحاد کی گرہ کشائی کر رہے تھے اور دہلی میں ان کا عزیز بھتیجا شاہد علی مرگ و زیست کی کشمکش میں گرفتار تھا، حالت بہت زیادہ نازک ہوگئی تھی بھتیجے کی یہ تمنا کہ وہ آخری وقت اپنے شفیق چچا کا دیدار کرے اور چچا کی یہ کوشش کہ وہ آخری

بار اپنے بھتیجے کو پیار کرے، مگر ملکی و ملی خدمت کی زنجیر ایسی پڑی ہے کہ قدم نہیں اٹھانے دیتی
آخر

مند گئیں دیکھتے ہی دیکھتے آنکھیں ہر ہر

مگر چچا کو موقعہ نہ مل سکا کہ وہ جنازہ ہی میں شرکت کرسکتا، یا کم از کم مٹی ہی دے سکتا۔

پھر التوا۔ ہفتوں کی اس مسلسل نشست اور تگاپو کے باوجود پھر بغیر کسی نتیجہ پر پہنچے ہوئے یہ کانفرنس ملتوی ہوگئی کہ کسی آئندہ موقع پر دیکھا جائے گا، اس وقت فضا مناسب نہیں ہے۔

یہ ایک واقعہ ہے کہ مسلمانوں نے اقلیت میں ہونے کے باوجود جس طرح ہندو مسلم اتحاد کی کوشش کی اور یہ چاہا کہ کوئی صحیح راہ عمل متعین ہوسکے، اس کی نظیر ملنی دشوار ہے لیکن اس کی نظیر بھی اس سے زیادہ ملنا دشوار ہے کہ "اکثریت" کو اپنے متعلق اتنا خطرہ ہو کہ ہمیشہ صلح کی کوششوں سے بھاگے، اتحاد کے نام سے کانوں پر ہاتھ دھرے اور اشتراک عمل کا نام سننا بھی پسند نہ کرے۔

اس التوا کے بعد پھر دوسرے نام سے جو کوششیں ہوئیں اور محمد علی نے ان میں جو حصہ لیا اس ذکر بعد کو آئے گا۔

باب ۲۸

مسئلہ حج و حجاز

عالم اسلام سے بالعموم اور حجاز مقدس سے بالخصوص ہمیشہ محمد علی کو ایک گہرا تعلق رہا اور جب بھی کوئی نازک موقعہ پیش آیا ان کے قدم کبھی پیچھے نہیں ہٹے بلکہ ہمیشہ انھوں نے ملت اسلامیہ کی صحیح رہنمائی کی۔

شریف حسین کی غداری | جنگ عمومی میں جس طرح حسین شریک مکہ نے صرف ترکوں ہی سے نہیں بلکہ اسلام اور قبلۂ اسلام سے اپنی غداری کا ثبوت دیا، وہ ہر شخص کو معلوم ہونا چاہیئے۔

جنگ عمومی میں یہی وہ "مرغ زریں بال" تھا جسے شاطر فرنگ نے اپنے دام استعمار میں اپنی بساط سیاست کا ایک اہم مہرہ سمجھ کر لانا چاہا تھا، اور اس دشمن اسلام کو "وحدت عربیہ" اور "حکومت متحدۂ حجاز" کے سبز باغ دکھا کر ترکوں سے بغاوت کروائی اور اپنا کام نکالا۔

اور پھر جنگ کے بعد جس طرح اس سے وعدہ خلافیاں کی گئیں اور رفتہ رفتہ اس غریب کو جس طرح اپنی "حفاظت" میں لے لیا گیا وہ ایک عجیب و غریب داستان ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ حجاز ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا، شام میں فرانس کا انتداب اور عراق و شرق اردن پر برطانیہ کی نظر عنایت ہوئی، البتہ یمن اور نجد دو مقامات ایسے تھے جو گورنمنٹ کے اثر سے کلیتہً آزاد تھے اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ حجاز کو اس عالم کسمپرسی میں رہنے دیں۔

حملے کے ارادے | آخر نجد کے جواں ہمت شہزادہ عبدالعزیز ابن سعود نے حجاز مقدس کو

ان گندگیوں سے پاک کرنا چاہا، اس لئے کہ عالم اسلام کی ہمدردی شریف حسین کھو چکا تھا اور خود حجاز کے باشندے اس کے مظالم اور عجیب عجیب ٹیکسوں سے تنگ آ چکے تھے، اس لئے سب کو یہ حملہ ایک آیۂ رحمت معلوم ہوئی کہ وہاں سے ایک صحیح العقیدہ اور پختہ مذہب شخص ان تمام گندگیوں کا استیصال کرنا چاہتا ہے۔

گورنمنٹ کا طرزِ عمل | جنگ شروع ہوئی تو گورنمنٹ کی ولی "ہمدردی" ظاہر ہے کہ شریف حسین کے ساتھ تھی، وہ کیوں چاہتی کہ اس کا ایک شکار مفت میں ہاتھ سے نکل جائے اور حجاز پر ایک ایسی حکومت قائم ہو جائے جو اس کے اثر سے کلیتہً آزاد ہو اور آزاد رہنا چاہے، اس لئے گورنمنٹ نے چاہا کہ کوئی ایسی صورت پیدا کیجائے کہ صورت حال میں تغیر پیدا کر دیا جائے اس کا نتیجہ یقیناً حسب دلخواہ نکلے گا، اور چونکہ علی الاعلان وہ کسی کی طرفداری یا مخالفت کر نہیں سکتی تھی ورنہ ہندوستان کے مسلمان ایک آفت برپا کر دیتے اس لئے اس نے یہ تجویز تیار کی کہ

التواءِ حج کی تجویز | اس سال ۱۹۲۵ء میں ہندوستان سے حاجیوں کو حج کرنے جانے ہی نہ دیا جائے، چنانچہ گورنمنٹ کی طرف سے ایک کمیونکے شائع ہوا جس میں حجاز کی حالت نہایت خطرناک اور دہشت ناک بتائی گئی اور حاجیوں کو حکم تو نہیں دیا جا سکتا تھا، اس لئے "مشورہ" دیا گیا کہ وہ حجاز کا رُخ نہ کریں، ورنہ ہم ان کے جان و مال، کسی چیز کی حفاظت کے ذمہ دار اور جوابدہ نہ ہوں گے! اس کمیونکے کی خوب اشاعت ہوئی۔

محمد علی | محمد علی اس کمیونکے کی اشاعت کے بعد کس طرح چین سے بیٹھ سکتے تھے، انھوں نے اس مسئلہ میں گورنمنٹ کی خوب مخالفت کی اور حاجیوں کو "حکم" دیا کہ وہ حج کرنے ضرور جائیں، دوسری طرف خلافت کا ایک وفد حجاز مقدس بھجوانا چاہا جو شریف حسین اور علی سے مل کر حالات میں اصلاح کرائے، ان کوششوں کا اثر یہ ہوا کہ خلاف توقع حاجیوں کے قافلہ

کے قافلہ بمبئی میں پہنچنے لگے شمع حرم کے ان پروانوں کو جان و مال کی پرواہی کیا تھی۔

چونکہ جدہ پر گولہ باری ہو رہی تھی اس لئے حکومت سعود نے رابغ، قنقدہ، لیت جدید بندرگاہوں کو اس قابل بنا دیا کہ حجاج وہاں سے جاسکیں اور سب سے بڑھ کر گورنمنٹ کے لئے ستم یہ ہوا کہ حکومت سعود نے حاجیوں کی جان و مال کی حفاظت وصیانت کی ذمہ داری بھی لے لی۔

سر حبیب اللہ سے خط و کتابت اس زمانہ میں سر حبیب اللہ حکومت ہند کی "اگزیکیٹو کونسل" کے ممبر تھے، ان سے محمد علی نے نہایت پر لطف خط و کتابت کی اور انھیں بہ دلائل معقول باور کرایا کہ ایسی صورت میں حج کا التوا قطعاً ناجائز ہے، اس اہم فریضۂ مذہبی کو ضرور پورا ہونا چاہیئے۔

ایک طرف یہ خط و کتابت دوسری طرف جدید بندرگاہوں کا انتظام، پھر ہندوستان کے طول و عرض میں ایک ہنگامہ اور سب سے بڑھ کر حاجیوں کے غول کے غول کا بمبئی میں جا کر ڈیرے ڈال دینا یہ سب اسباب ایسے ہوئے کہ گورنمنٹ اجازت دینے پر مجبور ہو گئی۔

"مسلمانوں" کی مخالفت ایک طرف تو محمد علی یہ کوشش کر رہے تھے کہ حاجیوں کو حج سے نہ روکا جائے اور گورنمنٹ پر دباؤ ڈال رہے تھے کہ وہ ایسی صورت پیدا کرے کہ حاجی جاسکیں دوسری طرف سرکار پرست مسلمانوں کا ایک جم غفیر میدان میں تو نہیں آسکا، ہاں اسمبلی کے ایوان میں اور اخبارات کے صفحات میں اس نے بھی اپنے زور بازو اور زور زبان و زور قلم کا پورا مظاہرہ کیا، اور کوئی ایسی ذلیل سے ذلیل تہمت نہیں تھی جو محمد علی پر نہ لگائی گئی ہو۔ یہانتک کہا گیا کہ اس معاملہ میں محمد علی خواہ مخواہ اس لئے دخل دے رہے ہیں کہ کانگرس اور کانگرسی لیڈروں کی وقعت جا چکی، یہ اپنا اقتدار اسی طرح بحال کرنا چاہتے ہیں (۱۱۔ ھ۔ ح محمد علی)

نے اپنے اس ناقد کو دعوت مقابلہ دی کہ بھائی اگر واقعہ یہ ہے کہ میں آبرو باختہ لیڈر ہوں اور

فرار | تم لوگ صحیح رہنمائی کر رہے ہو، کانگرسی لیڈر بے وقعت ہو چکے ہیں اور ان کی بات سنی نہیں جاتی اور تم لوگ ماشاء اللہ با وقعت ہو اور تمھاری باتوں پر خوب عمل کیا جاتا ہے۔ تو بسم اللہ۔

ہمیں میداں ہمیں چوگاں ہمیں گوئے

جامع مسجد ہی میں آجاؤ، میں بھی تقریر کروں گا تم بھی اپنی صحیح رہنمائی سے لوگوں کو مستفید کرنا پھر جس کے حق میں فیصلہ ہو جائے وہ لیڈر اور جس حق میں نہ ہو وہ "آبرو باختہ" لیڈر۔

یہ چیلنج اگرچہ منظور کر لیا گیا لیکن جمعہ کے دن وہ بزرگ اپنی "صحیح رہنمائی" سے مستفید کرنے حسب اطلاع و خلاف وعدہ تشریف نہ لا سکے، حاضرین کو بہت سخت اشتیاق و انتظار رہا!

کامیابی | بہر حال اس تمام شور و شغب اور اس تمام ہنگامہ کے باوجود گورنمنٹ کو اجازت دینی پڑی اور حجاج سوئے بیت اللہ گورنمنٹ کی نہیں بلکہ خدا کی حفاظت میں روانہ ہوئے۔

خیر و عافیت | ایک طعنہ محمد علی کو اور ان کے برادر بزرگ مولانا شوکت علی کو یہ بھی دیا جا رہا تھا کہ اتنے حاجیوں کو بھیج تو رہے ہو مگر ان سب کا خون ناحق تمھاری ہی گردن پر رہے گا۔ لیکن اللہ کو اپنے ان سپاہیوں کی عزت رکھنی منظور تھی، ایک حاجی کی نکسیر تک نہیں پھوٹی، سب بخیریت گئے اور بعافیت واپس آئے، ذٰلک فضل اللہ!

باب ۲۹

آویزش نجد و حجاز

محمد علی کی زندگی ایک عالم رستخیز تھی، انھیں اپنی زندگی میں بڑے بڑے معرکوں سے دوچار ہونا پڑا اور سب میں دنیا نے ان کے استقلال و استقامت کا ایسا نمونہ دیکھا جس نے ہمیشہ لوگوں کو متحیر کر کر دیا۔

شریف کی بدکرداریاں حسین، شریف مکہ کے متعلق اجمالاً بتایا جا چکا ہے۔ یہاں کسی اضافہ کی ضرورت نہیں، ہاں اتنا ضرور سمجھ لینا چاہیے کہ اس کی ان بدکرداریوں کے باوجود، عالم اسلامی کے اس سے بیزار ہونے کے باوجود اور وحدت اسلامیہ کو پارہ پارہ کر دینے کے باوجود ہندوستان میں ایک بہت بڑی جماعت ایسی بھی تھی جو اس سے عقیدت و محبت رکھتی تھی، اور گو اس کے افعال و اعمال سے نالاں تھی مگر پھر بھی حجاز پر وہ اسی کا اقتدار چاہتی تھی۔

شریف کے حامی اس کی حمایت میں سب سے بڑی دلیل یہ لائی جاتی تھی کہ وہ آل رسول ہے، نجیب الطرفین سید ہے اور اس کا مستحق ہے کہ حجاز کی زمام قیادت اسی کے ہاتھ میں رہے۔

ابن سعود کے خلاف ان لوگوں کے دلائل کا خلاصہ یہ تھا کہ وہ "وہابی" تھا!

ہندوستان میں اسلام پیروں اور مرشدوں کے ذریعہ پھیلا، اس لئے ہمیشہ سے ایسے گروہ چلے آتے رہے جنھوں نے مقدس اسلاف کے غیر مقدس اخلاف کو ان کا صحیح جانشین سمجھا اور ان کی ہر بدعت کو، ہر گمراہی کو اور ہر خباثت نفس کو اسلام سمجھا۔

اور اگر نہ قبول کرے تو میں تمھارے ساتھ ہوں اور جو کوششیں تمھاری حمایت اور اس کی مخالفت میں صرف کر سکتا ہوں وہ سب تمھارے لئے وقف ہوں گی اور مجھ سے بڑھ کر تمھارا کوئی شریک کار نہ ہوگا۔ مگر

بات بھی کھوئی التجا کر کے   کیا ملا عرض مدعا کر کے

اگر کوئی نتیجہ نکلا تو یہ کہ اختلاف روز بروز بڑھتا گیا اور اس نے رفتہ رفتہ پوری مخالفت کی صورت اختیار کر لی!

لکھنؤ کے معاونین | لکھنؤ میں محمد علی کے چند ہم خیال تھے یعنی مولنا ظفر الملک علوی مدیر الناظر، چودھری خلیق الزماں اور مولنا عبد الماجد (دریابادی) مدظلہ، یہ واقعہ ہے کہ اس سیلاب کا پہاڑ کی طرح سے اگر کسی نے مقابلہ کیا تو وہ یہی بزرگ تھے، اپنی "اقلیت" کے باوجود انھوں نے "اکثریت" کا جس پامردی جس استقلال اور جس غیر معمولی عزم سے مقابلہ کیا وہ ہمیشہ یادگار رہے گا۔

ایک جلسہ | چنانچہ شاید "امتحاناً" ایک جلسہ سلطان ابن سعود کی حمایت میں ان حضرات نے لکھنؤ میں منعقد کرنے کا اعلان کیا، وقت مقررہ پر حاضرین آنا شروع ہو گئے اور جلسہ چونکہ عام تھا، دعوت مخالفین اور موافقین سب کو دی گئی اس لئے سب ہی آئے۔

جلسہ میں مخالفین حضرات کے لیڈر پیش پیش تھے، مولنا قاری شاہ سلیمان صاحب پھلواروی مولنا عبد الباری صاحب مغفور، شیخ مشیر حسین صاحب قدوائی، ٹھاکر نواب علی صاحب اور داعیان نپ مولنا ظفر الملک وغیرہ۔

اختلال | قاری شاہ سلیمان صاحب صدر منتخب ہوئے، پھر مولوی عبد الرزاق صاحب ملیح آبادی نے ایک تقریر شروع کی، ان کی زبان سے چند لفظ نکلے ہوں گے کہ بعض حضرات

میں سخت اشتعال پیدا ہوگیا، ایک بزرگ نے جو اب کونسل آف اسٹیٹ کے ممبر ہیں، عبدالرزاق صاحب کو دھکا دیا اور سخت ناملائم الفاظ استعمال کئے، ایک دوسرے بزرگ نے جن کا اب انتقال ہوچکا ہے، بہت زیادہ درشتی سے فرمایا کہ وہ اس وقت خوش ہوں گے جب عبدالرزاق کا سر دیکھیں گے۔

محمد علی کو دعوت ان حالات میں محمد علی کو دعوت دی گئی کہ وہ ایک جلسہ میں تشریف لائیں اور تقریر کریں، ان لوگوں کی دراز دستیاں اب یہاں تک پہنچ چکی ہیں، بغیر آپ کے آئے اب کام چل نہیں سکتا، اس لئے کہ لکھنؤ ہی خدام الحرمین کا مرکز ہے، یہیں یہیں اپنا پورا زور صرف کرنا چاہئے۔

محمد علی کا ارادہ اس وقت محمد علی پراونشل کانگریس سیتاپور میں شریک ہونے کے لئے گئے تھے، وہیں سے مولنا عبدالماجد دریابادی نے انھیں لکھنؤ چلنے پر مجبور کیا، جب انھوں نے یہ حالات سنے تو وہ فوراً آمادہ ہوگئے اور لکھنؤ تشریف لائے۔

جلسہ کے حالات جلسہ کے صدر چودھری خلیق الزماں تھے، محمد علی کے ساتھ توفیق شریف بھی آئے تھے، محمد علی نے پہلے ان کا ایک مختصر تعارف کرایا اور پھر ان سے تقریر کرائی، وہ عربی میں تقریر کرتے جاتے تھے اور مولنا عبدالرحمن مرحوم اردو میں اس کا ترجمہ فرماتے جاتے تھے۔

توفیق شریف کی تقریر توفیق شریف کی تقریر جب تک ہوتی رہی لوگ خاموشی کے ساتھ ان کی تقریر سنتے رہے، ان کی تقریر کے اختتام کے بعد صاحب صدر نے اعلان کیا کہ اب مولنا محمد علی تقریر کریں گے اور ان کی تقریر کے بعد مخالفین میں جو لوگ تقریر کرنا چاہیں گے، انھیں پورا موقعہ دیا جائے گا، کہ وہ اپنے خیالات کا اظہار کریں۔

خلل اندازی محمد علی جیسے ہی اس قرارداد کے مطابق تقریر کے لئے کھڑے ہوئے، خدام الحرمین جماعت کے بعض افراد نے ایک ایک کونے سے شور کرنا شروع کیا کہ "ہم نہیں سنتے"، "بیٹھ جاؤ"، "پہلے مولانا حسرت موہانی تقریر کریں۔"

محمد علی ایسے ہنگاموں کے وقت خود درود شریف پڑھتے تھے اور چاہتے تھے کہ سب پڑھیں تاکہ اختلاف کم ہو، چنانچہ انھوں نے لوگوں کو خاموش کرنا چاہا، مگر وہ چند آدمی جو اس پر تلے بیٹھے تھے کہ آج جلسہ نہ ہونے دیں گے۔ وہ خاموش نہیں ہوئے۔

اصحاب جلسہ یعنی وہ لوگ جو محمد علی کی تقریر سننے آئے تھے، سخت پریشان اور متردد تھے کہ جس مقصد کے لئے آئے ہیں وہ فوت ہوا جاتا ہے، جواب میں انھوں نے بھی ہنگامہ بپا کرنا چاہا مگر جلسہ کے منتظمین نے انھیں خاموش رکھا۔

بعض لوگوں نے محمد علی سے کہا کہ مولانا حسرت موہانی سے کہئے وہ اگر کہیں گے تو یہ شور ختم ہو جائے گا، مگر محمد علی نے ان سے استدعا کرنے سے انکار کر دیا، کیونکہ وہ ایسا جلسہ کرانا نہیں چاہتے تھے جو دوسروں کے رحم و کرم پر منحصر ہو۔

بہر حال پندرہ بیس منٹ سے زیادہ تک یہ ہنگامہ برپا رہا اور باوجود کوشش کے یہ شور ختم نہیں ہوا، جناب صدر نے دوسرے آدمی کی مدد سے جلسہ کو قائم رکھنا نہیں چاہا اس لئے کہ جلسہ جس کی صدارت میں ہو رہا ہو اسی کو جلسہ پر قابو ہونا چاہئے

اس خیال کے ماتحت انھوں نے کچھ دیر انتظار کیا جب دیکھا کہ یہ لوگ باز نہیں آئیں گے تو جلسہ برخاست کر دیا۔

برخاستگی کا اثر محمد علی کے حامیوں اور معتقدوں کو اس حرکت سے سخت اشتعال پیدا ہوا اگر اس وقت انھیں قابو میں نہ رکھا جاتا تو یقیناً بہت سخت ہنگامہ ہو جاتا، مگر داعیان جلسہ کی

مصلحت بینی اور مآل اندیشی ان وقتی جذبات پر غالب آئی ، انھوں نے اپنے حامیوں اور معتقدوں کو پورے طور سے قابو میں رکھا اور کسی قسم کا ہنگامہ نہیں ہونے دیا۔

اثرات | لیکن یہ رخنہ اندازی بالکل بے اثر بھی نہیں رہ سکتی تھی ، اب انھوں نے اور زیادہ عزم صمیم کے ساتھ طے کرلیا کہ وہ جلسہ کریں گے اور ابن سعود کی حمایت میں کریں گے ، یہ سب کچھ دن کی روشنی میں ہوگا ، مخالف و موافق سب مدعو ہوں گے اور مکائد کو تار تار کر کے رکھدیا جائیگا چنانچہ منتظمین پورے طور سے آئندہ جلسہ کی تیاریوں میں منہمک ہو گئے۔

محمد علی کی روانگی | محمد علی دہلی واپس چلے گئے ، اس لئے کہ وہ بہت مجبوری کے عالم میں تشریف لائے تھے اور وعدہ کر گئے کہ آئندہ جلسوں میں پھر آئیں گے۔

دو اور جلسے | مولنا ظفر الملک صاحب علوی نے اب پھر بڑے انتظامات کے ساتھ جلسہ کا اعلان کیا ، مولنا محمد علی کو دعوت دی گئی اور وہ تشریف لائے ، عام خیال یہ تھا کہ اس جلسہ کا کامیاب ہونا بھی مشکل ہے۔

خدام الحرمین کے انتظامات | انجمن خدام الحرمین نے بھی جلسہ کے درہم برہم کرنے کے پورے انتظامات کرلئے تھے۔

جلسہ کا منظر | بعد نماز عصر ممتاز دارالیتامیٰ لکھنؤ میں جلسہ کا اعلان ہوا ، ندوہ سے کچھ طلبہ انتظامات کے لئے طلب کئے گئے تھے راقم الحروف اس وقت اگرچہ ندوہ کی ایک نیچی جماعت میں پڑھتا تھا لیکن پھر بھی اسے یہ اعزاز حاصل ہوا کہ وہ جلسہ کی خدمت بجا لاسکے۔

جیسے جیسے جلسہ کا وقت قریب آتا گیا ، حاضرین کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا اور ممتاز دارالیتامےٰ میں لوگ داخل ہونے لگے ، مگر وہاں داخلہ کی شرط یہ تھی کہ لاٹھی لیکر کوئی جلسہ میں نہ جائے جنھوں نے تعمیل کی وہ داخل ہوئے ، جنھوں نے انکار کیا وہ روک دیے گئے۔

اتنے میں ہزاروں کی تعداد میں چاروں اور پاسیوں کا ایک لٹھ بند گروہ آیا، سینہ پر "خدام الحرمین" کے بلّے لگے ہوئے تھے - وہ سب بدزبانیاں کرتے ہوئے آئے اور ہال اور پارک کو گھیر لیا اور داخلہ کی کوشش کی جس کی مدافعت کی گئی اور وہ داخل نہ ہو سکے -

علی برادران ابتک نہ آئے تھے، اب بہت زیادہ ہنگامہ پیدا ہو رہا تھا، اور نہایت صاف الفاظ میں محمد علی شوکت علی کے متعلق مغلظ سے مغلظ گالیاں سنی جا رہی تھیں -

محمد علی کی آمد | اتنے میں محمد علی مع اپنے برادر بزرگ مولنا شوکت علی کے چودھری خلیق الزماں کے ساتھ تشریف لائے - ایک بھگدڑ مچ گئی، مشتاقان زیارت دیدار حاصل کرنے کو بڑھے، اور مخالفین "حملہ" کرنے کو، اس یورش کی تفصیل بیان نہیں کیجا سکتی، یہ سارا لٹھ بند گروہ اور دوسرے لوگ اسی طرف ٹوٹ پڑے، یہ دونوں بھائی نہایت وقار و متانت سے آہستہ آہستہ بڑھے یا تو یہ عالم تھا کہ یہ لوگ محمد علی پر یورش کرنے کے لئے بڑھے تھے، ان کا جلسہ درہم برہم کرنے آئے تھے اور انھیں "مزہ" چکھانے آئے تھے، یا یہ عجیب و غریب منظر بھی دیکھنے میں آیا کہ لاٹھیاں جھک گئیں سر خم ہو گئے، اور تقریباً سب نے "محمد علی شوکت علی کی جے" کے نعرے لگانا شروع کئے، کہ اللہ اکبر کے نعروں سے فضا گونج گئی، ہر شخص بیتاب ہو ہو کر بڑھ رہا تھا کہ مصافحہ کا فخر حاصل کرے -

لیکن خدام الحرمین کے مخصوص لوگ اب بھی اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے اور انھوں نے اسی حالت میں جلسہ میں جانا چاہا، پھر بھی داعی جلسہ مولنا ظفر الملک علوی نے مخالف جماعت کے صلاح کار، شیخ مشیر حسین صاحب قدوائی، سے استصواب کیا کہ اگر وہ امن و امان کی ذمہ داری لیں کہ جلسہ میں کسی قسم کا اختلال نہیں پیدا ہوگا تو پھر ان مسلح آدمیوں کو آنے کی اجازت بھی دی جا سکتی ہے مگر یہ ذمہ داری لینے سے انھوں نے انکار کیا، اور پھر بغیر کسی نتیجہ

پر پہنچے ہوئے، یہ جلسہ بھی ملتوی کر دیا گیا۔

دوسرا جلسہ | لیکن دوسرے روز امین الدولہ پارک میں اور اس سے پہلے ممتاز حسن مرحوم کی کوٹھی میں ایک نہایت عظیم الشان اور کامیاب جلسہ ہوا جس میں محمد علی نے کئی گھنٹہ تک تقریر کی اور اپنے خیالات و دلائل لوگوں کے سامنے پیش کئے، جلسہ کی یہ حالت تھی کہ ہزاروں کی تعداد میں انسانوں کا ایک سمندر معلوم ہو رہا تھا اور سب لوگ گوش ہوش سے یہ تقریر دلپذیر سن رہے تھے۔ اگر کوئی آواز سنائی دیتی تھی تو وہ اللہ اکبر کے فلک رسا نعرے تھے، یا محمد علی شوکت علی کی جے تھی، جو فضائے آسمانی میں گونجتی تھی، اس کے بعد پھر دو روز تک محمد علی لکھنؤ میں اور مقیم رہے اور انھوں نے خوب دھواں دھار تقریریں کیں، نتیجہ یہ ہوا کہ لکھنؤ کا اسلامی طبقہ ان کے ساتھ ہو گیا۔

غیر معمولی کامیابی | اس طرح محمد علی نے اپنی ساحرانہ شخصیت کے ساتھ سارے اسلامی ہند کے جوش کو ٹھنڈا کیا اور انھیں آمادہ کیا کہ وہ مستقبل کا انتظار کریں کہ کیا ظاہر ہوتا ہے اس کے بعد وہ اپنے طرز عمل میں آزاد ہوں گے۔ ان کی کوششوں کا حاصل یہ ہوا کہ ایک بار پھر اسلامی ہند میں سکون کی فضا پیدا ہو گئی اور وہ ہنگامہ جس نے شریفوں اور سنجیدہ طبائع کو لب کشائی سے محروم کر دیا تھا، ایک بار کچھ عرصہ کے لئے پھر فرو ہو گیا۔

خلافت کمیٹی کی مستعدی | اس عرصہ میں خلافت کمیٹی برابر اپنے پروگرام پر عامل رہی اور ابن سعود سے مفصل اور مسلسل اطلاعات حاصل کرتی رہی، اپنی مجلس مرکزیہ کے اجلاس منعقد کر کے اس نے ایک پورا لائحہ عمل تیار کر لیا۔ حجاز کی حکومت کے متعلق اپنی پالیسی متعین کر دی، اور بالاتفاق یہ طے ہو گیا کہ خلافت کمیٹی حجاز پر ملوکیت اور شخصیت نہیں چاہتی ہے، نیز منہدم شدہ مقابر و قبب کی تعمیر کی حامی ہے، اور موتمر اسلامی میں اس کی طرف سے اس پر زور

دیا جائے گا کہ ان کی از سر نو مرمت کرائی جائے تا کہ اختلافات کا حقیقۃً خاتمہ ہو۔

خلافت کمیٹی کا یہ وہ بنیادی اصول تھا جس کی تائید اس کے ہر گروہ نے مولانا ابوالکلام صاحب آزاد کی صدارت میں کی۔

ابن سعود کا اعلان ملوکیت | کچھ عرصہ کے بعد خبر آئی کہ سلطان ابن سعود نے حجاز کے باشندوں کے "مجبور" کرنے سے وہاں کی "بادشاہت" قبول کرلی ہے!

ہمدرد نے اس خبر کو سیاہ جدول میں شائع کیا اور محمد علی چونکہ فطرتاً اور عقیدۃً شخصیت اور ملوکیت کے سخت دشمن تھے، اس لئے اب وہ ابن سعود کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔

محمد علی کی مخالفت | اب محمد علی ابن سعود کے مخالف ہو چکے تھے، اور اس کے اعلان ملوکیت سے بیزار و متنفر تھے!

لیکن غور فرمائیے اس کی زندگی کن کن سخت ترین آزمائشوں میں پڑی ہے، اب تک خدام الحرمین سے اختلاف تھا اور محمد علی اس کا مقابلہ کر رہا تھا۔

اب اپنے کیمپ میں پھوٹ پڑ گئی، کل جن لوگوں کے ساتھ اس نے غنیم کا مورچہ فتح کیا تھا، آج وہی لوگ اس کا محاصرہ کئے ہوئے تھے، اب اسی شدت، اسی زور شور اور اسی نامعقولیت سے حامیان ابن سعود نے مخالفت شروع کی، پنجاب کی خلافت کمیٹی باغی ہوگئی اور اس نے ابن سعود کی حمایت اپنا مقصد بنالیا، صدر، کانفرنس نے ان تمام تجویزوں کو پس پشت ڈال دیا جو انہیں کی صدارت میں ملوکیت اور قبور و قبب کے متعلق منظور ہو چکی تھیں اور سب نے بالا اعلان محمد علی کی مخالفت شروع کردی۔

جس شخص کی زندگی عبارت ہو، مجاہدہ سے، حرب فی سبیل اللہ سے اس نے

ان مخالفتوں کو بھی برداشت کیا، ان دوستوں کی بدگوئی پر بھی خورسند ہوا، اپنے مداحوں اور معتقدوں کی بھی گالیاں خندہ پیشانی کے ساتھ سنیں! خدا شاہد ہے کہ اس ظرف اور اس استقلال کے لوگ کم پیدا ہوئے!

باب ۳۰

موتمر عالم اسلام

اسی زمانہ یعنی ۱۹۲۶ء میں سلطان ابن سعود نے ایک "بلاغ عام" کے ذریعہ سے ایک موتمر کے انعقاد کا اعلان کیا۔

محمد علی کی آمادگی | محمد علی نے اتمام حجت اور واقعات کے برائی العین مشاہدہ کے لئے اپنے افلاس کے باوجود موتمر جانے پر آمادگی ظاہر کی اور اپنے مصارف سے تشریف لے گئے خلافت کمیٹی پر اپنے خرچ کا بار نہ ڈالا!

وفد | جب محمد علی آمادہ ہوئے تو تجویز یہ ہوئی کہ ایک وفد بھی خلافت کمیٹی کی طرف سے حجاز بھیجا جائے وہ موتمر عالم اسلام میں شرکت کرے اور خلافت کمیٹی کا نظریہ پیش کرے اور سلطان ابن سعود کو ان کے مواعید یاد دلائے۔

وفد کے ارکان | مولنا سید سلیمان ندوی صدر وفد مقرر ہوئے، مسٹر شعیب قریشی سکرٹری اور علی برادران ممبر، اس طرح یہ وفد موتمر کی شرکت کے لئے حجاز مقدس روانہ ہو گیا!

علالت | محمد علی کی صحت یہیں سے بہت خراب تھی وہاں پہنچے تو آب و ہوا کی ناموافقت کی وجہ سے علیل ہو گئے اور شاید بائیں حصہ جسم پر خفیف سا فالج کا حملہ بھی ہوا لیکن محمد علی ان چیزوں کو خاطر میں نہیں لائے اور اپنا کام برابر پورے استقلال سے جاری رکھا۔

موتمر میں شرکت | موتمر میں عالم اسلامی کے اکثر نمائندے شریک ہوئے تھے، خود سلطان ابن سعود نے موتمر کا افتتاح کیا تھا، اکثر نمائندے "جلالۃ الملک" کے جلال و جبروت سے

متاثر ومرعوب تھے! لیکن محمد علی کا ایک حق گو وجود ایسا تھا جو سلطان کے خدم وحشم، جاہ و جلال، عظمت وجبروت، کسی چیز سے بھی متاثر نہیں ہوا اس نے وہیں موتمر میں سلطان ابن سعود سے پورے آزادانہ لہجہ میں تخاطب کیا۔

محمد علی کا نعرۂ حق | کہ یہ ملوکیت کیسی؟ اسلام میں تو شخصیت کی بیخ کنی کی گئی ہے، شوریٰ اور جمہوریت کو تفوق حاصل ہے، تم کتاب وسنت کے تمسک کے مدعی ہو، پھر یہ قیصر وکسریٰ کی پیروی کیوں؟ محمد علی کے اس آوازۂ حق نے تمام لوگوں کو چونکا دیا اور یہ احساس پیدا کرا دیا کہ ابھی عالم اسلام حق گو اور حق پرست شخصیتوں سے خالی نہیں ہے، گو آج صحابۂ کرام کا وجود گرامی ہمارے درمیان نہیں لیکن پھر بھی ایسی ہستیاں ابھی موجود ہیں جو حق کے لئے سارے عالم سے دشمنی مول لے سکتی ہیں اور کسی شاہ وشہریار کو خاطر میں نہ لائیں۔

محمد علی کی رائے میں تغیر کے اسباب | لیکن ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس ہماہمی کے ساتھ جب انھوں نے ابن سعود کی حمایت کی تھی تو پھر اس زور شور سے اختلاف کیوں کیا؟

اس سلسلہ میں اسے ہمیشہ یاد رکھنا چاہئے کہ مقابر وقبب کی جتنی خبریں ہندوستان میں پہنچیں ان میں سے اکثر کو ابن سعود کی طرف سے "مبالغہ آمیز" قرار دیا گیا، پھر یہ وعدہ بھی کیا گیا کہ موتمر عالم اسلام کے فیصلہ کے مطابق ان کا آئندہ انتظام کیا جائے گا۔ بالاعلان بکرات ومرات یہ کہا گیا کہ حجاز میں شخصی حکومت مقصود نہیں ہے۔ بلکہ جمہوری طرز پر وہاں خلفاء راشدین کا سا عہد حکومت ایک دفعہ پھر پیدا کرنے کی کوشش کیجائے گی، یہ مواعید حکومت ابن سعود کی طرف سے برابر جمعیۃ خلافت سے کئے گئے، نیز محمد علی کے نام ذاتی مکاتیب ومراسلات میں بھی ان کا اعادہ کیا گیا۔

لیکن جب اس وفد کے ارکان (جو مسٹر شعیب قریشی، مولانا عرفان اور ظفر علی خاں

صاحب پر مشتمل تھا اور مسٹر شعیب قریشی نے اپنے مشاہدات کی بنا پر مظالم سلطان کی توثیق کی اور مزید احتیاط کے لئے منہدم شدہ مقامات کی تصویریں بھی انھوں نے بھیجیں اور پھر بعد کو محمد علی نے بھی برای العین ان مقامات کا معائنہ کیا اور معلوم کر لیا کہ جو کچھ کہا جا رہا ہے وہ صحیح ہے اور سلطان تلافی پر آمادہ نہیں ہیں تو پھر مجبوراً ان کا جام صبر لبریز ہو گیا، وعدے یاد دلا کر ان کے ایفا کی کوشش کی اور ناکامیابی کی صورت میں علم مخالفت اب محمد علی کے ہاتھ میں تھا۔

سب سے زیادہ تعجب خیز یہ بات ہے کہ خلافت کمیٹی کی پالیسی، ہدایات اور نصب العین سے جن لوگوں کو کامل اتفاق تھا جن کی صدارت اور جن کی تائید سے یہ چیزیں پاس ہوئی تھیں اور ابن سعود کو بھیجی گئی تھیں، انھیں نے نہایت شدومد سے اختلاف کیا اور ملوکیت کی حمایت کی، وعدہ خلافیوں پر پردہ ڈالنا چاہا۔

یہ تھے محمد علی کے اسباب اختلاف اور ان کے رفقا کا طرز عمل، ان تمام ہنگاموں میں ہمیں اس کا صاف طور سے احساس ہوتا ہے کہ محمد علی کا طرز عمل یقیناً حق بجانب تھا، ایک مومن کی طرح ایک مومن کے پرخلوص ساعی استخلاص حجاز کا انھوں نے خیر مقدم کیا اور پھر ایک مسلم کی طرح تعلقات کی زنجیروں کو توڑ کر انھوں نے سب کی مخالفت کی پروا نہ کی اور جو حق سمجھتے تھے اس کا اعلان کر دیا، اس جگہ نفس مسئلہ کے صواب وعدم صواب پر گفتگو مقصود نہیں، صرف محمد علی کے طرز عمل اور نیت کا رپر تبصرہ اور غیر جانبدارانہ اظہار رائے مقصود ہے۔

خواجہ حسن نظامی کا فیصلہ محمد علی کے اس اتفاق و اختلاف کے متعلق خواجہ حسن نظامی صاحب نے نہایت بے لاگ رائے دی ہے، محمد علی جب موتمر اسلامی کی شرکت کے بعد ہندوستان تشریف لائے تو جامع مسجد دہلی میں مسلمانان دہلی کی طرف سے خواجہ صاحب نے محمد علی اور ان کے رفقا کو ایک سپاسنامہ دیا تھا، جلسہ میں محمد علی نے تقریر بھی کی تھی، واپس جا کر اپنے ۲۲ راگست

۱۹۲۶ء کے روزنامچہ میں وہ اس جلسہ کے متعلق اور محمد علی کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں

"بعد مغرب جلسہ شروع ہوا، جامع مسجد کے جلسوں میں اتنا مجمع میں نے کبھی نہیں دیکھا، پندرہ بیس ہزار آدمی تھے، مولنا محمد علی صاحب کی تقریر کا حاضرین پر بہت اچھا اثر ہوا، میرا اعتماد تو یہ ہے کہ علی برادران اسلام کے سچے عاشق ہیں، انھوں نے پہلے جب ابن سعود کی مخالفت شروع ہوئی تو محض اس وجہ سے ابن سعود کی حمایت کی کہ ان کو یقین تھا کہ ابن سعود بُرا آدمی نہیں ہے اور قبہ شکنی کی خبریں مبالغہ آمیز اور غلط ہیں اور اس مقابلہ میں وہ اتنے ثابت قدم رہے کہ اپنے مرشد مولنا عبدالباری صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بھی موافقت پر راضی نہیں ہوئے، لیکن جب انھوں نے خود حجاز میں جا کر اپنی آنکھوں سے سب واقعات کو دیکھ لیا تو اب وہ ایمانداری کے ساتھ ابن سعود کی مخالفت کر رہے ہیں۔"

تہمت تراشیاں اختلاف و مخالفت ہی پر اگر قناعت کی گئی ہوتی تو غنیمت تھا اور اگر اس پر بھی دل کا بخار نہیں نکلا تھا تو سب و شتم کی بوچھار اس غریب کی سرکوبی کے لئے کافی تھی۔

ستم یہ ہے کہ اس پر بھی سے بھی اور غلط سے غلط تہمتیں لگائی گئیں۔

مصری محمل کا قضیہ اسی زمانہ میں مصری محمل کا قضیہ پیش آیا تھا اور ایک بار نجدیوں نے وفور وحشت سے مصر کے ایک گروہ پر گولی بھی چلادی تھی، مگر مصری دستہ خاموش رہا اور اس نے کوئی انتقامی یا جوابی کارروائی نہیں کی، محمد علی کی شاید مصری کمانڈر سے شناسائی تھی وہ اس سے ملے، ملاقاتیں کیں، اگر نہ بھی شناسائی ہوتی تو بھی ایک مسلم حکومت

کے مسلم عہدہ دار سے ملنا کوئی اخلاقی یا قانونی، یا شرعی جرم نہیں تھا، مگر اس ملاقات کے طرح طرح سے معنی پہنائے گئے اور ہندوستان میں یہ مشہور کیا گیا کہ محمد علی نے مصری کمانڈر کو ترغیب دی کہ وہ ایک اسلامی فوج کے حصہ پر گولیاں چلائے۔

اس واقعہ کو کئی کئی سرخیاں دے کر شائع کیا گیا اور مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید مولانا عرفان اور مولانا عبد الحلیم کو "دھمکی" دی گئی کہ تم شاہد ہو اپنا بیان دو، اگر بیان نہیں دیا تو ہم سمجھیں گے کہ تم اس واقعہ سے واقف ہو اور ہماری تائید میں ہو۔

جب ان بزرگوں کی بہ حلف تردید شائع ہوئی اور ان لوگوں نے اس واقعہ سے اپنی قطعًا لاعلمی اور بے تعلقی اور نفس واقعہ کے عدم وقوع پر بیان دیا تو ذرا تلاطم کم ہوا۔

باب ۳۱

حدیث "حسن" صحیح

محمد علی کی معرکہ آرائیوں میں ایک نہایت اہم اور معرکۃ الآرا جنگ وہ تھی جو انھیں مشہور انشاء پرداز خواجہ "حسن" نظامی صاحب سے کرنی پڑی۔

وقت اور مصلحت کا تقاضا ہو کہ اس قسم کے مسائل سے اجتناب کیا جائے اور آئندہ مورخ کو موقعہ دیا جائے کہ وہ ایسے نزاعی مسائل پر بحث کرے۔

لیکن محمد علی کے سوانح نگار کے لئے واقعات سے قطع نظر بھی ممکن نہیں، محمد علی ایک جنگجو زعیم تھے، اسلام کی خاطر قوم و ملت کی خاطر، استقلال وطن کی خاطر "دراز دستی کوتہ آستینان" کے "کشف غطا" کی خاطر، اپنے "ازالۃ الخفا" کی خاطر اور اپنے نظریات و اعتقادات کی خاطر، بارہا انھوں نے علم جہاد بلند کیا، پھر ان سب چیزوں سے آنکھ کیونکر بند کیجا سکتی ہی؟

ذوالفقار علی تو ہمیشہ باطل کے سر پر صاعقہ موت بن کر چکی، ایسا کب ہوا ہے کہ اس نے مرہم کا کام دیا ہو؟ محمد علی کی زبان و قلم بھی شمشیر آبدار بن کر اپنے نقطہ نظر کے مطابق اپنا کام کرتی رہی۔

مہذب ڈاکو | ہاپوڑ کے ضیاء الحق صاحب کے نام خواجہ حسن نظامی صاحب نے یہ خط بھیجا۔

"۸۶" از درگاہ شریف حضرت محبوب الٰہی دہلی ۱۲ راگست ۱۹۲۸ء

مکرمی سلام علیکم

دو خط پہنچے ابھی دو چار دن کی اور مصروفیت ہی، اس کے بعد لکھنے کی کوشش

کروں گا، لکھائی کا حساب رجسٹر میں دکھوا کر مطلع کروں گا۔

کیا عجب ہے کہ گورنمنٹ نے لکھا ہو، میں نے چیف کمشنر صاحب دہلی سے مفصل حالات بیان کر دئے تھے اور نظام کو پان اسلامزم کے جو سبق دئے جاتے تھے ان کی باضابطہ اطلاع دیدی تھی اور مجھے معلوم ہے کہ انھوں نے پنجاب گورنمنٹ کو اس خطرہ سے آگاہ بھی کیا تھا۔ (یہ خط بالکل خانگی ہے اس کو چاک کر دیجئے۔ یعنی میرے اس کام کی خبر سوائے آپ کے کسی کو نہ ہو۔ حسن نظامی"

ایک عرصۂ دراز تک یہ خط ہاپوڑی صاحب نے اپنے پاس محفوظ رکھا، اکتوبر ۱۹۲۶ء میں وہ یہ دہلی لائے اور مولانا محمد علی اور پیشوایان قوم کو یہ خط دکھا کر "چارہ جوئی" چاہی، اس کی اطلاع خواجہ صاحب کو بھی ہوئی، اور انھوں نے اپنے اخبار منادی میں "مہذب ڈاکو" کے عنوان سے یہ نوٹ لکھا۔

"مہذب ڈاکو کو معلوم ہو کہ میں ان کی دھمکیوں سے مرعوب نہیں ہوں گا۔"

محمد علی کے نام خط

۱۶ نومبر ۱۹۲۶ء کو خواجہ صاحب نے محمد علی کو مکتوب ذیل لکھا۔

"آپ کی شخصیت اور آپ کی مصروفیت ان فضولیات سے بالاتر ہے جب آپ .... والے صاحب کی خصلت اور تمام زندگی سے خود ہی واقف ہیں تو پھر میں نہیں جانتا کہ آپ کو اس معاملہ سے اس قدر دلچسپی کیوں پیدا ہو گئی ہے .... میری آرزو ہے کہ آپ .... صاحب کے قصہ سے علیحدہ رہیں تو مناسب ہے کیونکہ آپ کی عظمت ان ادنیٰ معاملات سے بہت اونچی ہے۔"

لیکن محمد علی اس خط سے متاثر نہیں ہوئے، انھوں نے منادی والے نوٹ کے بعد

اس خط کو ہمدرد میں شائع کر دیا، اس لئے کہ لارڈ ریڈنگ کے مراسلہ سے حضور نظام کی منزلت کو جو نقصان پہنچا تھا وہ محمد علی کے نقطہ نظر کے مطابق نتیجہ تھا اسی قسم کی ریشہ دوانیوں کا۔

محمد علی کا جواب | چنانچہ محمد علی نے خواجہ صاحب کے مکتوب گرامی کا جواب یہ دیا۔

"میں ایک اخبار نویس ہوں اور اس پیشہ کے باعث چند فرائض میرے ذمہ عائد ہوتے ہیں، ان سے کس طرح سبکدوش ہو سکتا ہوں؟ رہی ان صاحب کی شخصیت سو یہ معاملہ ان صاحب کی شخصیت کا نہیں ہے بلکہ خود آپ کی شخصیت کا ہے اور جو کارروائی آپ خود اقبال فرماتے ہیں کہ آپ نے کی ہے وہ ان صاحب کی شخصیت سے بے نیاز ہے اور اس قدر اہم ہے کہ میں اس سے چشم پوشی نہیں کر سکتا۔"

مفاد عام | سوال پیدا ہوتا ہے کہ محمد علی نے یہ "پردہ دری" کیوں کی؟ وہ خود کہتے ہیں۔

"خواجہ صاحب سے میرے تعلقات کچھ بھی ہوں، جہاں مفاد عام کا موقع ہو وہاں میں کسی کی پرواہ نہیں کرتا۔"

خواجہ صاحب کی صفائی | اس مسئلہ کے متعلق خواجہ صاحب نے خود اپنی صفائی بھی ان الفاظ میں دی تھی۔

"مولٰنا ظفر علی خاں کا اخبار "ستارۂ صبح" نکل رہا تھا اور اس میں تصوف کے خلاف مضامین شائع ہوتے تھے، اس واسطے مجھے بھی مولٰنا ظفر علی خاں صاحب سے سخت اختلاف تھا، اسی زمانہ میں مولٰنا ظفر علیخاں حیدرآباد میں بلائے گئے تھے، اور اعلیٰ حضرت حضور نظام کی ان پر بہت مہربانیاں ہو رہی تھیں ان مہذب ڈاکو صاحب نے مجھے لکھا کہ مولٰنا ظفر علی خاں صاحب اعلیٰ حضرت کو

پان اسلامزم کے سبق پڑھارہے ہیں اور اندیشہ ہے کہ اعلیٰحضرت اس کی وجہ سے کسی بلا میں نہ مبتلا ہو جائیں۔ جب مجھے یہ خط ملا تو سلطنت آصفیہ اسلامیہ کی حمایت اور مولانا ظفر علیخاں صاحب کے اثر کے نقصانات سے اعلیٰحضرت کو بچانے کے لئے میں نے دہلی کے چیف کمشنر صاحب سے اس کا ذکر کیا اور انھوں نے مجھ سے کہا کہ میں پنجاب گورنمنٹ کو اس کی اطلاع دوں گا، اس کے بعد میں نے ایک خط مہذب ڈاکو صاحب کو ان کے خط کے جواب میں لکھا کہ میں نے چیف کمشنر صاحب کو اطلاع دیدی ہے کہ حضور نظام کو پان اسلامزم کے سبق پڑھائے جا رہے ہیں اور انھوں نے غالباً پنجاب گورنمنٹ کو اطلاع دیدی ہو گی۔"

محمد علی کا اظہار رائے | خواجہ صاحب نے خط کی اشاعت سے پیشتر احتیاطاً جو صفائی دیدی تھی، محمد علی اس سے مطمئن نہیں ہوئے، ان کا خیال تھا کہ

"یاد رکھئے کہ یہ زمانہ جنگ عظیم کا تھا۔ یہ بھی یاد رکھئے کہ اس جنگ عظیم میں بھی یہ وقت توڑ کا تھا جبکہ جرمن فوج جنرل گاف کی فوج (پانچویں فوج) کا سین کا نتین کے موقف پر قلع قمع کرکے دراتی ہوئی آگے بڑھ چکی تھی پھر یہ بھی یاد رکھئے کہ غریب ظفر علیخاں صاحب کو کرم آباد میں نظر بند رہتے ہوئے تین چار سال گزر چکے تھے کہ انھیں کتے نے کاٹا اور یہ کسولی جانے کے بعد کسی طرح شملہ میں پہنچ گئے اور بہ ہزار وقت اوڈوائر کو راضی کرکے رہا ہوئے اور حیدر آباد پہنچے، ترک جرمنوں کے حلیف اور برطانیہ سے برسر پیکار ہیں اور ٹائمز آف انڈیا کا ایڈیٹر سابق کوٹ فرزیز انگلستان کے اخبار ڈیلی میل میں وہ مضمون شائع کرا چکا ہے جس میں

مشرقی دھمکی کو واضح کرنے کے لئے دنیائے مشرق کا ایک نقشہ دیا گیا تھا کہ اس پر ایک سیدھا تیر قسطنطنیہ سے لیکر دہلی تک کھینچ کر ظاہر کیا گیا تھا کہ ترکی کے پایۂ تخت سے لے کر ہندوستان کے پایۂ تخت تک دو رویہ فقط مسلمانوں ہی کی آبادی ہے یا مسلمانوں کی اکثریت ہے اور ہندوستان کے وائسرائے لارڈ چیمسفورڈ اسی خوف سے دہلی میں زعماء ہند کا وہ اجتماع کر چکے ہیں جس میں نہ صرف مہاتما گاندھی جیسے اس وقت کے انگریز دوست شریک کئے گئے تھے بلکہ تلک مہاراج کا ایک نائب بھی مدعو کیا جا چکا تھا تاکہ سب مل کر اور بالخصوص زعماء ہنود وہ تدابیر سوچیں اور انھیں اختیار کرنے کا حتمی وعدہ کریں جن سے ترکوں کی اسلامی فوج افغانستان ہوتی ہوئی ہندوستان میں داخل اور یہاں فتحیاب نہ ہو سکے۔ اور باوجودیکہ مسز بسنٹ اور انکے دو رفقا نظربندی سے رہا کئے جا چکے ہیں، علی برادران کے متعلق کونسل میں صاف کہدیا جا چکا ہے کہ ان کی صورت مسز بسنٹ سے مختلف ہے ایسے وقت میں خواجہ صاحب چیف کمشنر کے پاس جاتے ہیں کہ "مولانا ظفر علیخاں صاحب حیدرآباد بلائے گئے تھے" اور اعلیحضرت کی ان پر بہت مہربانیاں ہو رہی تھیں' چیف کمشنر سے کہتے ہیں کہ "مولانا ظفر علیخاں صاحب اعلیحضرت کو پان اسلامزم کے سبق پڑھا رہے ہیں۔"

دھمکی کا جواب | باپوڑی صاحب نے ایک بار اور کسی موقعہ پر پان اسلامزم والے خط کی خواجہ صاحب کو "یاد دہانی" کرائی تو خواجہ صاحب نے یہ جواب دیا۔

دہلی - ۲ر صفر ۱۳۴۲ھ

مکرمی - سلام علیکم

. . . . آپ نے آخری خط میں کسی تحریر کا ذکر کیا ہے جس کا تعلق حضور نظام سے ہے، میں بالکل نہیں سمجھا کہ اس میں کیا ہے اور وہ کس کی تحریر ہے"

خواجہ صاحب کے اس جواب کو محمد علی نے "تجاہل عارفانہ" سمجھا اور اصل خط اور یہ خط دونوں ہمدرد میں شائع کردئے اور مزید تصدیق کے لئے خطوط کے بلاک بنواکر بھی ہمدرد میں شائع کرادے۔

خط چروانے کی کوشش | خط کی اشاعت سے پیشتر محمد علی کے بیان کے مطابق خواجہ صاحب نے اپنا یہ خط چروانے کی بھی کوشش کی، چنانچہ شیخ فضل حسین صاحب مالک ہلالی پریس سے عبدالستار بیگ تیموری کے مواجہ میں خواجہ صاحب نے کوشش کرائی، ان دونوں حضرات نے بجائے خط چرانے کے اصل حقیقت محمد علی پر ایک اور دوسرے بزرگ کے سامنے واضح کردی تیموری صاحب کے بیان کا خلاصہ یہ ہے۔

"خواجہ صاحب نے غالباً ایک گھنٹہ سے زیادہ وقت لیا اور اس تمام عرصہ میں وہ شیخ ضیا۔الحق صاحب اور اپنے خط کے متعلق ذکر فرماتے رہے، اس وقت ان کی گفتگو کا لہجہ بہت عاجزانہ اور مسکین پن کا تھا، انھوں نے تین چار مرتبہ اصل خط کے اڑا دینے کے لئے فضل حسین صاحب سے کہا"

الزامات | یہ جنگ شروع ہوئی تو طرفین سے بڑے زبردست مضامین ومقالات لکھے گئے، فریق ثانی کی طرف سے ایک باقاعدہ روزنامہ اخبار "غریبوں کا اخبار" جاری ہوا، جس میں محمد علی اور حامیان محمد علی پر بڑے دلچسپ مضامین شائع ہوئے، آخر میں محمد علی

پر "رقابت" کا الزام لگایا گیا کہ وہ ڈاکٹر انصاری حکیم اجمل خاں، مولانا ابوالکلام آزاد، غرض تمام لیڈروں سے حتیٰ کہ مولانا عبدالباری اپنے مرشد سے بھی "رقابت" رکھتے ہیں چنانچہ مولانا عبدالباری نے محمد علی کو آخر عمر میں "مردود طریقت" کرکے "عاق" کر دیا، اس کا جواب محمد علی نے جو دیا وہ بہت اہم ہے اس کا ایک خاص حصہ یہ ہے جس میں ضمناً دوسرے الزامات بھی آجائیں گے اور ان کی صفائی بھی۔

"خواجہ صاحب خود ہی اس کا فیصلہ کریں اور میں انکی عدالت میں ایک ایسا شاہد پیش کرونگا جسے وہ بھی شاہد عادل مان لیں اس شاہد کا نام باپ دادا اور بزرگوں کا رکھا ہوا تو "علی حسن" ہے لیکن وہ خود اپنے کو خواجہ حسن نظامی کہتا ہے، وہ یکم ستمبر کے روزنامچہ اور شب نامچہ میں تحریری شہادت پیش کرتا ہے کہ۔

"خلافت اور جمعیۃ العلماء کے وفود حج کرکے واپس آرہے ہیں انکے استقبال کیلئے ہزارہا مسلمان اسٹیشن پر جمع ہوئے میں نے اندازہ کیا تو سات آٹھ ہزار آدمی کا ہجوم تھا، ہر طبقہ کے مسلمان آئے تھے ... تکبیروں کے نعروں سے اسٹیشن گونجنے لگا، (یہ کون کہتا تھا کہ محمد علی ایک آبرو باختہ سردار قوم ہے اور اسکی ماں کے جنازہ میں ڈھائی سو سے زیادہ آدمی بھی جمع نہ ہوسکے، دیکھو صفحہ ۵ کالم ایک غریبوں کا اخبار مورخہ ۲ نومبر ۱۹۲۶ء) ... علی برادران نے حجاز کے نہایت دردناک حالات سنائے بے اختیار رونا آگیا، (یہ کون کہتا ہے کہ سنوسی کے غریب لوگوں کے ہاں ایک رونے والا لیڈر آیا ہوا ہے جو بات بات میں روتا ہے، گلی گلی کہتے پھرے وہ آیا رونیوالا لیڈر، دیکھو صفحہ ۲ کالم ۳ غریبوں کا اخبار مورخہ ۲ نومبر) بعد مغرب جلسہ شروع ہوا جامع مسجد کے جلسوں میں اتنا مجمع میں نے کبھی نہیں دیکھا، پندرہ بیس ہزار آدمی تھے ..... میں نے مسلمانان دہلی کی طرف سے جمعیۃ علماء و جمعیۃ خلافت کے لیڈروں کو ایڈریس پڑھ کر سنایا (وہ طوالت کے خیال سے حذف کر دیا گیا) اس میں

علی برادران کی کافی مدح و توصیف تھی مؤلف)

اس کے بعد اب پڑھو غریبوں کا اخبار ہر روز اور ہر تاریخ کا ہر صفحہ اور ہر کالم ہر فقرہ اور ہر لفظ اور پھر دیکھو کہ یہ سب کچھ وہی شخص کہہ رہا ہے جو ۲۲ اگست کو خانہ خدا میں یہ کہہ رہا تھا (اشارہ ہے اس سپاسنامہ کی طرف جو خواجہ صاحب نے جامع مسجد میں دیا تھا، مؤلف) ... عشا کی نماز کے بعد مولنا شوکت علی اور مولنا محمد علی صاحب کی شاندار تقریریں بارہ بجے تک ہوئیں مولنا محمد علی کی تقریر کا حاضرین پر بہت اچھا اثر ہوا میرا اعتقاد تو یہ ہے کہ علی برادران اسلام کے سچے عاشق ہیں انھوں نے پہلے جب ابن سعود کی مخالفت شروع ہوئی تو محض اس وجہ سے ابن سعود کی حمایت کی کہ انکو یقین تھا کہ ابن سعود برا آدمی نہیں ہے اور قبہ شکنی کی خبریں مغالطہ آمیز اور غلط ہیں اور اس معاملہ میں وہ اتنے ثابت قدم رہے کہ اپنے مرشد حضرت مولنا عبدالباری صاحب رح سے بھی موافقت پر راضی نہیں ہوئے لیکن جب انھوں نے خود حجاز میں جاکر اپنی آنکھوں سے سب واقعات کو دیکھ لیا تو اب وہ ایمانداری کے ساتھ ابن سعود کی مخالفت کر رہے ہیں اب انکا سب سے بڑا اختلاف ابن سعود کی ملوکیت اور ابن سعود کی قبہ شکنی اور مزار شکنی سے ہے اور اس معاملہ میں تمام دنیا کے مسلمان ان کے ساتھ ہیں .....،،

کیا فرماتے ہیں شیخ المشائخ و قطب الاقطاب و قاضی القضاۃ مرشدی و مولائی حضرت خواجہ حسن نظامی طول زلفہ بیچ اس مسئلہ کے کونسا حسن نظامی سچا ہے اور کونسا حسن نظامی جھوٹا ہے وہ جو کہتا ہے کہ ”حضرت مولنا محمد علی کو مذہب پیارا نہیں ہے محض سیاست پیاری ہے (غریبوں کا اخبار، ۲۷ نومبر صفحہ ۱ کالم ۲) یا وہ جو اپنے کو چیونٹی کا دل والا سمجھ کر اُتنے بڑے مجمع میں جو جامع مسجد میں پہلے کبھی نہ دیکھا تھا“ اس ”آبرو باختہ“ لیڈر کو سپاسنامہ پڑھ کر سناتا ہے اور اسکی بے انتہا تعریف و توصیف کرتا ہے اور جامع مسجد سے واپس آکر اپنے

شب نامچہ میں لکھا ہے کہ میرا تو اعتقاد ہے کہ علی برادران اسلام کے سچے عاشق ہیں بینوا توجروا۔
کس حسن نظامی پر خدا کی رحمت اور کس حسن نظامی پر خدا کی لعنت اس پر جو کہتا ہے "علی برادران
اتنے ثابت قدم رہے کہ اپنے مرشد حضرت مولنا عبدالباری صاحبؒ سے بھی موافقت
پر راضی نہیں ہوئے یا اس پر جو کہتا ہے کہ مولنا محمد علی اپنے پیر و مرشد حضرت مولنا عبدالباری
صاحبؒ کے بڑھتے ہوئے رسوخ کو بھی نہ دیکھ سکے، ۰۰۰۰ کونسا حسن نظامی جھوٹا؟
بینوا توجروا"

اسی قبیل کے بیسیوں بلکہ سیکڑوں الزامات محمد علی پر لگائے گئے اور انھوں نے انکے جوابات بھی دیے۔

لب ولہجہ کی شکایت | سطور بالا سے آپنے اندازہ لگایا ہوگا کہ محمد علی کا لب ولہجہ بہت سخت ہے اس کا
ایک جواب تو غریبوں کا اخبار، کا ایک ایک حرف ہے اور دوسرا جواب خود محمد علی کے الفاظ میں یہ ہے۔
"خواص" مجھے معاف فرمائیں اگر انکے نزدیک طرز تحریر میں رقت و متانت و سنجیدگی نہیں نہیں
نظر آتی جس کے وہ عادی ہیں، وہ "عوام" کی کمزوریوں کو نہیں جانتے اگر عوام کو خواجہ
صاحب کا شکار ہونے سے ہمیں بچانا ہے تو اس تلخ کونین کی گولی پر شکر کی ایک تہ چڑھانی
پڑیگی یا یوں کہئے کہ باوجود "چٹخارے" کی خود شکایت کرنیکے مجھے ان مریضوں کو ابلی کھچڑی
کے ساتھ کم از کم آلو بخارے اور سیاہ مرچ کی چٹنی دینا ہوگی، ورنہ اس غذا کو حلق سے اتارنا کیسا
منہ تک نہ لیجائیں گے۔"

طوالت کلام | اس موضوع پر مسلسل مضمون دیکھ کر لوگ گھبرا اٹھتے تھے، کچھ انسانی فطرت ہی ایسی ہے کہ
ایک ہی موضوع پر مسلسل نہ تقریر پسند کرتی ہے نہ تحریر اس کا جواب بھی محمد علی کے الفاظ میں یہ ہے۔
"ایک دو مضامین لکھدینے سے کام نہیں چلیگا مسلمانوں کی خود فراموشی اور غفلت سے آپ
بیخبر ہیں، ضرورت ہے کہ یہ مسئلہ برابر انکے پیش نظر رہے، یہانتک کہ ان کو اس کی اہمیت

کا پورا پورا احساس ہو جائے، اقبال نے کیا خوب کہا ہے۔

می شود ہر مو درازے خرقہ پوش	آہ زیں سوداگران دیں فروش
با مریداں روز و شب اندر سفر	از ضرورت ہائے ملت بے خبر
دیدہ ہا بے نور مثل نرگس اند	سینہ ہا از دولتِ دل مفلس اند
واعظاں ہم صوفیاں منصب پرست	اعتبار ملت بیضا شکست
واعظ ما چشم بر بت خانہ دوخت	مفتی دین مبین فتوی فروخت
چیست یاراں بعد ازیں تدبیر ما	رُخ سوئے میخانہ دارد پیر ما"

ایک اور حقیقت | ہاپوڑی صاحب نے ایک کتاب "پولیٹکل گرگٹ" لکھی تھی جس کا دیباچہ غلام نظام الدین صاحب نظامی پریمی کے نام سے شائع ہوا تھا، محمد علی نے انکشاف یہ کیا کہ وہ خواجہ صاحب کا ہے اور اسے دلائل و ثبوت ہمدرد میں شائع بھی کیا، چنانچہ ایک مقام پر وہ تحریر فرماتے ہیں۔

"پولیٹکل گرگٹ نامی پمفلٹ کا دیباچہ از غلام نظام الدین صاحب ظاہر کیا گیا ہے مگر ہے وہ "از جناب خواہر زادہ حضرت نظام الدین اولیا مصوّر فطرت سابق مجاور و سارق گولک درگاہ شریف و مصنف مچھر کا اعلان جنگ و پسو کا پیغام صلح و ہزاران ازیں قبیل خرافات از فرام قبلہ تو شملہ تا کم ٹو موت وغیرہ وغیرہ و شریک لوٹ کھسوٹ نظام المشائخ، توحید رعیت، مرشد پیر بھائی، گرو سیوک، پیشوا، مولوی، درویش، فقیر، قلندر، مداری، سادھو جوگی وغیرہ وغیرہ حال جاسوسوں کے خواجہ جھوٹی تبلیغ کے راجہ، سیدی، مرشدی و مولائی پیدائشی علی حسن، خود ساختہ حسن نظامی، غریبوں کے اخبار والے و غریب نواز ثانی جٹا دھاری گیسو دراز ثانی پوسٹر بازی و پروپگنڈے میں لاثانی وغیرہ وغیرہ کثر اللہ حقہ و قلل اللہ باطلہ ساکن غیاث پور حال وارد دین بسیرا درویش خانہ، حسین خانہ، ایمان خانہ وغیرہ وغیرہ دلی

والے بڑے متوالے، سب سے نرالے، خدا ان کے پنجہ میں کسی کو نہ ڈالے۔"

آپس کی گالیاں غریبوں کے اخبار کا جس صاحب ذوق سلیم نے ایک صفحہ بھی دیکھ لیا، اس نے اخبار دیکھنے سے قسم کھالی، طرفین سے ہر قسم کے الفاظ کا تبادلہ ہوا، اب اگر ان نمونہ آپ کے سامنے پیش کیا جائے تو یہ کونسی علمی ادبی یا سیاسی خدمت ہوگی، مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح عمری کے سلسلہ میں ان چند باتوں کا پیش کرنا ناگزیر تھا، اس لئے صرف اتنا مواد پیش کر دیا گیا کہ حقیقت حال واضح ہوجائے، اصل مسئلہ سمجھ میں آجائے، صورت مسئلہ آنکھوں کے سامنے پھر جائے۔

ورنہ محمد علی پر جو تہمت تراشیاں کی گئیں، انھیں جس طرح ہدف مطاعن بنایا گیا، طرح طرح کے بے بنیاد واقعات انکے متعلق مشہور کئے گئے اور ہر طرح سے انھیں ذلیل ورسوا کرنے کی کوششیں کی گئیں، کس کا دل ہے کہ انھیں پڑھے اور کس کا قلم ہے کہ انھیں لکھے، فیصلہ کیا ہوا؟ اسے ان صفحات میں نہ تلاش کیجئے بلکہ زبان خلق سے پوچھئے، جسے نقارۂ خدا کہتے آئے ہیں۔

اب یہ عنوان ختم کیا جاتا ہے لیکن خاتمہ سے پیشتر یہ گزارش ضروری ہے کہ حتی الامکان پوری کوشش کی گئی ہے کہ نفس مسئلہ کے متعلق مواد فراہم کیا جائے اور ذاتیات پر جو خامہ فرسائیاں کی گئی ہیں، نیز غیر متعلق مباحث پر جو زبردست پروپگنڈا کیا گیا ہے اسے قطعاً نظر انداز کر دیا جائے اور صرف نفس مسئلہ کو پیش کیا جائے۔

مزید تفصیل آئندہ مورخ کے لئے چھوڑئیے۔

باب ۳۲

اسپیشل خلافت کانفرنس

مئی ۱۹۲۶ء میں اسپیشل خلافت کانفرنس منعقد ہوئی جس نے ہندوؤں کو محمد علی سے بہت برانگیختہ کر دیا تھا، اور یہ خیال ظاہر کیا جانے لگا تھا کہ اب خلافت کمیٹی اور محمد علی میں بھی فرقہ وارانہ جراثیم سرایت کر گئے ہیں، ان کے پیش نظر اب ملکی آزادی نہیں ہے بلکہ ہندستان میں افتراق واختلاف کی خلیج کو زیادہ سے زیادہ وسیع کر دینا ہے!

اس کانفرنس کے بعد ان پر اور حکیم اجمل خاں مرحوم پر جس جس طرح کے رکیک حملے کئے گئے ہیں، اور جس جس طرح سے انہیں ذلیل وبدنام کرنے کی کوشش کی گئی ہے، وہ ایک دردناک داستان ہے، اور ایک ایسا آئینہ ہے جس میں بہت سے نام نہاد قوم پرستوں اور وطن پرستوں کی "قومیت" اور "وطنیت" کا چہرہ بے نقاب دکھیا جا سکتا ہے، اور حقیقت معلوم کر لی جا سکتی ہے

ملک کی فضا پچھلے صفحات میں اس پر مفصل گفتگو ہو چکی ہے کہ محمد علی کی گرفتاری کے بعد ملک میں کیا حالات وانقلابات رونما ہوئے تھے؟ ملک کے امن وامان کو شدھی وسنگھٹن کی تحریکوں سے کس طرح تاراج کیا گیا، اور ہندو مسلمانوں کے اس عنصر کو جو صلح وسلام، اتحاد واتفاق اور خلوص ومحبت کا داعی تھا کس طرح گوشۂ عزلت اختیار کرنے پر مجبور کیا گیا؟ نیز ہندوستان کے بڑے بڑے زعماء نے عافیت اس میں سمجھی کہ وہ اسوقت ایک تماشائی کی حیثیت سے ملک وقوم کی اس دردناک کشمکش کا معائنہ کریں، اور جب حالات سازگار

ہو جائیں تو پھر پبلک انکی ہے، پلیٹ فارم انکا ہے اسٹیج ان کا ہے۔

محمد علی کا رویہ لیکن محمد علی نے گوشۂ عزلت نہیں اختیار کیا، اوھنوں نے اپنے آپ پر تعطل نہیں طاری کیا، اور نہ اپنے تئیں بے بس اور مفلوج ثابت کیا!

وہ مردانہ وار میدان عمل میں آئے، اوھنوں نے اپنی قوم میں ایک محاذ جنگ قائم کر دیا، اور مسلمانوں میں جن لوگوں نے اتحاد کش اور امن سوز سرگرمیوں کا بازار گرم کر رکھا تھا، اُنسے وہ برسر پیکار ہو گئے، اپنے اقتدار، اپنی وجاہت، اور اپنی "بلند پوزیشن" کا انھوں نے بالکل خیال نہیں کیا وہ ہر اس شخص سے لڑے جس نے ہندو مسلم اتحاد کو نقصان پہونچانے کی کوشش کی، جس نے "تبلیغ کا راجہ" بنکر قوم کو تباہ و برباد کرنا چاہا اور جس نے "تنظیم" کے داعی کی حیثیت سے مسلمانوں کو آزادی کی منزل مقصود سے دور کرنا چاہا

مشکلات محمد علی کو اپنی کوششوں میں سخت حوصلہ شکن مشکلات سے دوچار ہونا پڑا، خود مسلمانوں میں انھیں ذلیل ہونا پڑا، اور جن لوگوں سے وہ اپنی قیادت کی داد لے رہے تھے انھیں کے خلاف میدان جنگ میں اترنا پڑا۔

حالانکہ اگر وہ چاہتے تو خاموش رہ کر اپنی قیادت کو برقرار رکھ سکتے تھے لیکن ان کے سامنے ایک لائحہ عمل تھا، ایک مطمح نظر تھا، اور وہ قوم کو اسپر گام فرسا کرنا چاہتے تھے، اس لئے اُن سے خاموش نہیں بیٹھا گیا، اور جو بھی سنگ راہ بنکر میدان میں آیا اُسکے انھوں نے پرزے پرزے کر ڈالے،

کامیابی سخت جدوجہد، مسلسل کوشش، اور پیہم مبارز طلبیوں کے بعد محمد علی کو اتنی کامیابی ہوئی کہ اب انکا حریف راہ کوئی باقی نہیں رہ گیا، اوھنوں نے مسلمانوں کے دلوں میں یہ بات راسخ کر دی کہ آزادی حاصل کرنا، ہر مسلمان کا فرض ہے، غلامی سے

تنفر ہر مومن کا امتیازی نشان ہے، یہ انھیں کی ان تھک کوششوں کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں میں ان لوگوں کا اثر پھر باطل ہوگیا، جو قیادت کی عبا پہنکر لوگوں کو گمراہ کرنے آئے تھے، لیکن جن کا مقصد صرف یہ تھا کہ وہ قوم کو قعر ہلاکت میں گرائیں، اور ذاتی و شخصی منافع حاصل کریں قوم کے سرتاج بھی رہیں اور گورنمنٹ کے منظور نظر بھی۔

تصویر کا دوسرا رخ | لیکن یہ تو تھا، تصویر کا ایک رخ، جو خدا کے فضل سے جاذب نظر معلوم ہو رہا ہے۔

لیکن دوسرا رخ تاریک تھا، اور اس کی تاریکی میں اضافہ ہی ہو رہا تھا، محمد علی نے تبلیغ و تنظیم کے مقابلہ میں جس سرگرمی اور خلوص کا مظاہرہ کیا تھا وہ چاہتے تھے کہ اس سرگرمی اور خلوص کا مظاہرہ ہندو زعماء کی طرف سے بھی ہو جس طرح انھوں نے میدان عمل میں آکر مسلمانوں کی مخالفت کی، اور جمہور کو غلط رہنمائی سے بچایا، اسی طرح برادران وطن کے سنجیدہ رہنما یعنی کانگریسی قائدین بھی میدان عمل میں اتریں، اور ہندو جمہور کی مخالفت کریں، ان کو غلط رہنمائی سے محفوظ رکھیں اور کوشش کریں کہ افتراق کی خلیج پٹ سکے۔

جواب | لیکن انکی طرف سے جو عملی جواب دیا گیا وہ بہت زیادہ عجیب و غریب اور حد درجہ افسوس ناک تھا، ہندو زعماء کانگرس نے شدھی و سنگٹھن کے خلاف ایک محاذ جنگ تیار کرنے سے انکار کر دیا، اکثر نے ان لوگوں کی کوئی مخالفت نہیں کی جو امن و امان کے دشمن ثابت ہو رہے تھے، انھوں نے سوامی شردھانند، لالہ ہردیال، بھائی پرمانند، پنڈت مالویہ اور لالہ لاجپت رائے کو آزاد چھوڑ دیا کہ وہ جو چاہیں کریں، اور خود خاموشی کی قسم کھالی۔

سنگٹھنی جماعت نے آل پارٹیز کانفرنسوں کو ناکام کرایا، یونٹی کانفرنسوں کو ملتوی کرایا، اتحاد و اتفاق کی کوششوں سے اعراض کیا پھر بھی ان کے خلاف کانگرسی حلقہ سے

کوئی آواز بلند نہیں ہوئی۔

کانگریسی زعماء اکثر زعماء کانگرس کا یہ عالم تھا کہ وہ اس تخیل سے لرزتے تھے کہ وہ ہندو مہاسبھا یا اُس کے محترم کارکنوں کی مخالفت کریں، بلکہ اپنے طرز عمل سے ان کی مدح وستایش اور تعریف وتوصیف اور تائید واشتراک عمل کا ثبوت دیتے رہتے تھے۔

گاندھی جی کی روش گاندھی جی اگرچہ گوشہ تنہائی اختیار کر چکے تھے اور کسی طرح میدان عمل میں آنے پر رضا مند نہیں ہوتے تھے، لیکن پھر بھی سوامی شردھانند کا ان سے بڑھ کر "معترف" کوئی نہیں تھا، وہ برابر سوامی جی کے خلوص اور ان کی ملکی خدمات کا اعتراف کرتے تھے اور انھیں ہندو مسلمانوں کا سچا ہمدرد ثابت کرتے تھے۔

مالوی جی کے تقدس کے وہ ہمیشہ قائل رہے، انھیں اپنا بزرگ اور ہندوستان کا قائد اعظم انھوں نے ہمیشہ سمجھا۔

امرتسر پراونشل کانگریس امرتسر پراونشل کانگرس کے موقعہ پر جب مولنا ظفر علی خاں نے مالوی جی کی اسلام آزار، اور اتحاد سوز مساعی پر رنج وافسوس کا اظہار کیا تو گاندھی جی نے ان سے کہا کہ تم نے تو آج میرے سینہ پر گھونسہ مار دیا! مالوی اور یہ سنگین الزامات! العجب ثم العجب!

موتی لال کا رویہ پنڈت موتی لال نہرو سے محمد علی کو یہ شکایت تھی کہ وہ ہندو مہاسبھا سے مرعوب ہو گئے اور اس کا اثر کانگرس کے طرز عمل پر پڑ رہا ہے۔

یہ ہندو مہاسبھا کا اثر ہی تھا جس نے موتی لال اور ان کی سوراج پارٹی کو مجبور کر دیا کہ وہ صوبہ سرحد کو مساوی اصلاحات دیے جانے کے خلاف ملک میں آواز اٹھائیں اور اسمبلی ہال میں ہاتھ!

کانگرس کے بعض ہندو لیڈروں نے حکیم اجمل خاں کی تنبیہ و سرزنش کے باوجود اس سے صاف انکار کر دیا کہ ہندو مہاسبھا کے خلاف ایک حرف بھی کہیں گے، اس لئے انتخابات کا زمانہ قریب آرہا تھا، اور انھیں "ووٹ" حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کرنی تھی اور پھر وہ یہی لوگ تھے جنھیں لاجپت رائے اور مالوی جی نے اس وقت سخت شکست دی تھی، جب اسمبلی کی ممبری کے لئے انھوں نے کانگرس کے ٹکٹ پر مسٹر آصف علی کو دہلی کی طرف سے کھڑا کیا، باوجود منت سماجت کے ایک مہاسبھائی کو مالوی جی نے ان کے مقابلہ میں کھڑا کیا اور آصف علی کو شکست دلوائی!

ان حضرات میں یہ جرأت نہیں تھی کہ وہ مہاسبھا کے خلاف کچھ کہہ سکتے یا ہندو مہاسبھا کے کارکنوں میں سے کسی سے اختلاف کرتے۔

محمد علی اور کوشش "صلح" محمد علی نے ان حالات کے برعکس اپنی قوم میں سب کی مخالفت مول لے کر فضا کو ہموار کیا بہت سی یونٹی کانفرنسیں منعقد کرائیں، زیادہ سے زیادہ وہ اپنے درجہ سے گرے ہوئے الفاظ میں ہندوؤں کی منت کی کہ خدا کے لئے راہ راست اختیار کرو، اور اسی پر اپنی قوم کو چلانے کی کوشش کرو۔

گاندھی جی سے گفتگو آخر مجبور ہو کر انھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد اور دوسرے بزرگوں کی معیت میں کانپور کانگرس کے موقعہ پر یہ التجا کی کہ اب وہ اپنا قفل خاموشی توڑیں، اور اس مخالف فضا کا مقابلہ کر کے نسبتہً اچھی فضا پیدا کرنے کی کوشش کریں، اسی طرح محمد علی نے دوسرے زعماء سے بھی گفتگو کی، اور انھیں آمادہ کرنا چاہا کہ وہ مہاسبھا کے خلاف کچھ کارروائی کریں تاکہ پھر وہی فضا قائم کیجا سکے جس کے وہ متمنی ہیں اور جو آزادی

کی طرف پہونچانے والی ہے۔

لیکن یہ تمام کوششیں بے نتیجہ رہیں پرائیویٹ گفتگوؤں میں مہاسبھائیوں کو بُرا کہنے میں تو شاید ہی کسی کانگرسی لیڈر کو تامل ہو، لیکن پبلک میں! زبان یاری نہیں دیتی تھی، اور دل کے خلاف زبان سے کام لیا جاتا تھا۔

محمد علی کا فیصلہ | اب محمد علی نے یہ فیصلہ کیا! ذرا اس دل گردہ، اور اس عزم کو ملاحظہ فرمائے کہ وہ خود ہندو لیڈروں کا مقابلہ بھی کرینگے اور ان کی امن سوز جدوجہد کی مدافعت پوری طاقت سے کرینگے، اور بالآخر انہیں بھی اسی طرح بے نقاب کر کے چھوڑیں گے، جس طرح مسلمانوں کے بعض "لیڈروں" کے ساتھ وہ کر چکے تھے،

چنانچہ اونھوں نے ڈاکٹر مونجے، پنڈت مالوی، اور دوسرے بزرگوں کے نفاق انگیز رویہ پر سخت نکتہ چینی کی، اور انکی نقصان رساں اور مضرت دہ پالیسی کا پردہ چاک کیا اور جن مقاصد کیساتھ یہ حضرات مصروف عمل تھے، انھیں پبلک سے روشناس کرایا،

محمد علی کے یہ مضامین نکلے! اور ہندو پریس میں آگ لگ گئی، اتنا وسیع، اتنا مستقل، اور اتنا مسلسل "پروپیگنڈا"، محمد علی کے خلاف کیا گیا کہ حد بیان سے باہر ہے۔!

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ پر لطف بات یہ ہو کہ جبتک محمد علی مسلمان لیڈروں کی پردہ دری کرتے رہے اور گمراہ رہنماؤں کی مخالفت کرتے رہے، اسوقت تک تو وہ کانگرس کی آنکھ کا تارا بنے رہے، اور جب اونھوں نے مالوی اور لاجپت رائے، ہردیال اور مونجے کی پردہ دری کی، تو مہاسبھا تو مہاسبھا، خود کانگرسی حلقوں کی چین پیشانی چھپائے نہ چھپ سکی،

اسپیشل خلافت کانفرنس | ان تمام باتوں کے بعد مجبور ہو کر اونھوں نے اسپیشل خلافت

کانفرنس کا مئی ۲۶ء میں دھلی میں اجلاس منعقد کرانا چاہا، اوراس کے انتظامات شروع کردئے مقصد یہ تھا کہ آخر مسلمانوں کو برا بھلا کہنے کی کوئی حد ہے؟ فسادات کم نہیں ہوتے، اختلاف کم نہیں ہوتا، ہندو، مہاسبھائیوں کی مخالفت کرتے نہیں، پھر اسی زمانہ میں کلکتہ میں مسلسل فسادات ہوئے تھے، جنسے مسلمانوں کو سخت نقصان پہونچا تھا، تو مجبور ہوکر انھوں نے ایک اجلاس منعقد کرانا چاہا، جس میں مسلمانوں کے آیندہ طرز عمل کا فیصلہ کیا جائے اورغور کیا جائے کہ وہ کیا تدابیر ہیں جنسے پھر ہندو مسلمانوں میں امن قایم کرایا جاسکتا ہے، اورانکی حفاظت ہوسکتی ہے،

محمد علی کا بیان | چنانچہ محمد علی کانفرنس کے انعقاد کی غرض وغایت یوں بیان کرتے ہیں۔

> "جب پنڈت موتی لال نے مہاسبھائیوں کو ایک حرف بھی کہنے سے انکار کیا تو حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم نے مجبور ہوکر ان سے صاف کہدیا کہ اب وہ مسلمانوں سے کچھ توقع نہ رکھیں!
>
> جب ہماری سعی لاحاصل رہی، اور ایک ہندو لیڈر بھی ہندو مہاسبھائیوں کے خلاف کچھ نہ بولا تو ہم نے دہلی میں اسپیشل خلافت کانفرنس کا اجلاس طلب کیا، اس کانفرنس کی مجلس استقبالیہ کی صدارت حکیم اجمل خاں رحمۃ اللہ علیہ نے فرمائی اور کانفرنس کی صدارت مولینا سید سلیمان ندوی نے"

کانفرنس کا اجلاس | بالآخر دہلی میں اسپیشل خلافت کانفرنس کا اجلاس حکیم اجمل خاں کی تحریک اور مولینا ابوالکلام وشوکت علی کی زبردست تائید سے مولانا سید سلیمان کی صدارت میں منعقد ہوا،

خلافت کانفرنس کا خطبۂ صدارت ہند و مہا سبھا کا "ایڈریس" نہیں تھا، بلکہ اسمیں نہایت متانت و سنجیدگی سے ملک کی حالت زار کا نقشہ کھینچا گیا تھا، اور اتفاق و اتحاد کی تمنا ظاہر کی گئی تھی، اور صاف صاف یہ بھی کہدیا گیا تھا، کہ اب ہم میدان عمل میں اُتر چکے ہیں، اور اپنے ہندو دوستوں کی طرف اپنا ہاتھ بڑھائے ہیں، اب یہ انھیں اختیار ہے کہ وہ اس ہاتھ کو وہ ہاتھ سمجھیں جو ایک دوست دوسرے دوست کو مصافحہ کیلئے بڑھاتا ہے یا وہ جو ایک پہلوان دوسرے پہلوان کی طرف اکھاڑہ میں بڑھاتا ہے!

کانفرنس کی تجاویز کانفرنس میں کئی اہم تجاویز منظور ہوئیں لیکن ایک تجویز بھی ایسی نہیں تھی، جس سے نفاق کی بو آتی ہو، جس سے مقابلہ کی تمنا ظاہر ہوتی ہو، جس سے کانگرس اور ہندوؤں سے بیزاری کا اظہار ہوتا ہو، جسمیں اعلان جنگ ہو۔!

ہر تجویز نہایت معتدل، نہایت معقول، اور اس تمنا سے لبریز کہ ملک میں پھر امن و امان قائم ہو، اور ایسے ذرائع اختیار کئے جائیں کہ فسادات کی یہ گرم بازاری ختم ہو جائے، اور نہایت شرافت و اطمینان کے ساتھ ہندو مسلمان دونوں اپنے اپنے فرائض بجا لاسکیں، انپر کوئی مانع نہو، اور نہ کوئی ان کارروائیوں میں خلل انداز ہو!

محمد علی کی تقریر اس کانفرنس کے بعد ہی محمد علی وفد حجاز کے ساتھ دہلی سے روانہ ہوئے اسٹیشن پر جو مسلمان الوداع کہنے کے لئے آئے تھے، ان سے محمد علی نے فرمایا:

"یہ ملک کے لئے سخت ترین ابتلا و آزمایش کا زمانہ ہے نہ آپ خود مشتعل ہوں نہ اپنے کسی لفظ سے یا عمل سے اہل ہنود کو مشتعل ہونے کا موقعہ دیں میں درخواست کرتا ہوں کہ اگر وہ تمھاری اوپر ہاتھ اوٹھائیں تو سر جھکا دو، اگر چھری دکھائیں تو سینہ آگے کر دو، اگر ظلم کریں تو صبر سے کام لو،"

یہ الفاظ محمد علی کی زبان سے اسوقت ادا ہورہے ہیں جب مہا سبھائی کیمپ سے انہیں غدار وطن کا خطاب مل چکا ہے، اور کانگرسی حلقہ بھی انھیں چڑھے ہوئے ہوئے تیوروں سے دیکھ رہا ہے،

ہمیں نہیں معلوم کہ اس سے زیادہ کشادہ دلی اور رواداری کا اظہار کبھی کسی نے کیا ہو!

ہندوؤں کی مخالفت | اس امن پرور بیان اور ان صلح جو تجاویز کے باوجود، اسپیشل خلافت کانفرنس کو طرح طرح سے بدنام کیا گیا، اور حکیم اجمل خاں، اور محمد علی کو ہندو پریس نے ایسے ایسے الفاظ سے یاد کیا کہ انکا ذکر کرتے ہوئے شرم آتی ہے، بہرحال یہ تھی وہ اسپیشل کانفرنس جس نے کانگرس کو خلافت سے بددل اور بدظن کرنا شروع کیا،

باب ۳۳

قانون حج

اس سے پیشتر اجمالی طور سے اسکا ذکر آچکا ہے کہ گورنمنٹ نے ایک بار جب ٹرنر ماریسن کمپنی کو حجاز کی جہازرانی کا ٹھیکہ دینا چاہا ہے، تو حاجیوں پر واپسی ٹکٹ کی شرط بھی لازم کر دینا چاہی تھی، مگر محمد علی کی بروقت مخالفت لارڈ ہارڈنگ سے تحریک، اور خود لارڈ موصوف کے تدبر کی بدولت، حکومت بمبئی کی یہ "سفارش" وائسرائے بہادر منظور نہیں کر سکے اور یہ تجویز معرض التوا میں پڑ گئی، اور ایک عرصہ تک کسی کو اسکا خیال بھی نہیں آیا، لیکن جس قانون سے گورنمنٹ کو بالواسطہ بھی فائدہ پہونچتا ہو، اور انگریز تاجروں کو نفع ہو رہا ہو، وہ زیادہ عرصہ تک وقف طاق نسیان نہیں رہتا، کبھی نہ کبھی اسے منظر عام پر آنا ہی پڑتا ہے،

قانون حج کا مسودہ چنانچہ گورنمنٹ کی طرف سے ۱۹۲۶ء میں پھر یہ تحریک پیش ہوئی کہ ایک ایسا قانون وضع کر دیا جائے جسکی رو سے حج کو جانے والے زائرین مجبور ہوں کہ وہ واپسی ٹکٹ لیکر جایا کریں، اور کم از کم اتنی رقم جمع کرایا کریں، تاکہ معلوم ہو سکے کہ یہ "سرمایہ دار" ہیں، مفلس و قلاش نہیں،

اس طرح گورنمنٹ کو بھی اپنے نظم و انتظام میں سہولت ہوگی، اور حجاج کو بھی ہر طرح کی آسانی ہوگی، موجودہ صورت میں دونوں کو سخت نقصان اور اس سے زیادہ تکلیف کا سامنا ہوتا ہے،

دلائل دلیل یہ پیش کی گئی کہ اکثر حجاج نادار ہوتے ہیں اپنے مذہبی جوش میں وہ ہندوستان

سے روانہ تو ہو جاتے ہیں، لیکن چونکہ بہت کم رقم لیکر چلتے ہیں اسلئے راستہ ہی میں وہ مفلس ہو جاتے ہیں اور دوسروں کی مدد پران کی گذران ہوتی ہے اکثر ایسے ہوتے ہیں جن کے پاس کرایہ تک کے دام نہیں رہتے ہیں اور وہ فاقہ مستی کے عالم میں ادہر اُدہر گھومتے ہیں، تب مجبور ہوکر گورنمنٹ ان کو وطن پہونچانے کا انتظام کرتی ہے اسلئے اصولاً ایسی پابندیاں عائد کردی جائیں کہ وہی لوگ حج کا قصد کریں جو جیب میں دام بھی رکھتے ہوں،

محمد علی کی مخالفت محمد علی نے اس قانون کی سخت مخالفت کی، اور اسکے معائب تبلائے حاجیوں کی ناقابل برداشت دقتوں کا ذکر کیا، اور گورنمنٹ کو مجبور کیا کہ وہ اس قسم کا یکطرفہ قانون نہ بنائے جس سے صرف حاجیوں کو تکلیف تو پہنچ سکتی ہو، لیکن جو انکی اس تکلیف اور فاقہ مستی کے اسباب ہیں انکا انسداد نہ کیا جائے،

انکا خیال تھا کہ حاجیوں کے افلاس اور عسرت کی اصل علت خود گورنمنٹ کا تغافل اور جہازران کمپنیوں کا حاجیوں کو دونوں ہاتھوں سے لوٹنا اور تباہ کرنا ہے،

مضامین اس موضوع پر محمد علی نے ہمدرد و کمریڈ میں مسلسل اور پیہم مقالات و مضامین کے ذریعہ سے گورنمنٹ کو خبردار کیا، چنانچہ ایک مضمون میں وہ ارشاد فرماتے ہیں،

> "ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ہندوستان کے حاجی سب حجاج سے زیادہ نادار ہوتے ہیں، لیکن اسکی ذمہ داری ہندوستان کی حکومت پر ہے، اول تو ہندوستان کے لوگ مفلس ہیں، دوسرے حکومت ان کا خاطرخواہ انتظام نہیں کرتی"

مصر میں حج کا طریقہ مُصر میں حج کا طریقہ یہ ہے، وہاں کی حکومت حجاج کی تعداد تخمیناً معلوم کرلیتی ہے، پھر جہازران کمپنیوں سے ٹنڈر طلب کرتی ہے، اسطرح جو جہاز کم کرایہ

پر اور بہترین طریقہ پر لیجانا منظور کریں، ان میں مصر کے حجاج جاتے ہیں،

ہندوستان کی حالت | یہاں یہ حالت ہے کہ جہاز ران کمپنیاں جنکے زیادہ تر انگریز مالک ہیں پہلے کم کرایہ کا اعلان کرتی ہیں، حجاج اعلان سے کچھ زیادہ روپیہ لیکر بنگال اور سندھ وغیرہ دور دراز مقامات سے بمبئی آتے ہیں جہاز کی روانگی کا وقت مقرر نہیں ہوتا اس لئے ان کو عرصہ تک بمبئی میں رہنا پڑتا ہے جہاز ران کمپنیاں یہ کہکر کہ حاجیوں کی ابھی کافی تعداد نہیں آئی ہے، ان غریبوں کو انتظار کراتی ہیں اور پھر جب حاجی کافی تعداد میں بہت زیادہ آجاتے ہیں اور زیادہ کرایہ دیکر روانہ ہونا چاہتے ہیں تو کمپنیاں جہاز کا کرایہ بڑھا دیتی ہیں، اسطرح بہت سا روپیہ بمبئی ہی خرچ ہو جاتا ہے اور (حجاج) واپسی کے وقت بھکاری اور نادار بنجاتے ہیں،

اگر گورنمنٹ کو واقعی حجاج کی سہولت مقصود ہے تو اسکا علاج بمبئی میں ہونا چاہیئے، جہاں انکا روپیہ ناواجب طریقہ سے لوٹ لیا جاتا ہے"

اسی طرح بہت پُرزور دلائل کے ساتھ محمد علی نے اس لغو قانون کی مخالفت کی مگر (غالباً) نتیجہ کچھ نہیں نکلا، اور وہ قانون حاجیوں کی مشکلات میں اضافہ کرنے کے لئے ابتک موجود ہے اور جب تک گورنمنٹ موجود ہے وہ بھی موجود رہیگا۔

باب ۳۴

موپلہ بچوں کی عیدی

تحریک خلافت کے زمانہ میں اور اس کے بعد موپلہ قوم پر پیہم آفات و مصائب کا جو پہاڑ ٹوٹا، اور جس طرح اس بہادر اور شجیع قوم کو صفحۂ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹانے کی کوشش کی گئی، وہ سب کو معلوم ہے، لیکن، بہادر لوگ سخت جان بھی ہوتے ہیں، انکا مٹانا اور برباد کر دینا اتنا آسان نہیں ہوتا جتنا سمجھا جاتا ہے، وہ تلواروں کے زخم اور سنگینوں کے چرکے کھا کر بھی زندہ رہتے ہیں اور اپنی شجاعت کا ثبوت دیتے ہیں،

تحریک کے بعد پھر جب ان کا "قتل عام" شروع ہوا، اور انکی جائدادیں ضبط کی گئیں، انکی املاک سے انہیں محروم کیا گیا، تو کوئی نہیں تھا، جو انکی دستگیری کرتا، کوئی نہیں تھا جو ان جلا وطن، غریب الدیار لیکن اسلام کے جانباز و سرفروش سپاہیوں کی اعانت کرتا، اور کوشش کرتا کہ ان کے مصائب و آلام میں کچھ تخفیف ہو جائے،

زعماء کا تغافل جاڑے آتے تھے لوگ نفیس نفیس لحافوں میں آرام کرتے تھے، اور وہ ٹھٹر ٹھٹر کر اپنی زندگی کے دن کاٹتے تھے، گرمیاں آتی تھیں، اور لوگ خس پوش کمروں میں یا پہاڑوں کی بلندیوں پر موسم بہار کا لطف اٹھاتے تھے، مگر وہ غریب اپنے گلخن میں سلگتے تھے، برسات آتی تھی، لوگ موسم برشگال سے شاعرانہ کیف حاصل کرتے تھے، برآمدوں اور سائبانوں میں تقاطر اور ترشح، کا مزا اٹھاتے تھے، لیکن وہ بیچارہ بھیگ بھیگ کر نزلہ اور زکام کو دعوت دیتے تھے، عید آتی تھی، لوگ زرق برق کپڑے پہنتے تھے، اچھے اچھے کھانے

کھاتے تھے، دوست احباب کی دعوت کرتے تھے، سیر و تماشہ سے لطف اندوز ہوتے تھے، میلہ ٹھیلہ کی سیر کرتے تھے، بال بچوں کو طرح طرح کے کھلونے لاکر دیتے تھے، مگر ایک قوم کی قوم ایسی تھی، جہاں عید ماہِ محرم کا حکم رکھتی تھی، نہ ستر پوشی کے لئے ان کے پاس کپڑے تھے، نہ گرسنگی کے علاج و دفاع کے لئے اُنکے پاس خوشذائقہ اور لذیذ کھانے، خود تو بیچارے اس موسم ابتلا کو برداشت بھی کر لیتے تھے، لیکن بچے بلک بلک کر، تڑپ تڑپ کر، ہمک ہمک کر ماں باپ کو مجبور کر دیتے تھے کہ وہ ان کے لئے اچھے کپڑوں کا انتظام کریں، عمدہ کھانے مہیا کریں، میلا اور تفریح کے لئے کچھ دام دیں، تو ان ماماتا کے مارے فاقہ مست لوگوں پر کیا کچھ گزر جاتی ہوگی؟ مگر کون تھا، جو اپنے عیش و آرام کو منغص کر کے ان تباہ حال اور افلاس پیشہ لوگوں پر ایک نظر بھی ڈالتا، مدد کرنا تو خیر بعد کی چیز ہے!

ایک دردمند دل لیکن ایک ہستی تھی، جو اپنے عیش و آرام کو منغص کر کے ان دکھ کے ماروں پر ترس کھاتی تھی، اس کے سامنے جب کھانا آتا تھا، تو موپلہ قوم کے بھوکے بچے یاد آجاتے تھے، اسکے سامنے جب کپڑے آتے تھے، تو موپلہ قوم کے برہنہ اور عریاں لوگوں کی تصویر اسکے سامنے پھر جاتی تھی، وہ جب افطار کرنے کا ارادہ کرتا تھا، تو وہ صائم الدہر اُسے بیقرار کر دیتے تھے، جن کی افطاری آشوب چشم، جنکا کھانا غم دل اور جنکی سحری، فغان نیم شب تھی، جب عید کی نشاط افزا فضا میں لوگ مست ہو ہو کر عید گاہ کا رخ کرتے تھے، اور نماز کے بعد جب دھوپ کی تابش، اور گرمی کی شدت سے بیقرار ہو ہو کر جلد سے جلد نکلنا چاہتے تھے، تو ایک ذات تھی، جو عید گاہ کے دروازہ پر، ذیابطیس اور دوسرے امراض کے باوجود، دھوپ کی تابش میں اور لوگوں کی سرد مہری میں بھی چٹان کی طرح عید گاہ کے دروازہ پر کشکول گدائی لئے کھڑی ہوتی تھی، عام خاص، جاہل عالم، امیر

غریب ہر شخص کو وہ مخاطب کرتی تھی اور ایک ایک پیسہ، دو پیسہ بڑی خوشی سے لیکر اپنے چنبل میں ڈالتی جاتی تھی،

تقابل | نماز پڑھنے، دوسرے لیڈر بھی آتے تھے، لیکن وہ موٹر میں آئے، اور موٹر میں واپس چلے گئے، ایک فرض تھا، جو انھوں نے ادا کیا، اور پھر اپنے اپنے "دولتکدہ" پر واپس تشریف لے گئے!

لیکن یہ ایسا "لیڈر" تھا، جو خود بھی فاقہ مست تھا، اور دوسرے فاقہ مستوں کی بھی فکر رکھتا تھا، خود بھی تباہ حال تھا، اور دوسرے تباہ حال افراد کا درد بھی اپنے دل میں رکھتا تھا، خود بھی نادار تھا، اور دوسروں کی ناداری پر دل میں رحم و محبت کی ایک خلش بھی محسوس کرتا تھا،

اس طرح کئی گھنٹے، دھوپ میں کھڑے ہوکر اور ہر شخص سے بے تکلفی کے ساتھ تقاضا کر کے اس نے اپنے کشکول میں کچھ رقم جمع کر لی، کچھ رمضان کی دعوتوں میں وہ اپنے میزبانوں اور دوستوں سے وصول کر چکا تھا،

ایک عرصہ کے بعد لو کی لپٹ میں تھکا ماندہ جھلسا اور تمتایا واپس ہوا، اور گیارہ سو کی ایک رقم جبتک ان مصیبت زدہ لوگوں کو نہ بھیج لی چارپائی پر پیٹھ بھی نہیں لگا سکا،

باب ۳۵

خلافت کمیٹی کا غبن

جب محمد علی کی عام مخالفت شروع ہوئی تو ان کے تمام عیوب ونقائص جن کا ذہن کے سوا خارج میں بہت کم وجود تھا، پبلک میں لائے گئے اور انھیں ایک عیاش، فضول خرچ، مسرف اور سب سے بڑھ کر چندہ کا ہضم کر لینے والا ثابت کیا گیا۔

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ پرلطف بات یہ ہے کہ اس غریب پر یہ الزام بھی عاید کیا گیا کہ خلافت کمیٹی کے مشہور غبن کے ذمہ دار تم ہو اور کیا عجب کہ تمھارا ہاتھ بھی اس میں کارفرما ہو۔

حقیقت واقعہ واقعہ کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ محمد علی جب جیل میں اسیر تھے اُس وقت یہ "غبن" ظاہر ہوا اور یہ بھی واقعہ ہے کہ یہ غبن اتفاقی طور پر ہوا، یعنی بالارادہ نہیں بلاارادہ!

اجمال کی تفصیل اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ چونکہ جمعیۃ مرکزیہ خلافت ایک باغی اور قانون شکن جماعت تھی اس لئے وہ "رجسٹرڈ باڈی" نہیں تھی، دوسرے اس وقت کے مصالح کے اعتبار سے بھی یہی مناسب معلوم ہوا کہ خلافت کا روپیہ بنک میں نہ رکھا جائے، سیٹھ چھوٹانی صاحب چونکہ نہایت ہمت واستقلال اور نہایت اخلاص وایثار سے تحریک کے ایک بہت بڑے علمبردار ثابت ہو رہے تھے اس لئے انھیں خلافت کمیٹی کا خزانچی مقرر کر دیا گیا، سارے ملک کو ان پر اعتماد تھا اس لئے عوام یا خواص کسی میں سے بھی کسی نے کوئی اعتراض نہیں کیا، سب مطمئن رہے۔

غبن تحریک پورے زور شور سے جاری تھی اور تمام رہنما دھڑا دھڑ گرفتار ہو رہے تھے لیکن جس سرعت سے گرفتاریاں ہو رہی تھیں اسی سرعت سے چندہ بھی وصول ہو رہا تھا تا آنکہ وہ

وقت آیا کہ تمام قابل ذکر افراد و اشخاص جیل میں تھے صرف دو ایک آدمی باہر تھے

سیٹھ چھوٹانی صاحب کو پورا موقعہ حاصل تھا اگر وہ چاہتے تو اس روپیہ کو صحیح مصرف میں خرچ کر سکتے تھے لیکن انھوں نے اس روپیہ کو اپنے کاروبار میں لگا دیا اور خلاف توقع اس میں سخت نقصان اٹھایا اس لئے وہ روپیہ حسب الطلب مجلس خلافت کو ادا نہ کر سکے۔

لیکن انھوں نے اپنے چند کارخانے جو ان کے بیان کے مطابق سترہ اٹھارہ لاکھ کی ملکیت کے تھے، مجلس خلافت کو بجائے نقد روپیہ کے حوالہ کر دئے۔

تنقیح اس ساز و سامان کی جب جانچ کی گئی تو وہ مطلوبہ رقم سے بہت کم نکلا لیکن اب ہو کیا سکتا تھا اسے واپس تو کیا نہیں جا سکتا تھا اور نہ خلافت کمیٹی اپنے مسلک کے اعتبار سے کوئی قانونی کارروائی کر سکتی تھی اور نہ "ان رجسٹرڈ باڈی" ہونے کی وجہ سے غالباً مقدمہ چل سکتا۔

درگزر علی برادران جیل ہی میں تھے کہ ان کی اس حرکت کا راز فاش ہو گیا اور جو کچھ ان سے مل سکا وہ وصول کر لیا گیا۔

علی برادران اس کے کہاں تک ذمہ دار ہیں اس کے متعلق خود محمد علی کا بیان ملاحظہ فرمائیے۔

محمد علی کا بیان جب ستمبر ۱۹۲۱ء میں والیٹراسٹیشن پر خلاف توقع محمد علی کی گرفتاری وقوع میں آئی اور بعد کو پھر وہ کراچی اور بیجاپور جیل میں تبدیل ہوتے رہے تو محمد علی کا بیان ہے کہ۔

"میری بیوی نے کہا تم کو ہماری فکر نہ کرنا، خدا پہلے بھی رزاق تھا اور وہی اب بھی رزاق ہے، ہماری والدہ نے اور میری بیوی نے ہماری دو برس کی قید میں تقریباً چالیس پنتالیس لاکھ روپیہ وصول کیا جس کی ایک ایک پائی کا حساب دفتر خلافت میں آڈٹ کیا ہوا موجود ہے، یہ تو چندہ جمع کرنے کا حال ہے، لیکن خرچ کا حال

وہ بتائیں جو اپنے گھروں میں اپنے اہل وعیال کے پاس سوتے تھے اور ہماری طرح قید اور بالخصوص میری طرح خلاف قاعدہ وقانون قید تنہائی میں مبتلا نہ تھے۔ یہ سچ

کتنا روپیہ چھوڑا تھا

ہے کہ ہم نے خلافت کے خزانہ میں فقط تین لاکھ چھوڑے تھے اور ہمارے پیچھے ۱۴یا ۱۵ لاکھ روپیہ ہماری والدہ اور میری اہلیہ اور ہم سے محبت رکھنے والے بھائی بہنوں نے جمع کیا تھا لیکن اگر یہ بڑی اور محیر العقول رقم ہم نے جمع نہ کی تھی۔

ذمہ دار کون ہے؟

تو اس کی ایک پائی ہم نے خرچ بھی نہ کی سیٹھ چھوٹانی نے جو کچھ کیا اس کے جوابدہ پہلے وہ خود ہیں اور پھر وہ حضرات جو قید وبند سے آزاد رہے تھے نہ کہ ہم جنھیں خود اپنے ایک پیسہ پر بھی تصرف کی اجازت نہ تھی اگر ہماری رہائی پر ہمیں خلافت کا خزانہ خالی ملا اور چھوٹانی سیٹھ کے سوا اس کے تمام کارکنوں کی پوری دیانت داری اور سخت محنت وکوشش کے باوجود خلافت کی ساکھ بگڑی ہوئی ملی تو اس کی جواب دہی ہم پر نہیں ہے، بلکہ سبکساران ساحل پر۔"

یہ بصیرت افروز بیان ان لوگوں کے لئے پوری تسلی کا باعث ہو سکتا ہے جو علی برادران اور بالخصوص محمد علی پر اس قسم کے مکروہ، ناپاک اور رکیک الزامات لگاتے ہیں۔

لیکن رونا تو اسی کا ہے کہ قوم کی قدر شناسی گھٹ گئی ہے، اور شاید اسی تناسب سے قوت تنقید میں اضافہ ہو گیا ہے!

باب ۴۶

کتاب راجپال

راجپال کی وہ رسوائے عالم کتاب جب شائع ہوئی جس میں سرکار دوعالم پر نہایت رکیک اور ذلیل خیالات کا اظہار کیا گیا تھا، اور حضور کی حیات قدسی پر نہایت ناپاک اور غلط الزامات لگائے تھے تو سارا اسلامی ہند آتش زیر پا ہو گیا اور جولائی ۱۹۲۷ء میں اتنا زیادہ ہنگامہ برپا ہوا کہ حد بیان سے خارج ہے، وہ کتاب بھی درحقیقت اس ہنگامہ کی مستحق تھی کہ ساری اسلامی آبادی اس کے مطالعہ کے بعد یا خلاصۂ کتاب معلوم ہونے کے بعد آرزوئے شہادت اور تمنائے جہاد سے لبریز ہو گئی۔

زعماء اسلام کی حالت مسلمانوں کو سرور عالم سے جو محبت والفت ہے اس سے مسلمان زعماء میں سے اکثر کے دل اگرچہ خالی ہوں لیکن جانتے سب ہیں۔

پھر مسلمانوں نے جس جوش و خروش کا مظاہرہ کیا، جلسے کئے، جلوس نکالے، قانون شکنی کی، توہین عدالت کی جسٹس دلیپ سنگھ کو مستعفی ہو جانے پر مجبور کیا اور گورنمنٹ کے تشدد کا جس طرح مقابلہ کیا وہ منظر بھی قائدین ملت سے پنہاں نہیں تھا۔

گرفتاریاں ہو رہی تھیں، سزایابیاں ہو رہی تھیں اور مسلمان پروانہ وار اپنے تئیں قید و بند کے لئے پیش کر رہے تھے مگر مسلمانوں کے یہ "فقید الشرق" اور "زعیم ملت" سب کے سب خاموش تھے۔

ان مسلمان لیڈروں میں جو کانگرسی کہے جاتے ہیں اور جو "آل انڈیا" سمجھے جاتے ہیں

ایک متنفس بھی ایسا نہیں تھا جس نے اس ناپاک کتاب کے مصنف سے بیزاری ہی کا اعلان کیا ہوتا اس گندہ کتاب کے متعلق اپنے تاثرات قلب ہی بیان کر دیے ہوتے یا کم از کم مسلمانوں کے جوش و خروش کو صحیح راستہ پر لانے کی کوشش ہی کی ہوتی، مگر یہ کچھ نہیں ہوا، یہ حضرات اس طرح خاموش رہے گویا ہندوستان میں کوئی غیر معمولی واقعہ رونما ہوا ہی نہیں۔

ہندو زعما کی کیفیت ہندوستان میں جو جماعت مہاسبھائی کہلاتی ہے، اس کے متعلق کسی قسم کی امید ہی فضول تھی، ہاں جو طبقہ کانگرسی، وطن پرور اور غیر متعصب کہا جاتا ہے، اسکے متعلق یقیناً یہ امید تھی کہ وہ اس کتاب اور اس کے طابع و ناشر کے خلاف کم از کم "ملامت" ہی کا اظہار کرے گا، مگر یہ خیال بھی غلط ثابت ہوا، مہاسبھائی عنصر نے تو دلیپ سنگھ کے فیصلہ رہائی راجپال پر گھی کے چراغ جلائے، اور کانگرسی عنصر جو تھا وہ بالکل خاموش ہو گیا، گویا گاندھی جی کی طرح اس نے بھی "مون برت" رکھ چھوڑا ہے۔

گاندھی جی اور موتی لال کی خاموشی گاندھی جی نے ضرور اس کتاب کی اشاعت کے وقت اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا، لیکن مقدمہ اور فیصلہ رہائی راجپال کے بعد وہ بھی خاموش تھے دوسرے زعما جو تھے وہ بھی ایک حرف نہیں کہنا چاہتے تھے، سو ر اتفاق سے ایسوشی ایٹڈ پریس کا نمائندہ پنڈت موتی لال سے ملنے گیا اور اس کتاب کے متعلق اس نے ان سے ایک بیان لینا چاہا، انھوں نے فرمایا کہ اس مسئلہ پر "میں بیان دینا نہیں چاہتا"!

یہ سکوت کس لئے تھا؟ حیرت ہوتی ہوگی کہ یہ سکوت کس لئے تھا؟ لیکن تھوڑے غور و فکر سے یہ حقیقت بھی عریاں ہو جاتی ہے۔

آزاد خیال حضرات اپنی "رواداری" کے خلاف سمجھتے تھے کہ اس کتاب کے خلاف اظہار رائے کریں، نیز اس سے ان کی ہر دلعزیزی کا آبگینہ بھی چور چور ہو رہا تھا، غرض

یہ اسباب تھے جنھوں نے مہر خاموشی لگا رکھی تھی۔

بعض زعما، اس لئے خاموش تھے کہ ان کو یقین تھا کہ یہ ہنگامہ تو ختم ہو ہی جائے گا، زعمار کانگرس بھی جب خاموش ہیں تو خواہ مخواہ ہندو مہاسبھا سے ٹکر لینا کہاں کی دانشمندی ہے اس لئے وہ اس اضطراب کا جواب خاموشی سے دے رہے تھے

محمد علی کی رہنمائی | لیکن محمد علی جیسا بطل جلیل اس نازک موقعہ پر خاموش نہیں بیٹھ سکتا تھا، اپنی ملت اور اپنے مذہب کو وہ "رواداری" کے نذر کرنا نہیں چاہتا تھا، اسے نہ کانگریس والوں کی خوشنودی کا تمغہ لینا تھا، نہ مہاسبھا والوں کی رضاجوئی اس کا مقصود حیات تھی، اس کا صرف ایک کام تھا اور وہ اپنے خالق اور اپنے معبودؐ کی رضا جوئی تھی اور بس۔

اس لئے ان مصالح میں سے کوئی مصلحت بھی اس کی عنان گیر نہیں ہوئی، نہ اس نے ان تعلقات کی زنجیروں کو اتنا گرانبار بنا لیا تھا کہ وہ ٹوٹ نہ سکیں، اس نے جب اس ہنگامہ کو دیکھا نفس کتاب کے مضامین سے واقفیت حاصل کی تو اس عاشق رسول اور شیدائے اسلام کی رگ حمیت جوش میں آئی اور وہ دیوانہ وار میدان عمل میں کود پڑا!

نظریہ | کانگرس اور مہاسبھا یہاں تک کہ خود اپنے رفقا سے بے نیاز ہو کر جب وہ میدان عمل میں اترا تو کوئی اس کی پیشوائی کے لئے موجود نہیں تھا سب اس کی مخالفت پر آمادہ تھے اس لئے کہ وہ "جمہور" کے نظریہ کا قائل نہیں تھا بلکہ مخالف تھا۔

"پبلک" کہتی تھی، دلیپ سنگھ مستعفی ہو جاؤ "پبلک کا قائد" کہتا تھا قانون بدلواؤ، قصور قاضی کا نہیں ہے، قانون کا ہے"

جو لوگ "نفسیات اجتماعیات" سے واقف ہیں وہ خوب سمجھتے ہیں کہ عقیدۂ عالم کی مخالفت کرنا اور وہ بھی علی الاعلان کس قدر مصائب اور شدائد کا پیش خیمہ ہوتا ہے، محمد علی اس حقیقت

سے ناآشنا نہیں تھے وہ اس مخالفت اور اس کے نتائج سے پورے طور سے باخبر تھے اور مقابلے کے لئے تیار۔

پنجاب اور ہندوستان کے دوسرے حصص میں "توہین عدالت" کے الزام میں گرفتاریاں شروع ہو چکی تھیں اور سارے ہندوستان میں جوش وخروش کی ایک لہر دوڑ گئی تھی اس حالت میں عقیدۂ عالم کی مخالفت کرنا محمد علی ہی کا کام تھا۔

اثرات جس وقت لوگوں نے یہ معلوم کیا کہ محمد علی اس نازک موقعہ پر اپنی رہنمائی سے قوم کی ہدایت کریں گے تو سب خوش ہوئے تھے لیکن جب یہ معلوم ہوا کہ وہ رہنمائی تو کریں گے لیکن جمہور کے نظریے سے اتفاق نہیں کریں گے تو سب کے دل رنج وافسوس سے لبریز ہو گئے اہل پنجاب نے انکی مخالفت میں حصہ لیا اور محمد علی کو ان کے عقائد سے پھیر دینا چاہا، لیکن وہ ایک کوہ استقامت تھا جمہور سے وہ رہنمائی کا متمنی نہیں تھا نہ جمہور کی حمایت کے بل پر اس کی قیادت قائم تھی، بلکہ وہ زعیم تھا اور یہ اس کا کام تھا کہ لوگوں کے خیالات کا رخ بدل دے۔

ایک دلچسپ خط اسی زمانہ میں محمد علی کے ایک دیرینہ دوست، قوم کے مخلص خدمتگذار اور انبالہ کے مشہور شاعر اور وکیل نے محمد علی کو ایک نہایت تند و تیز خط لکھا جس میں محمد علی کی روش سے اپنی سخت بیزاری کا اظہار کیا اس مکتوب کا ایک حصہ یہ ہے:-

> "خدا کے واسطے اب مقدمۂ اجپال کی بحث کو اور ہر ایسے مضمون کو جو اس بحث سے لفظاً یا معناً، ظاہراً یا باطناً، صراحتہً یا اشارۃً یا کنایتہً، بالواسطہ یا بلا واسطہ، کوئی تعلق قریب یا بعید، حقیقی یا فرضی، واقعی یا وہمی، اصلی یا مصنوعی رکھتا ہو بند اور قطعاً بند کر دیجئے، آپ کے تمام راسخ العقیدت نیازمند پڑھتے پڑھتے اور سنتے سنتے تھک گئے کہ مسٹر دلیپ سنگھ نے بد دیانتی نہیں کی۔"

جواب لاجواب | محمد علی نے اپنے ان عزیز دوست کو جو اس وقت جذبۂ اسلام سے بیتاب ہوکر اس قدر برہم تھے، ایک نہایت دلچسپ جواب دیا اور اپنی پوزیشن صاف کی، جواب کے اہم اجزا یہ ہیں۔

"آپ سر محمد شفیع کا واسطہ دیتے، ...... کا واسطہ دیتے، "رواہ البخاری" کا واسطہ دیتے، ڈاکٹر سر علامہ ..... کا واسطہ دیتے، تو میں ہر ایسے مضمون کو جو توہین رسول اکرم کے انسداد کی تدابیر سے لفظاً یا معناً، ظاہراً یا باطناً، صراحتہً یا اشارۃً یا کنایتہً، بلا واسطہ یا بالواسطہ، قریبی یا بعیدی حقیقی یا فرضی، واقعی یا وہمی، اصلی یا مصنوعی، پنجابی یا دیسی، تعاونی یا عدم تعاونی، ہندو مہاسبھائی یا مسلم لیگی، شدھوی یا تبلیغی، سنگٹھنی یا تنظیمی، سوراجی یا جرابی تعاونی، منفیانہ یا مثبتانہ ایشیائی یا یورپی، مشرقی یا مغربی، حامی یا سامی غرض کسی قسم نوع، بھانت وضع طریقہ، انداز کا تعلق رکھتا اس کو "بند اور قطعاً بند" کر دیتا۔

پنجاب کے لیڈر، غریب پنجابی مسلمانوں کو گمراہ کر رہے ہیں اور آپ خدا کا واسطہ دیتے ہیں کہ "ان کو گمراہ کرنے دو۔"

یہ خط تو خیر ایک مخلص دوست کی طرف سے تھا لیکن اس کے علاوہ اور نہایت غیر مہذب خطوط جو گالیوں سے لبریز تھے، وہ آئے اور انھیں "رجوع" کرنے پر مجبور کیا گیا، مگر کسی مخالفت کسی ہنگامہ کسی دل آزار حرکت سے محمد علی کو جنبش نہیں ہوئی!

سرگرمیاں | محمد علی کا نظریہ آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ وہ جسٹس دلیپ سنگھ کو بے قصور سمجھتے تھے البتہ تعزیرات ہند کو قصوروار سمجھتے تھے کہ اس میں ایک صاف، واضح اور غیر مشتبہ دفعہ انسداد توہین انبیاء و بزرگان دین کے لئے کیوں نہیں جب کہ توہین عدالت اور توہین ملک معظم کے لئے ہر طرح

کی قانونی آسانیاں موجود ہیں؟ اسی مقصد کی خاطر انھوں نے سارے ہندوستان کا بالعموم اور پنجاب کا بالخصوص دورہ کیا، اور اپنا نقطۂ نظر سمجھا سمجھا کر، لوگوں کو راہ راست پر لائے اور ان کے مساعی کو ایک سیدھے راستہ پر ڈال دیا۔

لکھنؤ کا ایک جلسہ جولائی سنہ ۲۰ء کے زمانۂ شورش میں بمقام لکھنؤ ایک نہایت عظیم الشان جلسہ ہوا، مسلمانوں کی اتنی زبردست تعداد رفاہ عام کے میدان میں مشکل ہی سے کبھی نظر آئی ہوگی۔

محمد علی کو خاص طور سے اس جلسہ کی صدارت کے لئے مدعو کیا گیا تھا، جلسہ میں مہاراجہ محمود آباد، ٹھاکر نواب علی اور دوسرے تعلقداران اودھ، وکلا، بیرسٹر، معززین غرض ہر طبقہ، ہر نوع، ہر بھانت کے لوگ موجود تھے۔

محمد علی نے اپنی صدارتی تقریر کی جس کا حاضرین پر بہت اچھا اثر ہوا، مغرب کی نماز کے بعد پھر نشست ہوئی اور اب دوسرے مقررین کو تقریر کا موقعہ ملا اور تجویز کی تائید ہونے لگی۔

مولانا ظفر الملک کی تقریر اتنے میں حاضرین میں سے بعض حضرات کے پیہم اصرار سے مولانا ظفر الملک نے ایک نہایت پرجوش تقریر کی، اتنی ولولہ انگیز کہ اس وقت تک جلسہ میں ایسی کوئی تقریر نہیں ہوئی تھی، محمد علی اپنی صدارتی تقریر میں غیر ضروری جوش ٹھنڈا کر کے لوگوں کو ہموار کر چکے تھے کہ مولانا کی اس تقریر نے ایک ہنگامہ بپا کر دیا، اللہ اکبر کے فلک فرسا نعرے اور بیتاب ہو ہو کر بار بار مجمع میں تلاطم، کسی خطرناک جوش کا اظہار کر رہا تھا۔

محمد علی کا تدبر لیکن یہ محمد علی کا تدبر تھا کہ انھوں نے آدمیوں کے اس سمندر کے اتنے بڑے طوفان کو اپنے قابو میں رکھا اور پھر ایک نہایت پرجوش تقریر کی اور اس سلسلہ میں اپنی جان تک قربان کر دینے کا عہد کیا تب جا کے مجمع ذرا ٹھنڈا ہوا، اور مولانا ظفر الملک نے بھی اعلان فرما دیا کہ وہ محمد علی کی اس تقریر کے بعد اب پورے طور سے مطمئن ہیں۔

یہاں سے واپس جاکر محمد علی نے اپنی پوری قوت ایک قانون کے بنانے اور اسے پاس کرانے میں صرف کردی، اچھا ہو، اگر وہ قانون بھی ایک دفعہ نظر سے گزر جائے، جو محمد علی نے خود تیار کیا تھا، اور اسمبلی میں پیش کرایا، حالانکہ وہ نہ وکیل تھے، نہ بیرسٹر، اور پنجاب کے ایک بیرسٹر کے قول کے مطابق "محض عطائی"، بہرحال قانون یہ ہے۔

قانون | مسودہ دفعہ ۲۹۵ الف تعزیرات ہند جو فوراً نافذ ہونا چاہیے۔

"جو کوئی شخص" "کسی کا دل دکھانے یا" "کسی شخص کے مذہب کی توہین کرنے کی نیت سے یا"، "اس امر کے احتمال کے علم سے کہ اس کے ذریعہ سے کسی شخص کا دل دکھے گا یا"، "کسی شخص کے مذہب کی توہین ہوگی"۔

"ایسی باتوں کے ذریعہ سے جو تلفظ سے ادا کی جائیں، یا لکھی جائیں، یا اشاروں کے ذریعہ سے یا نقوش مرئیہ کے ذریعہ سے یا اور طرح سے"

"کسی نبی، یا ولی یا اور شخص کی جسے لوگوں کا کوئی فرقہ اسی طرح مقدس سمجھتا ہو" "توہین کرے یا" "اس کی نسبت ایسا اتہام لگائے یا مشتہر کرے، جس سے اور لوگوں میں اس کی ملکات کی خفت ہو" "تو اس کو دونوں قسموں میں سے کسی قسم کی قید کی سزا دی جائے گی جس کی میعاد تین برس تک ہو سکتی ہے یا جرمانہ کی سزا یا دونوں سزائیں دیجائیں گی"۔

تشریح | "ایسے شخص کی سیرۃ اور ملکات کی سنجیدہ تنقید اور وہ نکتہ چینیاں جن سے اس کی آرا یا افعال کی ناپسندیدگی کا اظہار ہو"۔

"اگر وہ شخص ایسی تنقید یا نکتہ چینیاں کرے یا انھیں مشتہر کرے، ثابت کرے کہ اس نے یہ کام بغیر اس نیت یا علم کے کیا تھا جس کا بیان اس دفعہ میں کیا گیا ہے"

"بلکہ نیک نیتی سے کیا ہے" "اور اس ایمانداری کی نظر سے" "کہ تاریخی یا مذہبی حقیقت متیقن ہو سکے" در حسب منشائے دفعہ ہذا جرم نہیں"

یہ ہو بہت

یہ ہے وہ قانون جسے محمد علی نے تعزیرات ہند کی ورق گردانی کے بعد تیار کیا تھا اور کمال یہ کیا تھا کہ مختلف دفعات سے الفاظ، فقرے، جملے کر اس قانون کو بالکل مکمل کر دیا، اگر اپنی طرف سے بنایا جاتا تو احتمال تھا کہ جدید ہونے کی وجہ سے غور و فکر اور اصلاح و تغیر میں ایک عرصہ دراز لگ جاتا، مگر انھوں نے تعزیرات ہند کے مختلف دفعات کو سامنے رکھ کر حسب منشا ایک قانون کا مسودہ تیار کر لیا جس کی ہر طرف سے خوب داد ملی اور بے انتہا تعریف کی گئی۔

اسمبلی میں اسمبلی میں یہ قانون نواب سر ذوالفقار علی خاں نے پیش کیا، اور شکر ہے کہ وہاں اس کی پورے طور سے تائید کی گئی اور تائید کرنے والے لوگوں میں ہندو بھی کافی تھے، مگر افسوس کہ یہ قانون بعینہٖ اس صورت میں پاس نہ ہو سکا اور اس میں جو ترمیمات کی گئیں، انھوں نے اس کے اثر کو کہیں محدود و کمزور کر دیا، پھر بھی کسی نہ کسی حد تک تو موثر ہی ہے۔

خصوصیت ممیزہ اس ہنگامہ کے متعلق ضروری اور اہم مواد پیش کر دیا گیا، کچھ اس سے قبل دوسرے عنوانات کے سلسلہ میں گزر چکا ہے، اب غور کیا جا سکتا ہے کہ محمد علی نے اپنی قیادت کے جوہر کو کس طرح جلا دی، جس بات کو حق سمجھ لیا اس کے لئے تن من دھن سب کچھ قربان کر دیا۔

اس سلسلہ میں محمد علی کو سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، لیکن انھوں نے نہایت اطمینان سے ان تمام باتوں کا مقابلہ کیا اور اپنے خیالات و عقائد کی تبلیغ جاری رکھی اور چونکہ وہ نیک نیتی خلوص اور للہیت پر مبنی تھی اس لئے آخر میں پوری کامیابی محمد علی ہی کو ہوئی اور شروع میں جو بڑھ بڑھ کے مخالفت کر رہے تھے، سب و شتم کر رہے تھے، دست و گریبان ہونے کے لئے تیار تھے وہی اب شریک کار تھے، دلیپ سنگھ کو مستعفی کرانے کے بجائے قانون کو بدلوانے کی فکر میں تھے۔

یہ ہوتی ہے اصل قیادت اور کمال رہنمائی جس کا سودا ہر سر میں ہوتا ہے، لیکن اہلیت بہت کم ہیں!

یہ اُس کی دین ہے جسے پروردگار دے!

باب ۳۷

آل پارٹیز کانفرنس

"ملاپ کانفرنس" کی سرگزشت بیان ہو چکی ہے کہ کس طرح "سبکساران ساحل" نے قوم کی اس کشتی کو غرق ہوتے دیکھا مگر خاموش ہو رہے!

یہ بھی بیان ہو چکا ہے کہ محمد علی نے اپنی علالت، اپنی خانگی پریشانیوں اور ہندو مسلمانوں کے حوصلہ شکن طرزِ عمل کے باوجود، پے در پے اس کی کوشش کی کہ کوئی صورت ایسی نکل آئے جس سے ہندو مسلمان دونوں متفق ہو جائیں اور اختلاف و افتراق سے ناجائز فائدہ اٹھا کر ہندوستان کی غلامی میں جو غیر محدود اضافہ ہو رہا ہے، اسے کم کیا جائے اور جلد سے جلد پھر کوس رحیل بجے اور یہ قافلہ، اپنی منزل مقصود کی طرف کوچ کر سکے،

یہ بھی ذکر ہو چکا ہے کہ اس قسم کی کانفرنسیں برخاست کبھی نہیں ہوئیں بلکہ "ملتوی" ہوئیں اور مناسب موقعے اور وقت کا انتظار کیا گیا کہ جب حالات سازگار ہوں گے تو پھر یہ کوششیں کی جائیں گی اور کامیاب ہونے کی سعی کی جائے گی!

شملہ یونٹی کانفرنس جب ملتوی ہوئی تو اس وقت ہندو مسلمان لیڈروں کی اور بالخصوص ہندو زعما کی ذہنیت قطعاً صلح جویانہ نہیں تھی بلکہ مجادلانہ تھی، انھیں حضرات کی بدولت بغیر کسی نتیجے پر پہنچے ہوئے وہ کانفرنس مجبوراً ملتوی کی گئی

محمد علی کی تگاپوئے دمادم لیکن محمد علی کی کوششیں ختم نہیں ہوئیں اور وہ برابر ہندو مسلمان زعما سے تقاضا کرتے رہے کہ جلد سے جلد کوئی صورت ایسی نکلنی چاہیے کہ جس پر اتفاق ہو سکے

ورنہ دفتری اقتدار بڑھتا جائے گا اور ہندوستانیوں کی قوت عمل اور جذبۂ آزادی میں انحطاط ہوتا جائے گا۔

آل پارٹیز کانفرنس | ۱۹۲۸ء میں آل پارٹیز کانفرنس کے نام سے پھر کوششیں شروع ہوئیں اور تمام قابل ذکر انجمنوں کے نمائندوں کو دعوت شرکت دی گئی، اور چاہا گیا کہ مختلف فیہ مسائل پر کوئی ایسا "درمیانی" راستہ نکالا جائے جس کے بعد پھر کسی کو یارائے اختلاف نہ رہے اور یہ سب صلح و محبت کی اسپرٹ میں ہونا چاہئے، اصولی اور آئینی طور سے نہیں یہ سمجھ کر بیٹھنا چاہئے کہ ہم اپنے گھر کے چند اہم مسائل پر غور و فکر کے لئے مجتمع ہوئے ہیں اور اس وقت تک نہیں اٹھیں گے جب تک اس قضیۂ نامرضیہ کا تصفیہ نہ کرلیں۔

پہلے اجلاس | ابتدائی جلسوں میں تو ہندو مسلم زعماء کی کافی تعداد شریک ہوئی اور جب تفریح و تبادلۂ آب دہوا، اور تنقیۂ دماغ کا مقصد پورا ہو گیا تو اب پھر گھر جانے کی کوشش شروع ہوئی، کوئی روٹھ کر واپس گیا، کوئی اپنی انجمن کی رائے حاصل کر کے آنے کا وعدہ کر گیا، کسی نے شرکت سے "معذوری" ظاہر کی، کوئی اپنی انجمن کی "ہدایات" سے مجبور نظر آیا اور کسی کے گھر سے کسی کی علالت کا تار آ گیا، اس طرح رفتہ رفتہ تمام ہندو جماعتوں کے نمائندے رخصت ہو گئے، مسلمان جماعتوں میں سے بھی مسلم لیگ کا رویہ اسی قسم کا رہا، انھوں نے بھی غصہ کا جواب غصہ سے دیا، تعصب کا جواب تعصب سے دیا، بہرحال پوری "جوابی کارروائی" جاری رکھی، لیکن ایک خلافت کمیٹی اور ایک محمد علی یہ دو چیزیں ایسی تھیں جو آل پارٹیز کانفرنس میں جمی رہیں اور جنھوں نے اپنے اشتراک عمل اور خلوص نیت کا پورا پورا ثبوت دیا۔

محمد علی پر حملہ | آل پارٹیز کانفرنس کے اکثر جلسے دہلی میں ڈاکٹر انصاری صاحب کے دولتکدہ پر منعقد ہوتے تھے، وہاں ایک بار کانگرس کے ایک ممبر نے چوٹ کی کہ بعض ایسے کانگرس کے

ممبر بھی ہیں جو یہاں تو ہندو مسلم اتحاد کا نعرہ لگاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہماری خواہش یہ ہے کہ ہندو مسلم اتحاد ہو جائے، کوئی ایسا دستور وضع ہو جائے جس میں سب لوگ متفق ہو سکیں اور پھر جب وہ جامع مسجد یا مندر میں جاتے ہیں تو وہی سب سے زیادہ ہندو مسلم اتحاد کے خلاف کوششیں کرتے ہیں اور اپنی جماعت کو دوسری جماعت کے خلاف بھڑکاتے ہیں ظاہر ہے یہ حملہ محمد علی ہی پر تھا، کانگرس کے اکثر ممبر مندر کی طرف رخ بھی نہیں کرتے، کوئی مسلمان لیڈر شاید ہی کبھی جامع مسجد میں جاتا ہو تو جاتا ہو، ایک محمد علی تھے جو داعی صلح و امن بھی تھے اور اپنے مذہب کے پرستار بھی وہی وہاں تقریریں بھی کرتے تھے اور یہاں صلح کی کوششیں بھی۔

محمد علی کا جواب محمد علی کو یہ حملہ ناگوار ہوا، اور انھوں نے وہیں جلسہ میں ان صاحب کو ایک ڈانٹ بتائی اور اس پر بھی ایک مختصر سا اشارہ کیا کہ صلح و امن کی کوششوں کا حقیقۃً کون دشمن ہے اور کس کی طرف سے "التوا" کی تحریک موقع بے موقع ہوا کرتی ہے!

طرزِ عمل بہرحال اس قسم کے دل شکن اور حوصلہ فرسا واقعات کے بعد بھی محمد علی کی روش میں کوئی تغیر نہیں ہوا، وہ برابر آل پارٹیز کانفرنس کے جلسوں میں شریک ہوتے رہے اور مسلمانوں کا نقطۂ نظر پیش کرتے رہے، اپنی ان مساعی سے انھیں اس درجہ شغف تھا کہ سخت علالت اور مرض کی حالت میں بھی طبی مشیر کے مشورہ کے خلاف وہ جلسوں میں شریک ہوئے ہیں اور ان پیچیدہ مسائل کی گرہ کشائی کی۔

گاندھی جی یہ یاد رکھنا چاہئے کہ گاندھی جی اب تک اپنے آشرم میں معتکف ہیں، اور انھوں نے سوا یونٹی کانفرنس دہلی کے نہ شملہ میں اور نہ پھر دہلی کی آل پارٹیز کانفرنسوں میں باوجود پیہم اور مسلسل التجاؤں کے شرکت کی، اس وقت ان پر یاس و قنوط کے جذبات طاری تھے اور وہ اس قسم کی کوششوں کو لاحاصل اور بے نتیجہ خیال فرماتے تھے

لیکن چند شوریدہ سر مسلمان تھے جنھیں نہ اعتکاف میں لطف آتا تھا، نہ مایوسی سے اپنے دل کو تسکین دے سکتے تھے، ان کے دل آرزوؤں اور تمناؤں سے لبریز تھے اور ان کی کوششیں فلاح قوم کے لئے صرف ہو رہی تھیں۔

پھر التوا | لیکن محمد علی کی اس انتھک کوشش کے باوجود، اور خلافت کے اس قابل داد اشتراک عمل کے باوجود یہ آل پارٹیز کانفرنس پھر ملتوی ہوئی اور طے پایا کہ چونکہ "یہ وقت مناسب اور موزوں نہیں ہے، اس لئے ایک بار پھر التوا۔"

یہ بھی طے ہوا کہ مئی ۱۹۲۸ء کی (غالبًا) آخری تاریخوں میں یہ پھر بمبئی میں منعقد کیجائے اور وہاں کوئی فرقہ وارانہ حل تلاش کیا جائے، اس لئے کہ دہلی اور شملہ میں تو چراغ رخ زیبا لیکر لاکھ لاکھ اس عروس تمنا کی جستجو کی گئی، مگر ایسا حسن اتفاق کبھی بھی پیش نہیں آیا کہ مقصد میں کامیابی ہوئی ہوتی۔ فیا للاسف۔

اس التوا کے حالات دوسرے موقعہ پر آئیں گے!

باب ۳۸

چودہ نکات!

جب محمد علی کوشش کرتے کرتے تھک گئے مگر مفاہمت اور سمجھوتہ کی کوئی صورت پیدا نہ ہوئی تو مجبوراً انھوں نے یہ چاہا کہ ہم مسلمان چند باتوں پر متفق ہو جائیں اور اس کے بعد انھیں کانگرس سے منوانے کی کوشش کریں، کانگرس اگر منظور کرے تو پھر ہم مطمئن ہو کر اپنا کام جاری رکھ سکیں گے۔

اس لئے کہ انکا یہ عقیدہ تھا، اور واقعہ بھی یہی تھا کہ اگر مسلمان اور کانگرس متفق ہو کر میدان عمل میں اتر آئیں، اور کانگرس مہا سبھا سے بے نیاز ہو جائے، مسلمان تبلیغی جماعتوں کی پروا نہ کریں تو بھی یقیناً ملک کا قابل اعتماد حصہ ہمارے ساتھ ہو گا اور گورنمنٹ بھی ہماری متفقہ آواز کا اثر قبول کرنے پر مجبور ہو گی۔

دہلی پرپوزل چنانچہ دہلی میں اسمبلی کے اجلاس سے فائدہ اٹھا کر محمد علی نے کوششیں صرف کرنی شروع کیں، خود شریک ہوئے، مسٹر جناح کو شریک کیا اور دوسرے بااثر حضرات کو دعوت دی اور ہفتوں کی مسلسل نشست کے بعد بالآخر چودہ نکات ایسے منظور ہوئے، جن پر مسلمانوں کی رائے عامہ نے اتفاق کر لیا، اور یہ انھیں کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ مسلمان جو مخلوط انتخاب کے نام ہی سے کانوں پر ہاتھ رکھتے تھے، اس پر بھی راضی ہو گئے، گو چند شرائط کے ساتھ اور وہ سب شرائط ایک دوسرے سے اس طرح وابستہ تھے کہ سب نے مل کر ایک تجویز کی صورت اختیار کی تھی۔

خلاصہ یہ چودہ اصول کیا تھے، انھیں مختصراً یوں سمجھئے کہ اکثریت کو کسی جگہ اقلیت میں تبدیل نہ کیا جائے، پنجاب و بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت حقیقی نہیں ہے بلکہ "عددی" ہے اس لئے ان

دونوں صوبوں میں ان کی نشستیں محفوظ رکھی جائیں، پنجاب و بنگال میں ان کی اکثریت کو نقصان نہ پہنچایا جائے، دوسرے صوبوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں انھیں رعایتیں دی جائیں، جہاں مسلمان اکثریت میں ہوں گے وہ ہندو اقلیت کو اسی طرح کی مراعات سے مستفید کریں گے، مرکزی لیجسلیچر میں ان کی ۳۳ فیصدی نمائندگی ہو، اکثریت کو برقرار رکھنے کا مطالبہ اس لئے تھا کہ توازن قائم رہے۔

اس کے علاوہ صوبہ سرحد کو مساوی اصلاحات دے جائیں اور صوبہ سندھ کو ایک مستقل اور جداگانہ صوبہ تسلیم کرلیا جائے، بلوچستان کو الگ صوبہ بنا دیا جائے!

محمد علی کی کوششیں | محمد علی نے دہلی تجاویز کو مقبول عام بنانے میں جدوجہد کی انتہا کردی

کانگریس کی تصدیق | محمد علی نے اسے کانگریس سے منظور کرایا، اور کانگریس نے اسے منظور کرلیا پھر کلکتہ کانگریس نے ان تجویزوں کو منظور کیا، اس کے بعد محمد علی نے ہندو مہاسبھا کے حضرات کو اس نقطۂ نظر پر لانے کی اور اپنا ہمنوا کرنے کی کوشش کی اور اس میں ایک حد تک کامیاب بھی ہوئے، اس جدوجہد کی داستان انھیں کی زبان سے سنئے۔

محمد علی کا اظہار خیال | ایک موقعہ پر وہ اظہار خیال کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"اگر برادران ہنود اور حکومت اس پر راضی ہوں کہ پانچ صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہو اور اس اکثریت پر ہندو اقلیت قانع اور مطمئن ہو کر رہنے کو آمادہ اور تیار ہو تو مسلمان بھی اس پر راضی ہیں کہ نو ۹ صوبوں میں ہندوؤں کی اکثریت ہو، اس اکثریت کے انصاف اور رواداری پر مسلم اقلیت بھی قانع اور مطمئن ہو کر رہنے کو آمادہ اور تیار رہے۔

الحمدللہ کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے اسے گزشتہ مئی میں قبول کرلیا جس میں ڈاکٹر

مونجے اور مسٹر کیلکر بھی شریک تھے بالآخر جیکر نے بہت کچھ گفت وشنید اور لفظی بحث کر کے دہلی کی تجویز کو قبول ہی کر لیا، ڈاکٹر مونجے نے فرمایا کہ میں ہندو سبھا میں صوبہ سرحد کو اصلاحات دیے جانے کے خلاف رائے دیے جانے کے خلاف رائے دے چکا ہوں اس لئے صرف اس مد کے خلاف ہوں، باقی ہر شئے قبول ہے، سندھ کے بعض متعصب ہندو ...... ہندوستان ٹائمز کے سابق ایڈیٹر جے رام داس دولت رام کی سرکردگی میں کانگرس کے خلاف علم بغاوت بلند کر رہے تھے۔"

ہندوؤں کی مخالفت کانگرس کی تصدیق وتوثیق کے باوجود ہندو بڑی شدت سے ان اصول کی مخالفت کر رہے تھے، ان پر یہ بہت گراں تھا کہ سندھ ایک آزاد صوبہ قرار دیا جائے سرحد کو دوسرے صوبوں کے مساوی اصلاحات مل جائیں، پانچ صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہو اور مرکزی لیجسلیچر میں مسلمانوں کی ۳۳ فیصدی نمائندگی ہو۔

علی گڑھ کا ایک جلسہ علیگڑھ پر دانشل کانگرس کے جلسہ کے حالات ایک دوسرے عنوان کے ماتحت گزر چکے ہیں، اور اس کی کارگزاریاں اور مسلم آزاریاں اور ہندو نوازیاں بھی آپ کے سامنے آچکی ہیں۔

کانگرس کے جلسہ میں محمد علی یہ منظر دیکھ کر بہت متاثر ہوئے، مسٹر شعیب قریشی اور ڈاکٹر انصاری بھی حد درجہ ملول وغمگین تھے کہ کانگرس کے جلسہ کی ذہنیت اس قدر خراب ہو رہی تھی کہ اس میں آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے طے شدہ اور پاس شدہ چودہ اصول جو مسٹر جناح نے مرتب کئے تھے، منظور نہیں ہو سکتے تھے اور طرح طرح کی مخالفت ہو رہی تھی۔

محمد علی کی تقریر بہت زیادہ اصرار والتجا کے بعد محمد علی اس جلسہ میں شریک ہوئے تھے، ورنہ

اس دلدوز کیفیت کو دیکھ کر نہ شریک ہونے کا انھوں نے عہد مصمم کر لیا تھا۔

تقریر انھوں نے انھیں چودہ اصول پر کی، اور ثابت کرنا چاہا کہ اس معاملہ میں تم لوگوں کی مخالفت ہندوستان اور مسلمانوں کے ساتھ دشمنی ہے، تمھاری رواداری عدیم النظیر ہونی چاہئے تھی، نہ کہ تمھاری تنگ دلی کا چرچا ہو؟ بہر حال انھوں نے اپنی تقریر میں فرمایا۔

"درحقیقتہً یہ محلکے اور یہ ضمانتیں جو آج ہم ایک دوسرے کو دے رہے ہیں وہ محلکے اور ضمانتیں نہیں ہیں جو ہمارے اجنبی حکمراں ہم کو مجرم سمجھ کر ہم سے طلب کیا کرتے ہیں، بلکہ یہ وہی محلکے اور ضمانتیں ہیں جن کی طرف ہر سچے مذہب کے اس سنہرے قاعدے نے اشارہ کیا ہے کہ دوسروں کے ساتھ وہی کرو جو تم چاہتے ہو کہ دوسرے تمھارے ساتھ کریں"

مالوی جی کی تائید پھر جب مدراس کانگرس میں ان اصولوں کی توثیق اور تصدیق ہوئی اور مالوی جی نے بھی تائید کے بعد ایک موثر اور دل نشیں تقریر کی تو فورتاثر سے محمد علی نے مالوی جی کے قدم لے لئے، اور کہدیا کہ تم اگر ایسے ہی ثابت ہوئے جیسا کہہ رہے ہو تو ہم تمھیں اقلیتوں کا امین بناتے ہیں۔

پھر بھی مخالفت لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ہندوؤں کی مخالفت میں کسی طرح کمی نہ ہوئی اور وہ برابر اختلاف کرتے رہے کہ مسلمانوں کو صوبہ سرحد میں مساوی حقوق نہ ملیں، سندھ کو آزاد صوبہ نہ بنایا جائے اور مرکزی مجلس قانون ساز میں انھیں ۳۳ فیصدی نیابت نہ حاصل ہو۔

محمد علی نے ان مخالفتوں کا بھی مقابلہ کیا اور اپنی ساری قوت تقریر، اور سارا زور قلم دلائل و براہین کے ساتھ صرف کر دیا کہ برادران وطن بھی کسی طرح اس حقیقت کو سمجھ جائیں اور اختلاف ختم کر دیں مگر ان کو اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔

دلائل ایک مضمون میں اسی موضوع پر اظہار خیالات کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"آجتک ہندوستان میں اکثریت کی حکومت نہیں ہوئی، نہ اشوکا کے وقت میں نہ بکرم جیت کے عہد میں، نہ محمود غزنوی کے زمانہ میں نہ غوری کے دور میں نہ پرتھی راج کی سلطنت اکثریت کی تھی نہ اکبر کی نہ اورنگ زیب کی، نہ سیواجی کی نہ رنجیت سنگھ کی نہ آج لارڈ ارون کی ہے۔

آج پہلی بار وہ دستور اساسی بن رہا ہے جس پر نہ سرٹیفکیشن کا کسی کو اختیار ہوگا نہ ویٹو کا، بلکہ ہر فیصلہ اکثریت ہی کے مطابق ہوگا، پھر اس بدعت حسنہ کی ابتدا کے وقت اگر ایک جاتی جسے برطانوی ہند میں بھی ۷۰ فیصدی اکثریت حاصل ہے، اس دستور اساسی پر پوری پوری طرح مطمئن ہو لیکن ایک اور ملت جو باوجود اس سے بھی حقیر تر اقلیت کے ہندوستان پر صدیوں تک حکومت کر چکی ہو اور ۲۵ فیصدی کی اقلیت میں ہو اس پر پوری طرح مطمئن نہ ہو تو تعجب کی کونسی بات ہے؟

ایک اور مضمون اس کے علاوہ ایک دوسرے موقعہ پر وہ فرماتے ہیں۔ گو یہ یاد رہے کہ اس زمانے میں وہ پکے کانگرسی ہیں لیکن زبان سے کلمہ حق بلا کسی مرعوبیت کے نکلتا ہی ہے۔ فرماتے ہیں۔

"یقیناً ہندو جاتی سارے عالم میں اپنی تنگ نظری میں نمایاں ہے، دنیا بھر میں کسی ملت نے خود اس تنگ نظری کا ثبوت نہیں دیا ہے کہ خود اپنے ہی فرقوں کو اچھوت سمجھا ہو کہ صدیوں سے سب ہنود نہ ایک دوسرے کو بیٹی دے سکتے ہیں نہ ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھ کر روٹی کھا سکتے ہیں اور یہی نہیں بلکہ سب ہنود ایک مندر تک میں یکجا نہیں ہو سکتے نہ سب جگہ سب کے لئے عام سڑکیں ہی کھلی ہوئی ہیں، جو جاتی اس درجہ خود غرضی کی شکار ہو، اس پر دوسری ملتیں کس طرح اعتماد کر سکتی

ہیں؟ جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب، اس قدر فرقہ بندی کا سبب نہیں بنے جس قدر کہ ہنود کی فرقہ بندی خود اس کا سبب بنی"

مسلمانوں کو افہام تفہیم یہ تو تھی ہندوؤں سے ان کی معرکہ آرائی لیکن مسلمانوں سے بھی انھیں کم مقابلے نہیں کرنا پڑے، یہ انھیں کا دم تھا جس نے ہر ہر مقام پر جاکر ان تجویزوں کو منظور کرایا اور مسلمانوں کو راضی کیا کہ وہ ان تجاویز کی حمایت کریں۔

مسلم لیگ مسلم لیگ سے اگرچہ وہ اس وقت بیزار تھے لیکن اس مقصد کے حصول کے لئے وہ اس میں بھی شریک ہوئے اور منوایا، میرٹھ میں جب مسلم لیگ پراونشل کا جلسہ راجہ صاحب سلیم پور کی صدارت میں منعقد ہوا تو محمد علی اس میں بھی پہنچے، اگرچہ وہ اس کے ممبر بھی نہیں تھے، مگر وہیں ممبر ہوئے اور اس کے بعد باقاعدہ اس کے مباحثوں میں حصہ لیا اور بالآخر وہاں سے بھی مہر تصدیق لگوا ہی لی اور کامیاب ہی واپس آئے!

ایک لمحۂ فکریہ محمد علی نے چودہ اصول کی تجویز میں تائید میں تحریک میں جو حصہ لیا وہ معلوم ہو چکا، یہ ظاہر ہو چکا کہ انھوں نے اپنی سحر کار شخصیت سے فائدہ اٹھا کر کس طرح مسلمانوں کو راضی کیا؟

بعض مسلمان اب تک جداگانہ انتخاب کو رحمت اور مخلوط انتخاب کو لعنت سمجھتے ہیں اور بہ دلائل سمجھتے ہیں، لیکن محمد علی اپنے نقطۂ نظر سے مخلوط انتخاب ہند[illegible] کے لئے باعث فلاح سمجھتے تھے، لیکن یہ انھیں کی جاذب توجہ شخصیت تھی جس نے [illegible] ہوں کو بالآخر مخلوط انتخاب کو ماننے پر راضی ہی کر دیا۔

مخالفت کا اثر ایک عرصۂ دراز کے غور و فکر، تلاش و جستجو اور سعی و کوشش کے بعد انھیں ایک حل ایسا ملا تھا جس پر انھوں نے مسلمانوں کو متفق کر لیا تھا اور کانگرس سے بھی اسے منظور کرا لیا تھا اور یہ منظوری اس کی مجلس عاملہ ہی میں نہیں ہوئی بلکہ مجلس عام میں ہوئی، آل انڈیا کانگرس

کمیٹی کے جلسے میں ہوئی اور پھر ہزاروں کی تعداد کے سالانہ جلسہ منعقدہ مدراس میں ہوئی مسلمانوں نے بھی گو شروع شروع میں مخالفت کی، مگر آخر میں وہ بھی ہموار ہو گئے اور انھیں ماننا ہی پڑا کہ ہمارے درد کی دوا یہی ہے۔

لیکن اسے انھوں نے نہایت شدت کے ساتھ محسوس کیا کہ اس توثیق و تصدیق کے بعد بھی نیت کا فتور کم نہیں ہوا تھا مالوی جی، مسٹر جیکر، مسٹر کیلکر اور ڈاکٹر مونجے کی رضامندی کے باوجود عام ہندوؤں نے ان سب کے اشارہ چشم سے جس طرح مخالفت کی وہ اظہر من الشمس ہے جبلپور میں مہاسبھا کے اجلاس میں ڈاکٹر مونجے نے جو کچھ فرمایا تھا اس کی آواز بہت سے مسلمانوں کے کانوں میں آج بھی گونج رہی ہوگی۔

اور پھر اس روش سے متاثر ہو کر، ڈر کر، مرعوب ہو کر قوم پرستی کا دم بھرنے والوں نے دفعتہً و بغتتہً لیکن نہایت ہوشیاری کے ساتھ اپنی روش میں تبدیلی کی، ہندو مہاسبھا کو ہاتھ میں لیا، اس کی تائید و حمایت حاصل کی اور مسلمانوں کو خود بلا کسی وجہ کے اپنے ہاتھ سے کھویا، ان کی مانی ہوئی اور طے شدہ باتوں کو قبول کیا، پھر "سیاست" سے کام لیکر ٹھکرا دیا اور اس کی توقع رکھی کہ مسلمان ہاں میں ہاں ملائے ہی جائیں گے۔

بہرحال [illegible] کے باوجود محمد علی اپنی زندگی کے آخری لمحات تک چودہ اصولوں پر قائم رہے، بعض حالات کی تفصیل نہرو رپورٹ کے ضمن میں ملاحظہ فرمایئے۔

باب ۳۹

سائمن کمیشن

ہندو مسلمانوں کے اختلافات سے ناجائز فائدہ اٹھا کر بیبر گورنمنٹ نے حسب اصول ۱۹۲۷ء میں ایک کمیشن کا تقرر کر دیا جس کے احاطۂ تحقیق میں یہ بات داخل تھی کہ وہ اس کی تفتیش کرے کہ گزشتہ اصلاحات سے اس وقت تک ہندوستان نے کتنی ترقی کر لی ہے تاکہ اسی کے مطابق جدید اصلاحات کا خاکہ تیار کیا جائے اور ہندوستان کو پھر

مجلس آئین و اصلاح و رعایات و حقوق

کا شیریں مگر "خواب آور" شربت پلا دیا جائے تاکہ پھر ایک عرصۂ دراز تک یہ مرغ زریں بال اسیر دام رہے۔

سائمن کمیشن کی ہیئت ترکیبی کانگرس نے اس کمیشن سے اپنی پوری بے تعلقی کا اعلان کر دیا، لیکن لبرل حضرات ابھی تک تذبذب میں تھے مگر گورنمنٹ کی مسلسل بے مہریوں نے اس تذبذب کو عرصہ تک نہ قائم رہنے دیا اور کمیشن کی ہیئت ترکیبی اس قسم کی رکھی کہ اس میں ہندوستان کے معتدلین تک کو نہیں رکھا، سر تیج بہادر سپرو اور مسٹر جناح جیسے اشخاص بھی انتخاب میں نہ آسکے اور زبان حال سے کہہ دیا گیا کہ ہندوستان کی قسمت کے فیصلہ میں ہندوستانیوں کو کچھ دخل نہیں ہو سکتا

طوفان اختلاف جب علی الاعلان گورنمنٹ نے اپنا یہ رویہ ظاہر کر دیا تو ہندوستان کے معتدلین بھی چیخ اٹھے اور سب نے بالاتفاق کمیشن کے بائیکاٹ کی صدا بلند کی جن میں سر تیج بہادر اور مسٹر جناح پیش پیش تھے، لالہ لاجپت رائے بھی نہایت برہمی کے ساتھ مالوی جی کی معیت میں اس کی مخالفت

کر رہے تھے اس لئے کہ یورپ کی مسلسل سیر و سیاحت کے بعد اور مسٹر میکڈانلڈ اور ان کی لیبر پارٹی سے ناامیدی کے بعد پھر لالہ جی بھی مخالفین کی صف میں نظر آنے لگے۔

مجالس قانون ساز میں یہ رنگ دیکھ کر گورنمنٹ کے خلاف ہندوستان کے ہر طبقہ نے اظہار خیال کرنا شروع کیا، سب سے پہلے لالہ لاجپت رائے نے اسمبلی میں سائمن کمیشن کے تقرر اور تعاون کے خلاف ایک زبردست تجویز پیش کی جو پنڈت موتی لال کی تائید اور "ہاؤس" کے دوسرے "آنریبل ممبروں" کی تائید مزید کے بعد منظور ہو گئی، پھر ہندوستان کی ہر صوبہ کونسل میں یہی تجویز پیش ہوئی معتدلین کے علاوہ تعلقداروں کا طبقہ بھی اس کمیشن کے تقرر سے ناخوش تھا، چنانچہ مہاراجہ صاحب محمود آباد اور راجہ صاحب کالاکانکر تعلقداروں کی جماعت سے اس کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔

تالیف قلب یہ رنگ دیکھ کر گورنمنٹ نے تالیف قلب کے خیال سے ہندوستانیوں کو پھر ایک تھپکی دی اور اسمبلی کونسل آف اسٹیٹ اور ہر ہر صوبہ کی طرف سے ایک دوسرا "سائمن کمیشن" بنا دیا جس کے صدر سر سنکرن نائر تجویز ہوئے، امید تھی کہ اس "فراخدلی" سے لبرل حضرات پھر "معتدل" ہو جائیں گے، اور اگر کانگرس کی نہیں تو کم از کم انھیں کی ہمدردی حاصل ہو جائیگی مگر اس کا بھی کوئی خاص نتیجہ نہیں نکلا، اور ہندوستان کے معتدلین کی طرف سے بھی اس کی اسی شدت سے مخالفت ہوتی رہی جس طرح کانگرس کی طرف سے، لیکن ان کی مخالفت بھی "معتدل" تھی، یعنی تقریر و تحریر تک محدود اور اس کے بعد جو کچھ ہوتا تھا وہ ان کے سنجیدہ طبائع کے خلاف تھا

مسلمانوں کی روش یہ تو تھی ہندوؤں کے عام طبقات کی حالت، لیکن مسلمانوں کی حالت اس کے برعکس تھی وہ تقریباً من حیث القوم کمیشن سے تعاون کرنے کے لئے آمادہ تھے جتنے خطابات فتہ اور ارکان کونسل تھے وہ سب تو کمیشن کے حامی تھے ہی مگر وہ لوگ جن کی عمر گورنمنٹ کی مخالفت

میں گزری تھی وہ بھی ہندوؤں کی ذہنیت سے اتنے بددل ہو چکے تھے کہ کمیشن سے تعاون میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے تھے، مثلاً مولٰنا حسرت موہانی، مسٹر جناح اگرچہ بہت مخالف تھے، لیکن وہ بھی حیران تھے کہ اس وقت مسلمانوں کی رہنمائی کس طرح کی جائے، اور کیوں کر ان کے جذبۂ تعاون کو ختم کیا جائے؟

محمد علی کی رائے | محمد علی بھی سائمن کمیشن کے تقرر کے سخت مخالف تھے، وہ گورنمنٹ، مسٹر میکڈانلڈ اور ان کی ساری پارٹی سے خوب واقف تھے، یہ بھی جانتے تھے کہ اس کمیشن سے ہم مسلمانوں کو کیا مل جائے گا، اور اگر تعاون نہ کیا گیا تو نقصان کیا ہوگا؟

بہرحال وہ پوری استقامت کے ساتھ میدان عمل میں آئے اور سائمن کمیشن کی مخالفت انھوں نے نہایت شدت کے ساتھ شروع کردی۔

اس سلسلہ میں پھر انھیں بڑے بڑے لوگوں سے ٹکر لینی پڑی لیکن جس چیز کو وہ مسلمانوں کے لئے باعث ذلت سمجھ رہے تھے، اسے قبول کرنے کی حمایت کیسے کرسکتے تھے؟ اس لئے اس کی مخالفت میں انھوں نے اپنے آپ کو وقف کردیا۔

سر شفیع کا "پیام" | سر شفیع مرحوم کمیشن کے بڑے سخت حامی تھے اور انھوں نے تعاون کے تمام سامان مکمل کرلئے تھے، اسی زمانہ میں مسلم لیگ کی صدارت کے لئے انکا انتخاب ہوچکا تھا۔ لیگ کی کونسل کے صدر مسٹر جناح تھے اور اجلاس کے صدر سر شفیع منتخب ہوئے، دونوں کے افکار و آرا میں سخت تضاد تھا، ایک کمیشن کا نہایت شدت کے ساتھ حامی تھا اور دوسرا اسی انداز میں اس کی مخالفت کر رہا تھا سر شفیع سے درخواست بھی کی گئی کہ وہ صدارت سے مستعفی ہوجائیں، لیکن انھوں نے اسے قبول کرنے سے انکار کردیا با صدارت اور مسلمانوں کی "رہنمائی" پر پوری آمادگی ظاہر کی، مقام اجلاس کلکتہ طے ہوا تھا، لیکن شفیع پارٹی لاہور کے

لئے مصر تھی ، بالآخر یہ کشمکش ختم نہیں ہوئی ، مسٹر جناح نے حسب قرار داد کلکتہ ہی میں اجلاس منعقد

لیگ کے دو ٹکڑے | کرانا چاہا اور سر شفیع نے حسب مرضی خود لاہور میں ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سر شفیع نے

لاہور میں اپنا جلسہ کیا اور "آل انڈیا مسلم لیگ" نام رکھا اور خود صدارت کی ، مسٹر جناح نے کلکتہ

میں کیا اور سر محمد یعقوب نے اس کی صدارت کی ۔

مسٹر جناح اس وقت سخت پریشان ہو رہے تھے انھیں سخت فکر تھی کہ اجلاس کامیاب

کیسے ہوگا ، موصوف کو عام مخالفت کا سخت اندیشہ تھا اور پھر اس جدید تفریق نے بھی ان کو اور

زیادہ پریشان و مضطر کر رکھا تھا ، بہر حال اسی کشمکش میں اجلاس کی معینہ تاریخ آگئی ۔

محمد علی کی جدوجہد | محمد علی مسٹر جناح کے پورے طور سے حامی تھے اور کمیشن کو وہ زیادہ سے زیادہ

ناکام بنانا چاہتے تھے ، چنانچہ مدراس کانگرس کا اجلاس نامکمل چھوڑ کر وہ کلکتہ روانہ ہوئے اور اگرچہ

حکیم اجمل خاں مرحوم کے انتقال کی خبر نے انھیں دیوانہ بنا رکھا تھا مگر پھر بھی وہ سیدھے کلکتہ روانہ ہوئے

دوسرے یا تیسرے روز ڈاکٹر انصاری اور مولانا ابوالکلام آزاد بھی "کمک" کے لئے پہنچ گئے ۔

محمد علی نے اجلاس میں پہنچتے ہی اپنے اثرات سے کامیابی حاصل کرنا شروع کی ، انھوں نے

سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کی تجویز منظور کرائی اور پھر "تجاویز دہلی" کے سلسلہ میں وہ چیز جس سے مسلمان

بہت بھڑک رہے تھے اور جس سے ابھی مسٹر جناح بھی مانوس نہیں ہوئے تھے یعنی (بشرائط) مخلوط

انتخاب کی حمایت ۔

مسٹر جناح کی مخالفت | مسٹر جناح نے محمد علی کو بہت سمجھایا کہ وہ اس "نازک" موقعہ پر ایسی تجویز

نہ پیش کریں جس سے اختلاف کا اندیشہ ہو اس لئے کہ اس انتشار سے وہ حد درجہ پریشان تھے ، مگر

محمد علی نے انھیں بہت ڈھارس دی اور بتلایا کہ جو تجویز مسلمانوں کی فلاح و بہبود سے تعلق رکھتی ہو

اور جسے ہم نے مسلمانوں اور ہندوؤں کے خاص خاص طبقات میں اتنی جدوجہد کے بعد منظور کرایا

ہے، اب مسلمانوں کے ایک جلسۂ عام میں کیوں نہ پیش کریں؟ اگر کوئی مخالفت کرے گا تو دیکھا جائے گا، اچھا ہے مخالفت کرے تو سمجھ کر رائے دے گا۔

کامیابی آخر محمد علی نے مسٹر جناح کو بھی بہت زیادہ تذبذب اور تامل کے بعد راضی ہی کر لیا اور لیگ کے کھلے اجلاس میں اپنی تجویز بھی پیش کی، اپنے خیالات بھی نہایت بسط و تفصیل سے ظاہر کئے اور اس فضا میں جس میں ناکامی کے اندیشہ سے دوسروں کے اوسان خطا ہوئے جاتے تھے محمد علی نے نہایت کامیابی سے اپنے خیالات کی پذیرائی کرائی اور وہاں سے کامیاب و کامران یلغار کرتے ہوئے اپنے دار السلطنت دہلی میں داخل ہوئے اور یہاں پہنچ کر پھر تبلیغ و اشاعت میں منہمک ہو گئے اور اس وقت تک چین نہیں لیا جب تک اس مقصد میں پورے طور سے کامیابی نہیں حاصل ہو گئی

سر شفیع کو چیلنج اگرچہ پنجاب میں اتنے زعما ہیں جتنے ہندوستان بھر میں مجموعی حیثیت سے ملیں گے اور ان بزرگوں میں سے ہر محترم شخصیت کا یہ خیال ہے کہ پنجاب میں اس کا طوطی بول رہا ہے اور اس گروہ عوام سے وہ جو چاہے کرا سکتا ہے، عوام ان کے اشارہ کے منتظر ہیں، اُدھر گوشۂ چشم التفات نے کچھ اشارہ کیا ادھر ان کی ”پبلک“ نے فرش راہ ہو ہو کر ان کا استقبال شروع کیا اور ان کے ارشادات عالیہ کی تعمیل۔

لیکن اس ادعا کی جب تحلیل کیجئے تو حقیقت دوسری نظر آئے گی۔

ہمیشہ یہ دیکھا گیا ہے کہ ان زعما کے مساعی جمیلہ کے باوجود سارے مسلم پریس کا ان کے قبضہ اقتدار میں ہونیکے باوجود اور ان کے مسلمہ اعتراف قیادت کے باوجود، کامیابی پنجاب میں ہمیشہ فریق مخالف ہی کے حصہ میں آئی! حیرت جس قدر بھی ہو واقعہ یہی ہے!

سائمن کمیشن کا تقریباً سارے ہندوستان نے نہایت جوش و خروش کے ساتھ بائیکاٹ

کیا لیکن پنجاب کی آغوش تمنا اس کے لئے کھلی ہوئی تھی، وہاں کے "وفاداروں" نے بغیر سیاہ جھنڈیوں کے، بغیر کسی مظاہرے کے جو چاہا کیا، اخبارات کے صفحات ان "ٹوڈیوں" کی ہجو سے لبریز تھے لیکن وہ اپنی کوٹھیوں میں سائمن صاحب اور انکے رفقا کو عین رمضان کے مہینہ میں دن کے وقت "ڈنر" دے رہے تھے۔

سر شفیع کی مسلم لیگ سے سارے پنجاب کے مسلمانوں کو اختلاف تھا اور اسی خیال سے ان زعماء میں سے کلکتہ کے اجلاس میں کوئی نہیں شریک ہوا کہ لاہور کی خدمت مقدم ہے، یہاں رہ کر وہ سر شفیع کی لیگ کو ناکام بنانیکی پوری کوشش کریں گے اور ان کو ان مقاصد مشئومہ میں ہرگز کامیاب نہ ہونے دیں گے، سارا ہندوستان منتظر تھا کہ دیکھئے یہ حضرات وہاں کیا کرتے ہیں، مگر اخبار میں صرف یہ آیا کہ سر شفیع نے نہایت اطمینان سے لاہور میں اجلاس کیا، خود صدارت کی اور جو چاہا پاس کرایا، جس میں سائمن کمیشن سے تعاون بھی تھا، اور کوئی بھی اس "کامیاب" اجلاس کو "ناکام" نہ کر سکا۔ یہ ضرور ہوا کہ بعض حضرات نے کچھ بولنا چاہا مگر بعد کو صدر کا "استبداد" اور اپنی "اقلیت" دیکھ کر وہ "واک آوٹ" یعنی اعلان شکست کر کے چلے آئے۔

اسی طرح ابن سعود کا سارا پنجاب حامی بتایا جاتا تھا لیکن جو گروہ اپنی "صوفیت" اور "حنفیت" کا بلند بانگ مدعی تھا اس نے حامیان ابن سعود پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا اور یہ کچھ نہ کر سکے، حالانکہ سب ان کے "ہم خیال" تھے۔

ان تمام مواقع پر ہمیشہ محمد علی سے استمداد کی گئی اور ٹیلیفون پر ایک خاص حلقہ کی جانب سے بار بار "عم محترم" کو بلایا گیا۔

پھر طلبی | چنانچہ سائمن کمیشن کے زمانہ میں جب پھر پنجاب میں سر شفیع اور انکے "ہم خیال حضرات"

دوسرے لیڈروں اور ان کے "ہمجیاں" حضرات پر غالب آئے اور اپنی من مانی کارروائی کرنے لگے۔

تو محمد علی کو پھر طلب کیا گیا اور پھر ان کی رہنمائی سے فائدہ اٹھانے کی تمنا کا اظہار کیا گیا۔ محمد علی نے یہ دعوت قبول کی اور سر شفیع کو چیلنج دیا کہ جس طرح چاہو تم سائمن کمیشن کے تعاون کی کوششیں کر کے دیکھ لو، میں بھی لاہور آتا ہوں، میں بھی تقریر کروں گا، اپنے خیالات و معتقدات پبلک کے سامنے پیش کروں گا آپ بھی ایسا ہی کیجئے گا اور پھر فیصلہ پبلک پر چھوڑ دیجئے گا، غرض انھوں نے پنجاب کے اکثر مقامات کا دورہ کیا اور ہر جگہ کامیابی حاصل کی اور پھر وہاں جو کچھ ہوا وہ سب کو معلوم ہے۔

لکھنؤ میں جلسہ مہاراجہ صاحب محمود آباد نے لکھنؤ میں بھی محمد علی کو دعوت دی تھی کہ وہ تشریف لائیں اور وہاں سائمن کمیشن کی مخالفت میں اپنے خیالات کا اظہار کریں۔

چنانچہ محمد علی گئے، گو وہاں کے مسلمان اس زمانہ میں امین آباد کے قضیۂ میلاد کے سبب ہندوؤں سے سخت بیزار تھے اور وہاں کا مقامی حلقہ جس کا خاصہ اثر تھا مسلمانوں کو بہت متاثر کر چکا تھا، مگر محمد علی گئے اور انھوں نے "اَمر بالمعروف" کا فرض وہاں بھی ادا کیا۔

مخالفت مسلمان چونکہ زخم خوردہ تھے اور وہاں کے ہندوؤں سے سخت شاکی اس لئے محمد علی سے مطالبہ کیا گیا کہ ہم اس وقت آپ کا ساتھ اس معاملہ میں دیں گے جب آپ یہ قضیہ ہمارے موافق فیصل کرا دیجئے۔

جلسہ میں جواہر لال نہرو، مولٰنا ابو الکلام آزاد، مولٰنا حسرت موہانی، سبھی تھے، جلسہ کو درہم برہم کرنے کی بعض مسلمانوں کی طرف سے پوری کوششیں کی گئیں، لیکن الحمد للہ کہ مخالفین کو کامیابی نہیں ہوئی اور محمد علی نے اس خوبی سے یہ مسئلہ سمجھایا کہ مقامی لوگوں کی حماقت کو پوری

قوم اور ملک کے معاملہ میں حائل نہیں کرنا چاہئے! پھر سارا مجمع محمد علی کے ساتھ تھا اور اس کے بعد دوسرے روز پھر انھوں نے امین آباد پارک میں ایک زبردست تقریر کی، وہ تقریر محمد علی کی تاریخی تقریروں میں شمار کیجاتی ہے، اس میں انھوں نے ہندو مسلم تعلقات پر اظہار خیال کیا تھا اور دونوں کو ان کے فرائض یاد دلائے تھے اور بتایا تھا کہ کیا کرنا چاہئے اور کیا کر رہے ہو؟

پھر دوسرا جلسہ دوسرے روز منعقد ہوا یہ لکھنؤ کے سکھوں نے سردار منگل سنگھ اور سردار کھڑک سنگھ کے اعزاز میں کیا تھا، محمد علی بھی اس میں مدعو تھے اور یہاں بھی انھوں نے ایک معرکۃ الآرا تقریر فرمائی!

مضامین | مسلسل تقریروں کے علاوہ اس مسئلہ پر انھوں نے مضامین کا بھی ایک مستقل سلسلہ شروع کر دیا تھا اور اس مسئلہ پر اتنی وضاحت کے ساتھ اظہار خیال کیا تھا کہ بڑے بڑے مخالفین بھی داد دئے بغیر نہ رہ سکے۔

ایک مضمون | چنانچہ ایک موقعہ پر وہ سائمن کمیشن پر اظہار خیالات کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"حقیقتہً برطانوی پارلیمنٹ کو نہ از روئے اخلاق ہماری قسمت کے خلاف فیصلہ کرنیکا حق ہونا چاہئے، نہ وہ صحیح فیصلہ کرنے کے قابل ہے، یہ جماعت ہندوستان کے متعلق محض جاہلوں کی ایک جماعت ہے، ان تقریباً سات سو (ممبران پارلیمنٹ) برطانویوں میں سے ستر بھی مشکل سے ایسے نکلیں گے جو ہندوستان کے متعلق کچھ بھی جانتے ہوں گے"

نتیجہ | محمد علی کی مسلسل اور قابل رشک اور غیر فانی جدوجہد کا نتیجہ یہ ہوا کہ پہلی بار جب سائمن کمیشن کے قدم ہندوستان میں آئے تو ہندو مسلمان دونوں نے نہایت ہم آہنگی سے بائیکاٹ کیا تھا جس کی یاد غالباً آج تک سائمن صاحب اور ان کے حامیوں کے دل سے محو نہ ہوئی ہوگی، حالانکہ مسلمانوں کے جذبات اس وقت ہندوؤں کے سخت خلاف تھے اور وہ ایسی تجویز

سننا بھی پسند نہیں کرتے تھے جس سے ہندوؤں سے اشتراک عمل کا ذرا بھی پہلو نکلتا ہو۔ مگر وہ محمد علی کی ساحرانہ شخصیت تھی جس نے ہنسا ہنسا کر، رُلا رُلا کر لوگوں کو ہموار کیا اور بتایا کہ یہ اختلافات کس قدر نقصان رساں ثابت ہوں گے، یہ وقت ایثار کا ہے، اس وقت اگر ہم نے اپنے اتفاق واتحاد سے سائمن کمیشن کا بائیکاٹ کر دیا تو ہمیشہ ہمیشہ ہندوستان کی تاریخ میں ہمارا نام زرین حروف سے لکھا جائے گا۔

اور پھر دوسری دفعہ جب سائمن کمیشن آیا تو ہندوستان میں نہرو رپورٹ تیار ہو چکی تھی ہندو مسلمانوں میں پھر اختلافات شروع ہو گئے تھے اور جو دل محمد علی نے جوڑے تھے وہ پھر برادران وطن کی مسلم آزار روش سے ٹوٹنے لگے تھے جو تعلقات استوار ہو گئے تھے وہ پھر شکست ہونے لگے، نتیجہ یہ ہوا کہ دوبارہ آمد کے موقعہ پر سائمن کمیشن کا بائیکاٹ اس شان کے ساتھ نہیں ہوا۔ جس کے خود سائمن صاحب متوقع تھے!

باب ۴۰

سفر یورپ

ملکی و ملّی مشاغل نے محمد علی کی صحت پر بہت بُرا اثر ڈالا تھا، رفتہ رفتہ انکی صحت اُنہیں جواب دینے لگی، ڈاکٹروں کے پیہم مشوروں اور ہدایتوں کے بعد بھی وہ اپنے آپ کو نہ آرام دے سکتے تھے، اور نہ مشاغل ملکی و ملّی سے بے فکر ہو کر بیٹھ سکتے تھے،

کئی بار انھوں نے بھی نہایت خلوص کے ساتھ یہ چاہا کہ کچھ عرصہ کے لئے قوم سے "رخصت" لے لیں، اور ذرا یکسوئی کے ساتھ اپنے کچھ دن آرام سے گزاریں تاکہ تازہ دم ہو کر، ملک و قوم کی خدمت اور زیادہ ہمت و طاقت سے کر سکیں، لیکن یہ موقعہ انھیں کبھی نہیں حاصل ہوا، جب فراغ طبع اور سکون خاطر حاصل کرنے کے لئے انھوں نے گوشۂ تنہائی اختیار کرنا چاہا، کوئی نہ کوئی ایسا حادثۂ ملّی واقع ہو گیا کہ انکا سارا سکون درہم برہم ہو گیا،

کچھ ان اسباب سے اور کچھ اسلئے کہ ہندوستان میں اتنے مسلسل علاج کے باوجود ذیابطیس میں کوئی نمایاں فرق نہیں ہوا تھا، بلکہ وہ بڑھتا ہی جاتا تھا، اور یہ صورت حد درجہ تشویشناک تھی انھیں اپنی صحت کا احساس ہوا،

اب ایک صورت تھی کہ بغرض علاج و تبادلۂ آب و ہوا وہ یورپ جائیں، لیکن اسکے لئے ضروری تھا کہ جیب میں دام ہوں، ناداری اور افلاس کا یہ عالم تھا کہ دھلی میں قیام مشکل تھا نہ کہ یورپ کے مرغزاروں کی سیر و تفریح، یہ تو قطعاً ناممکن تھا،

"مردے از غیب" | محمد علی انہی ناخوشگوار حالات میں گھرے ہوئے تھے، اور صبر و

خاموشی سے اپنے یہ دن،

شاد باید زیستن ناشاد باید زیستن

کھگر گزار رہے تھے کہ مسبب الاسباب نے ایک دوسری صورت پیدا کر دی، یعنی مہاراجہ صاحب الور نے خود ہی بغیر کسی تحریک کے، بغیر کسی سابقہ شناسائی کے، بغیر کسی خاص واقفیت کے محمد علی سے ایک ڈنر کے موقعہ پر عقیدت مندانہ طور سے نیاز حاصل کیا، اور چند روز کے بعد وہ محمد علی کی سحر کار شخصیت سے اتنے متاثر ہوئے کہ محمد علی ہی محمد علی انکی نظروں میں رہ گئے،

مہاراجہ نے محمد علی کی صحت کا یہ زوال وانحطاط دیکھا تو بہت پریشان ہوئے، اور فوراً محمد علی کو مشورہ دیا کہ وہ تبادلۂ آب وہوا اور علاج معالجہ کے لئے یورپ چلے جائیں، اور چونکہ انکی تنگدستی سے واقف تھے اسلئے تمام مصارف سفر وقیام اپنے ذمہ لئے،

عزم روانگی اس اصرار اور مخلصانہ اصرار کے بعد بھی محمد علی نے ابتدائً انکار کیا اور محترم مدیر سچ کے بیان کے مطابق انھوں نے ڈاکٹر انصاری اور مولانا شوکت علی سے پہلے مشورہ کیا، جب ان دونوں بزرگوں نے بھی اصرار کیا، تو محمد علی راضی ہو گئے اور ضروری انتظامات کر کے یکم جون ۲۸ء کو رخت سفر باندھ چل کھڑے ہوئے۔

روانگی سے پیشتر، وہ اجمیر شریف کے آستانہ پر حاضر ہوئے، پھر احمد آباد گاندھی جی سے ملنے گئے، پھر آبو پہاڑ پر، مہاراجہ صاحب الور سے کچھ ضروری باتیں طے کرنے کیلئے روانہ ہوئے، وہاں سے بمبئی آئے، وہاں دو ایک روز رہ کر، عازم یورپ ہوئے،

پیرس پہلے وہ پیرس پہونچے، وہاں ضروری معلومات ڈاکٹروں اور طریقۂ علاج کے متعلق حاصل کئے، اور چونکہ ابھی تک علاج شروع نہیں کیا تھا، اسلئے خوب جی کھول کر بدپرہیزی بھی کی،

آخر ایک ڈاکٹر پر رائے جمی، بعض دوستوں کے مشورہ کے مطابق اس ڈاکٹر سے انھوں نے رجوع کیا، پہلے خیال تھا کہ علاج میں فاقے بہت زیادہ کرائے جائینگے اور اُسکے علاوہ دوسری مشقتیں اور ریاضتیں بھی کرائی جائیں گی، مگر ایسا نہیں ہوا، اندازہ سے فاقے کم کرائے گئے، لیکن غذا میں یہ تغیر کیا گیا کہ پکی ہوئی غذا کی ممانعت کر دی گئی، اور کچی غذا کی ہدایت کی گئی،

بستر علالت | یہاں کچھ روز واقعی محمد علی نے نہایت استقلال سے اپنی فطرت اور طبیعت کے خلاف بستر علالت پر گزارے، چند روز کے بعد انکی طبیعت سخت خراب ہوگئی تھی، ایک دنبالہ بھی نکل آیا تھا، ذیابطیس میں ذرا سے پھوڑے یا پھنسی کا نکل آنا بھی پیام ہلاکت ہوتا ہے، اسلئے کہ زخم پھر بھرتا نہیں ہے اور رفتہ رفتہ وہ زخم سارے بدن پر چھا جاتا ہے، اور تھوڑے ہی عرصہ میں مرض اور مریض دونوں کا خاتمہ ہوجاتا ہے لیکن محمد علی کو خدا نے بچا لیا اور وہ صحتیاب ہوگئے،

مایوسی | لیکن اپنی اس علالت سے وہ بہت مایوس ہوگئے تھے، اسلئے اور کہ ان کی طبیعت نے مطابقت بھی پیدا کرلی تھی، یعنی اس عمر، اسی مرض اور اسی حالت میں اُنکے چچازاد بھائی اور خسر عظمت علیخاں صاحب کا انتقال ہوا تھا، اسلئے محمد علی سمجھے کہ میرا بھی اب وقت آخری ہے، چنانچہ انھوں نے بیگم صاحبہ، اور مولانا شوکت علی کو بلایا بھی کہ اگر وہ لوگ وہاں پہونچ جائیں تو آخری وقت دیدار تو ہوجائے گا، لیکن اپنی طلبی کے اسباب میں اپنی اتنی سخت اور نازک علالت کا ذکر نہیں کیا کہ مبادا یہ لوگ بہت زیادہ پریشان ہوجائیں اور انکی پریشانی محمد علی نہیں دیکھ سکتے تھے،

نماز جنازہ کا طریقہ | وہ اپنی زیست سے اتنے مایوس ہوچکے تھے کہ مظفر صاحب اور

دوسرے ہندوستانی عزیزوں کو جو وہاں پہونچ گئے تھے، انھوں نے نماز جنازہ بھی سکھلادی، کہ اس کفرستان میں کون ہے جو ایک مومن کی نماز جنازہ اسکے مذہب کے اصول کے مطابق اداکریگا، ان نوجوانوں کو نماز ہی مشکل سے آتی ہوگی نہ کہ نماز جنازہ، اس کا تو بہت کم اتفاق پڑتا ہے اسلئے یہ اکثر لوگوں کو نہیں آتی ہے،

بہرحال انھوں نے ان لوگوں کو نماز جنازہ پڑھنے کا طریقہ، غسل میت دینے کا طریقہ ادعیۂ ماثورہ، دفن کرنے کا طریقہ، مٹی دینے کا طریقہ سب کچھ بتا دیا، اور اطمینان سے مرنے کے لئے تیار ہوگئے،

صحت | لیکن خدا کو ابھی یہ منظور نہ تھا اسلئے کچھ عرصہ کے بعد وہ صحتیاب ہونے لگے انکی شکایتیں بڑی حد تک رفع ہوگئیں، صرف چند شکایتیں باقی رہ گئی تھیں، اگر چند روز اور جم کے علاج کیا جاتا، تو یقیناً ان میں بھی غیر معمولی فائدہ محسوس ہوتا،

مگر جس شخص نے درد قوم کے لئے اپنی صحت، اپنی عمر، اپنا وقت سب کچھ وقف کر رکھا ہو، وہ خود کیسے چین سے بستر (علالت ہی سہی) پر آرام کرسکتا ہے، اسکو تو ہر وقت قوم کی فکر اسکا غم، اور اس کی تباہی و بربادی پر کڑھتے گزرتی ہے یہ سچ ہے کہ وہ اپنے تئیں بالکل فراموش کردیتا ہے، یہی محمد علی نے کیا۔،

ہندوستان میں تلاطم | مولانا کے اسی سفر یورپ کے دوران میں ہندوستان میں نہرو رپورٹ شائع ہوچکی تھی اور جانبین میں سخت پیکار شروع ہوگئی تھی، محمد علی کو وہاں بستر علالت پر لیٹے لیٹے سب خبریں مل رہی تھیں بعد کو مسٹر شعیب قریشی بھی وہاں "ضروری کاغذات"، لیکر پہنچ گئے، اور ہندوستان اور مسلمانوں کی حالت زار کا نقشہ انکے سامنے کھینچکر انسے مداوا طلب کیا، انکے پاس بجز اسکے اور مداوا کیا ہوسکتا تھا کہ وہ اپنی صحت

کی فکر نہ کریں، ڈاکٹروں کے مشورہ کے علی الرغم اٹھیں اور ہندوستان پہنچ جائیں اور اپنی اسی جدوجہد کا آغاز کردیں جسپر تسخر کرنا آسان ہے، عمل کرنا مشکل،

انگلستان اپنے زمانۂ علالت میں بھی وہ دو ایک بار انگلستان گئے، ایک بار مسٹر سکلات والہ نے وہاں جلسہ کے انتظامات کئے اسمیں محمد علی نے اپنی نقاہت اور علالت کے باوجود سائمن کمیشن پر ایک زبردست تقریر کی، اور وہاں اسکی مخالفت میں جو لیگ قائم ہو رہی تھی، اسمیں اپنے افلاس کے باوجود چندہ دیا اور ہر طرح سے امداد و اعانت پر آمادگی ظاہر کی،

روانگی بالآخر محمد علی نے ابھی پورے طور سے صحت نہ حاصل کی تھی کہ وطن کی زار و نزار حالت نے انھیں اپنی طرف کھینچ لیا، اور وہ بہ عزم ہندوستان روانہ ہوگئے

ممالک اسلامی راستہ وہ اختیار کیا جس سے ممالک اسلامی پر بھی ایک نظرِ خوش گزرے "پڑ سکے، چنانچہ واپسی میں، قسطنطنیہ، بیت المقدس، بغداد، عراق، اور دوسرے قابل ذکر مقامات کی زیارت کرتے ہوئے، وہ کراچی پہنچ گئے!

باب ۱۸

نہرو رپورٹ

آل پارٹیز کے بعد! | آل پارٹیز کے سلسلہ میں یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ کس طرح مسلسل اور پیہم اسکے اجلاس طلب کئے گئے، اور کس طرح برادران وطن کی ہٹ اور ضد سے وہ برابر ملتوی ہوتے رہے، اور کام بگڑتا رہا،

دھلی میں جب آل پارٹیز کانفرنس ملتوی ہوئی تھی تو طے پایا تھا کہ مئی کے آخری عشرہ میں بمبئی میں ایک بار پھر اسے مدعو کیا جائے، چنانچہ جناب صدر کی طرف سے تمام انجمنوں کے نمایندوں کو شرکت دعوت اور وقت ومقام کی اطلاع دیدی گئی،

بمبئی میں جلسہ | چنانچہ وقت مقررہ پر جلسہ منعقد کیا گیا، لیکن ہندوستان کی کسی انجمن نے نے اسمیں اپنا نمایندہ نہیں بھیجا، اور نہ اسکی کارروائی جاری رکھنے پر آمادگی ظاہر کی،

مسلمانوں میں، مسلم لیگ، مسلم فیڈریشن، اور دوسری جماعتوں نے قطعاً اپنے نمایندے بھیجنے سے انکار کر دیا، ان جماعتوں کے ممبروں نے شخصی طور سے شرکت کرنے پر بھی آمادگی نہیں ظاہر کی،

اسی طرح ہندوؤں میں ہندو مہا سبھا، اور دوسری انجمنوں نے قطعاً انکار کر دیا کہ وہ اس میں کوئی عملی حصہ لینے سے قاصر ہیں، شخصی طور پر بھی مالوی جی، لاجپت رائے، ڈاکٹر مونجے، مسٹر جیکر، کسی نے بھی نہ شرکت کی، نہ شرکت پر آمادگی ظاہر کی،

کانگرس کا وہ طبقہ جو حقیقۃً مہا سبھائی ظاہر ہو چکا تھا، اور مسٹر جے رام داس دولت رام

کی سرکردگی میں اپنے اختلاف کا اظہار برابر ایوان کانگرس میں کیا کرتا تھا، وہ بھی نہ شریک ہوا، کل شرکا کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی تھی،

قابل ذکر لوگوں میں، گاندھی جی، پنڈت موتی لال نہرو، ڈاکٹر انصاری، مولٰسنا شوکت علی، اور مسز اینی بسنٹ! یہ تھی " آل پارٹیز کانفرنس "، جسکا " اجلاس " ہورہا تھا،

گاندھی جی کی تجویز | یہ صورت دیکھ کر گاندھی جی نے پھر تجویز " التوا " پیش کی، کہ چونکہ حاضرین اور شرکاء اور مندوبین کی تعداد اتنی کم ہے، لہذا اسے پھر ملتوی کردیا جائے، بعض لوگوں نے بددل ہوکر برخاست کردینے کی رائے پیش کی مگر اسے اسلئے نہیں مانا گیا کہ اس سے ملک میں مایوسی پیدا ہوجائیگی، گاندھی جی نے کہا کہ آل پارٹیز کانفرنس تو ملتوی کردیجائے، اور ایک کمیٹی بنادی جائے جو لارڈ برکن ہیڈ کے چیلنج کا جواب تیار کرے یعنی ایک دستور اساسی وضع کرے جسپر سارے طبقہ متحد و متفق ہوسکیں، اور جب وہ اپنی رپورٹ تیار کرلے تو پھر آل پارٹیز کانفرنس کا ملتوی شدہ اجلاس طلب کیا جائے،

شوکت کی تائید | شوکت صاحب موجود تھے، انھوں نے نہایت گرم جوشی کے ساتھ اس تجویز کی تائید کی، اور امید ظاہر کی کہ یہ کمیٹی ہماری تمام مشکلات کو رفع کردیگی۔، ہم برکن ہیڈ کے چیلنج کا جواب بھی تیار کرلینگے، اور ہمارے پاس خود ہمارا وضع کردہ دستور اساسی بھی موجود ہوگا جس میں ہم سب کے حقوق و مراعات کا تعین ہوگا، اور یہ حقوق حقوق کے جو نعرے لگ رہے ہیں، وہ ختم ہوجائیں گے اسلئے کہ جب سب کو مناسب اور معقول حقوق وہ دستور اساسی دے دیگا، تو پھر اختلاف کے باقی رہنے کا امکان ہی نہیں ہے، اور اسطرح ہم پھر اپنے کام میں لگ سکیں گے،

تشکیل | چنانچہ ایک کمیٹی بنادی گئی، جسکے صدر پنڈت موتی لال نہرو، اور ارکان

میں مسٹر شعیب قریشی، مسٹر اینے، مسٹر جیکر، سوباش چندر بوس، سردار منگل سنگھ شامل تھے، کمیٹی کو اختیار دیا گیا تھا کہ وہ حسب ضرورت اپنے ارکان کی تعداد میں اضافہ کر سکتی ہے۔

کمیٹی کے جلسے "انند بھون" میں منعقد ہوتے رہے اور ارکان کے اضافہ کی جو اسے رعایت دی گئی تھی، اس نے اس سے پورا فائدہ اٹھایا، اور حسب ضرورت نہیں تو حسب مقصد کمیٹی کے ممبروں میں اضافہ ہوا اور بالآخر ایک "رپورٹ" تیار ہو گئی جس نے برکن ہیڈ کے چیلنج کا قابل یادگار جواب دیا!

آل پارٹیز کانفرنس لکھنو جب رپورٹ تیار ہو گئی تو جناب صدر کی خدمت میں پیش ہوئی اور جناب صدر نے لکھنؤ میں غالباً ۲۸-۲۹-۳۰ اگست ۱۹۲۸ء کو اجلاس طلب فرمایا۔

رپورٹ کا خلاصہ اخبارات میں اس سے پیشتر شائع ہو چکا تھا، اور مشاہیر ملک نے اس پر اظہار رائے کا سلسلہ شروع کر دیا تھا، جب اجلاس شروع ہوا تو خلاف توقع ہندوستان کی اکثر انجمنوں کے مندوبین موجود تھے! جن میں ہندو مہاسبھا کے اقانیم ثلاثہ لالہ لاجپت رائے، پنڈت مدن موہن مالوی اور ڈاکٹر مونجے بھی تھے۔

کانفرنس کا اجلاس کانفرنس کا اجلاس ڈاکٹر انصاری صدر کانگرس کی صدارت میں شروع ہوا، قیصر باغ کی بارہ دری کھچا کھچ بھری ہوئی تھی، تل رکھنے کو مشکل سے جگہ مل رہی تھی، پہلے اجلاس میں تو واضعین دستور کی محنت و کوشش، تلاش و جستجو کا بروقت شکریہ ادا کیا گیا تھا جن میں مولانا شوکت علی بھی شامل تھے، سوائے مولانا حسرت موہانی کے کسی نے مخالفت نہیں کی، سو حسرت غریب کی مخالفت ہنسی مذاق میں اڑا دی گئی، اس

کے بعد کانفرنس میں نہرو رپورٹ منظوری کی غرض سے پیش ہوئی۔

یہ وقت وہ تھا کہ ہر کارگزار اور کارکن جماعت کو یا مندوب کو موقعہ ہونا چاہئے تھا اور نہایت فراخدلی سے سہولت بہم پہنچانی چاہئے تھی کہ اگر اختلاف کا اظہار ہو، تو اسے اگر جواب کے ذریعہ دفع کیا جا سکتا ہو تو ایسا کیا جائے اور اگر ترمیم و اصلاح کے ذریعہ سے ممکن ہو تو ایسا کیا جائے!

رپورٹ میں کیا تھا رپورٹ پر نکتہ چینی اور دوسرے حالات پر گفتگو ہمارے دائرہ بحث سے خارج ہے، محمد علی کے کارناموں کے سلسلہ میں اتنی تفصیل ناگزیر تھی، مخالفین کا خیال تھا کہ رپورٹ میں سب کچھ تھا! مگر کلکتہ بمبئی میں جو فیصلے کانگرس نے کئے تھے وہ نہیں تھے، مسلمانوں نے چودہ نکات جو پیش کئے تھے ان میں سے اکثر رد کر دئے گئے تھے، خلافت کانفرنس اور مسلمانوں کے متفقہ و متحدہ مطالبات نامنظور ہو گئے تھے سندھ کی آزادی مشروط کر دی گئی تھی، مسلمانوں کی نشستیں محفوظ نہیں رکھی گئی تھیں، بقول سوامی شنکر آچاریہ کے صوبوں کو وہ آزادی بھی نہیں دی گئی تھی جو اب حاصل ہے اور مرکز کو تمام اختیارات عطا فرما دئے گئے تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ "آزادی کامل" کے بجائے "ڈومینین اسٹیٹس" کا مطالبہ "درمیانی راستہ کے طور پر" منظور کیا گیا تھا۔

یہ چیزیں جو اب منظور کی گئی تھیں اور مسلمانوں کی متعدد جماعتوں کے علی الزعم منظور کی گئی تھیں خواہ کتنی ہی مبارک و مستحسن ہوں مگر یہ واقعہ ہے کہ کانگرس اور مسلمانوں کے گزشتہ فیصلوں کے قطعاً مخالف تھیں! اس لئے دیانتہً محمد علی اور ان کے رفقا کو پورا حق پہنچتا تھا کہ وہ اس کی مخالفت کریں اور انہیں مجبور نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ اس محضر پر دستخط

کریں جسے وہ اپنی قوم کے لئے "محضر قتل" سمجھ رہے تھے۔

علی برادران کا اختلاف | چنانچہ آل پارٹیز کانفرنس میں شوکت صاحب نے خلافت اور کانگرس کے گزشتہ فیصلوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ان تجاویز سے اختلاف شدید ظاہر کیا اور اُن کے ماننے سے انکار کر دیا۔

دباؤ | راقم الحروف کا یہ چشم دید واقعہ ہے کہ جس وقت شوکت صاحب نے مخالفت کا ارادہ کیا، اُس وقت مسٹر سین گپتا، اور سوباش چندر بوس نے انتہائی لجاجت اور سماجت سے شوکت صاحب کو اس سے باز رکھنا چاہا، لیکن انھوں نے صاف انکار کر دیا کہ میں مسلمانوں کو قتل ہوتا ہوا نہیں دیکھ سکتا ہوں، چنانچہ شوکت صاحب اسٹیج پر تشریف لائے، اور انھوں نے ان تجاویز کے ماننے سے حسب فیصلہ جات ماسبق انکار کر دیا۔

پھر محمد علی جب یورپ سے اپنے علاج کو نامکمل چھوڑ کر ہندوستان واپس آئے تو انھوں نے بھی پوری شدت کے ساتھ نہرو رپورٹ اور اس کی سفارشات سے اختلاف کیا، اور اس طرح ایک بار پھر ہندوستان معرکۂ کارزار بن گیا، اور صلح وسلام کے خوش آئند خواب اپنی تعبیر بد کے ساتھ رونما ہوئے۔

طوفان افتراق | آل پارٹیز کانفرنس کے برخاست ہو جانے کے بعد پھر ہندو مسلم زعماء میں سخت اختلاف رونما ہوا!

بلا استثنا، تمام ہندوؤں نے نہرو رپورٹ کی تائید کی، مہاسبھائیوں نے بھی اور کانگرس نے بھی، لالہ لاجپت رائے، پنڈت مالویہ، ڈاکٹر مونجے، سب ہی حمایت کے جوش میں سرگرم کار نظر آ رہے تھے، مگر مسلمانوں میں ماشاء اللہ نااتفاقی کا مرض

پھیلا ہوا تھا، ان میں فوراً اسی آل پارٹیز کے اندر دو ٹکڑے ہو گئے اور اختلافات کا بازار گرم ہو گیا، مزے لے لے کر ایک لیڈر دوسرے لیڈر کی ذات پر، نیت پر اور اخلاق و عادات پر حملے کر رہا تھا، اور اسے شعار اسلامی اور معیار تہذیب سمجھ رہا تھا، اکبر نے شاید اسی موقعہ کے لئے فرمایا تھا۔

آپس میں گالیاں ہیں غیروں میں تالیاں ہیں،

چنانچہ ہم میں گالیوں کا تبادلہ ہوتا رہا اور اغیار تالیاں بجا بجا کر ہمارے اس افتراق و اختلاف کا تماشہ دیکھتے رہے۔

صفائی | ان اختلافات کے بعد نہرو رپورٹ کے ہندو حامی تو تقریباً سب خاموش ہو گئے، مگر اکثر مسلمانوں کی مخالفت کے باوجود اس کے منظور ہو جانے سے مسلمانوں میں ایک زبردست اختلاف ہو گیا۔

ان مسلمانوں نے جو نہرو رپورٹ کے واضعین میں تھے، یا حامی تھے اپنی زبان و قلم کو اس کی حمایت کے لئے وقف کر دیا۔

نہرو رپورٹ کی حمایت میں ہمیشہ دلیل یہ پیش کیجاتی تھی کہ وہ کوئی صحیفہ آسمانی نہیں ہے جس میں تغیر و تبدل نہ ہو سکے وہ انسانوں کا بنایا ہوا ایک دستور اساسی ہے جو نقائص و معائب سے پاک نہیں ہو سکتا، اس میں یقیناً غلطیاں ہوں گی، آپ کا یہ فرض ہے کہ ہمیں بتائیں اور ہم سے ان غلطیوں کی تلافی کرائیں۔

اتحاد و اتفاق کی یہی صورت ہے کہ ایک دوسرے کی غلطیوں کو ظاہر کرے اور اصلاح چاہے۔

لیکن ...... | لیکن جب مخالف گروہ کہتا تھا کہ نہرو رپورٹ میں یہ نقائص و معائب

ہیں، ان ان دفعات کے باعث مسلمانوں کے حقوق کو نقصان پہنچا ہے، اور ان ان اصولوں کے ذریعہ ان کی اکثریت کو ہمیشہ کے لئے اقلیت میں تبدیل کرنے کی کوشش کی گئی ہو انھیں بدلوائے، تو رپورٹ کے حامی ان دعووں کو کسی طرح تسلیم نہیں کرتے تھے اور نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ رپورٹ میں ترمیم کی کوئی صورت نہ نکلتی تھی۔

نتائج بہرحال اس اختلاف کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان زعماء اور ہندو زعماء میں سخت اختلاف پیدا ہوگیا، اور مسلمانوں مسلمانوں میں بھی ایک جنگ شروع ہوگئی۔

نہرو رپورٹ کی حمایت پر کانگرس تھی، لبرل حضرات تھے، ہندو مہاسبھا تھی، مسلمانوں کی ایک جماعت تھی۔

مخالفین میں مسلمانوں کی اکثر انجمنیں تھیں اور سکھ بھی اپنے فرقے کی اغراض کی بنا پر شدت سے مخالفت کر رہے تھے۔

مقابلہ اب جو شدید جنگ چھڑی وہ ملک کے لئے عموماً، ہر فریق، ہر جماعت، اور مسلمانوں کے لئے خصوصاً نہایت مضر ثابت ہوئی، ہر لیڈر مسلمانوں کو اپنی طرف کھینچنا چاہتا تھا۔ جتنے جلسے، جتنی تقریریں، اور جتنے مضامین کا اس زمانے میں غلغلہ ہوا، کم کسی اور زمانے میں ایسا دیکھا گیا۔ اس معاملہ میں جو افسوسناک اختلافات پیدا ہو گئے تھے وہ آج تک نہیں مٹے۔

گاندھی جی کی حمایت اس وقت تک گاندھی جی خاموش تھے، حتیٰ کہ وہ لکھنؤ کی آل پارٹیز کانفرنس تک میں شریک نہیں ہوئے، اس لئے کہ وہ اپنی آواز کو بے اثر، اور اپنے آپ کو معذور سمجھ رہے تھے، یہی وجہ تھی جو دہلی کی پہلی یونٹی کانفرنس کے بعد پھر کسی "ملاپ کانفرنس" اور "آل پارٹیز کانفرنس" میں باوجود منت سماجت کے بھی

نہیں شریک ہوئے، لیکن نہرو رپورٹ کے منظور ہونے کے بعد انھوں نے اپنا ارادہ بدل دیا اور میدان عمل میں اس رپورٹ کے حامی کی حیثیت سے آگئے۔

ہندوؤں کا سکوت اس کا سب کو احساس تھا کہ مسلمان من حیث القوم نہرو رپورٹ کے ماننے کو تیار نہیں ہیں، اور مسلمانوں کا وہ طبقہ جس نے کانگریس میں شریک ہوکر اسے بہت قوت پہنچائی اور جس نے اس خلیج کو جو ہندو مسلمانوں میں غدر کے بعد سے چلی آرہی تھی، کم کیا، اور رفتہ رفتہ بالکل ختم کردیا، علٰحدہ ہوگیا ہے، اور اس کی علٰحدگی کانگریس کے مقاصد کے لئے بھی کسی طرح سودمند نہیں۔

باوجود اس احساس کے کوئی موثر تدبیر ایسی اختیار نہیں کی گئی کہ عام مسلمانوں کو جو بدظنی اور بے اعتمادی کانگرس کی طرف سے پیدا ہوگئی تھی وہ دور ہوجائے اور ہندو مہاسبھا نے تو قوم پرستی کی آڑ میں مسلمان لیڈروں کو بدنام کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا۔

محمد علی کا اختلاف ان حالات کو دیکھ کر، اگر محمد علی کی مخالفت میں کوئی کمی نہیں ہوئی تو کوئی تعجب کی بات ہے؟ اُس نے بارہا صلح و امن کی خاطر بے قصور مسلمانوں کو ڈانٹا، فسادات کے موقعہ پر خواہ ان کی خطا ہو یا نہ ہو مسلمانوں کو اُس نے ملامت کی نازک سے نازک مواقع پر، جب کانگرس کا اثر ہندو مہاسبھا اور تبلیغ نے زائل کردیا تھا، اور بڑے بڑے لیڈر گوشہ نشین ہوکر بیٹھ رہے تھے، اس وقت اُس نے کانگرس سے وفاداری کی، اپنوں کی گالیاں کھائیں لیکن کانگرس سے بگاڑ نہیں کیا، تو کیا اس شخص کے ساتھ اخلاقاً کم از کم اگر کچھ اور نہیں ہوسکتا تھا تو یہ بھی نہیں ہوسکتا تھا کہ محض دکھانے کے لئے، جھوٹ موٹ، پالیسی کے طور پر دو ایک ہندو اُس کے ساتھ ہو جاتے، تو اس

غریب کا دل تو نہ ٹوٹتا، لیکن ایسا کب ممکن تھا۔

واں وہ غرورِ عزّ و ناز یاں یہ حجابِ پاسِ وضع
راہ میں وہ ملے کہاں، بزم میں وہ بلائے کیوں؟

باب ۴۲

کلکتہ کانگرس

آل پارٹیز کانفرنس کے برخاست ہونے کے بعد نہرو رپورٹ قبول کرانے کی پوری کوششیں کی گئیں، پھر کانگرس کے سالانہ جلسہ کا وقت آیا، اور اس کے انتظامات شروع ہو گئے۔

کلکتہ کا انتخاب | کانگرس کے سالانہ جلسے کے لئے کلکتہ منتخب کیا گیا، اور صدارت کے لئے پنڈت موتی لال نہرو کا انتخاب ہوا، اور طے پایا کہ اس اجلاس میں آزادی یا بالفاظ دیگر "ڈومینین سٹیٹس" کا سنگ بنیاد رکھا جائے گا، اور اگر اس معاملہ میں گورنمنٹ کی طرف سے فراخ حوصلگی کا اظہار نہ ہوا، تو پھر ہم دوسری صورت پر غور کریں گے۔

خلافت کانفرنس | دسمبر ۱۹۲۸ء ہی میں خلافت کانفرنس کے انعقاد کے انتظامات بھی کئے گئے، اس کا مقام بھی کلکتہ قرار پایا، صدارت کے لئے مولٰنا محمد علی تمام صوبہ خلافت کمیٹیوں کے اتفاق سے منتخب ہوئے۔

مسلم لیگ | مسلم لیگ کا سالانہ جلسہ بھی انہیں تاریخوں میں کلکتہ ہی میں قرار پایا، اور سر مہاراجہ صاحب محمود آباد، مسٹر جناح کی پرخلوص مساعی کے سبب اسکے صدر قرار دئے گئے۔

غرض ہندوستان کی تمام قابل ذکر انجمنوں کے سالانہ اجلاس وہیں ہوئے، اور عجیب عجیب صورتیں بن بن کر بگڑیں، جن کی تفصیل آگے آتی ہے اور چونکہ حسن اتفاق سے ندوہ سے راقم الحروف بھی اس "قومی میلہ" کی سیر کو کلکتہ پہنچ گیا تھا، اس لئے اکثر

واقعات چشم دیدہ ہی ہونگے،

کنونشن | مسلمانوں کی پیہم چیخ پکار، اور مسلسل جدوجہد کا یہ نتیجہ نکلا کہ صدر کانگرس نے اعلان کیا کہ وہ اسی زمانہ میں ایک "نیشنل کنونشن" کا اجلاس بھی وہاں منعقد فرما ئینگے، تاکہ ایک بار پھر طے شدہ تجاویز پر غور کیا جاسکے اور نہرو رپورٹ پر ایک نظر ڈالی جاسکے اور اختلافات رفع کئے جاسکیں، کنونشن کے متعلق بڑی امیدیں تھیں کہ اس اجلاس میں یقیناً تمام شکایتوں کا ازالہ ہوجائے گا، اور اتفاق کی کوئی صورت نکل آئیگی،

محمد علی کی شرکت | محمد علی گو کانگرس میں نہیں شریک ہوئے، مگر کنونشن میں شریک ہوئے تھے،

کنونشن میں تمام انجمنوں کو نمائندہ منتخب کرکے بھیجنے کی اجازت دی گئی تھی، مگر خلافت کمیٹی اور جمعیتہ العلماء ہند نے متفقہ طور سے اپنا نمایندہ صرف محمد علی کو بنایا، اور وہ اسمیں شریک ہونے کے لئے تشریف لائے،

فضا | اسوقت کنونشن میں عجیب و غریب فضا تھی، محمد علی گو کانگرس کے بڑے مربیوں اور سرپرستوں میں تھے، اور ابھی صرف چند روز سے انھیں اختلاف ہوا تھا، مگر حضار مجلس کو یہ بھی ناپسند ہوا، آنکھیں بتا رہی تھیں کہ دل میں کیا ہے؟

مباحثہ کا آغاز | مباحثہ کا آغاز ہوا، اور غالباً سب سے پہلے "ڈومینین اسٹیٹس" کے اصول پر ہوا کہ آیا اسے قبول کیا جائے یا نہ کیا جائے؟ اجلاس میں ہر قسم کے لوگ تھے، آزاد خیال بھی، معتدل بھی، کانگرسی بھی، اور سوراجی بھی، ترک تعاون کے علمبردار بھی، اور حامی موالات بھی،

مسٹر سین گپتا کی تقریر | مسٹر سین گپتا اس اصول کے حامی تھے کہ "ڈومینین اسٹیٹس"

کو قبول کرلیا جائے، چنانچہ اسپر انھوں نے ایک تقریر بھی کی، کہ اگر اسے ایک "درمیانی منزل" تسلیم کرلیا جائے، تو کیا مضائقہ ہے اسکے بعد پھر ہماری منزل مقصود آزادی ہوگی اور ہم پھر اسی کی طرف بڑھینگے،

محمد علی کی مخالفت | محمد علی نے ایک تقریر کی، اس نظریہ کی مخالفت کی آزادی کامل کی حمایت کی، اور اسپر زور دیا کہ ابھی گزشتہ اجلاس کانگریس میں "آزادی کامل" کی جو تجویز پاس کیجا چکی ہے، اور جسے اپنا آخری نصب العین بنایا جا چکا ہے، اسے ہرگز نہ بدلا جائے اور کامل آزادی ہی کے لئے اپنی جد وجہد جاری رکھی جائے

تقریر کی رو میں کہیں اُنکے منھ سے یہ بھی نکل گیا کہ جو لوگ آزادی کامل کے مخالف اور درجۂ مستعمرات کے حامی ہیں، وہ ملک کے بہادر فرزند نہیں ہیں، بلکہ بزدل coward ہیں،

ہنگامہ | اس لفظ کا اُنکے مُنھ سے نکلنا تھا کہ ایک ہنگامہ برپا ہوگیا، لغو اور مہمل شور وغوغا کی اتنی افراط ہوئی کہ کان پڑی بات نہیں سُنائی دیتی تھی، اور برابر مطالبہ کیا جاتا تھا کہ "محمد علی بیٹھ جاؤ" "بیٹھ جاؤ" "ہم نہیں سُننا چاہتے"،

محمد علی کو اس قسم کے پست اختلافات سے ساری عمر سابقہ رہا تھا، وہ اس ہنگامہ سے متاثر کیوں ہوتے؟ انھوں نے اپنی تقریر جاری رکھی، اور ڈومینین سٹیٹس کی سخت مخالفت کی اور اسے ملک کے لئے مہلک قرار دیا،

انکی تقریر کے بعد دوسرے بزرگوں نے اسی موضوع پر تقریر کی، اور ان کے نظریہ کی مخالفت اور درجۂ مستعمرات کی حمایت کی،

مغرب کی نماز | مباحثہ ابھی اسی موضوع پر جاری ہی تھا کہ مغرب کی نماز کا وقت

آگیا، اور محمد علی مغرب کی نماز پڑھنے باہر چلے گئے،

تھوڑی دیر کے بعد وہ نماز پڑھکر واپس آرہے تھے، لیکن ابھی ڈائس پر نہیں پہنچے تھے، ہال کے اندر تھے کہ کسی نے انسے کہدیا کہ درجۂ مستعمرات تو پاس ہوگیا، اور اوس پر مباحثہ بھی ختم ہوگیا،

یہ سنتے ہی محمد علی نے انا اللہ پڑھا، اور اُلٹے پاؤں واپس لگ گئے، پھر انھوں نے اسکے بعد کنونشن میں شرکت نہیں کی، اگرچہ زور بہت ڈالا گیا،

خلافت کانفرنس | ہالیڈے پارک میں خلافت کانفرنس منعقد ہوئی، خلافت کمیٹی کے خلاف جو پروپیگنڈا کیا گیا تھا اسکا اقتضا تو یہ تھا کہ خلافت کمیٹی میں حاضرین کی تعداد بہت کم ہوتی، لیکن ایسا نہیں تھا،

پورا پنڈال حاضرین سے بھرا ہوا تھا، اور تمام ہندوستان سے مندوبین کی بڑی تعداد شریک اجلاس ہوئی تھی،

تحریک وتایئد کے بعد محمد علی نے اپنا زبانی خطبۂ صدارت شروع کیا، اسلئے کہ وہ اسی زمانہ میں ممالک اسلامیہ اور یورپ کے سفر سے واپس آئے تھے اور جب سے آئے برابر جلسے اور جلوس کی شرکت میں انکا وقت گزرتا رہا، اتنی مہلت انھیں کہاں مل سکتی تھی کہ وہ باقاعدہ اپنا خطبہ صدارت تیار کرتے،؟

خطبۂ صدارت | چنانچہ وہ تقریر کرنے کیلئے کھڑے ہوئے، اور اتنی مؤثر اور دلنشین تقریر فرمائی کہ سارا مجمع مسحور ہوگیا، بار بار اللہ اکبر، اللہ اکبر، کے دلنواز و روح افزا نعرے بلند ہوتے تھے،

اپنے خطبۂ صدارت میں انھوں نے پہلے تو اپنے عالم اسلامی کے تاثرات بیان

کئے، پھر اسکے بعد انھوں نے سیاسات وطنی پر ایک مفصل تنقید کی، اور نہرو رپورٹ پر ایک سیر حاصل تبصرہ کیا، اور اپنی علیحدگی، اور کانگرس سے عدم تعاون کے اسباب وعلل بتائے،

اسباب وعلل | اسباب وعلل وہی تھے، جو اس کتاب میں مختلف مواقع پر مختلف عنوانات کے ماتحت بتائے جاچکے ہیں

یعنی ہندو زعما کا تغافل، برادران وطن کی چیرہ دستیاں، اپنی کوششیں، خود مسلمانوں کے سواد اعظم سے اختلاف، مسلمان لیڈروں سے لڑنا، مسلمانوں کو "تبلیغ وتنظیم" کے فریب سے نجات دلوانا،

اور پھر ہندوؤں کا یہ طرز عمل کہ صوبہ سرحد کی اصلاحات کی مخالفت کرنا، کتاب راج پال پر خاموش رہنا، "تجاویز دہلی" کو منظور کرنا، اور متعدد بار منظور کرنا، اور پھر نہرو رپورٹ کی صورت میں نامنظور کر دینا، مسلمانوں کے مسلسل اور پیہم احتجاج کے باوجود، کوئی کوشش صلاح وتلافی کی نہ کرنا، اور اپنا نصب العین یعنی "مکمل آزادی" بدلکر مستعمرات کو منزل مقصود بنالینا،

ان تمام چیزوں کو اونھوں نے اپنی چار پانچ گھنٹہ کی مسلسل تقریر میں نہایت خوبی سے حاضرین کے ذہن نشین کر دیا، اور اعلان کر دیا کہ کانگرس سے اسوقت تک تعاون ناممکن ہی جبتک وہ "تجاویز دہلی" نہ منظور کرلے اور نہ منظور کرے تو اس سے ہماری جنگ ہے اور اگر منظور کرلے، تو پھر اسی طرح اشتراک عمل کرنے پر آمادہ اور تیار ہیں جس طرح گزشتہ تحریک میں ہم نے کیا تھا،

مجمع پر اثر | کلکتہ اسوقت مخالفت کا مرکز بنا ہوا تھا، وہاں کانگرس کا جلسہ ہو رہا تھا، اور دوسرے زعماء کلکتہ ہی میں مقیم تھے جو محمد علی کی رائے سے سخت اختلاف رکھتے تھے اور

جسکا اثر بھی کلکتہ میں بہت بیان کیا جاتا ہے اسلئے کہ کلکتہ کی امامت واقتدا بھی انہیں کے ہاتھوں میں ہے،

اسکے علاوہ محمد علی کے دوسرے رفقا جنھوں نے اپنی کارگزاری، اپنے ایثار، اپنے خلوص، اور صداقت سے کلکتہ پر خاصہ اثر قائم کرلیا تھا مثلاً اکرم خانصاحب وغیرہ، یہ سب محمد علی سے مختلف رائے رکھتے تھے، اور نہیں چاہتے تھے کہ نہرو رپورٹ نامنظور ہوجائے،

اسلئے جلسہ میں اگرکسی قسم کا ہنگامہ ہوتا تو وہ کوئی تعجب خیز بات نہ ہوتی، یا اگرکسی ایسی تجویز سے جسکا تعلق کانگرس کی مخالفت سے ہوتا، کوئی مخالفت کرتا، توبھی کوئی حیرت کرنے کی جگہ نہیں تھی،

پھر جس جلسہ میں ۸۔ ۹ ہزار آدمی ہوں وہاں ہر طبقہ، ہر خیال، ہر ذہنیت، اور ہر رائے کے افراد ہوتے ہیں "ملت واحدہ" وہ نہیں ہوتے ہیں، اصول میں اگر اتفاق بھی ہوتا ہے، تب بھی بعض فروعات میں اختلاف ہوتا ہے اور اسکے لئے صدر کو ترمیموں کا نوٹس دیا جاتا ہے، تقریریں ہوتی ہیں، یہ سب کچھ ہوتا ہے، اور ہونا چاہیئے،

مگر خلافت کانفرنس کے اس جلسہ میں یقین کیجئے کہ ایک آواز بھی مخالفت میں نہیں اٹھی، ہر شخص آمنا وصدقنا کہہ رہا تھا،

بہر حال کانفرنس ہوئی، اور نہایت شاندار طریقہ سے ختم ہوئی، اور اس ہزاروں کے مجمع میں نہ کسی نے مخالفت کی، نہ ہنگامہ بپا کرنے کی کوشش کی، سب نے عقیدت ومحبت کے ساتھ اپنے زعیم کے ارشادات کو سنا اور انپر عمل پیرا بھی ہوئے،

دوسرے حالات اب یہ عنوان ختم ہوجانا چاہئے تھا، مگر اجمالی طور سے ایک بات کا تذکرہ ضروری ہے،

ایک اعتراض بڑی شدومد سے محمد علی اور اُنکے رفقا پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ انھیں کنونشن میں اپنے مطالبات پیش ضرور کرنے چاہییں تھے، اگر وہ ایسا کرتے تو بہت بڑی امید تھی کہ مطالبات منظور ہو جاتے اور یہ اختلاف و افتراق وہیں ختم ہو جاتا مگر چونکہ محمد علی نے پھر شرکت نہیں کی اسلئے اختلاف کی خلیج اور زیادہ وسیع ہوتی گئی،

بادی النظر میں یہ اعتراض وزنی معلوم ہوتا ہے لیکن بہ تامل خفیف یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ محمد علی نے جو کیا وہی اچھا تھا، ڈومینین اسٹیٹس پر کنونشن میں انکے ساتھ جو طرز عمل اختیار کیا گیا وہ ایسا نہیں تھا کہ کوئی خوشگوار امید قائم کرنے میں مدد دیتا،

اسکے علاوہ اختلافات کے آغاز سے اس وقت تک ہندو زعما کا جو بے نیازانہ طرز عمل ہو گیا تھا، وہ بھی ایک خود دار اور شریف آدمی کو "طواف کوئے ملامت" کی اجازت نہیں دے سکتا تھا،

مسلم لیگ کی شرکت یا ان سب باتوں کو چھوڑ دیجئے، اسپر آئیے کہ مسلم لیگ نے اپنے اجلاس تک نہرو رپورٹ کی کوئی مخالفت نہیں کی، مسٹر جناح جو لیگ کی کونسل کے صدر تھے، اسوقت تک بالکل خاموش رہے، ایک حرف بھی انھوں نے مخالفت میں نہیں کہا، مسٹر چھاگلا، لیگ کے دوسرے سرگرم رکن آل پارٹیز میں شریک تھے، پھر نہرو رپورٹ کی حمایت میں اونھوں نے سخت جد وجہد کی تھی اور مسلمان قوم کی مخالفت مول لی تھی،

مہاراجہ محمود آباد، رپورٹ کے سخت ترین حامی تھے، انھیں کی کوششوں سے آل پارٹیز کا اتنا شاندار جلسہ لکھنؤ میں منعقد ہو سکا اور انھیں نے مسلم لیگ کی کرسئ صدارت پر محمد علی کے مقابلہ میں محض اسلئے فتح حاصل کی تھی کہ وہ نہرو رپورٹ کو مسلمانوں سے منوا سکیں،

سر علی امام بھی نہرو رپورٹ کے بڑے حامی تھے، اور اوِنھوں نے بھی صرف اسی حمایت کے سلسلہ میں مسلمانوں کی بڑی مخالفت اٹھائی،

ان سب حامیوں نے اپنے دوسرے رفقا اور شرکا کا ایک قافلہ مرتب کیا اور وہ مسٹر جناح کی سرکردگی میں کنونشن کے آخری اجلاس میں پہونچا، اور "تجاویز دھلی" کنونشن کے سامنے منظوری کے لئے پیش کیں،

مسٹر جناح کی تقریر | مسٹر جناح نے ایک بہت مؤثر تقریر کی، اور اپیل کی کہ محبت و اخوت کے جذبات کیساتھ ان تجاویز پر غور کیجئے، اور انھیں منظور کر کے اختلافات کا خاتمہ کر دیجئے کہ اس وقت قوم کی ضروریات کا تقاضا یہی ہے،

جیکر کی تقریر | جناح کے بعد جیکر نے تقریر کی اور انکے خیالات کا تار پود بکھیر کے رکھدیا ووٹ جب لئے گئے، تو مسٹر جناح کو شکست اور مسٹر جیکر کو فتح ہوئی، گو سر تیج بہادر نے کوشش کی کہ ایسا نہو مگر روک کون سکتا تھا؟

مسٹر چھاگلہ کا بیان | چنانچہ مسٹر چھاگلہ جنکا ذکر آچکا ہے، اور جو آجتک بہت بڑے قوم پرور ہیں، اسواقعۂ شکست سے اتنے متاثر ہوئے کہ ۴ جنوری ۲۹ء کو ایسوسی ایٹڈ پریس کو ایک بیان دیتے ہوئے انھوں نے فرمایا،

> "کنونشن کے اجلاس کے سامنے لیگ کی نمائندگی اسلئے کی گئی تھی کہ مسلمان چند ضروری ترمیمات کے بعد نہرو رپورٹ کو منظور کر سکینگے، میں نہایت افسوس کیساتھ اس امر کا اعادہ کرتا ہوں کہ کنونشن کو مسلم مطالبات پر نہایت فراخدلی سے غور کرنا چاہیے تھا بجائے اسکے وہ ہندو مہاسبھا کے زیر اثر اور اسکی دھمکی میں آنکر یہ صورت اختیار کرتا،

میں یہ امر ظاہر کر دینا چاہتا ہوں کہ مسلم لیگ کے نمایندوں کی اکثریت کنونشن کے اجلاس میں شریک ہوئی تھی اور جنھوں نے مسلمانوں کے جائز مطالبات کو پیش کیا تھا نہرو رپورٹ کے حامیوں میں سے تھے اور یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے نہ صرف اپنی ملت کے ساتھ جنگ کی بلکہ اپنی جماعت سے (مسلم لیگ) محض نہرو رپورٹ کی تائید کرنے کے سلسلہ میں بُرائی حاصل کی اگر کنونشن ان ۲۳ منتخب نمایندوں کیساتھ کسی امر پر گفتگو کرنے سے قاصر ہے تو سمجھنا چاہیئے کہ وہ ہندوستان کے کسی مسلمان سے بھی فیصلہ کرنے کی قابلیت نہیں رکھتا، اگر ان ۲۳ نمایندوں کو فرقہ پرست سمجھ کر انکے ساتھ یہ رویہ اختیار کیا گیا تو سمجھ لو کہ ہندوستان میں ایک بھی مسلم قوم پرور موجود نہیں،

جس طرح مسلم لیگ نے شفیع سکشن کو علیحدہ کر دیا، اور جسطرح اسنے ٹپنہ کی اس تجویز کو جو علی برادران نے تیار کی تھی رد کر دیا، یا آل پارٹیز کانفرنس دہلی میں اپنے نمائندوں کے بھیجنے سے انکار کر دیا، اسیطرح کنونشن کو بھی چاہیئے تھا کہ بہادری کیساتھ موبچے اور جیکار کیساتھ بھی یہی عمل درآمد کرتا، جو اجلاس کنونشن میں لحظہ بہ لحظہ دھمکی دے رہے تھے کہ وہ اجلاس چھوڑ کر چلے جائینگے،،

مسٹر چھاگلہ یہ بیان دینے کے بعد بھی وفادار رہے، لیکن مسٹر جناح دل برداشتہ ہو گئے اور نہرو رپورٹ کے مخالف ،،اسی سلسلہ میں ان سے اور پنڈت موتی لال نہرو سے اسمبلی میں ایک دلچسپ جھڑپ بھی ہو گئی تھی جسکی تفصیل سے یہاں احتراز کیا جاتا ہے،

بہر حال یہ اسباب تھے، جنھوں نے محمد علی جناح کے علاوہ محمد علی جوہر کو بھی مایوس کر دیا! اور وہ بھی بادل نخواستہ - لے تری بزم سے ناچار چلے جاتے ہیں؛
کہتے ہوئے کنونشن سے نکل آئے!! اور پھر نہ گئے،

محمد علی
خاص

محمد علی کا بیان اس باب کے ختم کرنیسے پیشتر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کنونشن اور اسکے متعلقات پر محمد علی کے جو تاثرات "روداد چمن" کے عنوان سے ہمدرد میں شائع ہوئے تھے انکا بھی ایک خاص حصہ پیش کر دیا جائے۔۔

وہ فرماتے ہیں، آج کل

"دیارِ غیر سے زیادہ خود اپنے وطن میں غریب الوطن ہوں، انھیں کانوں سے جنسے آج اپنی ہجو سُن رہا ہوں، اپنی تعریف میں ہزاروں قصیدے بھی سُن چکا ہوں، ہمارے قید ہوتے ہی ہندو مہا سبھائی مہاراشٹر نے مہاتما گاندھی اور عدم تعاون کے خلاف علم بغاوت بلند کیا، خود مہاتما گاندھی نے حکومت کو الٹی میٹم دے چکنے کے بعد باردولی میں وہ روش اختیار کی جسے ملک نے ہتھیار ڈال دینے کے مرادف سمجھا، اور وہ خود بھی ہماری طرح قید کر دئے گئے، انکے قید ہونیکے بعد پنڈت موتی لال نہرو اور دیش بندھو داس آزاد ہوئے، اور بجائے سول نافرمانی شروع کرنیکے، جسکا یادش بخیر! اب پھر کلکتہ میں نام لیا گیا ہے، گیا میں سوراج پارٹی کے نام سے وہ علم بغاوت بلند کیا جسنے عدم تعاون کی تحریک کا خاتمہ کر دیا، پھر لطف یہ کہ ہندو مہاسبھائیوں نے شدھی اور سنگھٹن کی تحریکیں شروع کیں جنھوں نے ان مذہبی تعصبات کی آگ کو پھر بھڑکا دیا جنھیں ہم ٹھنڈا کر چکے تھے اور اسکے جواب میں مسلمانان پنجاب کے اسی عنصر نے تبلیغ و تنظیم کے نام سے زبانی جمع خرچ دکھانا شروع کیا جو آج وطن پرستی اور ملت شکنی کا ڈھول بجا رہا ہے

نہ ہم نے ڈاکٹر مونجے، مسٹر آنے، اور مسٹر کیلکر کی طرح مہاتما گاندھی کے خلاف اس بغاوت میں حصہ لیا تھا جو بالآخر پنڈت موتی لال کے خلاف بھی جوابی تعاون کے لاجواب نام سے ظاہر ہوئی نہ ہمنے گیا میں اس تحریک کے خلاف پنڈت موتی لال اور انکے سوراجی ساتھیوں کی طرح علم بغاوت بلند کر کے حصہ لیا، نہ پنڈت مدن موہن مالوی اور سوامی شردھانند کی طرح ہندو مہاسبھا کی قائم کردہ سنگھٹن اور شدھی کی تحریکوں میں حصہ لیا، اور نہ ڈاکٹر کچلو اور انکے تنظیم

کی طرح تبلیغ و تنظیم کے نام سے اپنا ڈھنڈورا پیٹا، آج بھی حضرات کلکتہ کی تماشا گاہ میں اپنا سوانگ بھر رہے ہیں،

پنڈت موتی لال نہرو اور انکے ساتھیوں کو کونسلوں اور اسمبلی کی شرکت نے جو کچھ سوراج دلوایا وہ ہمارے سامنے ہے اس شرکت میں پنڈت جی کو جو آج کانگرس کے صدر ہیں اتنا اصرار تھا کہ انھوں نے خود مجھ سے فرمایا تھا کہ اگر کانگرس نے اس شرکت کی اجازت نہ دی تو میں کانگرس کے گرداگرد دو سو میل کے احاطہ میں بھی قدم نہ رکھوں گا، میں نے اس خیال سے طوعاً و کرہاً اپنی پارٹی سے آج کے خداوند کانگرس و کنونشن کو اجازت دلوائی کہ کہیں سے وہ جیل سے نکلکر مہاتما گاندھی مجھسے شکایت کریں کہ تم نے کانگرس سے اتنی بڑی اقلیت کو کیوں نکلوا دیا، ورنہ دھلی اور کوناڈا میں موتی لال جی کو شکست فاش نصیب ہوتی،

مہاتما گاندھی جب جیل سے چھوٹے تھے تو اونھوں نے اخبارات کے ذریعہ سے میرے نام ایک پیغام ارسال فرمایا تھا جسمیں اشارہ کیا تھا کہ جو تفریق ہندو مسلمانوں میں پڑ گئی ہے اسکے مٹانے ہی سے تم اپنی صدارت کانگرس میں کامیاب سمجھے جاسکتے ہو، میں نے اس تفریق کے مٹانے میں جبکہ اس کا فیصلہ خدا ہی پر چھوڑتا ہوں مہاتما جی نے کوہاٹ کی نزاع کی خبر سنتے ہی ہم سے خاص طور سے خطاب کرتے ہوئے ظاہر کر دیا تھا کہ وہ مسلمانوں کو ظالم اور ہندوؤں کو مظلوم سمجھتے ہیں اسکے بعد سے تو اونھوں نے ہندو مسلم تنازعات اور مناقشات کو چکانے کا کام ہی بند کر دیا اور جب کبھی انسے ہم دونوں بھائیوں ڈاکٹر انصاری مولانا ابوالکلام آزاد ڈاکٹر محمود، یا اور کسی نے اس بارہ میں عرض کیا تو اونھوں نے اسمیں حصہ لینے سے انکار فرمایا، اور اس کام کو کلیتہً خدا ہی پر چھوڑ دیا"،

یہ تھے وہ اسباب و علل جنکی بنا پر محمد علی کنونشن سے بیزار ہوئے، کانگرس سے مایوس ہوئے اور بالآخر۔

نے پیروی قیس نہ فرہاد کریں گے — ہم طرز جنوں اور ہی ایجاد کرینگے

کہکر اونھوں نے دوسرا "طرز جنوں" ایجاد کیا، جو سب کو معلوم ہے،

باب ۴۳

آل مسلم پارٹیز کانفرنس دہلی

کانگرس سے اور کنونشن سے جب مایوسی ہوگئی تو جنوری ۱۹۲۹ء میں محمد علی اس پر آمادہ ہو گئے کہ وہ مسلمانوں کی ایک "آل پارٹیز کانفرنس" منعقد کریں جس میں تمام جماعتوں کے نمائندے شریک ہوکر اپنا لائحہ عمل مرتب کریں اس لئے کہ

باہم سلوک تھا تو اٹھاتے تھے نرم گرم کاہے کو میرؔ کوئی دبے جب بگڑ گئی

محمد علی کانگرس کے تھے اور کانگرس کا سارا زور شور محمد علی کی "حدی خوانیوں" سے قائم تھا، اب کانگرس نے اپنے طرز عمل سے انھیں پورے طور سے مایوس کر دیا تھا اور جہاں تک امکان میں تھا ان کی اس "بغاوت" کی سزا بھی دیدی گئی تھی۔

سزا یعنی کلکتہ کانگرس میں جب اس کی "مجلس عاملہ" کے ارکان کا انتخاب ہو رہا تھا تو مدراس کے ایک صاحب نے بدقسمتی سے محمد علی کا نام بھی پیش کر دیا، جو اب تک اس کے ممبر چلے آتے تھے، نام منظور تو کاہے کو ہوتا، مگر پھر اس پر بھی "نہیں نہیں" کے شور نے "گرمیٔ محفل" کا سامان ضرور پیدا کر دیا تھا۔

لیکن محمد علی نے یہ روش خود نہیں رکھی بلکہ ۲ جنوری ۱۹۲۹ء کے ہمدرد میں یہ خبر شائع ہوئی۔

> "ڈاکٹر انصاری، سر علی امام، مسٹر حسن امام، مولانا ابوالکلام آزاد اور اسی طرح بہت سے زعماء کو خاص طور پر دعوت دی گئی۔"

اگرچہ ان زعما میں سے کوئی بزرگ تشریف نہ لائے لیکن کارکنان نے اپنے خیال کے مطابق اتمام حجت کرلیا۔

انتظامات بہرحال ان ہنگامہ آرائیوں کے بعد دہلی میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے انتظامات شروع ہوگئے، صوبہ کونسلوں اور اسمبلی و کونسل آف اسٹیٹ اور دوسری انجمنوں کو اطلاع دیدی گئی کہ وہ اپنے اپنے نمائندہ منتخب کرکے جلد سے جلد دہلی بھیج دیں۔

صدارت صدارت کے لئے قرعۂ فال سر آغا خاں کے نام پڑا، جنھوں نے ازراہ عنایت اسے قبول بھی فرمالیا، اور فوراً دہلی تشریف لائے۔

شرکاء کونسلوں اور اسمبلی و کونسل آف اسٹیٹ کے علاوہ مسلم لیگ اور خلافت کمیٹی کے مندوبین بھی شریک تھے اور خوشی کی بات ہے کہ اس مجلس میں جمعیۃ علماء ہند دہلی کے سربرآوردہ ارکان بھی موجود تھے، مثلاً مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب، مولانا احمد سعید صاحب اور دوسرے حضرات۔

سر شفیع کا دعویٰ سر شفیع نے کانفرنس کے اس اجلاس میں بالکل صحیح دعویٰ کیا کہ یہ کانفرنس پوری نمائندہ ہے اس لئے کہ جس کانفرنس میں علی برادران شریک ہوں اور جمعیۃ العلماء کے محترم بزرگ رونق افروز ہوں وہ سیاسی اور مذہبی دونوں نقطہ ہائے نظر کی صحیح طور سے نمائندہ کہی جاسکتی ہے۔

بڑا مرحلہ کانفرنس میں سب سے بڑا مرحلہ یہ درپیش تھا کہ کانفرنس کا نصب العین کیا ہو؟ سر شفیع اور ان کے ہمنوا حضرات کا جہانتک تعلق تھا وہ تو اس پر بھی راضی ہوسکتے تھے کہ "ڈومینین اسٹیٹس" بھی نہ رکھا جائے، مگر کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو کم از کم "درجہ مستعمرات" کے طلبگار ضرور تھے، ان کے ذوق کی رعایت بھی ضروری تھی اور ایسا ممکن بھی تھا، لیکن سب سے زبردست

مرحلہ یہ تھا کہ محمد علی مکمل آزادی کے علمبردار تھے! اور یہ وہ چیز تھی جسے کانفرنس میں بطور نصب العین اپنا کے پیش ہی نہیں کیا جا سکتا اور بہ فرض اگر ایسا ہوتا بھی ہو تو سر آغا خاں دہلی میں نہ نظر آتے نہ سر شفیع کی یہ سرگرمیاں ظاہر ہوتیں، نہ مسلم لیگ کے سیاست داں بزرگ اس پلیٹ فارم پر تشریف رکھ سکتے تھے اور یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ محمد علی اس " درمیانی راستہ" کو قبول کر سکتے، یہ ایک مسئلہ ایسا آن پڑا تھا کہ تھوڑی دیر کے لئے اندیشہ ہوتا تھا کہ کہیں کانفرنس ہی نہ ختم ہو جائے۔

حکمت عملی | آخر بڑے غور و فکر کے بعد یہ قرار پایا کہ کانفرنس اپنا کوئی خاص نصب العین نہ مقرر کرے اور جو جماعتیں اس کے ساتھ اشتراک عمل کر رہی ہیں ان پر نصب العین کے بارے میں کوئی پابندی کسی قسم کی نہ عاید کیجائے، یعنی اگر مسلم لیگ " ڈومنین اسٹیٹس " کی طلبگار رہے تو اسے حق ہے کہ وہ اس کے لئے جد و جہد کرے، اگر جمعیۃ خلافت آزادی کامل کی علمبردار تو وہ اپنے اس مقصد عالی کے حصول کی کوشش کر سکتی ہے، آل پارٹیز کانفرنس کی طرف سے اس پر کوئی پابندی یا کسی قسم کی روک نہیں ہو گی۔

لیکن مسلمانوں کے لائحہ عمل اور موجودہ سیاسی جد و جہد اور ان کے حقوق کا جہاں تک تعلق ہے وہاں سب جماعتیں جو اس میں شریک ہیں وہ مسلم کانفرنس کے ساتھ اشتراک عمل کرینگی۔

کارروائی | یہ تھی وہ بین بین صورت جس پر محمد علی کا اشتراک عمل حاصل کیا جا سکتا تھا اس مرحلہ صعب کے گزر جانے کے بعد کارروائی شروع ہوئی اور اس میں جو تجویز منظور ہوئی وہ درج ذیل ہے۔

تجویز | ہرگاہ کہ ہندوستان کی وسعت اور اس کی نسلی، لسانی، انتظامی جغرافی یا ملکی تقسیمات کو مد نظر رکھتے ہوئے ہندوستانی حالات کے مطابق صرف وفاقی طرز

حکومت ہو جس میں ان ریاستوں کو جو اس وفاقی حکومت کے اجزائے ترکیبی کی حیثیت رکھتی ہوں، کامل خود مختارانہ اور فیصلہ کن اختیارات حاصل اور مرکزی حکومت کو صرف ان امور کے متعلق قطعی اختیارات حاصل ہوں جو مشترکہ مفاد سے تعلق رکھتے ہوں اور جو دستور اساسی کی رو سے خاص طور سے اسے تفویض کئے گئے ہوں۔

اور

جبکہ یہ ضروری ہو کہ کوئی ایسا مسودۂ قانون، قرارداد، تحریک یا ترمیم جو بین الملی معاملات کے متعلق ہو کسی مجلس مقننہ میں خواہ وہ صوبہ دار ہو یا مرکزی، پیش نہ کیا جائے، یا زیر بحث نہ لایا جائے، یا منظور نہ کیا جائے، اگر اس ملت سے جس پر اس کا اثر پڑتا ہو خواہ وہ ہندو ملت ہو یا مسلم ملت، تین چوتھائی ارکان کی اکثریت اس مجلس مقننہ میں اس کے پیش کرنے، اس پر بحث مباحثہ کرنے یا اس کو منظور کرنے کی مخالفت کریں۔

اور

جبکہ مسلمانوں کا یہ حق کہ مختلف ہندوستانی مجلس مقننہ میں جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کے ذریعہ اپنے نمائندہ منتخب کریں، ملک کا مروجہ قانون ہو اور مسلمان اپنے اس حق سے بغیر اپنی رضامندی کے محروم نہیں کئے جا سکتے۔

اور

جبکہ ان حالات کے ماتحت جو اس وقت ہندوستان میں موجود ہیں اور جب تک یہ حالات موجود رہیں گے مختلف مجالس مقننہ اور دیگر آئینی خود مختار انجمنوں میں مسلمانوں کی نیابت اپنے جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کے ذریعہ ضروری ہو

تاکہ حقیقی نمائندہ جمہوری حکومت قائم کیجائے۔

اور

جبکہ اس وقت تک جب تک کہ مسلمانوں کو یہ اطمینان نہ ہو جائے کہ دستور اساسی میں انکی حقوق اور مفاد کی مناسب حفاظت کی گئی ہے وہ کسی صورت میں بھی اس پر رضامند نہ ہوں گے کہ خواہ مشروط یا غیر مشروط طریقہ پر مخلوط حلقہ ہائے انتخاب قائم کئے جائیں۔

اور

جبکہ مذکورۃ الصدر مقاصد کے لئے یہ ضروری ہے کہ مسلمان مرکزی اور صوبجاتی کابینوں میں اپنا جائز حصہ حاصل کریں۔

اور

جبکہ یہ ضروری ہے کہ مختلف مجالس مقننہ اور آئینی خود مختار انجمنوں میں مسلمانوں کی نیابت ایک ایسے طریقہ پر مبنی ہو جس سے ان اصولوں میں جہاں مسلمانوں کی آبادی اکثریت میں ہے، مسلمانوں کی اکثریت میں کسی صورت سے بھی فرق نہیں آئے گا اور ان صوبوں میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت[1] ہے کسی حالت میں بھی ان کی نیابت اس سے کم نہ ہو گی جو ان کو موجودہ قانون کے ماتحت حاصل ہے۔

اور

جبکہ ہندوستان کے تمام صوبوں میں مسلمانوں کی نمائندہ جمعیتوں نے متفقہ

---

[1] یا اقلیت؟ (مؤلف)

طور پر یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ ہندوستان میں بحیثیت مجموعی تمام مسلمانوں کے مفاد کے مناسب تحفظ کی غرض سے مرکزی مجالس مقننہ میں مسلمانوں کو ۳۳ ۱/۳ فیصدی نیابت کا حق ملنا چاہیے اور یہ کانفرنس اس مطالبہ کی کامل تائید کرتی ہے۔

اور

جبکہ لسانی، نسلی، جغرافی اور انتظامی وجوہ کی بناء پر صوبۂ سندھ بقیہ احاطۂ بمبئی سے کوئی بھی مناسبت نہیں رکھتا اور اس کے باشندوں کے مفاد کے لحاظ سے اس کا غیر مشروط طور پر ایک ایسا علیحدہ صوبہ بنانا جس میں ہندوستان کے دیگر صوبوں کی طرح اپنا علیحدہ نظام حکومت اور مجلس قانون ساز موجود ہو نا ضروری ہے، ہندو اقلیت کو اس کے تناسب آزادی سے زیادہ اسی طرح مناسب اور موثر نمائندگی دیدی جائے جس طرح کہ مسلمانوں کو ان صوبوں میں دی جاسکتی ہے جہاں ان کی آبادی اقلیت میں ہو۔

اور

جبکہ صوبۂ سرحد اور بلوچستان میں اسی طریقہ پر جو ہندوستان کے دیگر صوبوں میں اختیار کیا جائے، آئینی اصلاحات کا نفاذ نہ صرف ان صوبوں کے مفاد کے خیال سے بلکہ بحیثیت مجموعی تمام ہندوستان کی آئینی ترقی کے لحاظ سے بھی ضروری ہے، ان صوبوں کی ہندو اقلیتوں کو انکے تناسب آبادی سے زیادہ اسی طرح مناسب اور موثر نمائندگی دیدی جائے جس طرح کہ مسلمانوں کو ان صوبوں میں دی جاسکتی ہے جہاں کہ ان کی آبادی اقلیت میں ہو۔

اور

جبکہ انتظام ہندوستان کے مفاد کے لحاظ سے یہ ضروری ہے کہ دستور اساسی میں
ایسا بندوبست کیا جائے جس کی رو سے سرکاری اور آئینی خودمختار انجمنوں کی
ملازمتوں میں اہلیت کے واجبات کا مناسب لحاظ رکھتے ہوئے مسلمانوں کو دیگر
ہندوستانیوں کے ساتھ مناسب حصہ دیا جائے۔

اور

جبکہ ہندوستان کے موجودہ سیاسی، معاشی حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ ضروری
ہے کہ ہندوستان کے دستور اساسی میں مسلمانوں کے تمدن کے تحفظ اور مسلمانوں
کی تعلیم، زبان، مذہب، شخصی قانون اور مسلمانوں کے خیراتی ادارات کے تحفظ
اور ترقی اور سرکاری امداد میں ان کے مناسب حصہ کے لئے مناسب تحفظ شامل
کئے جائیں۔

اور

جبکہ یہ ضروری ہے کہ دستور اساسی میں یہ قرار دیا جائے کہ ہندوستان کے دستور
اساسی میں اس کے نفاذ کے بعد کوئی تغیر و تبدل اس وقت تک نہیں کیا جائیگا
جب تک کہ وہ تمام ریاستیں جن پر ہندوستانی وفاقی حکومت (انڈین فیڈریشن)
مشتمل ہو متفقہ اس کی خواہش نہ کریں گی۔
یہ کانفرنس نہایت زور کے ساتھ اعلان کرتی ہے کہ ہندوستان کے مسلمان کسی
دستور اساسی کو خواہ اس کو کوئی مرتب کرے یا تجویز کرے، اس وقت تک قبول
نہیں کریں گے جب تک وہ ان اصولوں کی تصدیق نہ کرے جو اس تجویز میں
پیش کئے گئے ہیں۔"

یہ تھی وہ ہنگامہ آرا تجویز جو آج تک "بدنام" ہے جسے سر محمد شفیع نے پیش کیا اور شفیع داؤدی صاحب، سر اقبال، سر یعقوب، حاجی عبداللہ ہارون، مولانا عبدالماجد بدایونی، مولانا کفایت اللہ اور مولانا محمد علی وغیرہ نے تائید کی۔

محمد علی کی تائید | محمد علی کے ساتھ کنونشن میں جو سلوک ہوا تھا وہ معلوم ہی ہے پھر نہرو رپورٹ کے بعد ان پر غداری، قوم فروشی اور تلون مزاجی کے جو الزامات لگے تھے ان سے بھی سب واقف ہیں، اب ان کی تائیدی تقریر کا بھی ایک حصہ ملاحظہ فرمائیے کہ اعلان جنگ کے بعد بھی ایک "شریف" دشمن کی زبان سے کیا الفاظ نکل سکتے ہیں۔

"میں انگریزی حکومت سے بیزار ہوں، میں دوسروں کو مجبور نہیں کرتا کہ وہ میرے ہمخیال بن جائیں، میں تو انگریزی حکومت سے اس قدر بیزار ہوں کہ اگر مجھے انگریزوں کی غلامی سے نجات حاصل کرنیکے لئے ہندوؤں کی غلامی بھی قبول کرنی پڑے اور اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ ہو تو میں اسے قبول کرلوں گا۔ میں اس مسلمان کو بزدل سمجھتا ہوں جو یہ کہتا ہے کہ جب انگریز ہندوستان سے چلے جائیں گے تو پھر کیا ہوگا! مسلمانوں کی زندگی ہندوؤں کے رحم و کرم پر ہوگی۔ میں اس اندیشہ کو اہمیت نہیں دیتا، میرے نزدیک ایک سچا مسلمان دس آدمیوں پر بھاری ہوتا ہے، کیا جنگ بدر اور جنگ احد میں مسلمانوں کی تعداد قلیل نہ تھی لیکن کامیابی و کامرانی کس کو حاصل ہوئی؟ مسلمانوں کو! میری خواہش یہ ہے کہ مصالحت ہو، امن ہو، اتحاد ہو، میری تحریروں اور تقریروں کو پڑھنے والے جانتے ہیں کہ میں نے ابھی تک صلح کا دروازہ بند نہیں کیا ہے، میں صلح کو پسند کرتا ہوں اور امن و اتحاد کا حامی ہوں"

مفتی صاحب کی تائید | مفتی کفایت اللہ صاحب کی تقریر بہت خوب تھی، خاص حصہ یہ ہے۔

"میں جس ریزولیوشن کی تائید کے لئے حاضر ہوا ہوں وہ ایک نہایت اہم ریزولیوشن ہے، اور یہ ریزولیوشن ایک ایسے جلسہ کی طرف سے ہے جو مسلم قومیت کے حقوق کی حفاظت کا ایک نمائندہ جلسہ ہے، اس میں ہر خیال اور ہر طبقے کے مسلمان شریک ہیں۔

اب کسی کو یہ کہنے کا حق حاصل نہ ہوگا کہ مسلمانوں نے نہرو رپورٹ کو تسلیم کیا ہے اگر کوئی شخص ایسا کہے گا تو اس کا کہنا غلط ہوگا اور یہ طرزِ عمل ایسا ہی ہوگا جس طرح کوئی شخص آفتاب پر خاک ڈالنے کی کوشش و سعی کرے، میں جمعیۃ علمائے ہند کی طرف سے اس تجویز کی تائید کرتا ہوں۔"

باب ۴۴

وائسرائے کا بیان

سنہ ۲۴ء میں جب سر مالکم ہیلی اسمبلی کے ہوم ممبر تھے اس زمانہ میں انھوں نے ڈومینین اسٹیٹس کی تعبیر و تعیین میں سخت غلط فہمیاں پیدا کر دی تھیں ایسی کہ لبرل حضرات بھی مایوس ہو گئے تھے۔

لارڈ ارون کا تدبر

لارڈ ارون نے یہ موقعہ غنیمت سمجھا کہ وہ ان غلط فہمیوں کو رفع کر دیں کہ اس وقت جو یہ شور و شر ہو رہا ہے اس میں بھی کمی ہو جائے گی، اور کیا عجب ہو کہ کانگرس کا تعاون بھی حاصل کیا جا سکے چنانچہ وہ یورپ گئے اور واپس آکر انھوں نے اسمبلی کے ارکان کو مخاطب فرمایا جس میں یہ صاف صاف تشریح کر دی کہ ڈومینین اسٹیٹس سے مراد کامل درجہ نوآبادیات ہے اور اس کے علاوہ کچھ نہیں۔

زعمائے کانگرس کا اجتماع

وائسرائے جس روز اپنا بیان دینے والے تھے اس وقت دوسرے مشتاقان زیارت کے علاوہ کانگرس کے غیور اور محترم زعماء بھی مختلف مقامات سے زحمت سفر برداشت کر کے دہلی میں تشریف لے آئے تھے، اور منتظر تھے کہ نائب السلطنت بہادر کے ارشادات کہاں تک مایۂ تسلی ثابت ہو سکتے ہیں؟

بالآخر وہ ساعت منتظرہ آئی اور ہز اکسی لینسی وائسرائے نے ایوان اسمبلی میں بقول "بعض غلط فہمی" رفع کر دی۔

کانگرس کا بیان

چنانچہ فوراً کانگرس کی طرف سے ایک محضر تیار ہوا جس میں وائسرائے

کے اس بیان کا شکریہ ادا کیا گیا، گول میز کانفرنس میں شرکت کا عزم ظاہر کیا گیا اور دبی زبان سے یہ بھی کہا گیا کہ ہم یہ بھی سمجھتے ہیں کہ "ہز اکسی لینسی" ہمیں کانفرنس میں ہماری طے شدہ رعائتیں بھی مرحمت فرمائیں گے اور اس طرح ہم اپنا مقصد حاصل کرلیں گے۔

وائسرائے کا اعلان اس بیان پر پھر وائسرائے نے یہ اعلان کیا، تعین منزل کے یہ معنی نہیں ہیں کہ آپ منزل کی قطع مسافت بھی کرچکے، قطع مسافت اسی وقت ہوگی جب آپ سفر شروع بھی کریں گے، ڈومینین اسٹیٹس آپ کو اسی وقت ملے گا جب رفتہ رفتہ تدریجی طور سے آپ میں یہ صلاحیت پیدا ہوجائے گی۔ اس بیان سے کانگرس پھر "ناخوش" ہوگئی اور اس نے "آزادی کامل" کا اعلان کردیا۔

محمد علی کی روش وہ بیان محمد علی کے پاس بھی گیا جس پر گاندھی جی، جواہر لال اور دوسرے زعمائے کانگرس نے دستخط کئے تھے اور وائسرائے کی تعریف و توصیف کے بعد "بہ اقرار صالح" گول میز کانفرنس کی شرکت پر آمادگی ظاہر کی گئی تھی بشرطیکہ اس میں درجۂ مستعمرات کے "اصول و ضوابط" بھی متعین کرنے کی اجازت دیدی جائے، یا بہ الفاظ دیگر نہرو رپورٹ کی سرکاری تصدیق کردی جائے۔

محمد علی نے اس بیان پر دستخط تو کئے لیکن "یہ شرط" انھوں نے بھی لگادی، اگر میری ملت کو مؤثر نمائندگی دی گئی تو میں گول میز کانفرنس میں شرکت پر آمادہ ہوں، بغیر اس کے اشتراک عمل مشکل ہے۔

بیان کا اثر کانگرس یا گاندھی جی کے اس بیان کا ہندو پریس اور مسلم پریس نے خیر مقدم کیا مگر محمد علی کو اس میں بھی شرف "جہاد" حاصل ہوا۔

ان کی خوب مخالفت کی گئی، تمسخر کیا گیا، استہزا کیا گیا کہ اگر کانگرس نے ڈومینین اسٹیٹس کو مان لیا تو خیر، وائسرائے کے بیان پر مرحبا کہہ کر اگر اس نے گول میز کانفرنس میں شرکت پر آمادگی

ظاہر کی تو یہ بھی زیادہ تعجب خیز نہیں ہے اس لئے کہ وہ تو درجۂ مستعمرات کو بطور نصب العین کے بھی طے کر چکی ہے، مگر مولانا محمد علی نے اس بیان پر کیسے دستخط فرمائے، وہ تو کامل آزادی کے علمبردار تھے، انھوں نے خلافت کانفرنس کلکتہ میں آزادی کامل کا جھنڈا بلند کیا تھا، "کنونشن" میں انھوں نے سب سے زیادہ مخالفت تو اسی درجۂ مستعمرات کی کی تھی، ان کا قلم دستخط کے لئے کیسے چلا؟

"برہان قاطع" اعتراض بہت وزنی ہے اور بظاہر محمد علی کی شخصیت اور اصول پروری کو بڑی حد تک یہ "برہان قاطع" مجروح کر دیتی ہے کہ ایک طرف یہ بلند بانگ دعاوی، یہ زبردست اعلان، یہ زبردست ادعاء آزادی کامل کے۔

دوسری طرف یہ تائید، یہ آمادگی اور وائسرائے کی دعوت کی یہ پذیرائی، قول و عمل کے تضاد کو کس قدر زیادہ نمایاں کر دیتی ہے اور اتنے دعوے پیش کر کے مزید دلیل یہ بھی پیش کی گئی کہ یہ سب ذیابیطس کا اثر ہے کہ اتنا اچھا دماغ اس طرح خراب ہو جائے، اور مسلمان تقریباً اس سے محروم ہو جائیں، چنانچہ ایک دوسرے موقعہ پر ایک بڑی ذمہ دار جماعت کے اخبار نے ایک بتذل پرچہ سے لے کر "بیچارہ" محمد علی پر لکھا تھا

اے فلک پیری و صد عیب اسے کہتے ہیں ۔۔۔ کوئی خوبی نظر آتی نہیں تجھ میں ظالم

غرض اس قسم کے براہین قاطعہ نے ایک بار پھر اسلامی پریس اور ہندو پریس میں ذرا ہاہمی پیدا کر دی۔

"قاطع برہان" لیکن اگر سنجیدگی سے اس اعتراض پر غور کیجئے تو اس کی یہ اہمیت قطعاً باقی نہیں رہتی جس کا اظہار بڑے شد و مد سے ترش لب و لہجہ میں چڑھی ہوئی آستینوں اور تنتی ہوئی رگوں میں ہوتا ہے۔

محمد علی یقیناً کانگریس کی طرح نہایت دیانت داری اور ایمانداری سے "کامل آزادی"

کے حامی تھے، بلکہ علمبردار تھے۔

مدراس کانگرس مدراس کانگرس میں جب ماسکو سے واپس آکر پنڈت جواہر لال نہرو نے "آزادی کامل" بطور نصب العین کے کانگرس سے منوانا چاہا تو وہ محمد علی ہی تھے جنھوں نے نہایت زوروں سے اس تجویز کی تائید کی اور پاس کرایا۔

مالوی جی کے اعتراضات پھر مالوی جی نے جب اس "سابق صدر کانگرس" کی مداخلت سے عاجز آکر گھبرانا شروع کیا، جس نے مالوی جی کو پریشان کر دیا تھا اور مالوی جی جو بڑی شدومد سے اس تجویز کی مخالفت کے لئے اٹھے تھے، بالآخر انھیں خاموش ہونے پر مجبور کر دیا اور یہ وہی محمد علی تھا جس نے کانگرس کے کھلے جلسہ میں ملک معظم کو "قانونی مغالطہ" کہکر ایک عجیب کیفیت پیدا کر دی تھی، پھر خلافت کانفرنس کلکتہ میں کامل آزادی کو محمد علی نے منظور کرایا، آل پارٹیز کانفرنس میں جو بعد کو "مسلم کانفرنس" کہلائی درجۂ مستعمرات کو پاس نہیں ہونے دیا۔

مگر جب انھوں نے دیکھا کہ اس نصب العین نے ایک تفریح ومذاق کی سی حیثیت اختیار کرلی ہے، جب گورنمنٹ کو دھمکی دے کر کام نکالنا ہوا تو فوراً "آزادی کامل" کی تجویز پیش ہو گئی اور جب اس کی کسی بات سے خوش ہوئے تو پھر درجۂ مستعمرات پر قناعت کرلی۔

ہندوستان میں یہی ایک جماعت ہے جو سب سے زیادہ طاقتور، سب سے زیادہ مؤثر اور سب سے زیادہ عاملہ جماعت ہے، پھر وہ خود جب "مصلحت وقت" سے درجہ مستعمرات پر راضی ہو گئی تو محمد علی کو کون الزام دے سکتا ہے، سیاست کا اقتضاء یہی ہے کہ زمانہ کا ساتھ دو، آزادی کامل کے نصب العین کو ترک کر کے عارضی طور پر محمد علی اگر مستعمرات پر راضی ہو سکتے تھے تو ہمیں کوئی مضائقہ نہیں ہوا عقیدہ ان کا بھی کانگرس

کی طرح وہی تھا جس کا انھوں نے، گول میز کانفرنس میں بہ بانگ دہل اعلان بھی فرمادیا تھا کہ

"میں ڈومینین اسٹیٹس کا قائل نہیں، میں تو آزادی کامل کا خواہاں ہوں،
اور اس کے علاوہ کسی چیز پر راضی نہیں ہو سکتا"

سیاستہً عارضی طور پر طرزِ عمل کی تبدیلی کو نصب العین اور عقیدہ کا تغیر نہیں کہتے اور اگر کہتے ہیں تو

ایں گناہیست کہ در شہرِ شما نیز کنند

باب ۴۵

جنوبی افریقہ

محمد علی کی قیادت کا سکہ صرف ہندوستان ہی میں نہیں بیٹھا ہوا تھا، بلکہ بیرونی مقامات پر بھی اس کی قیادت ورہنمائی کی خلقت اسی طرح قائل تھی جس طرح ہندوستان کی۔

دعوت | چنانچہ جنوبی افریقہ سے مسلسل اور متعدد دعوتیں تشنہ کا مان زیارت کی آئیں، گو محمد علی وہاں کبھی نہیں گئے تھے لیکن ان کی شہرت وہاں پہنچ چکی تھی۔

جنوبی افریقہ میں مسلمانوں کی ماشاءاللہ کافی تعداد ہے اور ہر اعتبار سے وہ اچھی حالت میں ہیں اس لئے اب تک ان کی خبر نہ لینا تعجب خیز تھا۔

بہرحال جب وہاں سے لگاتار دعوتیں آنے لگیں تو محمد علی کے لئے سوا اس کے اور کوئی چارۂ کار باقی نہیں رہ گیا کہ وہ یہ دعوت قبول کریں اور مسلسل کام کرنے سے ان کی صحت پر جو برا اثر پڑ رہا تھا، اس کو اسی بہانہ سے تبادلۂ آب و ہوا کا ذریعہ بنائیں چنانچہ انھوں نے دعوت قبول کرلی اور روانگی پر آمادہ ہوگئے، اپنے احباب اور عقیدتمندوں کو اطلاع بھی دے دی۔

شوکت کی روانگی | چنانچہ "مقدمۃ الجیش" کی طرح پہلے مولانا شوکت علی روانہ ہوئے، طے یہ پایا تھا کہ اس کے کچھ روز بعد محمد علی آئیں گے اس لئے کہ محمد علی بیگم صاحبہ کو بھی اپنے ہمراہ لیجانے والے تھے۔

عزم روانگی | اسی خیال سے اکتوبر ۲۹ء میں محمد علی بمبئی روانہ ہوئے، اپنے تمام انتظامات

مکمل کئے، اسباب سفر تیار ہوا، سامان بندھ گیا ٹکٹ لے لئے گئے اور وہ بس اب روانہ ہوا چاہتے ہی تھے۔

اہانت آمیز حکم کہ جنوبی افریقہ کے گورنر نے ایک نہایت اہانت آمیز شرط یہ لگائی کہ جنوبی افریقہ میں ان داخلہ اسی وقت ممکن ہے جب چند پونڈ بطور ضمانت کے جمع کر دیں، بصورت دیگر جنوبی افریقہ کے دارالسلطنت میں انھیں داخل ہونے کی اجازت دینا گورنر صاحب کو منظور نہیں۔

انکار محمد علی نے اس اہانت آمیز شرط کی تکمیل سے قطعاً انکار کر دیا اور اس صورت میں جانے سے معذوری ظاہر کی، نیز ایک تار فوراً گورنر کو دیا کہ اس قسم کے مہمل شرائط کے بغیر انھیں وہاں داخلہ کی اجازت دیدیں اور یہ کہ وہ وہاں کسی سیاسی غرض سے نہیں جا رہے ہیں بلکہ صرف اپنے مسلمان بھائیوں سے تبادلۂ خیالات کرنے اور ان کے حالات کے متعلق مشورہ کرنے، چنانچہ محمد علی نے جنرل ہرٹزوگ گورنر افریقہ کے نام ایک تار دیا جس کے الفاظ یہ ہیں۔

تار "بہادر لوگ ہر جگہ بہادری کو پسند کرتے ہیں، جو لوگ اپنی عزت کرتے ہیں وہ دوسروں کی بھی عزت کرتے ہیں۔ ہمیں جو قوم بوئر کی بہادری کے معترف ہیں ان شرائط کو معلوم کر کے بہت تکلیف ہوئی جن کو کوئی فرد بھی قوم بوئر کا تسلیم نہ کرے گا، مہربانی کر کے میرے بھائی کی جماعت کو وہاں اور مجھے اور میرے غمزدہ اہل وعیال کو یہاں موجودہ کشمکش سے نجات دلائے اور جن امور کا یقین ہم نے دیا تھا انھیں کی بنا پر اجازت بذریعہ برقی پیام عنایت فرمائے یہ اپیل ایک انسان کی طرف سے ایک انسان سے کیجا رہی ہے۔ محمد علی صدر خلافت"

جواب | اس تار کا جنرل ہرٹزوگ کی طرف سے نہایت مہمل اور حسب توقع وہی جواب آیا کہ
"آپ کا تار پہنچا، افسوس ہے کہ شرائط میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

وزیر داخلیہ"

جدوجہد | اس تار کے بعد محمد علی نے چاہا کہ گورنمنٹ اپنی اس "نوآبادی" کے اس احمقانہ طرز عمل کی اصلاح کرے، چنانچہ انھوں نے وائسرائے کو اس مطلب کا ایک تار دیا کہ وہ جنرل ہرٹزوگ کے اس غیر شریفانہ رویہ میں کچھ تغیر کرنے کی کوشش کریں۔ نیز ایک تار اپنے دوست میاں سر فضل حسین ممبر حکومت ہند کو دیا کہ وہ بھی اس معاملہ کو سلجھانے کی کوشش کریں، عرصہ کے غور و فکر کے بعد حکومت ہند نے کسی قسم کی مداخلت سے انکار کر دیا تو اب ظاہر ہے کہ سر فضل حسین کی کیا چل سکتی تھی چنانچہ وہ بھی خاموش ہو رہے اور معذوری ظاہر کی۔

آخری تار | ان مسلسل کوششوں کے بعد محمد علی نے جنرل ہرٹزوگ کو ایک آخری تار دیا جو یقیناً ان کے قصر استبداد پر بجلی بن کر گرا ہوگا۔

محمد علی نے لکھا۔

"ہندوستان کی حکومت کو یہ سبق دینے پر کہ دوستانہ معروضات سے کسقدر توقع ہو سکتی ہے، بہت بہت شکریہ، ہم اب اس وقت آئیں گے جب آپ کو یہ سکھا دیا جائے گا کہ اسلام اور ہندوستان کا کس طرح احترام کیا جاتا ہے۔

محمد علی صدر خلافت"

کانگرس کی تجویز | اکتوبر ۱۹۲۹ء ہی میں آل انڈیا کانگرس کمیٹی کا ایک جلسہ لکھنؤ میں منعقد ہوا تھا جس میں آئندہ صدارت کانگرس کے لئے پنڈت جواہر لال کا انتخاب ہوا تھا، اسی جلسہ میں مسٹر سردجنی نائڈو نے ایک تجویز پیش کی جس کا مفاد یہ تھا کہ علی برادران کے داخلہ

جنوبی افریقہ پر جو پابندیاں عائد کی گئی ہیں، انھیں کانگرس سخت ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتی ہے، مسٹر ولبھ بھائی پٹیل اور دوسرے کانگرسی حضرات نے اس تجویز کی پرزور تائید کی اور بالآخر یہ منظور ہو گئی۔

توقعات | جنوبی افریقہ نہ جا کر محمد علی نے اپنی خودداری کو تو برقرار رکھا اور اسے کوئی صدمہ نہیں پہنچنے دیا، لیکن ایک دوسرا نقصان بھی کیا۔

مجلس خلافت کی مالی حالت عرصہ سے سقیم ہوتی جا رہی تھی وہ اگر وہاں جاتے تو یقیناً اتنا سرمایہ فراہم کر سکتے تھے کہ مجلس خلافت کی مالی حالت کسی نہ کسی حد تک استوار ہو جائے تاکہ اطمینان کے ساتھ وہ اپنے کام جاری رکھ سکے، چنانچہ ان کے ایک دوست انھیں لکھتے ہیں کہ

اسپیشل ٹرین کا انتظام | "غلام معین الدین صاحب ابھی آئے ہیں، یہ وہاں کی ینگ مسلم سوسائٹی کے سکرٹری ہیں، انھیں آپ کے افریقہ نہ جانے کا سخت افسوس ہے، وہ کہتے تھے کہ اگر آپ افریقہ پہنچ جاتے تو تین چار لاکھ آسانی سے فراہم ہو جاتا، انکا بیان ہے کہ آپ کے استقبال کے لئے ایک اسپیشل ٹرین کا انتظام کیا جا رہا تھا، اور جس عمارت میں آپ کے ٹھہرنے کا انتظام کیا گیا تھا وہ پچاس ہزار پونڈ کی لاگت سے تعمیر کی گئی ہے، آپ کے نہ پہنچنے سے مسلمانوں میں مایوسی پیدا ہو گئی ہے۔"

محمد علی پر ایک سنگین اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ وہ "زر پرست" بہت زیادہ تھے اس سے انکار نہیں کہ ان کی ضروریات روز افزوں اور ان کے افلاس و ناداری نے انھیں بہت شکستہ حال اور تہیدست کر رکھا تھا اور وہ دوستوں اور قدر دانوں کے

عطیوں کو قبول بھی فرمالیا کرتے تھے۔

مگر ایسا کبھی نہیں ہوا کہ اس مالی اعانت نے ان کے عقائد و خیالات میں کسی قسم کا تغیر کیا ہو، وہ رہین منت ہونے کے باوجود ہمیشہ آزاد رہے اور کسی پابندی کو کبھی قبول نہیں کیا، اگر ایسا ہوتا تو اسی افریقہ کے معاملہ میں تین چار لاکھ روپیہ پر اس آسانی سے وہ لات نہ مارتے۔

باب ۴۶

ساردا ایکٹ

محمد علی کی آخری جدوجہد ساردا بل کی تنسیخ پر منتہی ہوئی۔ اس بل کے خلاف وہ اگر سخت علیل اور صاحب فراش نہ ہوتے تو یقیناً اپنی پوری کوششیں صرف کرتے اور اسے منسوخ کراکے دم لیتے، لیکن اس سے پہلے انھوں نے دم ہی دیدیا!

ساردا بل کیا تھا؟ اجمیر کے مسٹر ہر بلاس ساردا نے اسمبلی میں ایک تجویز پیش کی کہ چونکہ علی العموم ہندوؤں میں یہ عادت قبیحہ پائی جاتی ہے کہ وہ نہایت کمسنی میں بچوں اور بچیوں کی شادی کر دیتے ہیں، جس کا اثر بچوں کی ذہنی اور جسمانی نشوونما، اخلاق وعادات اور صحت پر بہت برا پڑتا ہے، لہذا ایک ایسا قانون نافذ کیا جائے جس سے اس رسم کا انسداد ہو سکے۔

ساردا بل محدود تھا مگر اسمبلی کے ایک مسلمان ممبر نے اس بل کی تائید کرتے ہوئے فرمایا کہ اس بل کو محدود نہ رکھا جائے بلکہ عام کر دیا جائے، اور اسے ہندوستان کی ساری قوموں پر بلا استثنا نافذ کیا جائے، ان کی تحریک پر بل کو "منتخبہ مجلس" کے سپرد کیا گیا اور بالآخر ہوا یہ کہ اسے سارے ہندوستان پر نافذ کر دیا گیا اور اب قانوناً کہیں بھی کسی صورت میں بھی کسی نابالغ لڑکے یا لڑکی کا عقد نکاح نہیں ہو سکتا۔

محمد علی کا اختلاف پہلے پہل جب یہ بل اسمبلی میں پیش ہوا تو اس وقت علما میں سے کسی کو خیال بھی نہیں آیا، لیکن محمد علی نے اس وقت اس قانون کی مضرتوں کا اندازہ کر لیا تھا جو ان کے نقطۂ نظر سے نہایت اہم تھیں، اس لئے انھوں نے اسی وقت ہمدرد میں اس

پر مسلسل مقالات و مضامین لکھے اور قوم کو متوجہ کیا کہ وہ اس قانون کا مقابلہ کرے اور اسے ہرگز نہ منظور ہونے دے اگر ہندو اپنے ہاں اس قسم کے قانون کی ضرورت محسوس کرتے ہیں تو چشم ما روشن دل ما شاد، لیکن مسلمانوں کو الحمدللہ کہ اس قسم کی پابندیوں کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے اس لئے کہ ان کے ہاں اول تو یہ رسم بد پائی نہیں جاتی، اور اگر ان سے ایسا ارتکاب ہوتا ہے تو بالکل ناگزیر حالت میں۔

مسلمانوں میں خاموشی | لیکن ان مقالات اور صدائے احتجاج سے مسلمانوں میں کوئی حرکت نہیں پیدا ہوئی، وہ اسی طرح غافل رہے کہ جیسے سارد ابل پیش ہی نہیں ہو رہا ہے۔

اسی جمود و سکوت کی حالت میں یہ بل "مجلس منتخبہ" میں گھومتا رہا اور دوسری کارروائیاں ہوتی رہیں، شہادتیں لیجاتی رہیں اور کسی قسم کی کوئی صدائے احتجاج نہیں بلند ہوئی۔

مولٰنا احمد سعید کی شہادت | چنانچہ جمعیۃ العلماء ہند کے محترم ناظم جناب مولٰنا احمد سعید صاحب نے بھی اس "مجلس منتخبہ" کے سامنے شہادت دی تھی اور اس بل کی مخالفت نہیں کی تھی۔

بہرحال بل کی غالباً دو خواندگیاں ہوگئیں، اب تیسری خواندگی کا جب وقت آیا تو پھر ایک ہلچل مچ گئی، جمہور مسلمین میں بھی ایک خاص انہماک پیدا ہوگیا اور ملک کی دوسری جماعتیں بھی اس کے خلاف مصروف پیکار ہوگئیں چنانچہ جمعیۃ العلماء ہند اور مولٰنا احمد سعید صاحب نے بھی اس بل کی مخالفت میں بہت زیادہ جوش و سرگرمی کا اظہار کیا۔

محمد علی میدان عمل میں | محمد علی اس زمانے میں سخت علیل تھے مگر جب اس کی تیسری خواندگی بھی قریب آن پہنچی اور گورنمنٹ کچھ بھی متاثر نہیں ہوئی اور اسکا احتمال پیدا ہوگیا کہ وہ اب ضرور ہی پاس ہو جائے گا تو ایک بار پھر محمد علی میدان عمل میں آئے اور تحریر و

تقریر سے اور ہر ممکن ذریعے سے اس کی تنسیخ کی جد وجہد کی، گو نتیجہ کچھ نہیں نکلا!

خواندگی ختم

آخر تیسری خواندگی بھی ختم ہوگئی اور سارد ا بل مسلمانوں کی مخالفت اور سوراج پارٹی، پنڈت موتی لال، دوسرے ممبران اسمبلی اور بعض مسلم ممبران سوراج پارٹی کی حمایت سے منظور ہوگیا۔

منظوری کے بعد

بل کے پاس ہو جانے کے بعد مسلمانوں میں حرکت بھی پیدا ہوئی جوش بھی پیدا ہوا اور غیظ وغضب کی شکنیں بھی ماتھے پر پڑگئیں لیکن اب اس کا منسوخ کرانا اتنا آسان نہیں تھا جتنا سمجھا جا رہا تھا۔

محمد علی کو دوگونہ آفتیں

محمد علی کی ذات اس وقت اتنی قابل رحم تھی جتنی کبھی نہیں ہوئی تھی، بہت سخت علیل وہ تھے، کانگرس کے خلاف مصروف پیکار وہ تھے، گورنمنٹ کے خلاف وہ تھے، مسلمانوں کی مختلف جماعتیں ان سے الجھ رہی تھیں، اسی زمانہ میں جمعیۃ علماء بھی حریف کے کیمپ میں تبدیل ہوگئی تھی، غرض ہر طرف سے مقابلہ کی دعوت دی جا رہی تھی، اور زور بازو کا امتحان ہو رہا تھا۔

وہ غریب کس کس کو جواب دیتا کس کس سے لڑتا، لیکن پھر بھی اس کے پائے ثبات میں لغزش نہیں آئی اور وہ اسی استقلال سے اپنا کام پورا کرتا رہا، جو اس کی خصوصیت ممیّزہ تھی۔

قائم مقام وائسرائے کے نام خط

لارڈ ارون اس زمانہ میں ولایت گئے ہوئے تھے غالباً مدراس پریسیڈنسی کے گورنر لارڈ گوشن ان کے قائم مقام تھے انھیں نے اس قانون پر تصدیقی دستخط ثبت کئے تھے۔

محمد علی بمبئی میں اس وقت صاحب فراش تھے، لیکن اپنی علالت کی انھوں نے

کوئی پرواہ نہیں کی اور ایک نہایت طول طویل مفصل مراسلہ وائسرائے کی خدمت میں بھیجا، اس میں بہ دلائل مذہبی وفقہی یہ ثابت کیا تھا کہ کوئی مسلمان از روئے شرع مجبور نہیں ہو کہ ایک خاص عمر میں شادی کرے اور ایک خاص سن میں نہ کرے۔

دلائل اسلام نے مسلمانوں کو اس باب میں بالکل آزاد رکھا ہے اور انسان کے مصالح اور ضروریات پر چھوڑ دیا ہے، مثلاً ایک ضعیف العمر باپ بستر مرگ پر پڑا دم توڑ رہا ہو، اس کے صرف ۶ سال کی ایک لڑکی ہو اور کچھ جائداد ہے، وہ چاہتا ہے کہ اپنے سامنے کوئی ایسی صورت پیدا کرے کہ وہ اپنی بچی کی طرف سے مطمئن ہو جائے چنانچہ وہ اس لڑکی کا نکاح ایک لڑکے سے کر دیتا ہے اور یہ سمجھ کر کہ اب ضروری انتظامات مکمل ہو گئے، وہ مطمئن ہو جاتا ہے، اور مر جاتا ہے۔

اور پھر اس نکاح کے یہ معنی نہیں کہ لڑکی اور لڑکا مجبور ہیں کہ اسے "پیمان وفا" سمجھیں بلکہ بلوغ کے بعد ان دونوں میں سے ہر شخص کو اختیار ہو کہ وہ اگر اپنی اس ازدواجی زندگی کو پسند نہیں کرتا ہے تو الگ ہو جائے۔

اس لئے مسلمانوں کو اس قانون کی کوئی ضرورت نہیں ہو جبکہ وہ شرعاً آزاد بھی ہیں جو پابندیاں یا آسانیاں ضروری تھیں ان کا بھی شرع نے کافی لحاظ رکھا ہے، آخر میں اس پر تعجب کا اظہار کیا تھا کہ میاں سر فضل حسین نے مسلمان ہونے کے باوجود اس قسم کے قانون کو کیسے منظور کرانے کی کوشش کی، جو صاف طور سے "مداخلت فی الدین" ہے؟

وائسرائے کا جواب لیکن قائم مقام وائسرائے صاحب نے ان دلائل پر کوئی توجہ نہیں فرمائی اور قانون کو اپنے اختیارات سے منسوخ کرنے سے اپنی معذوری ظاہر کی، حالانکہ اگر بجٹ کا یا تخفیف مصارف کا مسئلہ ہوتا تو بغیر کسی تحریک کے "ہز اکسی لینسی" کا قلم "ویٹو" کے اختیار

سے فائدہ اٹھارہا ہوتا لیکن چونکہ ایسا مسئلہ تھا جس سے گورنمنٹ کو براہ راست کوئی تعلق نہیں تھا اس لئے اس پر "معذوری" ظاہر کی گئی۔

لارڈ اروِن سے ملاقات | کچھ عرصہ کے بعد لارڈ اروِن اپنے سفر یورپ سے واپس آ گئے۔ اب محمد علی کی صحت میں بھی کچھ بحالی آچکی تھی، چنانچہ اس مسئلہ کے متعلق وہ وائسرائے سے ملے اور ان کو بھی بہ دلائل سمجھانا چاہا کہ یہ مداخلت فی الدین ہے، اور گورنمنٹ کی پالیسی کے خلاف ہے، لہٰذا اسے منسوخ کر دینا چاہیے۔

وائسرائے کا جواب | لیکن ان تمام دلائل کو سننے کے بعد ہز ایکسیلینسی نے جواب دیا کہ مذہب و معاشرت کی حدود جہاں متصادم ہوں، وہاں ایک مہذب اور متمدن حکومت کا فرض ہے کہ وہ معاشرت کا خیال رکھے! اور آخر میں انتہائی خوش فہمی سے یہ امید بھی ظاہر کی گئی کہ امید ہے آپ لوگ بھی اس ضرورت کا سختی سے احساس فرماتے ہوں گے اور مجھ سے متفق ہوں گے۔

محمد علی کا جوش بیانی | اس جواب سے محمد علی کی طبیعت میں اشتعال پیدا ہوا اور اسی وقت انھوں نے نہایت جرأت و بیباکی سے لارڈ اروِن کی غلط فہمی رفع کر دی کہ آپ نے ہم لوگوں کے متعلق غلط اندازہ لگایا ہے، ہم قطعاً آپ کے ہمنوا نہ ہیں، نہ ہو سکتے ہیں اور اگر آپ اپنے اختیارات سے اس قانون کو منسوخ یا کم از کم مسلمانوں کو مستثنیٰ نہیں فرماتے ہیں تو پھر ہماری آپ کی جنگ ہے اور یہیں جاتے ہی اس قانون کی خلاف ورزی کروں گا، اور لوگوں کو اس پر آمادہ کروں گا کہ وہ بھی ایسا کریں۔

اس تقریر سے محمد علی کے بعض "سرکاری" رفقا کی جو حالت ہوئی وہ تو خیر ایک مصور کا موقلم ہی پیش کر سکتا ہے، اس لئے اس سے قطع نظر کر کے اصل مقصد کی طرف رجوع کیجئے۔

لارڈ اروِن کی "درخواست" | اس تقریر کے بعد لارڈ اروِن نے "درخواست" کی کہ

آپ اس قانون کے خلاف جو چاہئے کیجئے، لیکن قانون کے حدود میں رہ کر اور حصول مقصد کے لئے وہی زیادہ بہتر صورت ہوگی۔

محمد علی کا جواب | محمد علی نے جواب دیا کہ مذہب کے معاملہ میں قانون اور آئین میرے سنگ راہ نہیں بن سکتے اگر ضرورت ہوگی تو میں مذہب کے لئے قانون شکن بن سکتا ہوں، اس لئے اس قسم کا وعدہ نہیں کیا جا سکتا؛ اس گرما گرم گفتگو کے بعد محمد علی واپس چلے آئے اور اپنی عملی جدوجہد کا آغاز کر دیا جس کا ابھی پورے طور سے آغاز بھی نہیں ہوا تھا کہ خود محرک داعی اجل کو لبیک کہہ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدا ہو گیا۔

باب ۴۷

"علماء کانفرنس"

وفات سے ایک سال پیشتر محمد علی نے ایک جدید "علماء کانفرنس" کی تاسیس "جمعیۃ علماء ہند" کے مقابلہ میں کی تھی، ایسا کیوں ہوا؟ ذیل کے صفحات میں یہی جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے!

علماء پر محمد علی کے احسانات غدر سے پیشتر ہندوستان کا یہ گرامی قدر طبقہ جس قدر سرفرازیوں اور قدردانیوں کا مستحق تھا اس کا پورا پورا ثبوت ہندوستان کے مسلمانوں نے دیا، لیکن غدر کے بعد مسلمانوں کی عقیدت میں کمی آتی گئی اور رفتہ رفتہ علماء کے اقتدار کا انحطاط شروع ہو گیا اس کے اسباب و علل پر مفصل بحث کرنے کی نہ ضرورت ہے، نہ کوئی خوشگوار موضوع اس لئے اس سے قطع نظر کر کے اجمالاً یوں سمجھ لیجئے کہ علماء کی عام طور سے حالت یہ تھی کہ گوشہ عزلت میں بیٹھے ہوئے وہ صرف درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے تھے اور خود یہ فرائض کس نوعیت کے تھے اسے بھی چھوڑئے۔

انگریزی تعلیمیافتہ اب یہ کہتے ہیں کہ سیاست اور چیز ہے اور مذہب دوسری چیز، لیکن ان لوگوں نے اپنے طرز عمل سے اس دعوے کی دلیل مہیا کی۔

عموماً سوا اس کے کہ وہ لوگوں کو مسئلہ مسائل کی تعلیم دیں یا صوفی ہو جائیں یا اگر کوئی گستاخی کرے تو اسے کافر کہدیں، دوسرے فرائض و واجبات سے بہت کم دلچسپی لیتے تھے، چاہے مسلمانوں پر جتنی بڑی آفت کیوں نہ آجائے، چند مستثنیات سے قطع نظر کر کے بیشتر کی حالت

یہی تھی۔

سر یعقوب کا خیال | سر محمد یعقوب نے بالکل سچ کہا کہ

"محمد علی کی زندگی کے سب سے نمایاں اور درخشندہ دو کارنامے ہیں ایک مسلمانوں کی مذہبی جماعت میں بیداری اور سیاسی احساس پیدا کرنا ہے، حاشا وکلا اس سے میرا مقصود حضرات علمار کی کسی طرح کی تحقیر یا تنقیص ہرگز نہیں ہو، لیکن یہ امر واقعہ ہو کہ ہمارے علمار مذہبی زندگی مساجد اور عربی مدارس میں بسر کرتے تھے اور سیاسی میدان سے دہ کوسوں دور تھے، علامہ شبلی علیہ الرحمۃ کی کوشش سے ندوۃ العلمار کی تحریک کے سلسلہ میں علمار کی ایک جماعت کو ضروریات زمانہ کا کچھ احساس ضرور پیدا ہو گیا تھا اور دار العلوم ندوۃ العلمار کے طلبہ میں چند ایسے نوجوان عالم پیدا ہو گئے تھے جو مضطرانہ طور پر قدامت پرستی کی زنجیروں کو توڑنا چاہتے تھے، لیکن اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ گوشۂ عزلت میں بیٹھنے والے علمار کو سیاسی پلیٹ فارم پر لانا محمد علی ہی کی جادو اثر کوششوں کا نتیجہ تھا، علمار اسلام کی جادۂ عمل میں اس انقلاب کے پیدا ہونے سے جو محشر خیز نتائج آئندہ پیدا ہوں گے وہ ہمیشہ اس ملک کی تاریخ میں محمد علی کے نام کے ساتھ منسوب کئے جائیں گے۔"

جمعیۃ العلمار بہ حیثیت تبع کے | محمد علی کے مرشد مولٰنا عبد الباری مرحوم نے اس جمعیۃ کا سنگ بنیاد اپنے دست حق پرست سے رکھا اور رفتہ رفتہ اس جمعیۃ نے سارے ہندوستان میں اپنا اثر و اقتدار پیدا کر لیا اور سارے مسلمان اس کو وقعت کی نگاہوں سے دیکھنے لگے۔

سیاست کیا تھی؟ | لیکن اگر کوئی یہ سوال کرے کہ جمعیۃ کے قیام کے وقت سے ۲۹ء

تک برابر مسلسل، غیر منقطع طور پر جمعیۃ العلمار ہند کا سیاسی نظریہ کیا تھا؟ وہ کس اصول سیاست کی پابند تھی؟ کن سیاسی لائنوں پر وہ اپنی قوم رہنمائی کرنا چاہتی تھی؟ اس کا مختصر لیکن نہایت جامع و مانع جواب یہ ہو کہ اس کی پالیسی وہ تھی جو محمد علی کی تھی، اس کا نظریہ وہ تھا جو محمد علی کا تھا اور اس کی سیاسی لائن وہ تھی جو محمد علی کی اختراع کی ہوئی۔ ہر جزئی سے جزئی معاملہ میں، اہم سے اہم معاملہ میں، ہر نازک سے نازک وقت پر جمعیۃ العلمار نے بلا تامل و بلا تذبذب محمد علی کی رفاقت کی۔

"انکشاف راز" لیکن جس طرح عشق و محبت کا چھپانا مشکل ہو اسی طرح تقلید کا راز بھی آخر ظاہر ہو کر رہتا ہو، جمعیۃ العلمار کا یہ نہایت معقول رویہ کہ وہ محمد علی کو اپنا قائد سمجھ رہی تھی اور چونکہ اس کے محترم ارکان سیاست کے فن سے ناآشنا تھے اس لئے اگر محمد علی کی سیاست پر انھوں نے اعتماد کیا تو گناہ کیا ہو گیا؟ محمد علی بھی تو آخر عربی نہیں جانتے تھے" اور وہ برابر اپنے شکوک حضرت مفتی صاحب، مولانا احمد سعید صاحب وغیرہ سے رفع کر لیا کرتے تھے۔

لیکن مخالفین کو تو ایک موقع چاہئے چنانچہ انھوں نے جمعیۃ علمار کو "بدنام" کرنا شروع کیا کہ جمعیۃ علمار محمد علی کی تابع مہل ہے، اس کے (محترم) ارکان محمد علی سے لرزتے ہیں اور ان کے خلاف ایک حرف کہنے کی جرأت نہیں رکھتے، محمد علی نے ان سب پر اپنی سیادت قائم کر لی ہے اور جو جی میں آتا ہے جائز ناجائز، مناسب غیر مناسب، سب ان لوگوں سے کام نکال لیتے ہیں اور یہ لوگ ایسے "سادہ لوح" ہیں کہ آلۂ کار بن جاتے ہیں۔

غرض اس قسم کے سفیہانہ اور رکیک الزامات سے جمعیۃ علمار کو زیادہ سے زیادہ مشتعل کرنے کی کوشش کی گئی۔

"آزادہ روی" کا فیصلہ بعض لوگوں کا خیال ہو کہ اس قسم کے مسلسل اور مکروہ پروپیگنڈے

کا اثر یہ ہوا کہ جمعیۃ کے محترم ارکان کے دل میں بھی یہ بات جم گئی کہ یہ بدنامی بڑی حد تک صحیح ہے کہ جمعیۃ نے ابتک محمد علی کی حمایت ہی کی مخالفت کبھی نہیں کی لہذا اب ذرا مخالفت بھی ہو جائے۔

اس پروپیگنڈے کا یہانتک اثر ہوا کہ راقم الحروف نے خود جمعیۃ کے ایک محترم رکن سے یہ شکایت سنی کہ کوئی "عالم" بھی آجتک خلافت کا صدر ہوا ہے؟ پھر ہم جمعیۃ کا صدر محمد علی کو کیوں بنا دیں؟

بنائے اختلاف بدقسمتی سے اسی زمانہ میں جمعیۃ کا سالانہ جلسہ ہونے والا تھا اور صدارت کے لئے بعض حضرات کی طرف سے محمد علی کا نام پیش کر دیا گیا، اس موقع کو غنیمت سمجھ کر اسی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی گئی اور طے کر لیا گیا کہ محمد علی کی صدارت سے اختلاف کیا جائے گا اور اس میں پوری کوشش صرف کر دی جائے گی۔

مراد آباد کا جلسہ چنانچہ مراد آباد میں جمعیۃ کی مجلس مرکزیہ کا جلسہ ہوا اور اس میں صدارت کے لئے کشمکش شروع ہوئی، ایک جماعت تھی جو محمد علی کو صدر بنانا چاہتی تھی اور دوسری جماعت تھی جو ان کو کسی حالت میں بھی اس منصب گرامی کا اہل نہیں سمجھتی تھی، پہلے خوب گرما گرم بحثیں ہوئیں اور بعد کو پھر فیصلہ یہی ہوا کہ صدارت کے لئے محمد علی کا نام منظور نہیں کیا گیا۔

یہ تھی وہ پہلی مخالفت جو جمعیۃ العلماء اور اس کے محترم اراکین کی جانب سے علی الاعلان پبلک پر ظاہر ہوئی۔

محمد علی کا رویہ محمد علی ظاہر ہے کہ اس اختلاف اور اس فیصلہ سے خوش نہیں ہوئے اور انھیں یقیناً صدمہ ہوا کہ ان کو صدارت سے صرف اس لئے محروم کیا گیا کہ وہ سند یافتہ عالم نہیں تھے، ورنہ "بہت سے عالموں سے بڑھ کر" تو خود جمعیۃ کے محترم کارپرداز حضرات

بھی مانتے تھے۔

ایک دلشکن حملہ | صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ محمد علی کی قابلیت اور عربی استعداد پر بھی حملے کئے گئے۔

سنا ہے کہ جمعیتہ کے ایک محترم رکن نے برسر اجلاس فرمایا کہ محمد علی تو قرآن شریف تک غلط پڑھتے ہیں وہ صدارت کیا کر سکیں گے؟ گویا صدارت کے لئے صرف ونحو کی قابلیت بھی ضروری تھی؟ بہرحال ان دلشکن اور افسوسناک کارروائیوں کے بعد جلسہ برخاست ہوگیا، اور صدارت کے لئے ہندوستان کے مشہور مخدوم قوم اور خادم اسلام مولنا معین الدین صاحب مدظلہ کا انتخاب ہوا، جنھوں نے اس روش کے بعد صدارت قبول کرنے سے قطعاً انکار کردیا اور ممبری سے بھی استعفیٰ دیدیا۔

محمد علی کے رفقا | لیکن جن لوگوں نے محمد علی کا نام صدارت کے لئے پیش کیا تھا، وہ اس ناکامی کے بعد جس کی بنیا د صرف تنگ خیالی اور غلط فہمی تھی، خاموش کیسے بیٹھ سکتے تھے؟

انھوں نے کہا کہ جب جمیعتہ العلما کا دائرہ اس قدر تنگ ہے کہ اس کے اجلاس کا صدر محمد علی کا سا مجاہد راہ حق، عاشق رسول، شیفتہ مذہب، جانباز اسلام اور وسیع النظر عالم نہیں ہو سکتا تو یقیناً ایک جدید جمیعتہ العلما کی ضرورت ہے جس میں اس قدر تنگ دلی کا مظاہرہ نہ ہو سکے، ان کا یہ دعویٰ بھی تھا کہ علما کی اکثریت اس خیال کی حامی نہیں ہے، وہ ضرور اپنی مجلس کا صدر نشین محمد علی کو بنانا چاہتی ہے۔

کانپور علما کانفرنس | چنانچہ کانپور میں ایک جدید جمیعتہ العلما کی تاسیس وقوع میں آئی اور اس کے دائرہ عمل کو بہ نسبت اس جمیعتہ العلما کے ذرا زیادہ وسیع کر دیا گیا تاکہ مسلمانوں کی ہر جماعت اور طبقہ اس سے اشتراک عمل کر سکے، مولنا عبدالماجد صاحب بدایونی، مولنا

عبدالکافی، مولنا قاری شاہ سلیمان پھلواروی، مولنا قطب الدین صاحب عبدالوالی، اور دوسرے مشہور علماء نے ایک دوسری جمعیتہ کے قیام پر آمادگی کا اظہار کیا۔

اجلاس | آخر کانپور میں دسمبر ۲۹ء میں "علماء کانفرنس" کا اجلاس محمد علی کی صدارت میں شروع ہوا اور خیر و خوبی سے ختم ہوا۔

حاضرین | داخلہ ٹکٹ سے تھا، حاضرین کی تعداد پانچ ہزار سے کسی طرح کم نہیں تھی، اگرچہ باد و باراں کی کثرت نے حواس پریشان کر رکھے تھے، لیکن جوق جوق کانپور اور دوسرے مقامات سے لوگ آکر شریک اجلاس ہو رہے تھے، جن میں سے ایک محمد علی کا یہ سوانح نگار بھی تھا جس نے اس جلسہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

تحریک و تائید | مولنا عبدالماجد صاحب بدایونی نے صدارت کے لئے محمد علی کا نام پیش کیا، اور جدید جمعیتہ العلماء کے قیام و تاسیس کی ضرورت اور سابق جمعیتہ کے طرز عمل پر ایک مفصل تقریر کی، پھر محمد علی کا استحقاق جتایا اور بتلایا کہ محمد علی اپنی خصوصیات کی بنا پر اس منصب رفیع کے کس قدر زیادہ بہ نسبت دوسروں کے مستحق ہیں۔

تائید کرنے والوں میں مولنا عبدالکافی علامہ ثقۃ الاسلام (ببمبئی)، قطب الدین عبدالوالی صاحب مولنا اعجاز حسین پرنسپل مدرستہ الواعظین (لکھنؤ)، مولنا فاخر اور ہندوستان کے بیسیوں محترم علماء تھے۔

آپ باور فرمائیے کہ تحریک و تائید کا ایسا عجیب و غریب منظر کم دیکھا گیا ہوگا۔

اتنے علماء نے اپنی مختصر مختصر تقریروں میں محمد علی کی صدارت کی تائید کی کہ پہلے اجلاس میں دوسری کارروائی کا وقت ہی نہیں رہا، سارا وقت اسی تائید میں صرف ہوگیا، محمد علی کی عظمت و جلالت کا اندازہ کرنے کے لئے یہ کافی ہے کہ گروہ علماء کی اتنی

بڑی جماعت نے ان کی ہمنوائی کی، ان کو صدارت کا منصب بخشا اور ان کے مقابلہ میں ایک دوسری جمعیۃ قائم کردی، اتنا بڑا ہنگامہ انھیں شخصیتوں کے لئے ہوتا ہے جو غیر معمولی جوہر کمال اپنے اندر رکھتی ہیں۔

خطبۂ صدارت | اس تائید و تحریک کے بعد محمد علی بالکل عربی وضع میں عبا پہنے، عمامہ باندھے، کرسی صدارت پر رونق افروز ہوئے اللہ اکبر کے نعروں کے ساتھ مجمع نے اپنی مسرت بے پایاں کا اظہار کیا۔

لیکن ان کی حالت کیا تھی؟ ایک دوسرے آدمی کے سہارے سے وہ کرسی پر تشریف لا سکے، کمزوری اور ناتوانی کا یہ عالم تھا کہ خود اپنا خطبۂ صدارت نہ پڑھ سکے، ایک دوسرے صاحب نے سنایا جس کا ایک اہم جزو یہ ہے، علماء کو مخاطب کرکے فرماتے ہیں۔

"کیا تفقہ فی الدین کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہوگیا؟ دنیائے اسلام ائمہ اربعہ کی ہمیشہ ہمیشہ ممنون احسان رہے گی کہ انھوں نے تفقہ فی الدین سے کام لے کر فقہ اسلام کو مرتب فرمایا، لیکن کیا انھیں کی درخشندہ مثال ہمارے لئے شمع ہدایت کا کام نہیں دیتی؟

میری غرض صرف اس قدر ہے کہ آپ کو یاد دلاؤں کہ اجتہاد کا دروازہ آپ لاکھ بند کریں، زندگی کا دروازہ آپ تاقیامت نہیں بند کرسکتے اور جب تک یہ دوسرا دروازہ کھلا ہوا ہے ہزاروں نئے مسائل آپ کے سامنے ایسے آئیں گے کہ ان کا حل آپ کو کرنا ہوگا اور اگر آپ نہ کریں گے تو ہم جیسے امی اور جہلا ان کا حل کرنے پر مجبور ہوں گے، یہ وہ مسائل نہیں کہ جو ائمہ اربعہ کے سامنے پیش ہو چکے تھے اور جن کا حل انھوں نے قرآن کریم اور

احادیث نبوی کے تفقہہ سے خود فرمایا تھا، یہ وہ نئے مسائل ہیں جو زندگی کی روز افزوں پیچیدگی کے باعث پہلی بار نوع انسانی کے سامنے آتے رہتے ہیں اور ان کے حل کرنے سے خواہ وہ حل صحیح ہو یا غلط انسان گریز نہیں کر سکتا، کیا آپ چاہتے ہیں کہ ان کا حل ہم جیسے امی اور جاہل کریں جنھیں نہ قرآن کریم پر عبور ہے نہ احادیث نبوی پر، یا آپ جیسے علماء کرام جنھوں نے اپنی زندگیاں انھیں کے مطالعہ کیلئے وقف کر دی ہیں، میں نہایت ادب سے عرض کرونگا کہ اس قسم کے اجتہاد سے اجتناب ہی نے ہماری آج یہ حالت کر دی ہے کہ ہم عہد حاضرہ کے فتنوں میں مبتلا ہو گئے ہیں اور جوں جوں ان سے نکلنا چاہتے ہیں اور ان میں گرفتار ہو جاتے ہیں، جس فلسفی شاعر نے ملت اسلامیہ کو رمز حیات سکھایا ہے اس کے یہ بھی شعر ہیں۔

بزم اقوام کہن برہم ازو — شاخسار زندگی بے نم ازو

جلوۂ اش مارا زما بیگانہ کرد — ساز مارا از نوا بیگانہ کرد

از دل ما آتش دیرینہ برد — نور و نار لاالہ از سینہ برد

اگر ہم نے عہد حاضرہ کے فتنوں کا نور و نار لاالہ سے مقابلہ کیا ہوتا اور اجتہاد وجہاد دونوں کو جاری رکھا ہوتا تو آج ہم اس زمانہ انحطاط تک نہ پہنچے ہوتے۔"

باب ۴۸

لاہور کا قومی ہفتہ

کانپور کی علماء کانفرنس کے بعد آخر دسمبر ۲۹ئہ میں محمد علی نے لاہور کا رخ کیا، جہاں قومی ہفتہ منایا جا رہا تھا اور کانگرس و خلافت کے سالانہ اجلاس ہو رہے تھے۔

گاندھی جی سے گفتگو کانگرس کا یہ سالانہ جلسہ نہایت اہم تھا، کلکتہ میں گاندھی جی نے وائسرائے اور برطانیہ کو ایک سال کی جو "مہلت" دی تھی وہ ختم ہو گئی تھی اور اب دریائے راوی کے کنارہ آزادی کامل کا پرچم لہرایا جانیوالا تھا، اس لئے کہ اس مہلت سے گورنمنٹ نے کچھ بھی فائدہ نہیں اٹھایا، اور ہندوستان کو درجہ مستعمرات نہیں دیا۔

لیکن محمد علی نے کانگرس کے فیصلہ اور خلافت کی آئندہ پالیسی متعین کرنے سے پیشتر گاندھی جی سے آخری گفتگو کر لینا ضروری خیال فرمایا۔

چنانچہ وہ گاندھی جی سے ملے اور انکو سمجھایا کہ اگر اب بھی آپ عام مسلمانوں کے مطالبات منظور کر لیں اور شکایات رفع کر دیں تو ہمارا اشتراک عمل حاصل کر سکتے ہیں اور پھر نہایت ہم آہنگی سے مسلمان آپ کا ساتھ دیں گے اور دونوں ساتھ ہی ساتھ منزل مقصود کی طرف روانہ ہوں گے۔

گاندھی جی کا جواب لیکن گاندھی جی اس وقت "کامل آزادی" کے خیال میں تھے وہ اپنی راہ عمل میں کسی قسم کی پابندیاں حائل نہیں ہونے دینا چاہتے تھے، انھوں نے انکار کر دیا اور کہدیا کہ اب تو ہم آزادی کامل کے لئے اپنی جدوجہد کا آغاز کرنیوالے ہیں لہذا

اس وقت تو آپ غیر مشروط طور سے ہمارا ساتھ دیجئے، پھر آزادی حاصل کرنیکے بعد آپ کے مطالبات پر غور کیا جائے گا اور حقوق کی تقسیم ہوتی رہے گی لیکن ابھی یہ ممکن نہیں ہے،

محمد علی پر اثر | اپنی کوششوں کی ناکامی سے محمد علی بہت مایوس ہوئے اور اب ان کے لئے کوئی چارۂ کار نہیں باقی رہ گیا کہ وہ کانگرس کیساتھ اشتراک عمل کر سکیں۔

اس لئے کہ آزادی کامل و ناقص کے متعدد دوران کے سامنے تھے اور وہ خوب سمجھتے تھے کہ یہ

بہ مرگش گیر تا بہ تپ راضی شود

کے ہمہ گیر اصول کے مطابق صرف درجۂ مستعمرات لینے کی تیاریاں ہیں، اس لئے وہ تصفیہ حقوق پر مصر رہے اور آخر مجبوراً انھیں اپنی راہ عمل الگ متعین کرنی پڑی۔

خلیج اختلاف | لاہور کے قومی ہفتہ سے جو آگ سلگ رہی تھی بھڑک اٹھی اور مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ کانگرس سے اپنا رشتہ منقطع کرکے خود اپنے اندر اتحاد و اتفاق پیدا کرے اور اسکے بعد اپنی منزل مقصود کی طرف رجعت کرے۔

اجلاس کے اختتام کے بعد بھی اور اس سے پہلے بھی محمد علی پر بہت زور ڈالا گیا کہ وہ "غیر مشروط" طور پر ہتھیار ڈالدیں، مگر انھوں نے انکار کر دیا۔

اختلاف مسلمانوں میں | جو مسلمان کانگرس کے ہمنوا تھے وہ خلافت کانفرنس کے اس فیصلہ کے بعد اور کانگرس سے علیحدگی کے بعد بہت برہم ہوئے اور آپس کے یہ اختلافات روز بروز بڑھتے گئے محمد علی پر رجعت پسندی کا الزام بھی لگایا گیا۔

مگر وہ ان چیزوں سے متاثر نہیں ہوئے، مسلمانوں کے دلوں میں آزادی کا بیج محمد علی نے بویا تھا، مسلمانوں کو گورنمنٹ کے خلاف محمد علی ہی نے صف آرا کیا تھا اور

مسلمانوں میں ایثار و قربانی کے جذبات محمد علی ہی نے پیدا کئے تھے اگر وہ اپنے ضمیر کی پیروی میں کانگرس سے علیحدہ ہوئے تھے تو اس کے یہ معنی نہ تھے کہ وہ رجعت پسند ہو جاتے یا حکومت کے دام فریب میں پھنس جاتے۔

ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں　　　جسے غرور ہو آئے کرے شکار مجھے

باب ۴۹

گول میز کانفرنس

کانگرس کے متعلق محمد علی کے تاثرات وخیالات اور محسوسات وجذبات کا ذکر ہو چکا ہے، یہ بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ وہ کیا اسباب تھے جنھوں نے انھیں بالآخر کانگرس سے دل برداشتہ کر دیا۔

دعوت کیوں قبول کی محمد علی نے اپنی خطرناک علالت کے باوجود یہ طول طویل زحمت سفر کیوں برداشت کی اور کیوں نہ جانے سے معذوری ظاہر کر دی، یہ ایک سوال پیدا ہو سکتا ہے لیکن محمد علی کے لئے اس کے سوا چارہ کار کیا تھا؟ کانگرس کی جو روش تھی اس سے وہ مایوس ہو چکے تھے، گول میز کانفرنس کے لئے جن مندوبین کا انتخاب عمل میں آیا تھا، ان میں ایک بھی ایسا نہ تھا جو محمد علی کی طرح قوم کا درد اپنے دل میں رکھتا ہو، یا محمد علی کے خیالات ومعتقدات سے اتفاق رکھتا ہو، اس لئے بجا طور سے انھیں خیال تھا کہ گول میز کانفرنس میں بغیر ان کے گئے ہوئے مسلمانوں کی صحیح ترجمانی نہیں ہو سکتی، اپنے ان خیالات کا اظہار انھوں نے اپنے مکتوب بنام مولنا عبدالماجد صاحب دریابادی میں بھی کیا تھا، لوگوں نے لاکھ لاکھ سمجھایا نشیب وفراز کی طرف رہنمائی کی صحت کے خطرات سے آگاہ کیا، سب جتن کئے مگر محمد علی جو عزم کر چکے تھے اس سے انھوں نے رجوع نہیں کیا، ان کا تو اس پر عمل تھا۔

ناصح کہے سنے پہ ہمارا نہیں عمل — جو دل میں آگیا وہ کیا کوئی کچھ کہے

مظاہرہ کا اندیشہ محمد علی کی خبر روانگی جب مشہور ہوئی تو بمبئی کے بعض مدعیان

حریت نے یہ طے کر لیا تھا کہ وہ مندوبین گول میز کانفرنس کو سیاہ جھنڈیوں کے ساتھ الوداع کہیں گے اور اس کے انتظامات بھی مکمل ہو رہے تھے اور اعلان کر دیا گیا تھا کہ مندوبین کی روانگی کے روز مظاہرہ کیا جائے گا۔

مسلمانان بمبئی اس خبر سے سخت مشتعل ہوئے وہ اسے کسی طرح برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ ان کے محترم رہنما کو سیاہ جھنڈیوں کے ساتھ ساتھ الوداع کہا جائے، انھوں نے بھی پورے طور سے طے کر لیا تھا کہ وہ اپنے اس سردار کو پھولوں اور ہاروں اور اللہ اکبر کے نعروں کے ساتھ الوداع کہیں گے، خواہ اس میں تصادم ہی کیوں نہ ہو جائے۔

اس "خبر وحشت اثر" نے مخالفین کے کیمپ میں تہلکہ ڈال دیا اور مجبوراً یہ ارادہ فسخ کر دینا پڑا، محمد علی بجائے سیاہ جھنڈیوں کے اپنے بہت سے مخلصوں اور عقیدت کیشوں کی دل سے نکلی ہوئی دعاؤں کے ساتھ روانہ ہو گئے، مشتاقان زیارت اس وقت تک جہاز کی طرف ٹکٹکی لگائے رہے جبتک جہاز آنکھوں سے اوجھل نہیں ہو گیا۔

تبادلہ خیالات | یہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ محمد علی کس حال زار کے ساتھ لندن پہنچے تھے لیکن چونکہ دل سے کام کی لو لگی ہوئی تھی اس لئے انھوں نے اپنی صحت سے بے نیاز ہو کر مستعدی اور کارگزاری کی انتہا کر دی، وزرا و امرا، اور مدیران جرائد سے مسلسل تبادلۂ خیالات کیا، انھیں ہندوستان کے حالات بتائے، سیاسی پیچیدگیاں سمجھائیں، ہندو مسلم اختلافات کی سیاسی اہمیت بتلائی، غرض تمام حالات آئینہ کر کے رکھ دیے۔

مکتوب بنام مولنا عرفان | اپنے ایک خط میں جو مولنا عرفان صاحب کو لکھا گیا تھا، پہلے تو اپنی علالت کا مفصل تذکرہ کیا ہے، پھر فرمایا ہے کہ۔

"اس پر بھی وہ کام کر رہا ہوں جو نہ کسی سے ہو سکتا ہے، نہ کرتا ہے۔ با اثر

محمد علی کی شخصیت | محمد علی نے جب میدان سیاست میں قدم رکھا، تو اسے میدان خالی نہیں ملا، قبل و بعد ہر زمانہ میں رقیبوں اور حریفوں کی گرم بازاری رہی، مخالفوں اور دشمنوں کی جماعت کی جماعت اسے تمام سامان اسلحہ سے مسلح ملی، لیکن جب وہ آسمان سیاست وصحافت سے طلوع ہوا، تو اس کی ضیا باریوں سے ایک عالم جگمگا اٹھا اور دوسرے ستارے ماند پڑ گئے! گلشن وطن میں اس کی نکہت بیزیوں نے باغ و چمن کے ہر گوشہ کو معطر بنا دیا، پر دوسرے پھولوں کی خوشبو جاتی رہی، نیستان سیاست و قیادت میں وہ جب ایک شیر کی طرح دھاڑا توشغال و روباہ نے بھٹ تلاش کرنے شروع کر دئے! اس کے سامنے کوئی بھی پیش نہ پاسکا، یہ داغ بڑا سخت تھا اور اسی داغ نے محمد علی کے سیکڑوں دشمن پیدا کر دئے۔

ہمہ گیر اختلاف | ان دشمنوں نے اس کی زندگی اجیرن کر دی وہ اگر دن کو دن کہتا تھا تو یاران بزم اسے شب بلا ثابت کرنے میں اپنی پوری طاقت صرف کر دیتے تھے، جب وہ کہتا تھا کانگرس سے تعاون کرو تو ایوان تبلیغ سے یہ صدا بلند ہوتی تھی کہ یہ مسلمانوں کے ساتھ دشمنی اور اسلام کے ساتھ غداری ہے، کانگرس میں شریک ہونا اپنے مذہب اور اپنی قوم کے ساتھ دشمنی کرنا ہے، پر جب اس نے کانگرس سے تعاون ممنوع قرار دیا تو پھر اسی ایوان تبلیغ سے صدا بلند ہوئی کہ "کانگرس سے علیحدگی مسلمانوں کی سیاسی خودکشی ہے"

میں ہوا کافر تو وہ کافر مسلماں ہو گیا!

جب اس نے ابن سعود کی حمایت کی تو ایک ہنگامہ بپا ہو گیا اور جب اس نے اپنی تحقیقات کے بعد مخالفت کی تو اس کے مخالف پھر اس کے مخالف ہو گئے، جو اس نے کہا دوسروں نے اس کی تردید کی۔

غرض وہ جب تک زندہ رہا اس کی مخالفت کے لئے ایک جماعت تیار رہی اس کو

ذلیل کرنے کے لئے ایک گروہ ہمہ تن مستعد رہا اور جب وہ مرگیا تو آج وہ انہیں مخالفین کی نظروں میں "رئیس الاحرار" ہے، سید قوم ہے، مخدوم ملت ہے، شہید راہ حریت ہے وفاکیش و وفاپرست ہے، رہنما ہے، قائد ہے، ولی ہے، سب کچھ ہے مگر آج سے ایک سال پہلے وہ غدار کے سوا کچھ نہ تھا، فیاللعجب!

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ!

مسلسل پروپیگنڈا محمد علی کے خلاف جتنا پروپیگنڈا ہوا شاید دنیا میں کم کسی کے لئے ہوا ہوگا، مسلم اخبارات نے اس پر "النباء العظیم" "حدیث الغاشیہ" اور طرح طرح کے مقالات افتتاحیہ "سپرد قلم کئے اور ہر طرح اس کی قبار قیادت کی دھجیاں فضاء آسمانی میں بزعم خود اڑائیں اور ہندو اخبارات نے اس پر اپنی مشق قلم کی انتہا کردی، قوم فروش، غدار ملک، بدعقل بددماغ، بدزبان، دیوانہ ملا، اور اس طرح کے بیسیوں خطابات والقاب سے یاد کیا۔

جب وہ کانگرس کا حامی تھا تو مسلم اخبارات اس پر زبان طعن دراز کر رہے تھے، اس پر سب وشتم کی بوچھار کر رہے تھے اور اسے اسلام وملت اسلامیہ کا اعدا عدو بلکہ الد الخصام ثابت کر رہے تھے اور بڑے فخر سے اظہار فرماتے تھے کہ ہم نے محمد علی کی قیادت کا خاتمہ کردیا اور جب اس نے کانگرس سے اختلاف کیا تو سارا ہندو پریس اس کا مخالف ہوگیا، کانگرسی مسلمان اخبارات اس کے دشمن ہوگئے، حتی کہ ایسوسی ایٹیڈ پریس اور فری پریس تک نے اس کے متعلق وہ وہ انکشافات کئے کہ دنیا انگشت بدنداں رہ گئی، مگر نہ ان خبر رساں ایجنسیوں کو اس کذب مبین کی نشر واشاعت سے شرم آئی اور نہ ان اخبارات کو جنہوں نے ان خبروں کی نشر و تبلیغ بڑی بڑی "سنسنی خیز" سرخیوں کے ساتھ چار چار اور پانچ پانچ سطروں کے عنوانات کے ساتھ کی، ان خبر رساں ایجنسیوں کا وظیفہ حیات محمد علی کے

متعلق بے سروپا خبروں کا اجرا ر تھا اور ان اخبارات کا مشغلہ تفریح ان کی اشاعت۔

ہر شخص خوش تھا کہ اس نے محمد علی کا خوب مقابلہ کیا، اور ہر اخبار اعلان کرتا تھا کہ محمد علی کی زندگی پر جیسی روشنی "کتاب وسنت" کی روشنی میں وہ ڈال سکتا ہے، اور کوئی اس کار اہم کو اس حسن وخوبی کے ساتھ نہیں انجام دے سکتا! اور پھر صرف ہندوستان ہی میں نہیں، ممالک غیر میں اس کے خلاف پمفلٹ شائع کئے گئے، مضامین لکھے گئے، اور طرح طرح کے عجیب وغریب الزامات لگا کر اسے ہر طرح سے "دشمن انسانیت" ثابت کیا گیا اور نہایت اطمینان ومسرت سے بغیر دل کی دھڑک اور قلب کے اضطراب کے!

تہمت تراشیاں

پھر اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا کہ اس کے اوپر طرح طرح کے الزامات لگائے گئے ہوں اور خاموشی اختیار کر لی گئی ہو، اس کو گالیاں دی گئی ہوں اور صبر کر لیا گیا ہو، اس کو غدار قوم وملک ثابت کیا ہو اور اطمینان حاصل ہو گیا ہو، اسے دشمن کانگرس یعنی دشمن اسلام مشہور کیا گیا ہو اور اس پر قناعت بھی کر لی گئی ہو بلکہ اس سے ایک قدم اور آگے بڑھایا گیا، اس پر ہر قسم کے جائز وناجائز، مناسب اور غیر مناسب، صحیح اور غلط اتہامات لگائے گئے، تہمتیں لگائی گئیں، کبھی یہ مشہور کیا گیا کہ وہ امیر افغانستان سے سازباز کر رہا ہے، اور عنقریب ہندوستان پر حملہ کرانے والا ہے، اور اس شبہ کو اتنی تقویت دی گئی کہ سر سپرو اور مالوی جی نے گاندھی جی کو پوری شدومد سے یقین دلانا چاہا، اور جب انھیں باور نہیں آیا تو پھر اس زمانہ کے وائسرائے لارڈ ریڈنگ کے مشکوئے معلیٰ تک یہ خبر وحشت اثر پہنچا کر اپنی مظلومیت اور وفاداری کی داد چاہی گئی اور اس خطرہ کے انسداد کے لئے ہز ایکسیلنسی کی توجہ مبذول کرائی گئی۔

کبھی یہ الزام لگا یا کہ محمد علی صوبۂ سرحد، سندھ اور پنجاب وغیرہ کے اتنے حامی کیوں

ہیں، ہو نہ ہو اس میں کوئی اہم بات پوشیدہ ہے اور وہ سوا اس کے اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ اتحادِ اسلامی کی کوشش کر رہے ہیں اور اس طرح جب وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب ہو جائیں گے تو پھر ہندوستان پر کسی اسلامی حکومت کا قبضہ کرا دیں گے اور اگر یہ فرضِ محال ایسا نہ ہو سکا تو یہ ضرور ہے کہ وہ مسلم راج قائم کریں گے اور ہندوستان کی "مرکزی حکومت" کو سخت نقصان پہنچائیں گے کبھی از راہ غایت محبت و شفقت نہایت ہمدردی اور افسوس کے لہجہ میں یہ شائع کیا گیا کہ محمد علی مسلم یونیورسٹی کی پرو وائس چانسلر شپ کو قبول کرنے پر آمادہ ہیں اور عنقریب ملت ان کی "رہنمائی" سے محروم ہو جائے گی، وہ تو تردید کر رہے ہیں لیکن اخبارات ہیں کہ تردید کے بجائے صل "افواہ" مزے لے لے کر شائع کر رہے ہیں اور خوش ہو رہے ہیں کہ بڑی قومی خدمت ہم سے انجام پا رہی ہے۔

قیادت کا اعتراف لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اس سخت ترین افتراق و اختلاف کے ہوتے ہوئے بھی محمد علی کی قیادت کا ہمیشہ سب کو اعتراف رہا، کسی نے بھی ان کی خصوصیات قیادت سے انکار نہیں کیا، منکر سب رہے، لیکن جب کوئی وقت پڑا تو اسی آبرو باختہ، بد دماغ، بد زبان لیڈر کو بلایا گیا، اسی کے دامن تدبر میں پناہ لی گئی، اسی سے قیادت و رہنمائی کی التجا کی گئی اور جب وہ "وقت بد" گزر گیا تو پھر آزاد، پھر بے باک، پھر سب و شتم میں طاق، پھر محمد علی کے مخالف، پھر اس کی قیادت کے دشمن اور پھر خود سب سے بڑے مدبر سب سے بڑے قائد، سب سے بڑے رہنما سب سے بڑے مصلحت شناس اور دور اندیش، ہمدردِ قوم اور بہی خواہ وطن، پروانۂ شمع حرم، اور اسیرِ دامِ بت پرفن۔

اسی طرح جب کوئی نازک مرحلہ درپیش ہوا تو محمد علی کی یاد آئی اور جب وہ مصیبت ٹل گئی تو پھر محمد علی کی مخالفت طرۂ امتیاز و افتخار!

کانگرس کی صدارت محمد علی کے اعتراف قیادت کا سب سے بڑا ثبوت ان کی صدارت کانگرس ہے اور وہ بھی بالاتفاق و بالاجماع۔

کانگرس میں دو تین سال کی شرکت کے بعد یہ "عہدۂ بلند" کسی کو نہیں ملا لیکن محمد علی نے یہ "شرف" حاصل کیا، اور دو ہی تین سال کی قلیل مدت میں؟ باخبر حضرات واقف ہیں کہ یہ عہدہ کن کن مصیبتوں اور آزمائشوں کے بعد ملتا ہے۔ مگر محمد علی بغیر کسی کوشش کے نہایت قلیل عرصہ میں صدر منتخب ہوئے اور وہ بھی اس حالت میں کہ ان کی "کنویسنگ" کرنے والا بھی کوئی نہیں تھا، اس لئے کہ وہ جیل میں تھے پھر جب رہا ہوئے تو یہ خبر سنی کہ بالاتفاق تمام صوبہ کانگرس کمیٹیوں نے آپ کو صدر منتخب کیا ہے، اور کوئی ہوتا تو۔

بریں مژدہ گرجاں فشانم رواست

کہہ کر کچھ دیر کے لئے توضرور کسی دوسرے عالم میں پہنچ جاتا، لیکن محمد علی کی حالت دوسری تھی، انھوں نے کانگرس کی صدارت قبول کی اور "لاغالب الا اللہ" اور "بسم اللہ" سے اپنا خطبہ صدارت شروع کیا، اپنی صدارت ہی کے زمانہ میں انھوں نے یہ اعلان کیا کہ ایک مسلمان کی حیثیت سے میں ایک فاسق و فاجر مسلمان کو گاندھی جی سے اچھا سمجھتا ہوں، جس پر ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا، لیکن وہ یہی کہے گئے اور اس اختلاف و مخالفت کی بالکل پروا نہیں کی۔

لیڈر گر محمد علی اس کی ایک طرف تو مخالفت ہوتی رہی، دوسری طرف اس کے قدم لئے جاتے رہے، عقیدت کی آنکھیں اس کی راہ میں بچھتی رہیں، اسکا اقتدار، اسکی شہرت، اور اس کی ہمہ گیر قیادت کا ڈنکہ بج رہا تھا اور ہر شخص اس کے جوہر کمال کا معترف تھا۔

جس زمانہ میں اس کی قیادت کا شباب تھا اس نے سیکڑوں ذروں کو آفتاب بنا کر چھوڑ دیا، سادات بارہہ اور بعض شعرائے دہلی و لکھنؤ کو اگر یہ افتخار حاصل ہے کہ اول الذکر حضرات جسے چاہتے تھے بادشاہ بنا دیتے تھے اور مؤخر الذکر بزرگ جسے چاہتے ایک نظر کیمیا اثر ڈال کر شاعر بنا دیتے تھے، اسی طرح خدا نے محمد علی میں یہ ملکہ ودیعت کیا تھا کہ جس پر انکی نظر پڑ گئی وہ خاک سے پاک ہو گیا اور دیکھتے دیکھتے لیڈری کا تمغہ اسے حاصل ہو گیا اور پھر بعد کو اسی نے سب سے زیادہ محمد علی کی مخالفت کی۔

دشمنوں کا نرغہ محمد علی اپنی رائے کے اظہار میں، دوستوں کی نکتہ چینی میں، دشمنوں کی سرکوبی میں کسی شخص سے، کسی جماعت سے کسی قوت سے نہیں ڈرتے تھے۔ تقریر میں ان کی زبان تلوار کا کام کرتی تھی، تحریر میں انکا قلم نیزے سے کم نہ تھا، اس وجہ سے ایک زمانہ انکا دشمن تھا، مقتدر افراد نے با اثر جماعتوں نے، اولعزم حکومتوں نے انھیں بدنام کرنے کی جتنی کوششیں کیں وہ شاید ہی کسی اور کے خلاف کی گئی ہوں۔ ان کی ذات کو ان کے خیالات کو ان کے عمل کو حریفوں نے بیدردی سے مسخ کر کے دکھایا اور آجتک دکھا رہے ہیں۔

پھر بھی عام مقبولیت ان تمام باتوں کے باوجود محمد علی کی عام مقبولیت بدستور باقی رہی، عوام اب تک اس کی جے کا رے بھرتے ہیں اور اسے اپنا صحیح رہنما مانتے ہیں، رہے خواص تو کچھ حامی، کچھ مخالف، کچھ دعا گو! بہر حال اس ہنگامہ میں محمد علی کی شخصیت گم ہو کے رہ گئی۔

لیکن اگر نظر تعمق سے دیکھا جائے تو اندازہ ہوگا کہ وہ آخر وقت تک زعیم رہا، گو اس کے خلاف سارا جہان صف آرا رہا، اس نے اپنی قوم کو جو حکم دیا، قوم نے اسکی اطاعت

کی۔ اگر گذشتہ تحریک کے متعلق چاہے جتنے اعداد و شمار پیش کئے جائیں لیکن یہ واقعہ ہے
کہ مسلمان من حیث القوم نہیں شریک ہوئے۔

ان تمام حقیقتوں پر غور کرنے کے بعد عقل اسی نتیجہ پر پہنچتی ہے کہ محمد علی سب سے زیادہ کامیاب لیڈر تھا۔ لیکن سب سے زیادہ بدنصیب! اس نے جو چاہا وہ ہوا۔ لیکن جو کہا اس کی مخالفت ہوئی! اس نے جب اپنی قوم کو مصروف عمل کیا وہ مصروف عمل ہوئی لیکن مخالفین کا گروہ اسے گالیاں دیتا رہا! یہ ہے محمد علی کی چند سالہ جد و جہد کا ایک مرقع۔

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کیلئے

تلاشِ حق

مہاتما گاندھی کی خود نوشت سوانح حیات

مترجمہ

ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے، پی ایچ ڈی۔

یہ وہ کتاب ہی جس کے مطالعہ سے معلوم ہو سکتا ہی کہ کیوں دُھن کے پکّے گاندھی کی ایک آواز نے ایک دنیا میں ہل چل مچا دی ؟ مالُ دولت چھوڑ کر عیش و آرام ترک کرکے کیوں لاکھوں انسان جیل کی سختیاں اُٹھانے اور لاٹھیوں کے مار کھانے کے لیے تیار ہو گئے ؟ یہ وہ خود نوشت حالات ہیں جو خود مہاتما گاندھی نے اپنے گجراتی اخبار نوجیون میں لکھے تھے اور جس کے انگریزی ترجمہ کی قیمت گیارہ روپے تھی، اب مکتبہ جامعہ نے عام فائدہ کی غرض سے اسکا اُردو ترجمہ شائع کرکے دونوں جلدوں کی قیمت صرف دو رُپئے رکھی ہی، کتاب کی ضخامت سات سو صفحات سے زیادہ ہی اور زمانہ طالب علمی سے لے کر اب تک کی متعدد تصاویر دی گئی ہیں۔

قیمت صرف دُو روپئے

مکتبہ جامعہ، قرول باغ، دہلی